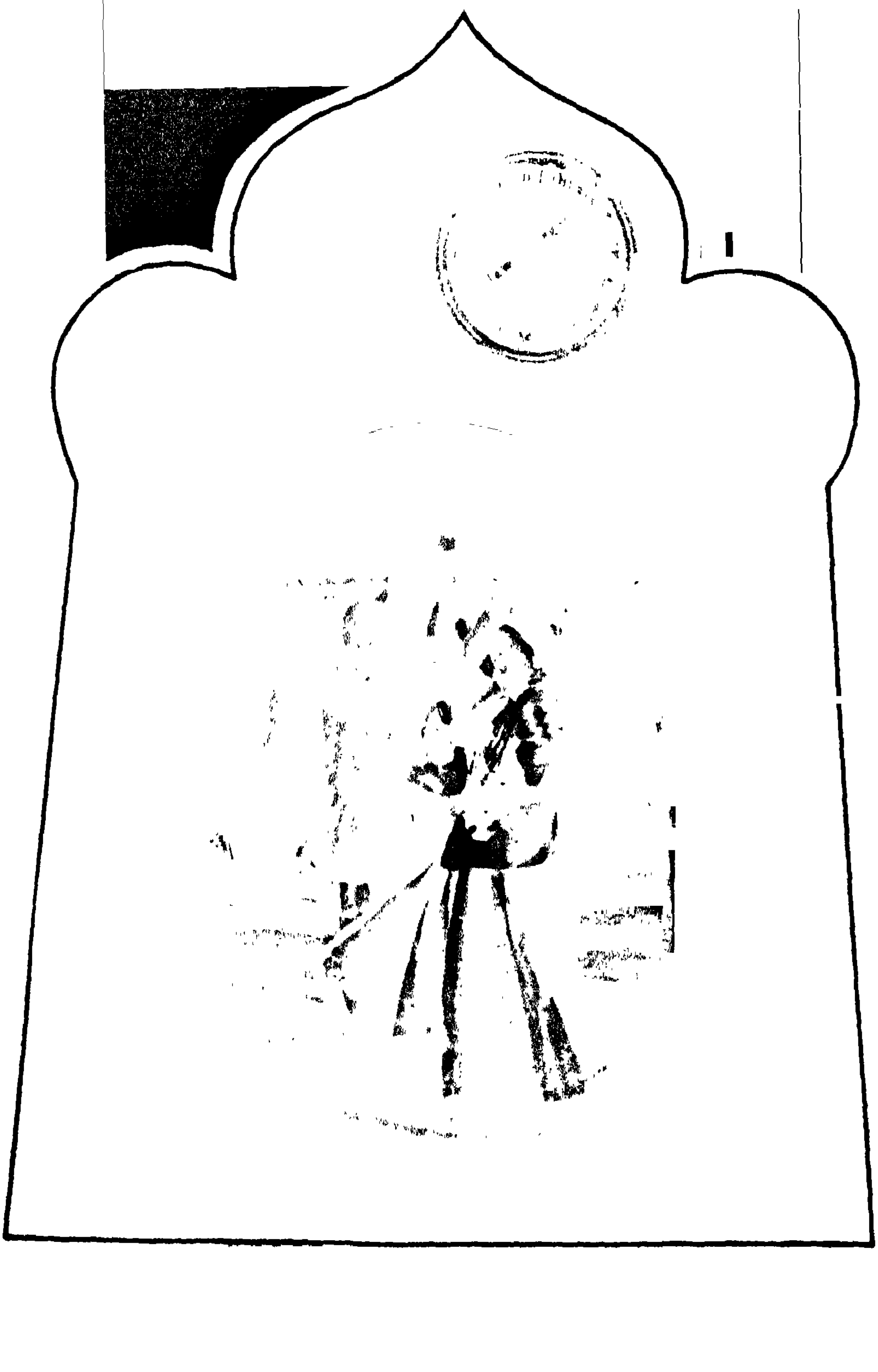
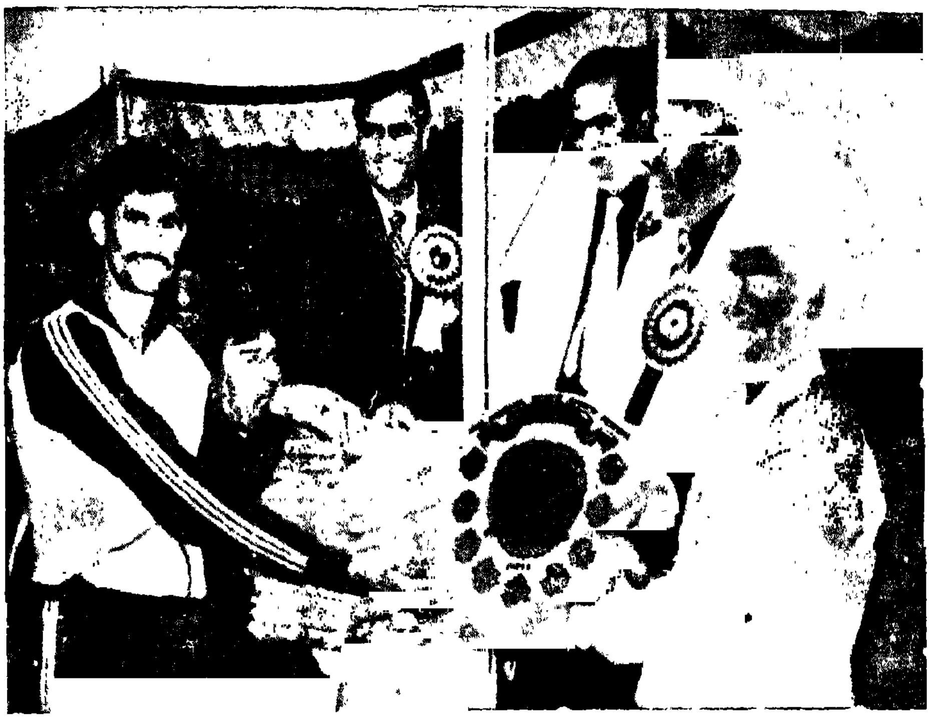




۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء کو بھوانی میں ۱۰ ویں ہریانہ سپورٹس فیسٹی ول کی اختتامیہ تقریب کے موقع پر عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ جیتنے والے کھلاڑیوں کو انعامات سے نوازتے ہوئے۔ تصویر میں ہریانہ اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر جناب آر۔ ایس ورما بھی نظر آرہے ہیں۔

جنوری ۱۹۸۷ء کو وزیرِ اعلیٰ ہریانہ، عالیجناب بنسی لال نے کلانور (روہتک) میں کمیونٹی سینٹر کا افتتاح فرمایا۔ تصویر میں سوشل ویلفیئر منسٹر محترمہ کرتار دیوی بھی نظر آرہی ہیں۔



فہرست

8V02

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

جنوری ۱۹۸۷ء	شمارہ ۱	جلد ۱۵

مدیر اعلیٰ

بھاسکر چیٹرجی

مدیر

سلطان انجم

سرورق: بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر "تعمیر ہریانہ" ایس. سی. او. ۱۸۹-۱۹۱

سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

حرفِ آغاز



عہدۂ جمہوریہ ہند عزت مآب گیانی ذیل سنگھ نے ۲۴ر نومبر ۱۹۸۶ء کو راشٹرپتی بھون میں گورنر ہریانہ عالیجناب سید مظفر حسین برنی کی گراں قدر تصنیف "Iqbal: Poet - Patriot Of India" کی رسمِ اجراء ادا فرمائی۔

گورنر ہریانہ نے "لیپروسی سیلز" کی فروخت مہم کا افتتاح فرمایا۔

۳۰ر جنوری ۱۹۸۷ء کو ہند کشٹ نوارن سنگھ کی ہریانہ شاخ کے زیرِ اہتمام ہریانہ بھون، نئی دہلی میں منعقدہ ایک سادہ تقریب میں عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے لیپروسی سیلز" کی فروخت مہم کا افتتاح فرمایا۔

عالیجناب گورنر ہریانہ نے اس بات پر زور دیا کہ عوام کو جذام کے متعدی مرض نہ ہونے سے آگاہ کیا جائے۔ اِس مرض میں گرفتار لوگ بھی مناسب عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اِس عوامی بیداری سے جذامیوں سے دُور رہنے جیسے بے بنیاد مفروضوں کی سماج سے بیخ کنی میں مدد ملے گی۔

گورنر ہریانہ نے جذام کے مسئلہ پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ہر سال جذام کے تقریباً چار لاکھ نئے کیس سامنے آتے ہیں۔ موصوف نے کہ ہریانہ اس موذی مرض سے تقریباً محفوظ ہے۔

تعمیرِ ہریانہ ۴ جنوری ۱۹۸۷ء

ہند کشٹ نِوارن سنگھ کی ہریانہ شاخ کی بہتر کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے گورنر موصوف نے فرمایا کہ یہ سنگھ انبالہ، جگادھری، کرنال اور روہتک میں جذامیوں کی چار کالونیوں کی دیکھ بھال اور انتظام کرتا ہے۔ جہاں انہیں طبی سہولتیں، مفت دوائیں اور خوراک مہیا کی جاتی ہے۔

پینے کے صاف پانی کی فراہمی میں خطۂ میوات کو ترجیح دی جائے گی۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۷ء کو وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بنسی لال نے تاوڑو ضلع گوڑگاؤں میں ایک عظیم عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ۳.۴ کروڑ روپے کی مرکزی امداد کی ایک ایک پائی ریاست کی ترقی اور ریاستی عوام کی فلاح پر خرچ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ تعمیری کاموں میں اور تیزی لانے کے لئے مرکز سے مزید امداد کی درخواست کی جائے گی۔

خطۂ میوات کی ترقی کا حوالہ دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے فرمایا کہ اس علاقہ کے سبھی دیہات میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی کو اولیت دی جائے گی۔ یہاں پانی کی سطح کافی اوپر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آبپاشی کے لئے بڑے بڑے کنوئیں کھود کر آبپاشی سہولیات کو توسیع دی جائے گی۔ وزیرِ اعلیٰ موصوف نے لوگوں سے ریاست کی برق رفتار ترقی کے لئے وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی کی پالیسیوں اور پروگراموں کی حمایت کرکے اُن کے ہاتھ مضبوط کرنے کی اپیل کی۔

وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ اس وقت ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کے تحت حکومت لوگوں کو بنک قرضوں سے معافی دلا سکے۔ یہ محض عوام کو گمراہ کرنے والی بات ہے۔ بالفرض ایسا کوئی قانون عمل میں آیا تو میں بنک قرضوں کو معاف کرنے والا پہلا شخص ہوں گا۔

حزبِ مخالف کی ریاست دشمن سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ ان پارٹیوں نے ۳.۴ کروڑ روپے کی مرکزی امداد کے بارے میں الیکشن کمیشن کو لکھ کر اس کی مخالفت کی ہے۔ یہ امداد ریاست کی تعمیر و ترقی کے لئے دی گئی ہے۔ اس پر نکتہ چینی ریاستی مفاد کے خلاف ہوگی۔

خطۂ میوات کے عوام کے مطالبات کا حوالہ دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ موصوف نے اعلان کیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وطن پر جانیں قربان کرنے والوں کی یاد میں رائے سینہ اور دوہا میں میموریل قائم کرنے کے لئے سپیشل گرانٹ دی جائے گی۔ انہوں نے ضلع فریدآباد کے میو اکثریت والے آٹھ گاؤں کو ضلع گوڑگاؤں میں شامل کرنے کا بھی اعلان کیا۔ اسی طرح کوآپریٹو قرضوں کی وصولی بھی آئندہ فصل تک کے لئے ملتوی کردی گئی ہے۔ جناب بنسی لال نے علاقہ کے چار اسکولوں کا درجہ بڑھانے کا بھی وعدہ کیا۔

اس موقع پر وزیرِ آبپاشی و بجلی ہریانہ جناب شمشیر سنگھ سُرجے والا نے کہا کہ حکومت اس علاقے کے عوام کی سہولت کے لئے پانچ نئے پُلوں کی تعمیر پر ۱۰ لاکھ روپے خرچ کرے گی۔

آنجہانی بابو جگجیون رام کی صاحبزادی محترمہ میرا کمار ایم۔پی کے علاوہ ڈیولپمنٹ اینڈ پنچایت منسٹر کرنل رام سنگھ، وزیرِ خوراک و رسد جناب اندر جیت سنگھ، ہریانہ پردیش کانگرس کمیٹی (۱) کے صدر جناب ہرپال سنگھ، جناب ایم۔پی کوشک ایم۔پی اور چودھری رحیم خاں ایم۔پی بھی خطاب فرمانے والوں میں شامل تھے۔

اس سے قبل وزیرِ داخلہ ہریانہ چودھری طیب حسین نے شہر میں ۸،۲۷ لاکھ روپے کی سب تحصیل کی عمارت اور اناج منڈی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اناج منڈی کی تعمیر کے پہلے مرحلے میں تقریباً ۱۳۲٫۶۷ لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔

عروج زیدی

پھولوں کی مورچہ بندی

کیا خبر تھی ایک ایسا بھی زمانہ آئے گا
پھول جو در اصل ہیں، جانِ چمن، شانِ چمن
غنچہ و گل بھی حسد رکھتے ہیں یہ سوچا نہ تھا
پھول آپس میں لڑیں، یہ بات فطرت کے خلاف
اب یہ نعرہ برزباں ہے، یاسمیں ہو یا گلاب
سوچنا پڑتا ہے وہ شام و سحر، اب کیا ہوئے؟
جس سے یہ ابھرے ہیں اُس پر فخر ہونا چاہیئے
کثرتِ گلہائے رنگا رنگ کا گلشن ہے نام
لوگ کہتے تھے اسے ہندوستاں جنت نشاں
چھوڑ کر بغض و حسد سب لیں رواداری سے کام

سبزہ زارِ ہند میدانِ وغا ہو جائے گا
برسرِ پیکار رہے آپس میں ان کا بانکپن
اب سے پہلے تو یہاں ماحول زہریلا نہ تھا
نِت نئی تہمت گھڑیں، یہ بات فطرت کے خلاف
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب
جن کا ہر اک گل تھا رنگ و نور کی دنیا لیے
اپنی تابندہ روایت کو نہ کھونا چاہیئے
جو چمن آرا ہیں میرا ایسے پھولوں کو سلام
منبعِ اخلاص تھیں اس کی سبھی انگڑائیاں
نونہالانِ وطن کو سوچنے کا ہے مقام

سیکڑوں پھولوں کا یہ گلدستۂ شاداب ہے
رنگ و نکہت جس پہ نازاں ہوں وہ آب و تاب ہے

شرون کمار ورما

سانجھ بھئی

نم آلود، ٹھنڈی ہوائیں، شرارت بھرا بلاوا تھا۔

گوتم، کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ درخت، عمارتیں، سڑکیں سب بارش میں نہا رہے تھے۔ بجلی کے تار سے لٹکی پتنگ، آزاد ہونے کی کوشش میں اور کبھی الجھتی جا رہی تھی۔

"مشکل ہے میری جان۔" گوتم نے کہا اور مسکرا دیا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہیں۔" کملا جو کسی کام سے کمرے میں آئی تھی، نے تشویش سے پوچھا۔

"ادھر آؤ۔" گوتم نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "وہ دیکھو پتنگ کا کیا حال ہوا ہے۔"

کملا نے پتنگ کو ناقابلِ توجّہ سمجھ کر خاوند کی طرف یوں دیکھا جیسے اس مرد سے اُسے ایسی بچکانہ بات کی امید نہ تھی۔ ایسا مرد جس کی تین بیٹیاں ہوں اور بالوں پر سفیدی اُتر رہی ہو۔

وہ مسکرا دیا جیسے رو دیا ہو۔ ایک بگلا بے فکری سے اُڑتا ہوا، اُس کے سامنے سے گزر گیا۔ اُسے یاد آیا۔ ایسے موسم میں وہ بھی اسکول، کالج سے بھاگ جایا کرتا تھا۔

"پھر رات بھر چھینکو گے۔" کملا کو موسم میں اس کی صحت کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

مِل کے آفیسرز میں سے انل اور سنیل رین کوٹ پہنے نکلے۔ اُس پر نظر پڑی تو انل نے پکار کر کہا۔

"چلتے ہو نینی تال۔"

"مشکل ہے۔" گوتم نے کہہ دیا۔

وہ دونوں ایک کھٹری وہیلر میں سوار ہو کر چلے گئے۔

پتنگ کا کاغذ پھٹ کر ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ بانس کی تیلیاں اور ڈور تار سے لٹک رہی تھی۔ ہوا نے رُخ بدل لیا تھا اور بوچھار اندر آنے لگی تھی۔

ایک دم کسی نے جیسے اُسے کھڑکی سے نوچ لیا۔ اُس نے دیکھا کملا پھرتی سے کھڑکی بند کر رہی تھی۔

"دیکھ رہے ہو قالین خراب ہو رہا ہے۔"

گوتم نے قالین کی طرف دیکھا۔ کملا قالین اور کھڑکی کی طرف سے مطمئن ہو کر چلی گئی تھی۔ قالین دیوار تک پھیلا ہوا تھا۔ دیوار پر اُڑتے ہوئے دو پرندوں کی تصویر آویزاں تھی، جس کے نیچے درج تھا They Can Because they think they can —— بارش کھڑکی پر دستک دے رہی تھی۔ وہ بگلا اُس کے ذہن میں اُڑ رہا تھا۔ بارش کہہ رہی تھی "باہر آؤ، یا مجھے اندر آنے دو۔"

ہریش نے نینی تال کی بہت تعریف کی تھی۔ بس انل اور سنیل تیار ہو گئے تھے۔ دونوں چھوٹے چانس۔ بہت سال پہلے وہ بھی گیا تھا نینی تال۔ تب اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جھیل کے کنارے سیر کرنے، بوٹنگ کرتے اس نے سوچا تھا۔ کوئی خوبصورت ساتھی ہو تو —— تب وہ جونیئر کلرک تھا ——

——— ایک پرائیویٹ فرم کے ملازم کا بیٹا۔ تین بہنوں کا بھائی۔
شادی ہوئی تو بوڑھے باپ نے کھانس کر کہا تھا ———
پہاڑ پر ہنی مون منانے جائے گا۔ جوان بہنیں ہیں۔ شرم نہیں آئے گی، کملا نے بھی کہا تھا۔ مجھے نہیں اچھے لگتے پہاڑ وہاڑ، اب گھر بنانے کی سوچو۔ اگنی کُنڈ کے گرد پھیروں کے بعد وہ تیلی، تیلی سی لڑکی ایک دم سیانی ہوگئی تھی۔ گوتم نے بھی سوچنا شروع کردیا۔ پھر اس کے لئے بھی وقت نہیں رہا۔ دفتر میں ترقی کیلئے محنت، امتحانات، بھاگ دوڑ، سفارشیں، خوشامدیں، جوڑ توڑ۔ سمجھوتے اور کل کی چنتا، اس چکر میں اُس کے یہاں بیٹی نے جنم لیا۔ بوڑھا باپ پرلوک سدھار گیا۔ دوسری بیٹی آئی۔ ماں بھگوان کو پیاری ہوگئی۔ بہنوں کو سسرال بھیجتے بھیجتے اُس کا کچومر نکل گیا۔ جب ذرا کمر سیدھی کی تو تیسری بیٹی آگئی۔ گھر میں اتنی ڈھیر ساری لکشمیاں پھر بھی تنگدستی۔ ترقی ہوتی تو مہنگائی برابر کردیتی۔ وہی ڈھاک کے تین پات رہ جاتے۔ تیسری بیٹی کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے کھل کر کہہ دیا کہ اب بس، نہیں تو وہ بیوی کو ہمیشہ کے لئے کھو دے گا۔ اس پل اسے احساس ہوا کہ وہ کملا کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ انھوں نے لڑکے کی خواہش کو بل کر دفن کردیا۔ نہ ڈاکٹروں، حکیموں سے کچھ ہوا نہ پیروں فقیروں کے ٹونے ٹوٹکے کام آئے ——— بس چنتا بڑھ گئی۔

"رانی کو ایسے (Essay) لکھا دو" کملا اس کے لئے کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈتی رہتی تھی۔

"کون سا ایسے بیٹے۔"

" اے وزٹ ٹو ہل سٹیشن "

وہ ہنس دیا۔ کملا اور رانی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ کبھی کبھی وہ ان کی سمجھ سے بالکل باہر ہوجاتا تھا۔ کملا نے پوچھا بھی کہ وہ کیوں ہنسا تھا لیکن جواب میں مسکراہٹ، پاکر وہ آلو چھیلنے لگی۔ گوتم نے آنکھیں موند لیں۔ چند منٹ کمرے میں خاموشی رہی پھر وہ بولنے لگا۔
"نینی تال اِز اے بیوٹی فل ـــ" وہ بولتا چلا گیا۔ پرانے اخبار پر آلو کے چھلکوں کا ڈھیر بڑھتا گیا۔ کملا ایک دم سی، کراُٹھی۔ گوتم نے آنکھیں کھول دیں۔ کملا انگوٹھا ہونٹوں میں دبائے تھی۔ رانی برنول کی ٹیوب لے آئی تھی۔ گوتم نے پھر آنکھیں موند لیں۔ اپنے اندر دیکھا کچھ تو وہاں بھی کٹ گیا تھا

"ـــ لکھو بیٹی ـــ" وہ پھر لکھانے لگا۔ کملا آلو کاٹتی رہی۔

"اتنا لمبا نہیں ڈیڈی، کچھ کم کیجئے۔" رانی نے کہا۔

ایسے (Essay) ختم ہوگیا اور آلو بھی۔ کملا چھلکے پھینکنے چلی گئی۔ وہ پھر اکیلا ہوگیا تھا۔ بارش کھڑکی پر بدستور دستک دے رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ قالین کی طرف دیکھا۔ کملا نے کمیٹی کے پیسوں سے خریدا تھا ——— ننگا بچّا فرش اچھا نہیں لگتا نا ——— بیٹیاں بیاہنی ہیں لڑکے والے پہلے گھر دیکھتے ہیں۔ بارش کھڑکی پر دستک دے رہی تھی۔ کیا وہ مُکتت نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے اندر کہیں ہنسا۔ وہ کھڑکی کھولنے کے خیال سے اُٹھا اور میز سے وہ خط اٹھا لایا۔ جو دہرہ دون سے اُس کے بڑے سالے نے لکھا تھا۔ بڑی بیٹی کے رشتہ کے بارے میں کملا نے کہا تھا۔

بھائی صاحب کو لکھا دو کہ لڑکے کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم کرکے لکھیں۔ لڑکے والوں سے لین دین کے بارے میں کھل کر بات کرلیں۔

کملا ہاتھ پونچھتی ہوئی آگئی۔

"کہاں سے آئی ہے چٹھی ـــ؟"

"وہی دہرہ دون والی ہے۔"

"ابھی تک جواب نہیں لکھا ـ" کملا نے ناراضگی سے کہا۔ "تم بھی بس ـ" وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

"خود ہی دہرہ دون ہو آتے ہیں، تم سب باتیں اطمینان سے کرلینا۔ سب سے مل بھی آنا۔"

"میں ایک ایک پیسہ بچا رہی ہوں اور تم ——— لکھ دو بھائی صاحب کو ـــ وہ ان معاملوں میں خود سیانے ہیں۔"

وہ قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی جیسے خط لکھوا کر ہی اٹھے گی۔ گوتم نے دیکھا۔ کملا کے بال پیشانی کے اوپر سفید ہونے لگے تھے۔ چہرے پر جیسے تھکان کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔ گنگا ندی آتار پر

ہے۔ پہلے کیسی پتلی نازک سی تھی وہ۔ مٹی کے کورے برتن سی مہکتی۔ انجان، اجنبی، پرجوش، کسی قدر ڈری ڈری سی۔ پھر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اپنی سی ہوگئی۔ ہوتی ہی چلی گئی۔ اور اس ماحول، اس گھر، اس کی زندگی میں رچ بس گئی۔ احساس ہی نہیں رہا کہ یہ لڑکی کسی دوسرے گھر، دوسرے خاندان سے آئی تھی اور اب اس نے کملا کو چھونا چاہا۔ شاید کملا کی چھٹی حس نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا۔ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ پہلی رات کی طرح۔ ہر عورت میں، برسوں بعد، آخر تک، پہلی رات کا کچھ نہ کچھ ضرور بچا رہتا ہے اُس نے سرشاری میں سوچا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔" اُس نے جھوٹ بول دیا۔ اسے اپنے کھردرے لہجے کا احساس ہوا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یہ کھردرا پن اب کیوں۔ دریا کے ساتھ بہتے بہتے تو پتھر بھی گول ہو جاتے ہیں۔ کملا اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے زیر کرنے پر آمادہ ہو۔ یہ عورت کیوں ہر گھڑی اس پر قابض رہنا چاہتی ہے۔ اس کی سوچوں تک پر بھی۔ یہ کیسا ادھیکار ہے اس کا۔ یہ کوئی خوف ہے یا کوئی ازلی خواہش۔ شاید عورت اپنا آپ یونہی نہیں سونپ دیتی مرد کو۔ بدلے میں بہت کچھ چپ چاپ لے بھی لیتی ہے لیتی رہتی ہے۔ وہ ندی جو زمین کو سیراب کرتی ہے، اُسے کاٹتی بھی رہتی ہے۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ وہ مسکرا دیا۔

" اب لکھ دو۔ لڑکے والے ہمارے لئے بیٹھے نہیں رہیں گے۔"

شاید کملا ہی ٹھیک ہے۔ ان معاملوں میں عورت کبھی غلط نہیں ہوتی۔ گوتم کو اپنی سوچ کے اس تضاد پر حیرت ہوئی۔ وہ کیا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ہے بھی یا نہیں۔ گوتم۔ خاوند۔ باپ۔

کملا کاغذ، قلم لے آئی۔ وہ خط لکھنے لگا۔ وہ بتاتی رہی۔ وہ لکھتا رہا۔ خط مکمل ہو گیا۔ کملا کی تسلی کے لئے اس نے خط پڑھ کر سنایا۔ کچھ تبدیلیاں اس کی مرضی کے مطابق کیں اور جیسے سرخرو ہو گیا۔

" اب پوسٹ کر آؤں۔" اس نے سوچا اس طرح بارش میں بھیگنے کا موقع ملے گا۔ شائد سریش سے ملاقات بھی ہو جائے۔ بہت دنوں سے نہیں ملا۔ دلچسپ باتیں کرتا ہے۔ وقت اچھا گزر جائے گا۔

" بارش تھم لینے دو۔"

بارش بھی شاید دستک دے دے کر تھک چکی تھی۔ مایوس ہو چکی تھی۔ گوتم نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اب بوندا باندی ہو رہی تھی۔

" پھر کھڑکی کھول دی۔" کملا چونکی۔

"اب بارش تو نہیں ہو رہی۔" اس کا لہجہ پھر تلخ تھا۔

" گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ادھر آؤ۔ دیکھو، موسم" وہ نرمی سے بولا۔

اس نے دیکھا، کملا جا رہی تھی۔ کیا کہہ دیا ایسا اس نے۔ کون سا گناہ کر دیا کھڑکی کھول کر۔ یہ قالین ہی سب کچھ ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں۔ اس کی معمولی سی خواہش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ عورت قالین اور خاوند میں فرق کیوں نہیں سمجھتی۔ اُس کے الگ وجود کو قبول کیوں نہیں کرتی۔ اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتی ہے۔ اس کے احساسِ ذمہ داری اس کی شرافت اور محبت کو اس کی کمزوری کیوں سمجھتی ہے۔

" دیکھو کملا۔ اب بارش نہیں ہو رہی کمرے میں۔"

" مجھے کیا۔ چاہے سب کچھ سڑک پر پھینک دو، تمہاری کمائی کا ہے۔ میرا کیا ہے۔"

" کب کہا میں نے ایسا۔" اسے تین بیٹیوں کی اس ماں پر غصہ آنے لگا۔ کیسی احمقانہ بات ہے۔ چلا جائے وہ گھر سے۔ ہوا کے گیلے سے جھونکے نے دہرہ دون سے آئے خط کو میز سے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے لپک کر خط اٹھا لیا۔ کملا کمرے سے نکل گئی۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ کھڑا قالین کو دیکھتا رہا۔ لڑکے والے یہی سب کچھ دیکھیں گے۔ گھر، فرنیچر، قالین، مہمان نوازی خرچ کر سکنے کی سکت۔ ٹھیک ہے۔ اس نے خود کو شانت کرنے کیلئے

تنو کی گنتی اُلٹی گنی۔ یہ گُر اُسے سریش نے سمجھایا تھا۔ ایک، تک آتے آتے وہ سچ مچ شانت ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ اچھا ہوا وہ بے قابو نہیں ہوا۔ عورت تو جذباتی ہوتی ہے۔ کیا رکھا ہے اس فضول سی تکرار میں۔ شاید کملا ہی درست ہے۔ اس عورت نے بھی تو اپنے پاس اپنا کچھ نہیں رکھا۔ سب کچھ اس گھر میں جذب ہو گیا۔ وہ آنگن میں آگیا۔ ہر کمرے میں دیکھا۔ کچن میں گیا۔ کملا کہیں نہیں تھی۔ روٹھ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ روٹھ کر وہ چھت پر چلی جاتی ہے۔ برچھتی میں اکیلی بیٹھی کاٹھ کباڑ کو دیکھتی رہتی ہے۔ وہ چھت پر چلا گیا۔

وہ برچھتی میں تھی۔

"یہاں کیا کر رہی ہو۔؟"

"——"

"کمرے کی بند کر آیا ہوں" وہ مسکرایا۔

وہ پرانے، اُلجھے بان میں لپٹا الابلا دیکھتی رہی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اور یوں اُسے چوم لیا جیسے پھول کو چھو لیا ہو۔

"کیا کر رہے ہو۔ بیٹیوں والا گھر ہے۔"

وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دور کسی مل کی اونچی چمنی سے گاڑھا، کالا دھواں نکل رہا تھا۔ طوطوں کی ڈار ٹیں ٹیں، کرتی گزر گئی تھی، اسٹیشن پر انجن کی چھک چھک، تیز ہو گئی۔ بادلوں کی چھاپ سے کہیں کہیں نیلا، دھلا ہوا آکاش جھانکنے لگا تھا۔

"اب کیا ہوا۔؟" وہ اُسے اداس دیکھ کر بولی۔

"کچھ نہیں۔" اُداسی اس کی آواز میں ڈھل رہی تھی۔

"مجھ سے مت چھپایا کرو کچھ۔" وہ مسکرا دی۔ "چھپا پاتے تو ہو نہیں۔"

اس نے سوچا۔ شاید وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہے۔ اپنی شخصیت کا ایک حصہ، جو شائد ہر مرد اپنی بیوی سے چھپائے رکھتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ کیا چھپا رہا ہے! شائد مکت ہونے کی معصوم خواہش۔

"لڑکا چاہتے ہو۔" وہ اس کے چہرے پر کچھ پڑھ رہی تھی وہ چونکا۔ یہ کیا سوچ رہی ہے وہ۔ شاید اس میں کملا کی اپنی خواہش کا رنگ ہو۔ بیٹے کی ماں ہونے کا احساس۔ فخر۔ لیکن کملا کی قیمت پر ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔ بیٹا نہیں تو نہ سہی۔ یہ کملا نے کیسے سوچ لیا۔ ایسا خود غرض، کمینہ، ظالم وہ نہیں ہو سکتا۔

"ڈرو نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے۔"

وہ چیخنا چاہتا تھا۔ اُس کے لب نہیں کھلے۔ یہ کیا ہے اس عورت میں۔ کیوں مٹ جانا چاہتی ہے وہ اس کے لئے۔ یہ کیسا جال ہے جس میں سے وہ نکل نہیں پاتا۔ باتوں کا۔ محبّتوں کا —— مسکراہٹوں کا۔ خود سپردگیوں —— اور قربانیوں کا۔

گوتم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور نیچے لے آیا۔ وہ کام میں مصروف ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ الجھن سی محسوس کرنے لگی

"خط پوسٹ کر آؤ——"

چھتری لے کر وہ چلا تو کملا نے یاد دلایا۔

"میری دوا لیتے آنا۔ اور ہاں درزی کی طرف بھی ہو آنا میرے بلاؤز نہیں دے گیا ابھی تک۔"

وہ سیڑھیاں اُتر گیا۔ وہ میس کی طرف گیا۔ گیٹ پر چوکیدار نے بتایا کہ سریش بابو میس چھوڑ گئے تھے۔ شادی کر کے باہر رہنے لگے تھے۔

"گوتم واپس ہو لیا۔ سریش جیسے شخص نے شادی کر لی۔ وہ تو ان بندھنوں کے خلاف تھا، آزاد پرندہ۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر۔ یہی سب سوچتا وہ پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ وہاں سے نکلا تو سریش مل گیا۔ جلدی میں تھا۔ گوتم نے سوچا اس موسم میں تھوڑی سی پی لی جائے۔ اس نے گوتم سے کہا تو اس نے مسکرا کر انکار کر دیا۔

"پھر کبھی سہی۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔"

"سنا ہے۔"

"ہاں۔ وہ مس الوا ہیں نا۔ وہی مشن اسکول کی ٹیچر۔ آؤ۔ گھر چلتے ہیں۔"

"پھر کبھی سہی۔ گوتم نے سریش کے الفاظ دہرا دیئے۔

سریش ہنستا ہوا چلا گیا۔

گوتم اسے جاتے دیکھتا رہا پھر مین بازار کی طرف چل دیا۔ جہاں سے اسے کملا کی دوا اور بلاؤز لینا تھے ●●

مہندر پرتاپ چاند

دعوتِ عمل

آؤ۔ خوشی کے دیپ جہاں میں جگائیں ہم
آؤ۔ ضیا و نور کے دریا بہائیں ہم

پھر آسماں سے تارے یہاں توڑ لائیں ہم
پھر چار چاند اور بھی اِس کو لگائیں ہم
آؤ۔ زمینِ ہند کو پھر سے سجائیں ہم
آؤ۔ خوشی کے دیپ جہاں میں جگائیں ہم
آؤ۔ ضیا و نور کے دریا بہائیں ہم

تعلیم و تربیت سے اُجالا کریں یہاں
اِنسانیت کے بول کو بالا کریں یہاں
تعمیرِ نو کی راہیں ہر سُو دِکھائیں ہم
آؤ۔ خوشی کے دیپ جہاں میں جگائیں ہم
آؤ۔ ضیا و نور کے دریا بہائیں ہم

بنجر ہے جو زمیں اُسے ہم گُل زمیں کریں
پھر گُل زمیں کو غیرتِ خُلدِ بریں کریں
نہروں کے جال دشت و دمن میں بچھائیں ہم
آؤ۔ خوشی کے دیپ جہاں میں جگائیں ہم
آؤ۔ ضیا و نور کے دریا بہائیں ہم

پھُولے پھَلے، بہار بدامن رہے چمن
بھُولے سے بھی نہ غیر کا محتاج ہو وطن
اُٹھو کہ خود کفیلِ وطن کو بنائیں ہم
آؤ۔ خوشی کے دیپ جہاں میں جگائیں ہم
آؤ۔ ضیا و نور کے دریا بہائیں ہم

ابراہیم یوسف

عجیب مصنف

مکان کی دوسری منزل کا برآمدہ جو تقریباً دس فٹ چوڑا ہے برآمدہ میں دو بالکونیاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ کمرہ رہا ہوگا جسکو برآمدہ کی شکل دے دی گئی ہے یہ دونوں بالکونیاں اس کمرے کے دروازوں کے سامنے رہی ہونگی۔ برآمدہ کے دائیں جانب ایک دروازہ اور دروازے کے دونوں جانب کھڑکیاں ہیں جن پر ہلکے سبز رنگ کے پردے پڑے ہیں۔ شمالی جانب ایک اور دروازہ دوسرے کمرے کا ہے جو بند ہے اس دروازے کے پاس کونے میں ٹیلیفون رکھا ہے اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں سردی کا موسم ہے دھوپ میں ابھی تیزی نہیں آئی ہے۔ صابرہ شال اوڑھے بالکونی میں بیٹھی ہے اس کے سامنے ایک گول میز پہ چائے کی پیالیاں اور کیتلی رکھی ہے ایک دو کرسیاں اور پڑی ہیں۔ صابرہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے ٹکی بیٹھی ہے کچھ دیر بعد شکیلہ برآمدہ سے گزر کر صابرہ کے پاس آتی ہے۔ صابرہ آنکھیں کھولتی ہے۔ شکیلہ کو دیکھ کر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کرکے:

صابرہ: آیئے۔ تشریف رکھیے۔

شکیلہ: شکریہ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میرا نام شکیلہ ہے میں بھی اس کوٹھی کی کرایہ دار ہوں۔

صابرہ: بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے صابرہ کہتے ہیں — صابرہ اسرار احمد۔

شکیلہ: (مسکرا کر) مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ ہم نے آپ کے ناول پڑھے ہیں۔

صابرہ: اچھا۔ پسند آئے آپ کو؟

شکیلہ: کیوں نہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی مگر میں اور راحت دونوں نوکری کرتے ہیں واپسی میں اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ آج اتوار تھا سوچا آپ سے ملاقات کی جائے۔

صابرہ: نوکری تو میں بھی کرتی ہوں۔ (پیالی میں چائے نکال کر شکیلہ کے سامنے رکھتے ہوئے) فرصت کی مجھے بھی تلاش رہتی ہے۔

شکیلہ: آپ کو یہاں تنہائی کا تو احساس ہوتا ہوگا۔ عجیب ویران اور سنسان جگہ ہے، آس پاس کوئی آبادی نہیں۔

صابرہ: تنہائی اور ویرانی تو ہے مگر جگہ ہے پُرسکون۔ کوشش کر رہی ہوں کہ کوئی ایسی عورت مل جائے جو دن رات میرے ساتھ یہاں رہے۔

شکیلہ: مسٹر فخری کی پرانی ملازمہ اس کوٹھی میں رہتی ہے ممکن ہے تیار ہو جائے۔

صابرہ: کیا وہ مسٹر فخری کے یہاں کام نہیں کرتی۔

شکیلہ: جی نہیں (ہنس کر) وہ تو یہاں آتے ہوئے بھی ڈرتی ہے

صابرہ: (حیرت سے) آتے ہوئے ڈرتی ہے! کیوں؟

شکیلہ: (مسکرا کر) اس کا خیال ہے کہ مسٹر فخری کی بیوی کی روح منڈلاتی رہتی ہے۔

صابرہ: مسٹر فخری کی بیوی کی روح!

شکیلہ : جی ہاں۔ (صابرہ کے کمرے کی طرف اشارہ کرکے) اسی کمرے میں انہوں نے خودکشی کی تھی۔ (صابرہ خاموش رہتی ہے) آپ کی مسٹر فخری سے ملاقات ہوئی۔

صابرہ : جی ہاں۔ (ہنس کر) جس دن کمرہ کرایہ پر لینے آئی تھی اسی دن ملاقات ہوئی تھی۔

شکیلہ : (مسکرا کر) پھر؟

صابرہ : میں نے گھنٹی بجائی وہ دروازے پر آئے میں نے کمرہ کرایہ پر لینے کی خواہش کی تو وہ اندر چلے گئے پھر واپس آ کر کمرہ کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ کر دروازہ بند کر لیا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی نہ انہوں نے پوچھا میں کون ہوں کیا ہوں یہاں تک کہ کرایہ تک طے نہیں کیا۔ ان کا رویہ عجیب سا تھا۔

شکیلہ : ہم تو تین سال سے یہاں رہ رہے ہیں انہیں بہت کم بولتے سنا ہے ہمیشہ خاموش رہتے ہیں۔

صابرہ : میں صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ خاموش اس درخت کے نیچے بیٹھے ہیں۔

شکیلہ : (نیچے دیکھتے ہوئے) وہ دن دن بھر وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ دیکھئے وہ زینت بی ہے۔ (ذرا اونچی آواز سے) زینت بی ذرا یہاں آنا۔ (صابرہ کو دیکھ کر) وہ یہاں آتے ہوئے ڈرتی ہے۔

صابرہ : جاہل عورت ہے وہم میں مبتلا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) کچھ پتہ چلا مسٹر فخری کی بیوی نے کیوں خودکشی کی تھی۔

شکیلہ : زینت بی کہتی ہیں کہ یہ دس سال پرانی بات ہے۔ جب یہ حادثہ ہوا وہ موت کے دن اپنے گھر پر گزار رہی تھیں۔ کچھ پتہ نہ چلا تب ہی سے مسٹر فخری گم سم ہو کر رہ گئے ہیں (زینت بی آتی ہے عمر پچاس سال سے زیادہ ہے) زینت بی یہ نئی کرایہ دار صابرہ بیگم ہیں ــــ (زینت حیرت سے صابرہ کو دیکھتی ہے اور سلام کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے۔ صابرہ گردن ہلا کر جواب دیکر)

صابرہ : آؤ بیٹھو (زینت زمین پر بیٹھنے لگتی ہے) نہیں نہیں ادھر کرسی پر (زینب حیرت سے صابرہ کو دیکھتی ہے پھر سمٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) کیوں۔ کیا بات ہے؟

زینب : کچھ نہیں بی بی۔ (کچھ دیر یوں خاموش رہتی ہے جیسے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہو) مجھے اپنی پرانی مالکن یاد آ گئیں انہوں نے بھی مجھے زمین پر نہیں بیٹھنے دیا (کمرہ کی طرف اشارہ کرکے) آپ نے یہی کمرہ کرایہ پر لیا ہے؟

صابرہ : ہاں۔ کیا بات ہے؟

زینت : مگر اس میں تو مالکن نے ــــ یعنی ــــ شاید وہ ــــ

صابرہ : شاید وہ کیا (ہنس کر) مجھے اس کمرہ میں نہیں رہنے دیں گی۔

زینت : اللہ جانے بی بی۔ چار سال ہوئے جب ایک ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی آ کر رہے تھے مگر تین چار دن بعد ہی اپنا سامان لیکر چلے گئے۔

صابرہ : تمہاری مالکن کو وہ پسند نہ آئے ہوں گے (ہنس کر) میں ان سے دوستی کر لوں گی۔

شکیلہ : زینت بی۔ صابرہ بیگم کو ایک عورت کی ضرورت ہے اگر تم۔

زینت : (بات کاٹ کر) نا بی بی نا۔ میں فخری میاں کی نوکر ہوں۔

شکیلہ : (حیرت سے) فخری میاں کی نوکر! مگر ہم نے تو کبھی تمہیں وہاں کام کرتے نہیں دیکھا۔

زینت : مگر تنخواہ وہ مجھے برابر دیتے رہتے ہیں میری لڑکی زینب کی شادی کے لئے چار ہزار روپے دیئے تھے۔

صابرہ : اور وہ تم سے کوئی کام نہیں لیتے؟

زینت : مالکن کی موت کے بعد مجھے یہاں آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے مجھے یہاں آنے سے منع کر دیا۔

صابرہ : بڑے عجیب آدمی ہیں!

زینت : سچ پوچھو بی بی تو ان کی حالت دیکھ کر رونا آتا ہے ہزاروں کی آمد ہے مگر کبھی ایک پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتے سب لوگوں میں بانٹتے رہتے ہیں۔

صابرہ : اچھا!

زینت : ہاں بی بی۔ غفور میاں یہاں مالی کا کام کرتے تھے بیچارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے لڑکے کریم کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اسے ہندوستان کے باہر کہیں پڑھنے کو بھیج دیا۔ تین سال تک ہزاروں روپیہ اسے بھیجتے رہے۔ جب وہ پڑھ کر آیا تو اس سے اتنا کہا کہ وہ اب یہاں نہ آیا کرے۔

صابرہ : (سوچتے ہوئے) اب وہ یہاں نہیں آتا؟

زینت : آتا ہے بی بی۔ بڑا آدمی ہو گیا ہے موٹر میں آتا ہے۔

شکیلہ : اچھا وہ نوجوان جو اکثر سیاہ رنگ کی کار میں آتا ہے وہی کریم ہے!

زینت : ہاں بی بی وہی۔ بیچارا گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے کہ وہ اس سے ایک دو بات کر لیں مگر تم نے دیکھا وہ اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں جیسے اسے پہچانتے ہی نہ ہوں۔ بیچارا ان کی صورت دیکھکر چلا جاتا ہے۔ (نیچے سے آواز۔ شکیلہ۔ ارے بھئی شکیلہ۔)

شکیلہ : (نیچے دیکھتے ہوئے) جی۔ کیا ہے؟

آواز : ارے بھئی کیا آج کا پروگرام بھول گئیں۔؟

شکیلہ: یاد ہے۔ ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں۔

آواز : آپ کے میک اپ کا وقت کس حساب میں جائے گا۔ دس یونہی بج جائیں گے۔

شکیلہ: ان مردوں کو ہمارے میک اپ سے جانے کیوں چڑ ہے (اونچی آواز سے) اچھا حضور آ رہی ہوں (کھڑے ہوکر) آپ نے داڑھی بنالی؟

آواز : بنالوں گا آپ آکر تو تیار ہو لیجئے۔

شکیلہ : ابھی تک داڑھی نہیں بنی (ہنسکر) بس تو پھر پروگرام کینسل سمجھیے۔ آپ داڑھی بنایئے میں آ رہی ہوں۔ (صابرہ سے) اجازت دیجیئے۔ اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔ کوئی پریشانی ہو تو بلا تکلف کہیئے گا۔

صابرہ : ضرور۔ کیوں نہیں۔ (شکیلہ آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔ صابرہ ایک پیالی میں چائے نکال کر زینت کو دیتے ہوئے کھڑے ہوکر) تم چائے پیو میں ابھی آتی ہوں۔

زینت : (گھبراکر) مگر بی بی۔ وُہ۔ وُہ۔

صابرہ : (مسکراکر) تمہاری مالکن کی روح دن میں نہیں آئے گی۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ــــ (چائے کی پیالیاں اور کیتلی اُٹھا کر کمرے میں چلی جاتی ہے۔ زینت کے چہرے سے خوف اور گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے وہ بار بار نیچے دیکھتی ہے۔ کچھ دیر بعد صابرہ چائے کی کیتلی پیالیاں اور چند رسائل لئے پھر واپس آتی ہے اور زینت کو دیکھکر) ارے تم نے چائے نہیں پی (کرسی پر بیٹھکر) ٹھنڈی ہو گئی ہو تو اور دُوسری لے لو (زینت نیچے دیکھتی ہے) کیا بات ہے (نیچے دیکھکر) یہ مسٹر فخری کیا کر رہے ہیں؟

زینت : شاید ان پودوں کو اکھاڑ رہے ہیں جن پر انہیں شک ہے کہ ان میں پھول کھلیں گے۔

صابرہ : (حیرت سے) وہ پھولوں کو پسند نہیں کرتے؟

زینت : جب تک مالکن زندہ تھیں اس کوٹھی میں پھول ہی پھول تھے (ٹھنڈی سانس بھرکر) ان کے بعد فخری میاں نے کبھی پھول کا پودا نہیں رہنے دیا۔

صابرہ : اچھا۔ بڑے بدذوق ہیں۔

زینت : ایک مرتبہ راحت میاں نے گملوں میں کچھ پھولدار پودے لگا لئے تھے تو انہوں نے سب گملے توڑ ڈالے تھے اور اتنے ناراض ہوئے تھے کہ تین مہینے تک ان سے کرایہ نہیں لیا تھا۔

صابرہ : (ہنس کر) یہ ناراضگی تو بڑے کام کی ہے میں ہر مہینے دو چار گملے ان کے دروازے پر لاکر رکھ دیا کروں گی۔

زینت : نہ بی بی ایسا نہ کرنا جانے کیا غضب ڈھائیں۔ (گھبراکر ایکدم کھڑے ہوکر) میں اب جا رہی ہوں۔ وہ اِدھر ہی آ رہے ہیں ــــ (تیزی سے گھبرائے ہوئے خوفزدہ انداز میں چلی جاتی ہے صابرہ حیرت سے زینت کو دیکھتی ہے۔ پھر پیالی میں چائے نکال کر ایک دو گھونٹ لیتی ہے اور رسالہ اُٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہے کچھ دیر بعد فخری آہستہ آہستہ صابرہ کے پاس آتا ہے۔ رُک کر صابرہ کو دیکھنے لگتا ہے)

صابرہ : تشریف رکھیے مسٹر فخری (فخری خاموش رہتا ہے۔ صابرہ دُوسری پیالی میں چائے نکالتے ہوئے) اب موسم بدل گیا ہے سردی کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ (صابرہ چائے کی پیالی فخری کی طرف بڑھاتے ہوئے) تشریف رکھیئے نا۔ (فخری کچھ خاموشی سے صابرہ کو دیکھتا رہتا ہے پھر پیالی لیتا ہے) یہاں کا یہ خاموش ماحول کچھ تھکا تھکا ضرور ہے مگر اِس میں ایک دلکشی ہے۔ آپ تشریف تو رکھیئے۔ (فخری کچھ دیر خاموش رہ کر پیالی نیچے پھینک دیتا ہے۔ صابرہ کچھ دیر حیرت زدہ سکتے کے عالم میں رہتی ہے پھر ایکدم کھڑے ہوکر بپھرے ہوئے انداز میں) ایڈیٹ کیا کبھی مہذب انسانوں

میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ (مڑ کر نیچے دیکھتی ہے) واہیات انسان۔ غیر انسانی حرکتیں کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ (یکدم بلند آواز سے) ارے بھائی جان آپ کب آئے زینہ دائیں جانب ہے (پھر مڑ کر فخری کو دیکھ کر) تم بڑا سراہنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم اپنی بیوی سے محبت کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنا چاہتے ہو۔ مگر نہ تم مظلوم ہو اور نہ قابلِ ہمدردی غیر مہذب انسان کی طرح قابلِ نفرت ہو۔ —— (فخری خاموشی سے سب کچھ سُنتا رہتا ہے پھر آہستہ سے)

فخری : واہیات مصنفہ صابرہ اسرار احمد۔

صابرہ : تم مجھے کہاں سے جانتے ہو۔

فخری : میں ہر اس واہیات مصنف کو جانتا ہوں جو تجربات کی بھٹی میں نہیں پکتے صرف تخیلات کی فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں۔

صابرہ : (غصہ سے) میں واہیات مصنفہ سہی مگر تمہاری طرح غیر مہذب اور جنگلی نہیں۔ (فخری آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جاتا ہے۔ صابرہ بلند آواز سے) جنگلی میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔

(فخری اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے صابرہ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فخری کے اطمینان اور خاموشی سے اور چڑ گئی ہو۔ برابر فخری کے دروازے کو غصہ سے تکتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد ابرار آتا ہے اور صابرہ کو غصہ میں دیکھ کر)

ابرار : کیا بات ہے صابرہ تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟

صابرہ : کوئی خاص بات نہیں۔ آپ کب آئے؟

ابرار : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) رات میں آ گیا تھا ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا۔

صابرہ : امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟

ابرار : ٹھیک ہی ہے۔ کھانسی کسی طرح نہیں جا رہی۔ (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) یہ جگہ بڑی ویران ہے۔ تمہیں کالج کے پاس کوئی مناسب جگہ نہیں ملی؟

صابرہ : مجھے جلد ہی کوارٹر مل جائے گا۔ آپ کو میرا پتہ کیسے مل گیا میں نے تو ابھی تک آپ کو خط بھی نہیں لکھا۔

ابرار : تمہارے کالج کے چوکیدار سے۔ وہ بیچارا خود یہاں تک چھوڑنے آیا تھا —— (فخری بہت سی کتابیں اٹھائے ہوئے کمرے سے نکلتا ہے اور نہایت بے دردی سے انہیں نیچے پھینک دیتا ہے)

صابرہ : یہ جنگلی پن کی انتہا ہے —— (ابرار اسے غور سے دیکھتا ہے فخری پھر کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ ابرار سوچتے ہوئے)

ابرار : یہ کون ہے؟

صابرہ : فخری۔ اس کوٹھی کا مالک۔ میں اسی کی کرایہ دار ہوں۔

(ابرار برابر فخری کے دروازے کو دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ فخری پھر کتابوں کا ایک ڈھیر لئے نکلتا ہے اسی بے دردی سے نیچے پھینکتا ہے اور بے حد اطمینان سے برآمدہ پار کرکے نیچے چلا جاتا ہے۔ ابرار اور صابرہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ صابرہ ابرار کو دیکھ کر)

صابرہ : کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟

ابرار : ہاں۔ وہ ایک خطرناک انسان ہے۔ (کچھ دیر رُک کر) صابرہ تم فوراً یہ مکان چھوڑ دو۔

صابرہ : نہیں۔ میں اس سے نہیں ڈرتی وہ ایسی ہی غیر معمولی حرکتیں کر کے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ابرار : تم اسے نہیں جانتیں صابرہ —— وہ ——

(نیچے سے آواز)

آواز : آپ یہ کیا کر رہے ہیں مسٹر فخری؟

صابرہ : (نیچے دیکھ کر) وہ کتابوں میں آگ لگا رہا ہے۔

ابرار : یہ دوسرا شخص کون ہے؟

صابرہ : دوسرے کرایہ دار مسٹر راحت۔

ابرار : (بلند آواز سے) جلانے دیجئے راحت صاحب۔ اس کی رُوح کو شاید اسی سے سکون مل جائے۔

آواز : نہیں نہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہ علم و ادب کے خزانے کی یوں بے حرمتی کریں۔ مسٹر فخری رُک جائیے۔ خُدا کے لئے —— ورنہ ——

ابرار : وہ فخری نہیں عامر زنگی ہے راحت صاحب۔

صابرہ : (حیرت سے) عامر زنگی۔ وہ مشہور ڈرامہ نگار و ناولسٹ (ابرار اثبات میں سر ہلاتا ہے (صابرہ پھر نیچے دیکھتی ہے) اس نے کتابوں کو آگ

لگا دی ہے کتابیں دھڑا دھڑ جل رہی ہیں۔ (کرسی پر اس طرح بیٹھ جاتی ہے جیسے اس کا بہت کچھ لُٹ گیا ہو۔ ابرار دُوسری کُرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ صابرہ کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ جنگلی عامر زنگی ہے؟ مگر وہ لِکھا بیٹا ہیں۔

ابرار : اُس نے ایسا مشہور کردار لکھا ہے خود کو اُن کا سیکرٹری ظاہر کرتا ہے۔ (اُسی وقت فخری برآمدہ میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے ابرار اُسے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ فخری بے حد مطمئن انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکونی کے پاس آتا ہے۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر بالکونی میں آ کر نیچے جلتی ہوئی کتابیں دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد مُڑ کر ابرار سے)

فخری : تو تم نے مجھے پہچان لیا؟

ابرار : ہر مجرم کو پہچاننا پولیس والوں کا پہلا فرض ہے۔

فخری : اور تمہاری نااہلی کے باعث مجرم دندناتے پھرتے ہیں اور تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

ابرار : ہم نااہل سہی مگر ان مجرموں کی طرح بے وقوف نہیں جو اپنے جُرم کا ثبوت خود فراہم کرتے پھرتے ہیں۔

فخری : اپنے جُرم کا ثبوت!

ابرار : ہاں۔ کیا تم نے اپنے جُرم کا ثبوت اپنے ناول "شیطان" میں فراہم نہیں کر دیا ہے (فخری خاموشی سے ابرار کو دیکھتا رہتا ہے) عامر زنگی اِس ناول کا شیطان اور کوئی نہیں وہ تم ہو اور صرف تم۔

فخری : اچھا — اور کچھ۔

ابرار : تم نے ایک مُجرم کے ان جذبات اور احساسات کو جو ایک بے گُناہ کو بلا وجہ قتل کرتا ہے جس طرح بیان کیا ہے وہ تمہارے جذبات اور احساسات ہیں مقتولہ کی بے بسی اور تڑپنے کی جو کیفیت تم نے بیان کی ہے وہ کسی فرضی کردار کی نہیں تمہاری معصوم بیوی کی بے بسی اور تڑپ ہے۔

صابرہ : (نفرت سے) تو اپنی بیوی کے قاتل تم ہی ہو جس کی رُوح کے یہاں منڈلاتے رہنے کا افسانہ تراش کر تم نے اپنے گرد حصار قائم کر رکھا ہے۔ تم زندہ کیوں ہو لعنتی (فخری مُسکراتا ہے۔ صابرہ چڑ کر) جہنمی شیطان۔

ابرار : اور عامر زنگی تم نے اپنے بچاؤ کا جو جال تیار کیا تھا وہ بھی شیطان میں موجود ہے۔

فخری : (مُسکرا کر) اور کچھ۔

ابرار : اور یہ کہ تم نے خودکشی کی کوشش کی مگر مر نہ سکے۔

صابرہ : جہنم نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوگا جو یہ ضمیر کی لعنت برداشت کرنے کو زندہ ہے۔

ابرار : عامر زنگی تم نے خودکشی کا فیصلہ کرتے وقت یہ نظرانداز کر دیا تھا کہ تم ان جذبات کو ضبط تحریر میں نہیں لا سکتے جو خودکشی کرنے والے پر طاری ہوتے ہیں۔

فخری : (ہنس کر) پولیس والوں کی اڑان یہیں تک ہوتی ہے۔ بیوقوف پولیس والے۔

ابرار : (غصّہ سے) شٹ اپ۔

فخری : (مُسکرا کر) مَیں نے اپنے جذبات اور احساسات کو ٹیپ کر لیا تھا اور وہ "شیطان" میں اسی جگہ شامل کر دیے جاتے جہاں آج ہیں اور وہ ٹیپ آج بھی میرے پاس موجود ہے جو میرے جُرم کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے (صابرہ حیرت سے فخری کو دیکھتی ہے۔ فخری بیحد اطمینان سے چلتا ہوا فون کے پاس جاتا ہے نمبر ڈائل کر کے) ہلو — پولیس کنٹرول روم — میں عامر زنگی عرف فخری بول رہا ہوں...... ہاں ہاں وہی ..... میں پندرہ منٹ بعد خودکشی کر لوں گا اگر اس سے پہلے مجھے گرفتار نہیں کیا گیا تو میری خودکشی کی ذمہ داری پولیس پر ہوگی۔ (فون رکھ کر بیحد اطمینان سے واپس آ کر کُرسی پر بیٹھ کر مُسکراتے ہوئے) صابرہ اسرار احمد کیا آپ مجھے ایک پیالی چائے پلائیں گی؟

صابرہ : (نفرت سے) نہیں میں قاتلوں اور مُجرموں کی خاطر مدارات نہیں کرتی اور پھر مجھے اپنی دُوسری پیالی کا خون بھی نہیں کرانا۔

فخری : (مُسکراتا ہے آنکھیں بند کر کے کُرسی کی پُشت سے ٹیک کر) صابرہ اسرار احمد۔ میں آپ کا شکر گزار ہُوں جس چیز کی مجھے دس سال سے تلاش تھی وہ آپ نے تھوڑے سے وقت میں دے دی۔

صابرہ : (حیرت سے) میں نے! کون سی چیز؟

فخری : نفرت۔ (آنکھیں کھول کر) ان دس سالوں میں یا تو لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے رہے یا پھر خوفزدہ رہے اور میں نفرت ڈھونڈتا رہا کہ اس کی کسک محسوس کر سکوں (ابرار کو دیکھ کر) اگر میری یادداشت غلطی نہیں کر رہی ہے تو آپ ابرار احمد ہیں۔ جو میری بیوی والے کیس کے انویسٹی گیشن آفیسر تھے۔

ابرار : ہاں۔ میں نے ہی اس کا انویسٹی گیشن کیا تھا۔

(آنکھیں بند کرکے فوزی کچھ دیر خاموش رہتا ہے ۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ)

فوزی : مسٹر ابرار احمد۔ میں نے جرائم پر جتنے بھی ناول لکھے ہیں۔ وہ سب جرائم میں نے کئے ہیں۔ اور پولیس مجھے ایک بار بھی گرفتار نہ کرسکی، ہار تھک کر فائلیں بند کرتی رہی۔

(کھڑا ہوتا ہے اور اپنے کمرہ کی طرف جاتا ہے ابرار اس کا راستہ روک کر)

ابرار : اب تم اپنے کمرے میں نہیں جاسکتے۔

فوزی : (مسکراکر) آپ بھی میرے ساتھ چلیئے۔ میں تو صرف ان احساسات کو ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں جو صابرہ اسرار احمد کی نفرت سے میرے دل میں موجزن ہیں۔

ابرار : لیکن اب تم۔۔

فوزی : (بات کاٹ کر) ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح داؤ نہ لگاؤ مسٹر ابرار احمد مجھے جو کچھ چاہیئے تھا وہ مل گیا۔ اب زندگی کی صرف ایک تمنّا ہے کہ میں ایسے شخص کے احساسات کو لکھوں جو سیاہ کوٹھڑی میں بند اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔

ابرار : تم جو چاہے لکھتے رہنا مگر اس وقت تم۔

فوزی : (بات کاٹ کر) مسٹر ابرار احمد میں خود اپنے آپ کو سرینڈر کر چکا ہوں۔ جانتے ہو میری آخری خواہش کیا ہوگی؟ ۔۔ کہ جب مجھے تختۂ دار پہ لے جایا جائے تو میرے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کیا جائے اس وقت تک جب تک میں مر نہ جاؤں اور اسے میری اس تحریر میں شامل کردیا جائے جو میں موت کے انتظار میں لکھتا رہا ہوں۔ آیئے مسٹر ابرار احمد۔ (ابرار کچھ سوچ کر اس کے ساتھ چلتا ہے۔ فوزی ایکدم مڑکر صابرہ کے پاس آکر) صابرہ اسرار احمد تم ایک ناول لکھنا اور اس میں بتلانا کہ عامر زنگی بڑا مصنّف تھا یا بڑا مجرم۔

(فوزی ابرار کے ساتھ کمرے میں چلا جاتا ہے صابرہ خاموش بت بنی وہیں کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔)

۔۔: پردہ :۔۔

خالدؔ کفایت

غزل

موہوم منزلوں کی خبر دے گیا مجھے
گمراہ تھا میں سمتِ سفر دے گیا مجھے

شیشے کی کرچیاں مری آنکھوں میں بھر گیا
وہ شخص کیسا ذوقِ نظر دے گیا مجھے

گھائل ہُوا ہے جب سے پرندہ اُڑان میں
اپنے بدن سے نوچ کے پر دے گیا مجھے

لوگوں کو دے کے سنگِ ملامت، وہ مہرباں
شہرِ صدا میں کانچ کا گھر دے گیا مجھے

خالدؔ وہ بانٹتا رہا اوروں میں برگ و گُل
خوابوں کے خارزار مگر دے گیا مجھے!



ڈاکٹر مظفر حنفی

جمہوری معاشرہ اور اردو ادب

ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کے بعد ہمارے قومی رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ اس ملک میں جمہوری نظام رائج ہونا چاہیئے۔ اس فیصلے کے پیچھے اَن گِنت صدیوں کا وہ انسانی تجربہ کار فرما تھا جس نے مختلف اَدوار میں دُنیا کے مختلف خطوں میں شخصی حکمرانوں، آمروں، فوجی حکومتوں، سامراج وادیوں اور سرمایہ داروں کے معاشرے پر غلبے کے نتائج بھگتے تھے اور ان عظیم تجربات نے روشن کر دیا تھا کہ بنی نوعِ انسان کیلئے سب سے بہتر نظام جمہوریت کا ہے۔

جمہوری نظام میں عوام کے نمائندے حکومت سنبھالتے ہیں اور یہ حکومت عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہوتی ہے اس نظام میں من مانے فیصلوں کی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ جمہوریت میں تمام اہم فیصلے عوام کی مرضی سے ان کے نمائندوں کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے نظام میں تمام شہری ایک اہم کردار اَدا کرتے ہیں انہیں اچھی حکومت کا انتخاب کرنے کے بعد اس کی کارکردگی پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہوتی ہے۔ ایک جمہوری معاشرے میں ہر شہری کو نہ صرف اپنے فرائض سے پوری طرح باخبر ہونا چاہیئے بلکہ اپنے حقوق کو جمہوری طریقے پر حاصل کرنے کی جرأت بھی ہونی چاہیئے۔

اس اعتبار سے اُردو اَدب کا جائزہ لیا جائے تو اس خوشگوار حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُردو زبان اور اس کے اَدبی مزاج میں جمہوریت کا خون ابتدا ہی سے گردش کرتا رہا ہے۔ عہدِ شاہجہاں میں مختلف طبقوں دیسیوں، بدیسیوں، فوجیوں، تاجروں نیز عوام کے باہمی ربط و ضبط نے بڑھ کر عجیب و غریب صُورتِ حال کو جنم دیا۔ دربار کی زبان فارسی تھی۔ بیرونی ممالک سے آنے والے لشکریوں میں ترکی بولنے والے بھی موجود تھے۔ جبکہ بازار اور عام شہریوں کے گھروں میں برج، ہریانوی، اودھی اور اسی نوع کی دوسری بھاشائیں بولی جاتی تھیں۔ اِن حالات میں غیر محسوس لیکن جمہوری طریقے پر ایک ایسی زبان عالمِ وجود میں آئی جس میں ملک کے تمام علاقوں، فوجیوں اور حکمران طبقے کے لوگوں کی زبان سے نمائندہ الفاظ چُن لئے گئے اور انکی شیرازہ بندی ایک ایسی گرامر میں کی گئی جو عوام کی اکثریت کے لئے غیر مانوس نہ ہو۔ یہی ملی جلی زبان مختلف اَدوار میں دہلوی، ریختہ، ہندوستانی یا اُردو کہلائی۔ ظاہر ہے کہ عوامی مطالبات اور اکثریت کی نمائندگی کرنے والی یہ زبان جمہوری ہے اسی لئے اُردو معاشرے سے سب سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

میرے اس خیال کی تائید اُردو اَدب کے سرسری جائزے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے بھی ہو جاتی ہے۔ جمہوری معاشرے میں جمہوریت کی بات کرنا زیادہ دُشوار نہیں ہے۔ مزا تو جب ہے کہ شخصی حکمرانوں اور آمروں کے دورِ حکومت میں بھی عوام دوستی اور جمہوریت کا پرچم بُلند کیا جائے اور یہ فریضہ اُردو ادب اپنے بالکل ابتدائی دور سے انجام دیتا آیا ہے۔ اُردو کے غالباً سب سے پہلے شاعر امیر خسرو کی

مشہور آفاق تصنیف "خالق باری" کا پہلا مصرعہ ہی میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ ؎

"خالق باری سرجن ہار"

اس مصرعے سے دو پہلو اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کوئی بادشاہ نہیں بلکہ معبودِ حقیقی ہمیں پیدا کرنے اور پالنے والا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیرِ بحث مصرعے میں ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہبی جذبات کی پاسداری کی گئی ہے۔

آگے چل کر شخصی حکمرانوں کے دور میں جہاں اُردو کے شاعروں نے ان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے وہیں ایسے صاحبانِ اقتدار کی خامیوں کو نمایاں کرنے اور اُن کے عوام دشمن رویوں کی مذمت کرنے کے لئے ہجویہ قصائد بھی کم نہیں لکھے گئے۔ فرخ سیر کے دور میں یہ جرأت اُردو کے ایک شاعر جعفر زٹلی نے ہی کی تھی کہ ایک مطلق العنان حکمراں کو بادشاہِ دانہ کش کا خطاب دے سکے۔ یہ احتجاج عوام سے گہری ہمدردی کا نتیجہ تھا کیونکہ فرخ سیر نے کسانوں پر ناقابلِ برداشت ٹیکس عائد کر دیا تھا۔

اُردو کی ابتدائی منزلوں میں جو اصنافِ ادب زیادہ مقبول تھیں ان میں قصیدے کا ذکر کیا جا چکا ہے، غزل، مثنوی اور نظم بھی جمہوری معاشرے کی ترجمانی کے روزِ اوّل سے ہی سرگرم رہی ہیں۔ غزلوں میں میر تقی میر جیسے شعرا نے انسان دوستی اور مساوات کا پیغام دیا۔ ان کا مشہور شعر ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اور آگے چل کر غالب نے کہا ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اور پھر اصغر گونڈوی نے اعلان کیا ؎

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و بند نے جسے ایمان بنا دیا

الغرض ابتدا تا حال اُردو غزل میں وسیع المشربی، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی ایسی تابناک مثالیں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں۔

نظم کی بنا اُردو میں نظیر اکبرآبادی نے ڈالی ہے ان کے جمہوری مزاج اور عوامی رجحانات ہندوستان کی طرح عیاں ہیں اور نظیر کی آدمی نامہ، روٹیاں اور بنجارہ نامہ جیسی نظمیں اپنے عہد کے عوام کی بلا تفریق مذہب و ملت بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ مسلم تہواروں کے ساتھ ساتھ نظیر نے ہولی، دیوالی، بسنت اور دسہرہ جیسے موضوعات پر شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔ نیز ہندو دیوی اور دیوتاؤں پر بھی جم کر طبع آزمائی کی ہے۔ جمہوریت پسندی کی اس روایت کو اُردو نظم نے ہمیشہ باندھ رکھا ہے۔ اور پابند، معرّیٰ نیز آزاد نظموں میں اس کا مظاہرہ مسلسل کرتی آئی ہے۔ یہاں اس نکتے کی جانب بھی اشارہ کرنا چاہوں گا کہ نظموں میں ایک خاص صنف خالصتاً عوام کی دشواریوں اور پریشانیوں کا اظہار کرنے کے لئے وقف کی گئی ہے جسے "شہر آشوب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نظیر، میر، سودا سے لے کر موجودہ دور کے خلیل الرحمٰن اعظمی تک اُردو کے شعری ادب میں سینکڑوں شہر آشوب لکھے جا چکے ہیں جن میں اپنے اپنے دور کے عام انسان اور اکثریت کے جذبات و احساسات نیز معاشرتی پس ماندگی کے نہایت پُرتاثیر مرقعے محفوظ ہیں۔ ہمارے قومی ترانوں میں ممتاز ترین حیثیت کا حامل ؎

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

بھی اُردو کے ایک شاعر علامہ اقبال کی تخلیق ہے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران اُردو کی بے شمار نظمیں اپنی جمہوریت پسندی کے باعث ضبط بھی کی گئیں۔

اُردو مثنویوں میں بھی جمہوری معاشرے کی نہایت واضح اور روشن تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بہمنی عہد کے شاعر نظامی اُردو کے پہلے مثنوی نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موصوف کی مثنوی کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" ہی ہندو کرداروں سے اخذ کیا گیا ہے۔ ولی دکنی کی مشہور مثنوی "قطب مشتری" کا ہیرو قطب شاہ ہے۔ اور ہیروئن بھاگ متی۔ میر تقی میر کی مثنویوں میں پرسرام جیسے برہمن زادے ہیرو کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو دیا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم" میں مثنوی کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے نیز اس کا اختتام ہندو اور مسلمان کے مابین شادی پر کیا جاتا ہے۔ بلا مبالغہ اُردو میں ہزاروں مثنویاں لکھی گئی ہیں اور کم و بیش سب ہی میں جمہوری معاشرہ جلوہ گر ہے۔

نثری اصناف دیگر تمام زبانوں کی طرح اُردو میں بھی زبان کی ابتدا کے کافی عرصے کے بعد اپنی شناخت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ لیکن یہاں بھی ابتدا ہی سے جمہوریت کا دور دورہ رہا۔ فورٹ ولیم کالج کی آسان اور عام فہم اُردو نثر کے ارتقا میں ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت

رکھتا ہے اور اس کے اُردو نثر نگاروں میں میر امن سے شانہ بشانہ للو لال بھی موجود ہیں جو نہ صرف "لکھ لباوُلی" جیسی داستان تصنیف کرتے ہیں بلکہ مظہر علی خاں ولا کو سنسکرت سے "بیتال پچیسی" کا اُردو ترجمہ کرنے میں تعاون دیتے ہیں۔ اسی طرح اودھ کے نوابین کے دور میں رجب علی بیگ سرور کی داستان "فسانہ عجائب" میں جوگی اور جادوگر جیسے مقامی کردار موجود ہیں۔ آگے چل کر انشا اللہ خاں انشا نے کسی شہزادی کی جگہ 'رانی کیتکی' کی کہانی لکھی اور اُردو کے جمہوری مزاج کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یہ کہانی ہندی کی پہلی کہانی بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ "آزاد" ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا منہ بولتا مرقع ہے۔ جس میں معاشرے کے حقیر ترین فرد سے لے کر اعلیٰ طبقے تک کے کرداروں کی ایسی بھرمار ہے کہ محسوس ہوتا ہے پورا ہندوستان اس داستان میں سمٹ آیا ہے۔ سرسید کے مضامین قومی یکجہتی کی جو شاندار مثال پیش کرتے ہیں اسے واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اپنی مشہور تصنیف 'دربارِ اکبری' میں محمد حسین آزاد نے اکبر کے نورتنوں میں راجہ مان سنگھ، ٹوڈرمل اور بیربل کے کارنامے اس طمطراق کیساتھ پیش کئے کہ عبدالرحیم خانِ خاناں اور دیگر مسلم نورتنوں کی تصویریں دُھندلی پڑ گئیں اور ان ہی آزاد نے جب بقائے دوام کا دربار آراستہ کیا تو پھر کسی مذہبی رہنما کے بجائے عظمت کی بلند ترین کرسی پر راجہ رام چندر کو متمکن کیا نیز کالیداس کو فردوسی سے بالاتر مقام عطا کیا۔ آگے چل کر پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستان کے پسماندہ عوام کی نمائندگی اور حریت پسندی کے جذبات کو عام کرنے کی جو کامیاب کوششیں کی گئیں ان سے اُردو ادب کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔

الغرض قدما اور متوسطین سے لیکر جدید ترین نسل تک خواہ سرسید تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک اُردو ادب ہمیشہ جمہوری معاشرے کا ترجمان اور عکاس رہا ہے۔ اور اسکے اہم مصنفین میں مسلمانوں کے دوش بدوش دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، چکبست، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، نیز ہندوستان کے تقریباً ہر فرقے اور ہر طبقے کا لکھنے والا موجود ہے۔ شاید عالمی پیمانے پر بھی کوئی دوسری زبان جمہور نوازی کی اتنی تابناک مثالیں نہیں پیش کر سکتی جتنی کہ اُردو کے دامن میں موجود ہیں۔........

سہیل صدیقی

غزل

مزاجِ وقت راس آنے لگا ہے
کنواں پیاسے کے پاس آنے لگا ہے

میں جس سے رُوٹھ کر بکھرا ہُوا ہُوں
وہ ماضی پھر سے پاس آنے لگا ہے

نئی تہذیب کی صُورت بدل کر
زمانہ بے لباس آنے لگا ہے

جو سائے کی طرح لپٹا تھا مجھ سے
وُہ بن کر ناشناس آنے لگا ہے

سہیل ان سے کہو طوفان اُٹھ کر
تمہارے گھر کے پاس آنے لگا ہے



م.ق.خاں

حصارِ ذات

تجزیہ کرنا یا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دل کے نہاں خانے میں بیٹھا اس کا اپنا غرور ریا کچھ ہونے کا احساس راستے میں دیوار کی طرح حائل تھا یا اخلاقیات کی وہ فصیل تھی جسے معاشرے یا مذہب نے اس کے چاروں طرف ایستادہ کر رکھا تھا یا آسودگی اور اطمینان کا شدید احساس!

ان تمام باتوں کے باوجود حالات نے شب خون مار دیا۔

وہ اس بات کا اعتراف کرتی یا نہیں، اندر ہی اندر وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ کچھ سانحے دبے پاؤں زندگی میں یوں داخل ہو جاتے ہیں کہ مدافعت کی ساری کوشش بس محض تماشائی بن کر رہ جاتی ہے اور عالم بے خبری میں سب کچھ ہو جاتا ہے — جس کا نہ خواب میں خیال آتا ہے، نہ تصور میں!

وہ ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل تھا ورنہ عام انسانوں کو شمیم نے کب خاطر میں لایا تھا، وہ بھلا کیوں کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلاتی؟ وہ نہایت مغرور تھی —— لیکن اس غرور کے پس پردہ ٹھوس اور دیرپا حقیقتیں بھی تو تھیں۔

لیکن پتہ نہیں وہ کیا قیامت خیز لمحہ تھا کہ ساری طنابیں یکسر اپنی بندھنوں سے آزاد ہو چکی تھیں اور اس کے آہنی ارادوں کے شیشے طوفان کی زد میں تھے۔ ہر طرف سے آندھی اسے اُڑائے لئے جا رہی تھی اور وہ تنکے کی مانند بہتی چلی جا رہی تھی!

اُسے اپنے جسم پر فخر تھا۔ اس کا متنوع جسم ظاہری حُسن کا شاہکار تھا۔ ایک خوبصورت گھر تھا جہاں ہر چیز قرینے اور سلیقے سے تھی۔ اس کا شوہر صحت مند اور مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ خلوص و محبت کا جیتا جاگتا پیکر اور ایک اچھی آمدنی کا مالک۔ اللہ کے فضل و برکت سے گھر میں وہ سب کچھ تھا جس کی ضرورت تھی۔ دو ہونہار بچے تھے۔ شکیل اور شہلا۔ ایک کی عمر یہی کوئی بارہ سال کی ہوگی اور دوسرے کی دس سال۔ اس کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے تھے اور اس کی ازدواجی زندگی مسرتوں، عیش و عشرت سے ہمکنار تھی۔ اس میں کبھی ایسا لمحہ نہیں آیا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا رونا روتی، یا کم مائیگی کا احساس اُسے ڈستا!

وہ حالات سے مفاہمت کرنے کا بھرپور عزم رکھتی تھی۔

یہ ساری خیر و برکت اس کے سامنے من و سلویٰ کی طرح ٹپک نہیں پڑی تھیں۔ اس نے خود اپنی جانفشانی، اپنی سوجھ بوجھ، اپنی دانشمندی اور ضرورت کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی اہلیت کے بل بوتے پہ حاصل کی تھی وہ شاید ہی کسی سے ضرورت سے زیادہ کھل کر ملتی یا بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی کہ کسی کو بُرا لگے۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ سارے لوگوں کے بارے میں اچھے خیال ہی رکھتی تھی لیکن وہ اپنے اندر اُبھرتے ہر خیال کا برملا اظہار کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ یوں خندہ پیشانی سے ملتی کہ ہر شخص اس کی دانشورانہ گفتگو اور پُرکشش شخصیت کا دلدادہ و گرویدہ ہو جاتا۔ لوگوں سے ملنے میں خواہ عورت ہو یا مرد وہ ایک متینّہ

دوری رکھنے کی قائل تھی جیسے آپ دو خطوطِ متوازی کی دوری کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر وہ لوگوں سے یوں ٹوٹ کر ملتی تھی کہ ہر شخص اپنے کو اس سے بہت قریب سمجھتا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ایک حدِّ فاصل، ایک لکشمن ریکھا کھینچ رکھی تھی اور اس نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی راون کہیں اس تاک میں لگا ہے جو اس کے سکون و اطمینان کی سیتا کو ہرن کرنے میں کامیاب ہو جائے گا!

جب وہ ماہنامہ "ادب و فن" کے دفتر پہنچی تو حسبِ معمول وہ کمرے میں داخل ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ خلافِ توقع مدیر کی کرسی پہ ایک نوجوان جلوہ افروز تھا۔ شمع نے دریافت کیا۔

"جناب شاہد احمد صاحب کہاں ہیں؟"

"چند دنوں سے ان کی طبیعت خراب ہے" اس نے جواب دیتے ہوئے شمع کو کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ "تشریف رکھئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

شمع کھڑی رہی۔ اس نے محض میز کا سہارا لیا۔ اور اس
ان کا سرسری جائزہ لینا شروع کیا۔ نوجوان شکل و صورت سے
ب نظر تھا۔ وہ نہایت دیدہ زیب لباس میں ملبوس
رغیر معمولی وقار تھا۔ چہرے مہرے سے ظاہر
وجمال کا بھرپور احساس ہے جو اس کے
سے ضوفگن تھا۔ شمع دل ہی دل

، مبتلا، خود بین شخص
ھ لنی جانے

نہ جانے کتنے فن کاروں کی رہنمائی کی تھی۔ انھیں فن کے رموز و حقائق سے آشنا کیا تھا انھیں اچھے برے کی تمیز تھی ملمع اور اصل کے فرق کی پرکھ تھی۔ شمع نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ کون ہیں؟" شمع کا اندازِ تخاطب صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس نوجوان کو احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ غاصبانہ اس کرسی پر فروکش ہے۔

"میں شاہد احمد صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آپ تشریف نہیں رکھیں گی؟"

شمع نے سوچا شاہ بلوط کی شاخوں پر چڑھی انگور کی بیل شاہ بلوط نہیں ہوتی اور آخر کابل میں گدھے بھی تو ہوتے ہیں! شمع نے اپنے ہاتھ کے لفافہ کو ہلاتے ہوئے کہا "میرے پاس ایک تبصرے کا مسودہ ہے" اور شمع نے لفافہ نوجوان کی جانب بڑھا دیا۔

اس نوجوان نے لفافہ کھول کر تحریر پڑھنا شروع کی۔ شمع کو اس کا یہ انداز بھی پھوٹی آنکھوں نہ بھایا کہ ہر کس و ناکس جو کسی وجہ سے مدیر کی کرسی پر براجمان ہو جائے اس کی تحریر پہ رائے زنی یا فیصلہ کرنے کا حقدار ہو۔ شمع نے اپنے جذبات کو روکتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا۔ "اگر یہ تحریر آپ کے مزاج و معیار کے ہم آہنگ نہ ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شمع نے مسودہ واپس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں، نہیں، ایسی بھی کیا بات ہے؟ میں اسے ناقدانہ نگاہ سے نہیں شوق سے پڑھ رہا تھا۔ آپ کے تبصروں کا میں شروع سے قاری رہا ہوں۔ آپ کے تبصرے مدلل اور متوازی ہوتے ہیں۔ اس تبصرے کو اگلے ہی شمارے میں شاملِ اشاعت کیا جائے گا۔"

"بہرحال شاہد احمد صاحب کو اس کی اطلاع کر دیجئے گا۔"

"ضرور، ضرور! آپ کو پچھلا شمارہ کیسا لگا؟" نوجوان نے گفتگو کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گزشتہ شمارہ نہایت وقیع تھا۔ خاص کر خالد احمد صاحب
اماندار تھا بلکہ یوں کہیئے ماصل شمارہ تھا۔ سچ پچھ
وہ سب رہا رے ب ہیں۔"

نوجوان کھڑا ہو گیا اور اس نے قدرے جھک کر کہا "آپ کی پسند کا بہت بہت شکریہ! اطلاعاً عرض ہے کہ ناچیز ہی خالد احمد

ہے۔

شمیم جو ابھی تک اس نوجوان کی خوبیوں کو محض اسی کسوٹی پر پرکھ رہی تھی کہ وہ کوئی ظاہردار، نمود ونمائش کا جوان ہے اور اُسے نظر انداز کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ سحر زدہ سی ہوگئی۔ وہ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئی کہ ظاہری حسن کا دیوتا حسن باطن اور علم وفضل کا بھی مالک ہے۔ شمیم جو ابھی تک میز سے لگی ہوئی کھڑی تھی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے اس کے اندر مدافعت کی طاقت مزاحمت سے باز آ گئی ہو۔ کچھ دیر تک شمیم کی زبان گنگ رہی۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا "آپ نے اس مقالہ میں کمال کر دیا ہے۔ آپ کے دوسرے مقالے کن جریدوں میں شائع ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں؟"

خالد نے ایک کتاب اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میری حقیر کوششوں کا مجموعہ جلد ہی اس کتاب کی صورت میں ظاہر ہوگا ابھی یہ جلد ساز کے پاس ہے۔ ایک کاپی یونہی لیتا آیا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے دیکھیں اور موقع ہو تو اپنی گرانقدر رائے سے نوازنے کی زحمت گوارا کریں۔"

خالد بکبر مسلسل اپنی نظر شمیم کے چہرے پر جمائے ہوئے تھا۔ وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا کر جھینپی جا رہی تھی، لیکن اندر ہی اندر اس کے دل میں یہ احساس بھی جاگ رہا تھا کہ وہ اب بھی کسی کو اپنے حسن سے متاثر کر سکتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہ یہ نوجوان مشکل سے اس کے بڑے لڑکے سے دس یا بارہ سال بڑا ہوگا۔ وہ اقرار اور انکار کی صلیب پر دیر تک لٹکتی رہی۔ کتاب خالد کے ہاتھ میں تھی۔ شمیم کا ہاتھ اس کتاب کی جانب لپک رہا تھا لیکن اس کا دھڑکتا ہوا دل اسے اس عمل سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے دل و ذہن میں دو باتیں متصادم تھیں۔

اگر وہ یہ کتاب جلد ہی قبول کر لیتی ہے تو اُسے جلد ہی اس دشمن ہوش و خرد کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن دل میں خطرے کا الارم بج چکا تھا کہ تمہیں اس نوجوان سے دور رہنا چاہیئے۔ آخر شمیم نے کہا۔

"معاف کیجئے گا، مجھے آپ کی کتاب پڑھنے کا بڑا شوق ہے لیکن فی الحال فرصت کا دامن اتنا تنگ ہے کہ شاید میں۔۔۔"

خالد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اس میں عجلت کی کیا بات ہے؟ آپ کو جب فرصت ملے گی تب ہی سہی۔"

اب شمیم کے سامنے کوئی عذر نہیں تھا۔ اس نے اپنی کمزوری پر خود ہی نظر ثانی کرتے ہوئے سوچا۔ یہ شاید واہمہ ہے یا بیجا خوف اور اس نے خالد احمد کی کتاب قبول کر لی۔

گھر واپس آکر اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اس کتاب کو پڑھے لیکن اس نے ایک عجیب سا انجانا خوف اپنے رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا۔ شمیم نے کتاب کو میز سے اٹھا کر الماری میں بند کر دیا۔ ہر روز جب اسے فرصت ملتی اس کے قدم الماری کی جانب بڑھ جاتے لیکن وہ الماری کا دروازہ کھولتی تو پھر انجانا خوف کنکھجورے کی طرح اس کے ذہن سے لپٹ جاتا اور وہ دوسری کتاب نکال کر پڑھنے لگتی۔ اس طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ اب اُسے اس بات کا انتظار رہنے لگا تھا کہ خالد ضرور اپنی کتاب پر تبصرہ کا تقاضا کرے گا۔

ایک دن خالد نے ٹیلیفون کیا۔ رسمی سلام و پیام اور مزاج پرسی کے بعد خالد نے اطلاع دی کہ شاہد احمد کا آپریشن کامیاب رہا ہے اور وہ دس بارہ دنوں کے بعد اسپتال سے گھر لوٹ آئیں گے۔ شمیم کا ہاتھ ریسیور پر کانپ رہا تھا۔ وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ خالد اپنی کتاب کے تبصرہ کے بارے میں دریافت کرتا۔ جب کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا تو شمیم نے ہی کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک آپ کی کتاب نہیں پڑھ سکی ہوں۔"

"کوئی جلدی نہیں۔" خالد نے جواب دیتے ہوئے ٹیلیفون رکھ دیا۔

خالد کی اس شانِ بے نیازی سے شمیم کے دل کو ٹھیس لگی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جب تک خالد تبصرے کے لئے تقاضا نہیں کرے گا وہ تبصرہ نہیں لکھے گی۔ لیکن وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی وہ جس قدر خالد کے خیال کو ذہن سے کھرچ کر پھینکنا چاہتی

تھی اس کا خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔

اب وہ جب بھی قدِ آدم آئینے کے سامنے ہوتی اپنے سراپا کا بھرپور جائزہ لیتی۔ وہ مختلف زاویوں سے کھڑی ہو کر آرٹ کے ناقد یا مصوّر کی طرح حسن و تبسم کے ہر پہلو پر غور کرتی۔ وہ اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ اب بھی اس میں کشش اور دوسروں کو متاثر کرنے کے نقوش اور خوبیاں کس حد تک موجود ہیں۔ وہ ماضی کو یاد کرتی اور حال سے اس کا موازنہ کرتی اور پھر مطمئن ہو جاتی کہ وقت اور عمر نے اس کا سب کچھ نہیں چھین لیا ہے۔ آج بھی وہ بہتوں سے بہتر تھی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ آ جاتا اور رخسار ان سے سرخ جھلک کر وہ آئینے کے پاس سے ہٹ جاتی تھی۔

خالد ہر لمحہ کسی عفریت کی طرح اس کے دل و دماغ پر مسلّط تھا اب وہ جہاں جاتی۔ جو کچھ کرتی۔ خالد اس کے ہمراہ ہوتا — وہ اپنے شوہر کے پاس ہوتی تو بھی خالد کا چہرہ اس کے شوہر کے چہرے پر ابھرا ہوا نظر آتا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اپنے شوہر کا چہرہ غور سے دیکھنے لگتی۔ اسے اس طرح متوحش دیکھ کر اس کے شوہر کے چہرے پر سوال اگ آتے۔ شمیم مصنوعی ہنسی ہنس کر منظر بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی اور اس کا شوہر بھی ہنسنے لگتا۔

اس کے ذہن کے دریچے سے ایک نیا سورج جھانک رہا تھا۔ وہ خود احتساب کرتی تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی آج تک کی زندگی محض ایک سایہ تھی یا رہا —— اس نے حقیقت کا صحیح روپ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جس قدر بھی باعصمت یا پاکباز رہی ہو اس میں اس کی افتادِ طبیعت یا کردار کو دخل نہیں تھا۔ یہ تو محض حالات کے پابند یا پروردہ تھے اور جب اس کا دل بقول غالب کہہ رہا تھا ؏

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

وہ ہر لمحہ خود کو تنگ و تار قید میں محسوس کرتی جہاں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے اپنا سارا ماحول اکوریم کی طرح لگتا جس میں وہ ایک خوبصورت مچھلی کی طرح تھی —— کیا اس دامِ فریب سے نکلنے کی کوئی صورت ہے اس کے دل میں ہجوم پاس تھا۔ وہ اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرتی خواہشوں کا الاؤ جل اٹھا تھا لیکن اس کے سامنے انجام کا بھیانک چہرہ بھی روشن تھا۔ اسی پنجرے میں گھٹ گھٹ کر زندگی کے آخری سانس تک جینا مقدر تھا۔ آزادی کا تصور بھی ایک گناہِ عظیم تھا!

آخر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ تبصرہ لکھا اور رجسٹری سے "ادب و فن" کے دفتر کو بھیج دیا۔ اور محسوس کیا کہ اس نے ایک بڑی جنگ جیت لی۔ ایک بڑے فتنہ کا سر کچل دیا۔ ایک قیامت خیز طوفان کو خاموش کر دیا۔ وہ نہایت مطمئن تھی۔

تیسرے دن ٹیلی فون پر خالد نے تبصرے کے ملنے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی شمیم اور اس کے شوہر کو ایک روسی فلم دیکھنے کی دعوت بھی دی۔ شمیم عجیب تذبذب میں تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے بھونرے منڈلا رہے تھے۔ سامنے بیٹھے شمیم کے شوہر نے دریافت کیا "کون ہے اور کیا بات ہے" شاید وہ شمیم کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر دریافت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شمیم کو اتنا موقع بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی بہانہ اختراع کرتی، ویسے بھی وہ کوئی بات اپنے شوہر سے پوشیدہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے بتا دیا کہ خالد نے انھیں ایک روسی فلم دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ اس نے فوراً یہ دعوت قبول کر لی اور شمیم نے خالد کو اطلاع دے دی کہ وہ مقررہ جگہ پر ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔

لیکن دوسرے دن ٹھیک وقت پر شمیم کے شوہر نے اطلاع دی کہ وہ بہت ضروری کام میں مشغول ہے اور شمیم اکیلی وہاں چلی جائے۔ شمیم سینما ہال دیر سے پہنچی تھی۔ خالد عین دروازہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا خالد نے شمیم کی رہنمائی سیٹ تک کی اور پھر بغل میں بیٹھ گیا۔ شمیم نے اپنی نگاہیں پردہ پر مرکوز کر دیں وہ اس بات سے بے نیاز رہنا چاہتی تھی کہ پاس میں کون بیٹھا ہے۔ وہ کرسی کے بائیں بازو سے لگ کر ایسی بیٹھی تھی کہ داہنے بازو پر کوئی ہاتھ رکھ بھی دے تو شمیم کے جسم کو لمس یا ٹکراؤ کا خدشہ نہ ہے۔

"میں تو مایوس ہو چکا تھا کہ اب آپ نہیں آئیں گی۔" خالد نے سرگوشیانہ انداز میں یوں کہا کہ اس کے سانسوں کی گرمی شمیم کے رُخسار اور بالوں پہ ٹھونگے مار رہی تھی۔

شمیم نے دیر ہونے کی وضاحت کی لیکن وہ اپنی نگاہیں ہر وقت پردہ پہ لگائے رہی اور پھر فلم چلتی رہی۔ شمیم ہر طرح خالد کی قربت اور موجودگی کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ وہ فلم میں بری طرح محو ہونے کا سوانگ رچائے ہوئے تھی دل کے اندر خواہش مچل رہی تھی کہ خالد کوئی پیشقدمی کرے۔ اس کے بعد شمیم نے اپنی کرسی کے دائیں بازو پہ خالد کی کہنی کا دباؤ محسوس کیا اور وہ ہاتھ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا شمیم کی کمر تک بڑھ آیا۔ خالد کے دوسرے ہاتھ میں شمیم کی نازک انگلیاں تھیں جنہیں مردانہ انگلیاں اسپنج کی طرح دبا رہی تھیں۔ شمیم کے ذہن میں بغاوت کی ہوا چلنے لگی کہ وہ ان ہاتھوں کو جھٹک دے اور وہاں سے اٹھ کھڑی ہو لیکن خالد کے ہاتھوں کی متنا طیسی گرمی نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ وہ خاموش بیٹھی رہی، محظوظ ہوتی رہی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا پور پور ——— انگ انگ عجیب کیف و نشاط سے معمور ہو رہا تھا ——— دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ سو جائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جائے اور وہ لمحہ ٹھہر جائے، رفتار وقت رک جائے۔

اس کے دل نے ایک سوال کیا ——— کیا خالد بھی اس کی طرح ابدی مسرت سے ہمکنار ہوگا؟ اس نے پلٹ کر خالد کی جانب دیکھنا چاہا تھا کہ فلم ختم ہو گئی اور ہال میں روشنی جگمگانے لگی۔

گھر لوٹتے وقت اس کو کچھ دیر تک دکھ ہوا لیکن پھر اس نے اپنے کو اس محفوظ فیصل میں پایا۔ بچے سو چکے تھے، شوہر ابھی نہیں آیا تھا۔ اسے کھانے کی ذرہ برابر خواہش نہیں تھی۔ وہ بستر پہ لیٹ گئی۔ کافی رات گئے شوہر آیا۔ وہ کسی فلمی گانے کی دھن گنگنا رہا تھا۔

آتے آتے وہ شمیم کے بستر پہ لیٹ گیا۔ "کیوں ڈارلنگ سو گئی ہو کیا؟"

شمیم نے کروٹ بدل لی۔ اس کے ہاتھ شمیم کے جسم پہ رینگنے لگے۔ اس کی انگلیاں پتھر کی طرح سرد، بیجان تھیں جن کا لمس لطف و انبساط کی جگہ نہایت تکلیف دہ تھا ——— جیسے تیز نشتر ہو جو اس کے جسم میں اترتا چلا جا رہا تھا ——— جسم سے روح تک! اور اس کے جسم کے ساتھ اس کی روح بھی زخمی ہو رہی تھی ——— اور چند لمحوں کے بعد اس کی انگلیاں منجمد ہو گئیں اور وہ سو چکا تھا، گہری نیند، بے خبری کی نیند۔

شمیم کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے ماضی اور حال کے خانوں میں پلٹ کر دیکھا۔ تھوڑی سی روشنی آئی ——— پھر اس کا ذہن سینما ہال میں چلا گیا۔ جب ہال اندھیرے کے خول میں بند تھا۔ اس نے اپنے رخسار پہ رواں آنسوؤں کو خشک کیا اور کندھے جھٹک دیئے۔ وہ جسمانی لذت کیلئے اپنی شخصیت کے گرد کھنچے حصار کو نہیں توڑ سکتی۔ معاشرے اور اخلاقیات کا درس جو اُسے ورثے میں ملا تھا اس کو وہ یکسر جھٹلا نہیں سکتی تھی اور انہیں فصیلوں، انہیں حصاروں میں گھری وہ قید و بند کی زندگی گذارنے پہ مجبور تھی۔

سید امین اشرف

غزلیں



خوابِ نظارا میں یوں حُسن ہے شامل تجھ سا
نظر آتا ہی نہیں دید کے قابل تجھ سا

جیسے دشتِ نگراں، جیسے خرامِ آہو
مجھ سا مشتاقِ نظر، پیکرِ غافل تجھ سا

تجھ سے بڑھ کر تری تصویرِ خیالی ہوگی
نہ سہی محشرِ دل، حورِ شمائل تجھ سا

وار اس تیغ کا ہر زخم کو بھر دیتا ہے
چارہ گر بھی تو ہو اے دیدۂ قاتل تجھ سا

سر کو پتھر سے جو ٹکرانے کا سودا ہے مجھے
تو نہیں ہے تو کوئی اور مقابل تجھ سا

کلس چمکتا رہا اس طرح محبت کا
طلسم ٹوٹ گیا راہ کی صعوبت کا

چلا تھا بوالہوسِ شوق سوئے نظارا
قدم قدم پہ تھا منظر جہانِ عبرت کا

شکستِ آئینہ ہے اعتبارِ آئینہ
پتہ کسے دلِ وحشی کی قدر و قیمت کا

ہم اپنے گھر ہی میں خود اجنبی سے ہوں جیسے
عجیب حال ہے دیوار و در کی وحشت کا

بجھا بھی دیتی ہوا شمعِ انتظار مگر
خیال ہے کسی بے مہر کی مسرت کا

نسیم بن آسی

اندر ہی اندر

میں اکثر سوچتا ہوں، یہ زمین کی تقسیم نہیں، جسم کی ہے، جس کا ایک حصہ ہندوستان میں ہے، دوسرا پاکستان میں! ایسے جسم میں پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔ ایک لاش ہے جو دفن نہیں ہو رہی ہے، لیکن دھیرے دھیرے سڑ رہی ہے۔!

میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی ہیں۔ پوری روشنی کمرے میں پھیل گئی ہے۔ روشنی اور ہوا ہی تو زندگی ہے۔ کوئی ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ کھڑکی سے آسمان کیسا دکھائی دے رہا ہے۔ کالے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اور دور دور تک ہرے بھرے کھیتوں کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ جس میں آسمان جھک کر اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ برسات کی ٹھنڈی ہوائیں کھڑکی سے آکر میرا بدن چھو رہی ہیں۔ لیکن میں ان کی خنکی کیوں نہیں محسوس کر رہا ہوں؟ مجھ پر ان ہواؤں کا اثر کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میرے اندر جیسے کوئی آگ دہک رہی ہے۔ میرا سارا وجود جل رہا ہے۔ میں بہت اداس ہوں۔ جب بھی یہ خط آتا ہے میں اداس ہو جاتا ہوں۔ کتنے غم سمٹ کر اس خط کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ میرے سامنے ایک دیوار ابھر آئی ہے جو مجھ سے بہت دور کسی سرحد پہ ہے۔ دیوار کے اس پار میں ہوں، اُس پار صفیہ! دیوار اونچی ہے۔ میں اُس پار نہیں جا سکتا! اُس پار جانے کے لئے پاسپورٹ چاہیئے، جو میرے پاس نہیں ہے۔ اور صفیہ میرے آنے کا کب سے انتظار کر رہی ہے!

خط میں کیا ہے، وہی ایک سوال کب آرہے ہو؟

اور میں سوچتا ہوں، کیا جواب دوں؟ اس کیا کا میں ایک سال سے جواب سوچ رہا ہوں!

اس خط نے کراچی اور مغل سرائے کے طویل فاصلے کو سمیٹ کر مختصر کر دیا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو آدھی ملاقات بھی نہ ہوتی۔ یہ خط کتنے ٹوٹے دلوں کو جوڑتے ہیں۔ پوسٹ آفس میں چٹھیاں چھانٹنے والے، مہریں لگانے والے، اپنے اپنے کاموں میں معروف کلرک اور سارے پوسٹ مین انسانی تعلقات کی کتنی اہم کڑیاں ہیں۔

اب تک میرے یہاں صفیہ ہی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آتی رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں "صرف تم ہی انڈیا جاتی ہو۔ تمہارے بھائی کو بھی تو یہاں آنا چاہیئے۔ کم سے کم ایک ہی بار۔ اُسے تم سے محبت نہیں؟ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، لوگ سچ کہتے ہیں۔ پچیس سالوں سے صرف وہی میرے یہاں آرہی ہے۔ میں ایک بار بھی وہاں نہیں گیا۔ میں نے اس بار وعدہ کر لیا ہے۔ اُسے یقین ہے میں اپنی بھانجی کی شادی میں ضرور آؤں گا۔

میں نے اپنے خطوں میں آنے کے لئے بار بار وعدہ کیا ہے۔ وعدہ پورا نہ ہو تو وہ جھوٹ ہو جاتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ میں جھوٹ سے گھبرا رہا ہوں۔ گھبراہٹ صرف اس بات کی ہے، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور سزا مل رہی ہے۔ جرم سے پہلے سزا۔ جرم اور سزا کی بھی عجیب کہانی ہے۔ جو جرم نہیں کرتا ہے، اُسے سزا ملتی ہے اور جو جرم کرتا ہے اسے سزا نہیں ملتی! اس کا بھی گلہ کس سے ہو۔؟ جبکہ گلہ بھی ایک جرم ہے۔!

اس میں صفیہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ کسی بھی جگہ جانے کے لئے مجبور ہے۔ وہ جگہ پاکستان بھی ہو سکتی ہے، امریکہ اور روس بھی! فرق اتنا ہے۔ امریکہ اور روس سے تہذیبی اور جذباتی رشتہ نہیں ہے، پاکستان سے ہے! وکیل اور ڈاکٹروں پر جانے کیوں بہت جلد یقین ہو جاتا ہے اور ہم اپنی گردن اونچی کر لیتے ہیں۔ پاسپورٹ کا فارم بھرنے کے بعد وکیل نے کہا تھا، ایک ڈیڑھ مہینے میں بن کر آ جائے گا۔ آج ایک سال ہو رہا ہے۔ اور وہ اب تک نہیں بنا۔ میں پاسپورٹ بنانے والوں کی مٹھی یا جیب گرم کروں تو وہ بہت جلد بن کر آ جائے۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا اپنے ضمیر کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ ضمیر کا اپنا غرور ہوتا ہے۔ گناہ کا اپنا۔ ضمیر کی بات یہ ہے کہ وہ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ تو ہر برائی، ہر گناہ کی سزا دیتا ہے۔ ایسی سزا جو زندگی بھر یاد رہے۔ اور میں اس سزا سے ڈر رہا ہوں۔!

مٹھی اور جیب گرم کرنے کا محاورہ بھی اب پرانا ہو گیا ہے۔ مٹھی اور جیب گرم کرنے کی بات سے بھی لوگوں کو شرم آنے لگی ہے۔ جیسے ہر اصل سے شرم آتی ہے۔ انسانی جسم کے بعض نازک حصوں کو ان کے اصل ناموں سے کون پکار سکتا ہے؟ جو چیز کہنے یا سننے میں بری معلوم ہو، اس کے اصل کو کسی مہذّب نام سے بدل دیجئے۔ کوئی برا نہیں ماننے گا۔ ان مہذّب ناموں میں ڈاکٹر بھی ہو سکتا ہے، انجینیر بھی! ان کے اصل کی طرف مت جائیے۔ برائی کام میں نہیں، نام میں ہے۔!

باہر وہی موسم ہے۔ وہی ہوائیں، وہی بادل ہیں۔

پانی کی بوندیں میرے پلنگ پر آ رہی ہیں۔ میں اپنی کھڑکی کے پٹ بند کرنا نہیں چاہتا۔ اور میں پانی میں پوری طرح بھیگ جانا چاہتا ہوں۔ میرے اندر جو آگ دہک رہی ہے شاید وہ ٹھنڈی ہو جائے۔ لیکن میں جانتا ہوں وہ ٹھنڈی نہیں ہو گی۔!

میز پر رکھا ہوا خط ہوا سے کانپ رہا ہے!

بغل کے کمرے میں شمی کی آہٹ سے میں اُس کی طرف دیکھنے لگا ہوں۔ دوپہر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے کام ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی بیوی کی اس حرکت پر غصّہ آتا ہے میں نے کتنی بار کہا ہے جب میں گھر میں رہوں، کچھ دیر میرے پاس بیٹھو۔ لیکن اس کی "وہ" سنتی ہے۔ اُسے گھر کے برتنوں اور کپڑوں سے کب فرصت ملی ہے۔ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، کاش! شمی بھی سمجھتی!

"شمی! تم ایک ہی کام کے لئے بنی ہو۔ اس کے سوا تم کچھ نہیں جانتی۔"

وہ مسکرانے لگتی ہے۔ دونوں کمروں کے بیچ کے دروازہ سے ہوتی ہوئی وہ میرے کمرے میں آ جاتی ہے۔ اُس کی نگاہ خط پر پڑتی ہے۔

"کیا پاسپورٹ بن گیا؟"

صفیہ کا جب بھی خط آتا ہے اس کے ذہن میں پاسپورٹ کی بات تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ پاسپورٹ کے بارے میں جانے کتنے سوال کر ڈالتی ہے۔ وہ چاہتی ہے، ایک پاسپورٹ اس کا بھی بن جائے۔ وہ بھی ایک بار صفیہ کے یہاں ہو آئے۔ صفیہ کتنے دنوں سے اُسے بھی آنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ اس کے دل میں بھی صفیہ سے ملنے کی کتنی آرزو ہے۔ عرفان اور فرزانہ نے بھی کتنی بار کہا ہے، پاپا! ہم بھی پھوپھی کے یہاں جائیں گے۔ ان کا مکان دیکھیں گے!

میں شمی کو کیا جواب دوں۔؟ میں خود کو احمق سمجھنے لگا ہوں۔ احمق نہیں۔ گدھا۔ گدھے کا یہی ہے نا، بوجھ بھی ڈھوتا ہے، مار بھی کھاتا ہے، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا، صرف رفتار تیز

کر دیتا ہے!

"نہیں بنا نا؟"

"نہیں ـــــ!" پس شمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

"شمی! مجھ سے بار بار پاسپورٹ کے بارے میں مت پوچھا کرو۔"

وہ میرے سامنے ہی لکڑی کے تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور میری طرف دیکھنے لگتی ہے۔

"دوسروں کے پاسپورٹ کیسے بن جاتے ہیں؟"

وہ کہتی ہے۔ شمی کے اس بھولے پن کو کیا کہوں! میں اُس سے کہتا ہوں۔

"شمی! میں پاسپورٹ بنانے والوں کی مٹھی گرم کروں تو میرا بھی پاسپورٹ بن جائے۔"

شمی میری بات سن کر چپ ہو جاتی ہے!

مجھے سی۔آئی۔ڈی۔ کے اُس کانسٹیبل کی بات یاد آجاتی ہے، جو مجھے سڑک پر مل گیا تھا جبرا اُس سے تعارف نامر میاں نے کرایا تھا۔

میں نے اسے چائے پلائی۔ بعد میں پان بھی! پھر میں اپنے اصل مقصد پہ آگیا۔ میں نے اُس سے اپنے پاسپورٹ کی بات کہی جو اس کے آفس میں پڑا کب سے سڑ رہا ہے۔ اس نے عاجزی سے دانتوں کو دکھاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ دیا۔ جیسا کہ کچھ لوگ اپنے کو بہت شریف ثابت کرنے کے لیۓ کرتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا، وہ میرا کام ضرور کرے گا۔ اُس دن کے بعد وہ مجھ سے راستے میں کئی بار ملا بھی۔ اور وہی وعدہ کیا۔ دھیرے دھیرے ایک سال ہو جاتا ہے۔ وہ اب بھی مجھ سے راستے میں ملتا ہے۔ لیکن اب میں اُس سے نہیں بولتا ہوں۔ اور وہ بھی مجھ سے بولے بغیر نکل جاتا ہے۔ اصل میں مجھے اسے سمجھنے میں دھوکا ہوا، اور شاید اُسے بھی! میں نے اسے خوش نہیں کیا، اور اس نے میرا کام نہیں کیا۔!

باہر اسی طرح بارش ہو رہی ہے۔ پیڑ کی پتیاں سر پٹخ پٹخ کر جان دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن ہواؤں کو کب رحم آتا ہے؟ آنگن میں پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ کبھی ایسے موسم میں ذہن میں فتور سا پیدا ہو جاتا تھا۔ اور پیار کے لمحے انگڑائی لے کر جاگ اٹھتے تھے۔ انھیں لمحوں میں کتنی بار میں نے شمی سے محبّت کی ہے۔ اس کے ریشمی بالوں میں لگے پھولوں کو سونگھا ہے۔ اور اس کے بدن سے اڑتی ہوئی خوشبو کو محسوس کیا ہے۔ آج وہی شمی ہے۔ وہی لمحے ہیں میرے اور شمی کے سوا کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن وہ میرے لئے مٹی کا ڈھیر بنی کیوں بیٹھی ہے؟ اور میں برف کا ایک تودا کیوں بن گیا ہوں؟

باہر ایک کچی دیوار پانی کی چوٹ سے کٹ کر ابھی ابھی گری ہے۔ میرے اندر بھی کوئی دیوار کٹ کٹ کر گر رہی ہے۔ کوئی ہوا، کوئی بارش ہے، جس کے بے رحم تھپیڑے اس پر بار بار پڑ رہے ہیں اور اسے کاٹ کاٹ کر گرا رہے ہیں!

شمی خط لے لیتی ہے۔ اور میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔ ذہن کے پردے پہ سارے منظر ایک ایک کرکے ابھرنے لگتے ہیں۔ خط پڑھنے کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے

"مجھے یقین تھا، تم شبانہ کی شادی میں ضرور آؤ گے۔ شادی کب تک ٹلتی رہتی۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے اس کی شادی ہو گئی . . . ."

شمی خط ہاتھ میں لئے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں اس سے نگاہیں چرا رہا ہوں۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ جی میں آتا ہے، کمرے سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ جو اپنے آپ کو اس دنیا کے مطابق ڈھال نہیں سکتا، اسے اس دنیا میں رہنے کا کیا حق ہے؟ میرے سارے وعدے کہاں گئے؟ کیبی شبانہ کی روح مجھے معاف کرے گی؟ اور صفیہ۔ صفیہ تو اب بیمار رہنے لگی ہے۔ ادھر اس کی صحت بہت گر گئی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ کافی بیریس ہو جاتی ہے پتہ نہیں کب دل کی دھڑکن بند ہو جائے! کہیں یہ صفیہ کی زندگی کی آخری شادی تو نہ رہی ہو۔!

ایک برسات باہر ہو رہی ہے۔ دوسری میرے اندر ـــ!

اندر کی یہ برسات کتنی الگ، کتنی عجیب ہے۔!! ●●

انور پانی پتی

غزلیں



"وحشی آنکھوں میں کوئی خواب سہانا رکھ دے"
دل کے ہر تارِ شکستہ پہ ترانہ رکھ دے
سبز موسم میں دبے پاؤں خزاں آئی ہے
غنچہ و گل پہ تو پت جھڑ کا زمانہ رکھ دے
صورتِ شمع جلوں تیری اداؤں کی قسم
اور اس ذکر کا تو نام فسانہ رکھ دے
تیری یادوں کے بچھڑنے کا سماں یاد نہیں
آئینے میں نہ ترا راز زمانہ رکھ دے
بھول جانے کی ادا، خوب ہے تیری انور
دو گھڑی بعد ہی ملنے کا بہانہ رکھ دے

لہو لہان پروں میں اڑان مت رکھیو
شکستگی کا نیا امتحان مت رکھیو
جو دل کو درد سے رشتہ ہے کون جانے ہے
وفا کی بزم میں وہ داستان مت رکھیو
کسی کو شہرِ تمنا میں شک نہیں ہوگا
سپردگی کا کوئی تم نشان مت رکھیو
نگاہ و دل کی حقیقت سے جو نہیں واقف
مرے نگر کا اسے ترجمان مت رکھیو
زباں سلیس ہو الفاظ معتبر انور
نئی غزل میں کوئی اور خان مت رکھیو

رفیع حیدر انجم

اُس کا کھویا ہوا میں

اس شہر کے لیۓ میں اجنبی ضرور تھا مگر وہ میرے لیۓ اتنا اجنبی قطعی نہیں تھا کہ بھری پڑی سڑک پر اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری ہوتی البتہ ایک عرصے کے بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر حیرت اور خوشی کے ساتھ میرا جی چاہا کہ بے ساختہ اس سے بغلگیر ہو جاؤں اور اسے اپنے سینے سے لپٹا کر پوچھوں کہ اتنے دنوں وہ کہاں رہا؟ کس حال میں رہا؟ اس شہر میں کب سے ہے؟ اور...... اور..... مگر دوسرے ہی لمحہ جانے کیوں میرے دھیان کے مارگ پر بے یقینی کی دھند چھا گئی اور میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تم؟------" اس نے جواباً کچھ کہا مگر اس کی آواز بھیڑ میں کچل کر رہ گئی۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک دوسرے کا مفہوم سمجھا اور وہ میرا ہاتھ تھامے کسی اطمینان بخش جگہ کی تلاش میں سڑکیں بدلتا رہا۔ مگر تمام سڑکیں مختلف سمت سے دوڑتے بھاگتے مشینی چہروں کے بوجھ تلے کراہ رہی تھیں اور شہر کا شہر جیسے کسی انجانے خوف سے چیخ رہا تھا۔

کچھ دور چل کر اس کے قدم لاشعوری طور پر ایک ریستوران کی طرف مڑ گئے اور پھر جیسے ہمارے لئے سب کچھ ٹھہر سا گیا.......... یہ وقت، یہ لمحہ، یہ منظر اور شاید ہم دونوں.......

چائے کی چند پیالیاں، سگریٹ کے کچھ پیکٹ اور شہر کی آوارہ گردی......... ان دنوں ہمارے شب و روز کچھ ایسے ہی ہوا کرتے تھے.......... مستقبل سے بے خبر اور حال سے بے پروا، اور ماضی؟---------- اپنے ماضی میں جھانکنے کی ہمت کیسے ہوتی ہے؟ لیکن کبھی کبھی تنہائی کا موقع پا کر ہم تصور ہی میں اپنا سب کچھ اتار پھینکتے اور ایک دوسرے کی برہنگی سے لطف اندوز ہوا کرتے کہ ہم جو خود کو بہت ہی مہذب اور انٹلکچول پروز کرتے تھے، ان لمحوں میں اپنی بے حیائی پہ ذرا بھی شرمندگی محسوس نہ ہوتی۔ وقت کا دریا اسی یکسانیت سے بہہ رہا تھا کہ اچانک ہی ایک ایسا جوار بھاٹا اٹھا جس نے اس کی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ ایک آگ اگلتی ہوئی دوپہر تھی کہ وہ حواس باختہ سا میرے پاس آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں زرد رنگ کا ایک لفافہ تھا۔ دراصل اس لفافے میں ایک ایکسرے رپورٹ تھی جس پر اس کا نام لکھا ہوا دیکھ کر میں کانپ اٹھا تھا۔ اس وقت تصویر کی پسلیاں گنتے ہوئے میں نے خود کو بے لباس محسوس کیا تھا مگر وہ پورے لباس میں بھی اس طرح گھبرا رہا تھا جیسے جسم کا کوئی نازک حصہ کھل گیا ہو اور جیسے ڈھکنے میں ناکامی ہو رہی ہو۔ اس کی تسلی کے لئے مجھ سے رسمی سا بھی کوئی جملہ ادا نہیں ہو سکا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکنے کی اپنی بے بسی بہت دنوں تک مجھے کچوکے لگاتی رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد بھی اس سے کئی ملاقاتیں رہیں لیکن یوں اب پہلے جیسی بے ساختگی نہیں رہی تھی۔ کہیں کوئی ساشگاف ضرور پڑ گیا تھا جو بظاہر تو نظر نہیں آیا مگر اپنے س کا لمس دیتا رہا۔ پھر اچانک معلوم ہوا کہ وہ کسی کو کچھ بتائے شہر سے غائب ہو گیا ہے اور اب اتنے برسوں کے بعد یہاں شہر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کیسے ہو تم؟ تمہارے گھر کے لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نے دیکھا، اس کی ملتجی نگاہیں جیسے فریاد کر رہی تھیں۔ بہت چکا اب اور مجھے ادھیڑنے کی کوشش مت کرو ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کیا؟ یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔ مگر اس سے قبل کہ میں اس کچھ دریافت کرتا اس نے یہ سب پوچھ کر مجھے الجھن میں ڈال ۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اسے کیا بتاؤں؟ کس کس کے بارے میں اؤں؟ اس عرصہ میں تو اتنی ساری تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ تفصیل لئے کافی وقت درکار ہو گا۔ اور پھر وہ یہ سب جان کر کیا کرے گا ۔ میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ میری ماں گذشتہ کئی برسوں سے تپ دق میں مبتلا ہے۔ بہن کی عصمت اور اپنی عزت کی خاطر پنا آبائی مکان فروخت کر دینا پڑا۔ چھوٹا بھائی ریل کے حادثے کا شکار ہو گیا۔ بیوی کے رخسار کی سرخی اور بالوں کی سیاہی دن بدن ماند پڑتی جا رہی ہے۔ بچوں کو چیریٹی اسکول میں ڈال دیا ہے اور میں ان سب کی خاطر صبح سے شام تک دفتر میں قلم گھستا رہتا ہوں۔ آخر کیا کیا بتاؤں اسے؟

"یہ بتاؤ، یہاں کب سے ہو؟" میری خاموشی کا سبب وہ سمجھ گیا شاید۔

"تقریباً ایک ماہ سے" میں نے مختصراً کہا۔

"اچھا وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستیش، لوٹی، دلباغ سنگھ، مینی، شیلا بھٹناگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ایک ایک نام جیسے اس نے اپنی یادداشت کے تہ خانے میں بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ اتنے دنوں کے بعد بھی اس کے ذہن میں یہ تمام نام تازہ تھے۔ تو کیا وہ کسی کو بھی نہیں بھولا؟ لیکن ان میں سے بہت سے نام میرے ذہن کی تختی سے کب کے مٹ چکے تھے اور اب وہاں تحریر کا ہلکا سا عکس بھی نہیں بچا کہ کم از کم لینس کا سہارا لے کر ہی نشاندہی کر سکوں۔ اپنی اس نا اہلی پر میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ لیکن پھر بھی میں نے اسے لوٹی اور دلباغ سنگھ کے بارے میں بتایا کہ ان دونوں نے اسی شہر میں اپنا کاروبار کر لیا تھا اور بسا اوقات ان لوگوں سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ لوٹی نے کتابوں کی دکان کھول لی تھی اور دلباغ سنگھ نے موٹر پارٹس کا بزنس کر لیا تھا۔

"اور ونود؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے اپنے تہ خانے سے ایک اور نام نکال کر سامنے رکھ دیا۔

ونود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی یادداشت کی بنجر زمین پر یہ نام میں نے بہت تلاش کیا۔ مگر اس کا کہیں اتہ پتہ نہیں ملا۔ شاید کبھی کبھار کی ملاقات رہی ہو۔ البتہ اس جانفشانی میں ایک ایسا چہرہ ابھر کر میرے سامنے آ گیا جس کا ذکر وہ اکثر کیا کرتا تھا اور شاید ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے اچانک چلے جانے کے بعد پھر اس کے بارے میں کسی سے کوئی خبر نہ مل سکی۔ آخر وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا؟ کیوں چلا آیا بغیر بتائے؟ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا؟ اس شہر میں کب سے ہے؟ کیا کر رہا ہے ان دنوں؟ یہ سب جاننے کے لئے میں بے چین تھا کہ اس نے مجھے کچھ بھی پوچھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اندر کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا تو مشکل ہے مگر باہر کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حالات نے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ضرور بنا ڈالے تھے۔ بالوں میں کچھ سفیدی بھی نمایاں ہونے لگی تھی تاہم آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ویسی ہی گہری تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"خیر چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ، بشپال کیا کر رہا ہے؟" اپنے وجود کو میری آنکھوں کا قیدی محسوس کر کے وہ تلملا گیا۔

"یش ۔ ۔ ۔ ۔ پال ۔ ۔ ۔ ۔" مجھے پھر اپنے ذہن پر زور ڈالنا پڑا۔

"ہاں یاد آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یشپال کپور ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک میگزین میں اسے دیکھا تھا۔ بمبئی میں ہے۔ فری لانسنگ کر رہا ہے۔ لیکن تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

بالآخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

(بقیہ صـ۴۱ پر)

جے ایل۔ اروڑہ جوہر

جواہر ریزے

بادِ صبا نے جب کہیں غنچے کھلائے تھے
گزرے ہوئے زمانے ہمیں یاد آئے تھے

صحرا کی دھوپ ہم نے سہی ذوق و شوق سے
ہمراہ ناتمام محبت کے سائے تھے

اِک بے قرار دِل مری جاگیر تھا مگر
سوغات آنسوؤں کی وُہی ساتھ لائے تھے

•

پیروں کے آبلوں کو کانٹوں پہ تولنا ہے
راہِ وفا میں چلنا ہرگز نہیں ہے آسان

تنہائیوں کے غم سے خود کو بچا جوہر
اِس شہرِ بے اماں میں ہے کون تیرا پرساں

•

محسن جلگانوی

غزلیں

•

ہر فرد دلپزاد ہے، صدؔ آسمان ہے
پہچانتا ہوں کون سا قدؔ آسمان ہے

مٹھی میں بند ہو گئے جسموں کے سارے لمس
اَب نیک ہے زمیں نہ بَدؔ آسمان ہے

بر فیلی چوٹیوں پہ ہیں سانسیں رکھی ہوئیں
اب ٹوٹتے پروں کا لحدؔ آسمان ہے

اپنی بلندیوں میں مجھے بھی پناہ دے
اِن پستیوں سے مجھ کو بھی کدؔ آسمان ہے

•

گھر سے نِکل بھی آئیں مگر یار بھی تو ہو
جی کو لگے کہیں کوئی کردار بھی تو ہو

کاغذ کی کشتیوں میں سمندر سمیٹ لیں
پہلو میں تیری بانہہ کی پتوار بھی تو ہو

یہ کیا کہ برگِ خشک سا ٹوٹے بکھر گئے
آندھی چلے ہواؤں کی یلغار بھی تو ہو

سر کو عبث ہے سنگِ تواتر کا سامنا
صحنِ مکاں میں شاخِ ثمر بار بھی تو ہو

اچھی ہیں چہرہ چہرہ یہ آئینہ سازیاں
لیکن کہیں پہ آنکھ کی دیوار بھی تو ہو

سب کو اسی کے لہجہ کی توقیر چاہیئے
محسنؔ کسی کو میر کا آزار بھی تو ہو

•

عظیمہ اقبال

تسکین

اب نوید صاحب قبر کے مجاوروں کی طرح اس بیابان اور ویران مقبرے میں تنہا رہ گئے تھے۔ وہ اور ان کی بیوی زندگی کے اس تپتے ہوئے صحرا کی تاریکی میں کسی مزار کے دیئے کی طرح ٹمٹمانے لگے۔ ایک شکست خوردہ جواری کی طرح نوید صاحب نے حالات کو ہی تھک ہار کر اپنا مقدر مان لیا اور یہ باور کر لیا کہ زندگی حسین بہار کا ہی نام نہیں، خزاں بھی تو اس کائنات کا ایک جزو ہے۔ جو دیکھتا دانتوں تلے انگلی دباتا کیونکہ نوید صاحب اپنے وقت میں بڑے رعب اور دبدبہ کے انسان تھے۔ گھر میں ان کی طوطی بولتی تھی۔ باہر کی دنیا میں وہ مقبول تھے۔ ان کی شان اور آن بان کا بول بالا تھا۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم سا ان کے پاس لگا رہتا۔ وہ پولیس میں تھانیدار تھے۔ انتہائی لحیم شحیم قوی ہیکل انسان۔ جوانی اور اکڑ ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ جاہ و جلال اور اقتدار کی شان ہی نرالی تھی۔ چلتے تو لگتا پاؤں زمین میں دھنسے جا رہے ہیں، زمین پر زور سے پیر مارتے تو معلوم ہوتا کہ پانی نکل پڑے گا۔ بازدکیا تھے مگدر تھے۔ اس پہ وردی اور وردی پہ بلّے۔ کیا شان و شوکت تھی! جس وقت وہ گھوڑے پہ سوار ہو کر نکلتے تو لوگ ایک کنارہ کو کھسک جاتے۔ راستہ میں دور دور تک کوئی نظر نہ آتا۔ عورتیں چھتوں پہ چڑھ کر اس نظارہ سے لطف اندوز ہوتیں۔ بچے خوف و ہراس کے باعث ماؤں کی گود میں منہ چھپا لیتے۔ لیکن آج . . . . . آج کے نوید صاحب اور پہلے کے نوید صاحب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آج ان کو پہچاننا مشکل تھا۔ وہ بالکل کمزور اور ناتواں ہو گئے تھے۔ یاسیت و غم کے نقوش ان کے چہرے سے عیاں تھے جیسے کسی نے ان کی ساری کی ساری بشاشت چھین لی ہو۔ موت کا سایہ قریب ہوتا جا رہا تھا جسم کی ہڈیاں ابھرنے لگی تھیں۔ کھال آہستہ آہستہ سمٹی جا رہی تھی۔ گمان ہوتا تھا جیسے کسی ویران مقبرہ میں چراغ جھلملا رہا ہو۔ یہ وہی چہرہ ہے جس میں کبھی زندگی کی تمام رعنائیاں موجود تھیں اور آج اس میں زندگی کے آثار تک معدوم تھے۔ وہ ساری امنگیں جن سے زندگی عبارت تھی مردہ ہو چکی تھیں۔ سلیم صاحب ان کے بچپن کے ساتھی کچھ عرصہ قبل پاکستان چلے گئے تھے۔ اب جو وہ پلٹے تو سب سے زیادہ تبدیلی ان کو نوید صاحب میں نظر آئی۔ یہ سلیم کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ واقعی کوئی ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ پہلے وہ کیا تھے۔ دل شکستہ اور مرجھائے ہوئے وہ نہ جانے کیسے ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حسرت و یاس کا ایسا گہرا تاثر تھا جسے دیکھ کر ان کے پاس دیر تک بیٹھنا محال تھا۔ سلیم صاحب نوید صاحب سے بہت ملتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ دونوں میں دانت کاٹی دوستی تھی۔ سوچا تھا۔ خوب دیر تک نوید صاحب سے بات چیت کریں گے مگر ان کو نوید صاحب سے مل کر

بے حد مایوسی ہوئی۔ اپنی زندگی کی مایوسیوں کے سبب بات بات پر انکی آنکھیں گیلی ہو جاتیں ۔۔۔ سانیہ دل شکستہ ہو تو اس سے پھوٹنے والے نغمے بھی مجروح ہو جاتے ہیں۔

ادھر پچھلے دنوں سے نوید صاحب بیمار تھے۔ بیماری نے ان کے اعضاء کو اور زیادہ مضمحل کر دیا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی تنوطی ہو گئے تھے۔ زندگی نے ان کو کچھ بھی تو نہ دیا تھا ۔۔۔ ان سے لیا بہت کچھ تھا۔ انہوں نے گھر کے ہر فرد کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا تھا۔ پوری محبت، رفاقت اور لگن سے اپنے بچوں کو پروان چڑھایا تھا۔ نوید صاحب کی شادی ایک متوسط گھرانے کی معمولی شکل و صورت کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن شریف الطبع تھی۔ متین اور سنجیدہ، نیک اور صالح تھی۔ شادی کے بعد دو لڑکے عامر اور احمر پیدا ہوئے۔ ان دونوں کو نوید صاحب نے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ تہذیب اور اخلاق کے آداب سکھائے۔ کھانے کی میز پر بیوی بچوں سے ملاقات ہوتی تو دونوں لڑکے ان کے احترام میں سر جھکائے کھانا کھاتے رہتے، بیوی بچوں سے بس رسمی سی گفتگو ہوتی تھی۔ اگر کبھی لڑکے بیٹھے ہوتے اور باپ آجاتے تو وہ لوگ کھڑے ہو جاتے۔ باپ کا نہایت ادب و لحاظ کرتے تھے۔ ان کے سامنے نہ کھل کر ہنستے اور نہ زیادہ باتیں ہی کرتے تھے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور آنگن میں پتوں کو بکھیر کر چلا گیا۔ نوید صاحب نے لاچاری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طویل برآمدے پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر کروٹ بدل لی۔ بستر پر پڑے پڑے کمر میں تکلیف زیادہ ہونے لگی تھی۔ پہلے نوید صاحب غیروں سے زیادہ ملنے کے قائل نہ تھے مگر اب ان کی رائے میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ سوچتے قریبی عزیزوں کے مقابلہ میں اگر دور کے لوگ جن سے کوئی رشتہ نہ ہو وہ اگر وقت پر ساتھ دیتے ہیں اور کام آتے ہیں تو وہ قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ بہتر ہیں۔ اپنے دونوں بیٹوں کے ردِ عمل نے ہی انہیں یہ سبق سکھایا تھا اور انہوں نے محلہ پڑوس کے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھا لیا تھا۔ آج ان دونوں میاں بیوی کی حالت ان بچوں کی سی ہو گئی تھی جو میلے کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے ہمجولیوں سے بچھڑ گئے ہوں ۔۔۔ جن کے اردگرد انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تو ضرور تھا لیکن وہ خود اکیلے تھے۔ غیر لوگوں کے دل میں ان کے لئے پیار بھی تھا، ہمدردی بھی۔ لیکن یہ سارے جذبے اس محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتے تھے جو انہیں اپنے بچوں سے میسر ہو سکتی تھی۔

کہنیوں پر زور دے کر نوید صاحب نے اپنا جسم تھوڑا اوپر کو اٹھایا اور تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ جسم بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ دوسری سمت انکی بیوی پلنگ پر دراز تھیں۔ ان کی صحت بھی اب کافی گر گئی تھی۔ کام کرنے کی سکت اب جسم میں نہیں رہی تھی۔ بیچاری خاموشی سے گھٹتی رہتی تھی۔ کس سے کہیں اپنے دل کا درد؟ ایک نظر گھر پر دوڑائی تو اپنا ہی گھر ان کو اجنبی اور غیر سا لگا۔ جا بجا بے ترتیبی سے سامان پھیلا پڑا تھا۔ پہلے یہی گھر کیسا صاف ستھرا رہا کرتا تھا۔ کبھی ان کے آنگن میں رونق رہا کرتی تھی۔ یہ سوچ کر ہی ان کو اپنے بچوں کی یاد نے تڑپا دیا۔ جیسے جیسے جسم لاغر ہوتا جا رہا تھا، اعضاء جواب دینے جا رہے تھے ان کو اپنے بچوں کی یاد زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ وہ سوچتیں کسی پر اعتماد و بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ امیدیں باندھنی چاہیئں۔ انہوں نے اپنے لڑکوں سے اُمیدیں باندھ لی تھیں لیکن کیا انجام ہوا؟ جب ان کو سہارے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے لاڈلے کنارہ کش ہو گئے اور اُنہوں نے اپنی دُنیا الگ دُور ۔۔۔ بہت دُور بسا لی جہاں ان کی آہوں کی پہنچ بھی نہ تھی۔

نوید صاحب نے بیوی کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو ان کو سوچ وچار میں منہمک پایا۔ انہوں نے کروٹ بدل لی اور اپنے لڑکوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ ان کے دماغ میں ماضی کی یادیں آب و تاب کے ساتھ اُبھرنے لگیں۔ کتنا پیارا تھا عامر اور احمر۔ بھوری آنکھوں اور سُنہرے بالوں والا۔ بالکل بلا سا لگتا تھا۔ کس طرح محنت اور مشقت سے انہوں نے اور ان کی بیوی نے دونوں کی پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا ۔۔۔ دُنیا میں رہنے کے قابل بنایا اور آج وہ اس طرح طوطا چشم ہو گئے ۔۔۔ اس درجہ ان کے خون سفید ہو گئے، اتنے احسان فراموش ہو گئے۔ آہ! انسان کے اخلاق کی اس قدر گھناؤنی پستی!

یہ سب سوچ کر نوید صاحب کی طبیعت عجیب عجیب سی ہونے لگی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اُداس، بے کیف اور ویران۔ تنہا مکان میں دو میاں بیوی پڑے ہوئے ہیں۔ کتنی ہی طبیعت خراب ہو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے دُوسروں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان ہی دنوں کے لیے تو انسان اولاد کی تمنا کرتا ہے کہ آج ہم ان کا سہارا بن رہے ہیں کل یہ ہمارا سہارا بنیں گے۔ کیسے اُنہوں نے بچوں کو دیوانہ وار چاہا تھا، کیسے ناز و نعم سے ان کی پرورش کی تھی۔ اب جبکہ نوید صاحب کو اُن کے تعاون کی، ان کے سہارے کی

ضرورت پڑی تو وہ بیگانے ہو گئے۔ اس بے بسی کے عالم میں نوید صاحب کی بیوی اکثر بیمار اور کمزور ہونے لگیں۔ ایک ٹھنڈی آہ سرد منہ سے نکلتی اور وہ بیکراں خلاؤں میں گھورنے لگتیں ـــ اکثر بیگم سوچا کرتیں کہ وہ دن کتنے پیارے تھے جب ان کے دونوں بچوں کو اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ ملازم ہو جانے کے بعد شروع شروع میں دونوں بھائی پابندی کے ساتھ اپنے ماں باپ کی قدم بوسی کو ہر ماہ حاضر ہوتے۔ تھوڑے عرصہ بعد نوید صاحب نے یکے بعد دیگرے دونوں بیٹوں کی شادیاں نہایت شاندار طریقہ سے کر دیں۔ وہ کون سے ارمان تھے جو نوید صاحب یا ان کی بیگم نے نہیں نکالے۔ شادی کے بعد دونوں بھائیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ سست پڑتا چلا گیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ منقطع سا ہی ہو گیا۔

اس دن نوید صاحب کو ہر سمت تاریکی ہی تاریکی نظر آئی جس دن وہ ریٹائر ہوئے۔ فنڈ کی معمولی سی رقم ہی اُن کا کل اثاثہ تھی۔ بچوں کی ضروریات کے وقت وہ اسی فنڈ کی رقم سے کچھ نہ کچھ نکلواتے رہتے تھے۔ دل پر گرانی اور گھبراہٹ تھی۔ لیکن بیٹوں کا خیال ان کے دل میں اُمید کی کرن بن کر اُبھرا۔ یہی ان کا سہارا تھا۔ ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کے تلاطم میں ٹھہراؤ تھا۔ نوید صاحب کو یقین کامل تھا کہ ان کے ریٹائرمنٹ کی خبر پا کر دونوں لڑکے ضرور آئیں گے اور اُن کو ساتھ لے جانے پر اصرار کریں گے۔ کہیں گے۔ آپ آپ کو یہاں رہ کر کیا کرنا ہے؟ ہم لوگوں کو خدمت کا موقعہ دیجیے۔ ہمارے ساتھ چلئے اور وہاں چل کر اطمینان و سکون کے ساتھ رہیئے" لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دونوں میں سے ایک نے بھی ان کی سُدھ نہ لی۔ ہر طرف سے مایوسی، نااُمیدی اور یاس و حسرت کی یلغار ہو رہی تھی۔ وہ سوچتے کیا خبر کب یہ کمرہ ولمحات ان کا مقدر بن جائیں اور ان کی شمعِ زندگی تیز ہواؤں کی زد میں آ کر گُل ہو جائے۔ یہ امر مُسلّم ہے کہ رشتوں کے لگاؤ سے ہی انسان کو جینے کی ترغیب ملتی ہے۔ جو دنیا میں تنہا ہے وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کر رہ جاتا ہے اور تنہا اپنے آپ میں سما کر ان زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر عامر اور احمر دونوں اس وقت ان کے پاس ہوتے تو یہی گھر جو اس وقت اتنا ویران اور اُجاڑ نظر آ رہا تھا کیسا بھرا پُرا لگتا۔ دونوں کے بچے شرارتیں اور اُچھل کود کرتے۔ جب وہ لوگ آ جاتے تھے تو دن کتنے پیارے گزرتے تھے۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔

ان کے جانے کے بعد تو یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے جیسے بھوت کا ڈیرہ ہو۔

کبھی عید بقر عید کے موقعہ پر لڑکوں کا کوئی خط آ جاتا تو نوید صاحب اور ان کی بیوی بار بار اس خط کو پڑھتے۔ لفافہ اور کاغذ کو پلٹ پلٹ کر دیکھتے کہ شاید کچھ اور لکھا ہو ـــ شاید کچھ اور لکھا ہو بس ان لڑکوں کی محبت کی یہی معراج تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ دونوں میں سے کسی نے لوٹ کر باپ سے یہ تک نہ پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی گزر اوقات کس طرح ہو رہی ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ نوید صاحب اور ان کی بیوی دونوں بیمار رہنے لگے تھے۔ جسم میں کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے عامر اور احمر کو اپنی بیماری کا خط لکھ دیا تھا اور خط لکھنے کے بعد ان کی آمد متوقع تھی۔ اس لیے ان کا انتظار دونوں نے شروع کر دیا تھا۔ نوید صاحب کی بیوی کی زبان پر ہر وقت بیٹوں کا نام ہی ہوتا تھا اور وہ ان ہی کی باتیں کیا کرتی تھیں اور ہمہ وقت انکو اُن ہی کی فکر دامنگیر رہتی۔ لیکن اب بیماری کا خط بھیجے ہوئے بھی کافی دن ہو گئے تھے۔ نہ وہ آئے اور نہ اُن کا کوئی خط ہی آیا۔ ہر آہٹ پر وہ دونوں میاں بیوی چونک جاتے۔ بار بار ان کی نگاہیں دروازے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ انہیں لگتا کہ عامر اور احمر دونوں بھاگے ہوئے آ رہے ہیں لیکن ان کا انتظار بے سود رہا۔

دوپہر ڈھل جانے کے بعد ڈاکیہ ایک خط ڈال گیا۔ تحریر عامر کی تھی۔ نوید صاحب نے جلدی سے چشمہ لگا کر خط ایک ہی سانس میں پڑھ لیا۔ لکھا تھا "آجکل کام کی بہت زیادتی ہے۔ انتہائی عدیم الفرصت ہوں۔ اس وقت آنے سے قاصر ہوں۔ حالات سے مطلع کیجئے گا۔ انشاءاللہ جلد آؤں گا البتہ بچوں کو کسی موقعہ سے بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ والدہ صاحبہ سے سلام کہیئے گا۔"

نوید صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایسی بھی کیا مشغولیت؟ ماں باپ تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ ان کو فرصت نہیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دل سے ایک سرد آہ نکلی اور وہ مایوس ہو کر پلنگ پر گر پڑے۔ ایسی اولاد سے کیا فائدہ جو ماں باپ کے وقت پر کام نہ آئے۔ اس سے تو وہ لاولد ہوتے۔ کم سے کم یہ غم تو نہ ہوتا کہ اولاد ہوتے ہوئے بھی وہ اس قدر بے سہارا ہیں۔ نوید صاحب اکثر ماضی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے۔ اپنے گزرے ہوئے وقت اور آج کے وقت کے محاسبہ میں لگ جاتے تو ان کو بے حد حیرت ہوتی۔ اب ان کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی زندگی بے معنی ہے اور وہ زمین پر ان چاہا بوجھ ہیں۔ ان کو خیال آتا کہ زندگی کا ہر لمحہ، ہر گھڑی موت کے قریب تو ضرور کر دیتی ہے مگر موت سے آنکھیں چار ہونے نہیں دیتی۔ کاش ان کو اب مزید موت کا انتظار

نہ کرنا پڑے۔ یہ انتظار کی گھڑیاں جلد ہی ختم ہو جائیں!

ان کا بڑا بیٹا احمر تو بالکل ہی بیگانہ ہو گیا تھا۔ دولت کمانا اور عیش کرنا اس کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ باقی چیزوں کی اس کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہاں تک کہ بوڑھے ماں باپ تک کا وجود اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھے لوگ بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ وہ اس دھرتی کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ دو آنسو نوید صاحب کے گالوں پر ڈھلک آئے تو وہ اپنی بیوی کی طرف سے منہ پھیر کر کروٹ بدل کر لیٹ گئے کہ کہیں وہ ان کی آنکھوں میں لرزتے ستاروں کو نہ دیکھ لے۔ لیکن ان کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ اندر ہی اندر ایک آگ سلگ رہی ہے۔ کوئی جلتی سی چیز ان کے اندر دھواں چھوڑتی ہوئی بُجھ سی گئی۔

ایک دن اچانک عامر اور احمر کے بچے چھٹیوں میں دو چار دن کے لیے آ گئے۔ دادا دادی ان کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔ بچوں کو دیکھ کر ان کو عامر اور احمر کی یاد بُری طرح ستانے لگی۔ ان کو دیکھے ہوئے دن بھی تو بہت ہو گئے تھے۔ نوید صاحب بچوں سے پُوچھ ہی بیٹھے کہ ان لوگوں کے پاپا کیوں نہیں آئے۔ عامر کا لڑکا بنٹی فوراً بولا۔

"میرے پاپا کو بہت کام ہے دادا جی۔ بالکل فرصت نہیں ہے۔"

"کیا کرتے رہتے ہیں تم لوگوں کے پاپا؟" نوید صاحب نے تجسس سے پُوچھا۔

"میرے پاپا تو پندرہ دن کے لیے شکار کو گئے ہیں۔ بہت سے جانور مار کر لائیں گے۔"

احمر کا لڑکا ببلو آنکھیں نچا کر کہنے لگا۔ "دادا جی! آپ نہیں جانتے کہ میرے پاپا کو تو کلب سے لوٹتے لوٹتے رات کے بارہ بج جاتے ہیں۔ ان کو فرصت کہاں۔"

بیٹے کا نیا رُوپ نوید صاحب کے لیے بے پناہ اذیت ناک ثابت ہُوا۔ پوتے کے مُنہ سے کلب کی بات سُن کر ان کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ دل پر کاری ضرب لگی۔ ایسا لگا جیسے کسی خوفناک خواب کے بعد ان کی نیند ٹوٹ گئی ہو۔ وہ سوچنے لگے کہ اس واقعاتی دنیا میں جانے کتنے عامر اور احمر ہوں گے جنہوں نے ماں باپ کو نظر انداز کیا ہوگا۔ زندگی کے اس طویل سفر میں پُر خطر راہوں پہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے جب انسان تھک کر چُور ہو جائے تو کیا اُسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا؟ پھلتی پھولتی فصل کا کیا یہ فرض نہیں ہوتا کہ مفلوک الحال باغبان کی جھولی میں کم از کم اتنے ثمر تو ضرور گرا دے کہ اس کی شمعِ حیات منوّر رہے؟

وقت کے انجان سائے پھیلتے رہے۔ نوید صاحب نے اپنی زندگی کی ضروریات کو بہت محدود کر لیا تھا۔ بہت سی خواہشات اور چاہتوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ بیٹوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھ کر انہوں نے اپنا تن پیٹ کاٹ کر اپنے اور اپنی بیوی کے کفن کے لیے مناسب رقم اکٹھی کر لی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنی شاندار رُعب اور دبدبہ والی زندگی گزارنے کے بعد ان کی لاش کفن دفن کے لیے اپنے بیٹوں یا عزیزوں کا مرہونِ منّت رہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی اس الجھن کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا تھا۔ اس سے ان کو ذہنی سکون ہی نہیں اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو گیا تھا۔

پھر بھی تحت الشعور میں نوید صاحب کو اپنے لڑکوں کا انتظار تھا۔ والدین کی بیماری کا خط ان کو مل ہی گیا تھا۔ اس لیے ان کی نگاہیں باوجود عامر کا خط آ جانے کے کہ وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے نہیں آ سکتا، دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا، دن ڈھلتا اور شام ہو جاتی تو ان کی آنکھوں میں ناامیدی کے سائے لہرانے لگتے۔ انتظار کی جوت بجھنے لگتی۔ وہ اپنی حرماں نصیبی پر خود کو کوستے، اس کل یُگ کا گلہ کرتے جس نے خونی رشتوں کو بے وقعت بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت لاغر ہو گئے تھے۔ جسم کے اعضا مضمحل ہو رہے تھے۔ انتظار اب بھی برقرار تھا۔ سوچتے کمرے میں آتے آتے عامر اور احمر کو دیر لگے گی۔ دروازے سے اندر آئیں گے، آنگن پار کریں گے، پھر برآمدہ اور اس کے بعد کہیں ان کے کمرہ کا نمبر آئے گا۔ اتنے وقفہ کے بعد وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دیکھ سکیں گے۔ اس لیے وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے تھے۔ وہیں انہوں نے اپنا پلنگ بچھوا لیا تھا لیکن ان کی متلاشی نظریں لڑکوں کی دید کی مشتاق ہی رہتیں۔ وہ نہ آئے۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اب نوید صاحب بے چین و بے قرار ہو کر سوچتے۔ "کیا وہ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے نہیں آئیں گے پھر آہ سرد بھر کر بولے۔ جنہوں نے زندہ کا منہ دیکھنا گوارا نہ کیا وہ مرے کا مُنہ کیوں کر دیکھیں گے۔"

آج صبح نوید صاحب کی آنکھ دیر سے کھُلی۔ چاروں طرف دُھوپ پھیل چکی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ کشمکش کی آنچ تیز ہوتی چلی گئی۔ فکر کی پرچھائیاں گہری اور لمبی ہوتی گئیں۔ نوید صاحب اخبار لے کر بیٹھے تو نگاہ نے ساتھ نہ دیا۔ سارے الفاظ ایک دوسرے

میں لڈھڈ ہوگئے۔ انہوں نے جھنجھلا کر اخبار رکھ دیا۔ جسم کا ایک ایک عضو جواب دیتا جا رہا تھا۔ ان کا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ان کے پڑوسی مولا بخش ان کی مزاج پرسی کے لیے آئے تھے۔ ان کے آنے سے نوید صاحب کا ذہن بدلا۔ رسمی گفتگو سے جب معاملہ آگے بڑھا تو مولا بخش نے اپنی بپتا بیان کرنی شروع کی۔ کہنے لگے — "میرا جسم بہت لاغر ہو گیا ہے۔ پرانا دمے کا مرض ابھر آیا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اس نے دوائیں اور انجکشن لکھ دیئے ہیں لیکن دوا خریدنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لڑکے کو خط لکھا ہے مگر اس ناخلف نے روپیہ بھیجنا تو در کنار خط کا جواب دینا تک بھی گوارا نہ کیا۔ دن رات کراہتا رہتا ہوں۔ کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ میرے لڑکا پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ چہرہ اشکبار ہو گیا۔

نوید صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اپنا دل تھوڑا مت کرو۔ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے لڑکے کو تمہارا خیال نہ ہو۔ آجکل خط بہت دیر میں پہنچتے ہیں۔ ڈاک کا نظام گڑبڑ ہے۔ انشا اللہ تمہارے مرض کو آرام ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر بیٹھ کر مولا بخش اپنے گھر چلے گئے تو نوید صاحب سوچنے لگے۔ بیچارہ مولا بخش کیسا مصیبت میں گرفتار ہے۔ وہ بھی میری ہی طرح اولاد کے ہاتھوں زخم کھائے ہوئے ہے۔ مجھ سے بری حالت ہے اس کی — کم سے کم میں کسی کا دست نگر تو نہیں۔ مجھے پنشن تو ملتی ہے۔ انہوں نے مولا بخش کی زندگی کا اپنی زندگی سے موازنہ کیا تو خود کو مولا بخش سے بہت بہتر حالت میں پایا۔ مولا بخش کی مدد کرنے کو دل بیتاب ہو اٹھا۔ روپے کہاں سے حاصل کئے جائیں؟

کھانا کھا کر دوپہر کو جب نوید صاحب آرام کرنے لیٹے تو ان کو نیند نہیں آئی۔ کافی دیر کروٹیں بدلتے رہے۔ پڑوس کے گھر سے مولا بخش کے کراہنے اور کھانسی کی آواز ان کو بار بار پریشان کر رہی تھی وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا تدبیر کریں جس سے مولا بخش کی تکلیف دور ہو۔ ان کے پاس روپے بھی نہیں تھے۔ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ مشکل سے دونوں میاں بیوی کی روٹی چل پاتی تھی۔ وہ اسی سوچ میں تھے کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ان کے ذہن میں کوند گیا۔ مرنے کے بعد کفن ملے یا نہ ملے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

چارپائی کی پٹی پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھے۔ جسم تھوڑا کپکپایا پھر وہ سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ ای کر گھر کا بھرپور جائزہ لیا۔ اندر کمرے میں گئے اور صندوق میں سے کفن کے لئے جوڑے ہوئے روپے لے کر آنگن میں آ گئے — مولا بخش کو بلوایا اور وہ کفن کے روپے ان کو دے کر کہا — "بھائی تم مجھ کو اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ اس روپیہ سے اپنا علاج کرا لینا۔ خدا تمہاری مدد کرے!"

نوید صاحب کو لگا کہ ان کی لاش بے کفن ہو کر بھی بے کفن نہیں رہی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف مڑے۔ دور کہیں لاؤڈ اسپیکر پر کوئی یہ شعر گا رہا تھا۔ ؎

خوشی ہوتی ہے جس کو ہیں وہ محرم مسرت ہوں
ریاضِ دہر ہیں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں

❋

صادق گیاوی

غزل

اب اگر مجھ سے ملوگے بھی تو کیا پاؤ گے
آگ ہوں ہاتھ لگاؤ گے تو جل جاؤ گے

قافلہ درد کا آنکھوں میں اتر آئے گا
اپنے آنچل کو ہواؤں میں جو لہراؤ گے

کون دے گا تمہیں آواز کی خوشبو اپنی
ہم نہ ہوں گے تو ہماری ہی غزل گاؤ گے

اپنی آنکھوں میں مسائل کے سوا تم صادق
گاؤں سے شہر میں آؤ گے تو کیا لاؤ گے

لطفی امومن

غزل

دُھوپ کا موسم یہ کھنکتا پانی
جسم کی شاخ کے بستر پہ ٹپکتا پانی

کھیتوں کو ہری شاخوں سے بھر جائے گا
جلتے موسم کے اندھیروں میں بھٹکتا پانی

آواز پہ آواز دِیے جاتی تھی
سوکھی ندی میں نہ کیوں سر کو پٹکتا پانی

کے جسم سے پھوٹے ہیں لہو کے چشمے
اِس طرف آگ ہے اُس طرف لپکتا پانی

تلک دھوپ کی یورش سے رہے گا محفوظ
درودیوار سے رہ رہ کے چھلکتا پانی

احد پرکاش

غزل

لوگ آتے ہیں لوگ جاتے ہیں
رسمِ دُنیا سبھی نبھاتے ہیں
اپنے گھر کے چراغ ہیں ہم لوگ
دُوسروں کے مکاں جلاتے ہیں
گھر کے بوڑھوں کی کون فکر کرے
اپنے بچے بہت ستاتے ہیں
یہ دُھواں روشنی کو ڈس لے گا
سائرن چیخ کر بتاتے ہیں

●

مُقیم شاد

آزاد غزل

لرزتی شاخ، بکھری پتّیاں ہیں
غضب کی بجلیاں ہیں
نہ اِتنا سر اُٹھاؤ
کہ وحشت ناک مردم خیزیاں ہیں
بہت ادراک کے جھگڑے چلیں گے
خِرد کی زد میں سبھی پُروائیاں ہیں
وہیں سے دُودھ لاؤ
جہاں تیشے کے نیچے کوہکن کی ہڈیاں ہیں
مجھے اے شادؔ دیدو
مِری الماری میں بچپن کی جتنی کاپیاں ہیں

●

مطبوعات

"تیشے کا سفر" : رضا اشک

قیمت : ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ : سمی بک ڈپو۔ اسٹیشن روڈ۔ سمستی پور (بہار)

ابتدائے آفرینش سے حق اور باطل کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی آرہی ہیں۔ تقریباً ہر دور میں انسانی زندگی کسی نہ کسی کشمکش میں مبتلا رہی ہے۔ جس نے انسان کے ذہن و شعور کے تخلیقی قویٰ کو غیر معمولی ترغیب اور تحریک میسر کی اور وہ اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے آمادہ اور مجبور ہوا۔ اس نور اور ظلمت کی پیہم جنگ کے علاوہ دوسرا اہم موضوع جو علم و ادب میں نمایاں طور پر اُبھرا وہ حسن و عشق ہے۔ تقریباً ہر اہلِ دل ادیب اور شاعر نے لوح و قلم کے ذریعہ ان مضامین میں اپنی صلاحیت اور علمی استطاعت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنے جذبات اور تاثرات کا مظاہرہ کیا ہے —— اور "تیشے کا سفر" اِس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

"تیشے کا سفر" نظموں اور غزلوں پر مشتمل ایک شعری مجموعہ ہے۔ تقریباً اسّی صفحات پر نظمیں ہیں۔ جن میں کئی آزاد اور کئی قافیہ ردیف کی قید و بند میں محیط ہیں۔ آخری ساٹھ صفحات پر غزلیں ہیں۔ نظموں میں عہدِ حاضر کے معاشرہ اور زندگی سے وابستہ تلخ تجربات کا شدید طور پر نہایت ہی موثر انداز میں بیان ہے۔ جو قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر اُسے دعوتِ فکر پر مجبور کرتا ہے۔ شاعر نے جہاں اپنے زورِ قلم سے انسانی زندگی پر مسلط نفرت۔ تعصب۔ مذہبی جنون۔ علاقائی دہشت گردی۔ اقتصادی اور مجلسی استحصال وغیرہ گھناؤنے جذبات کا نہایت ہی زوردار الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے وہاں حسن اور فطرت کی جمالیاتی منظر کشی سے روح کو فرحت بخشی ہے۔ "ایک ٹانگ کی عورت" "بازارِ عورت" "گریز" "ارے نوجوان" "فیصلہ" "تم" "پندرہ اگست" "وادیٔ کشمیر کو سلام" وغیرہ نظمیں شاہکارانہ حیثیت کی حامل ہیں۔ جن میں مختلف جذبات اور احساسات کے علاوہ حب الوطنی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ بعض نظموں میں ساحر لدھیانوی اور فیض کے سماجی رجحانات کا تقلد پایا جاتا ہے۔ آجکل کی زندگی پر خرافات کے غلبہ کے باوصف بھی شاعر کا صالح اقدار کی ابدیت پر یقینِ محکم ہے مثلاً "کسان اور کھلیان" اور "بازارِ عورت" کے علاوہ چند دوسری نظموں میں بھی شاعر کے اِس خوش آئند یقین کا اعادہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں غزلیں اپنا مقام ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن اِن میں بھی اکثر و بیشتر نظم کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے۔ کہ اشک صاحب طبعاً صنفِ نظم کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ فی زمانہ ایک طرف حسن و عشق کی عریانی اور عمومیت اور دوسری طرف زندگی کی سیاسی اور معاشی دشواریوں نے ادبا اور شعرا کے تخیل اور روئے سخن کو موخر الذکر مسائل کی طرف زیادہ موڑ دیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی تقریباً ہر غزل مطلع سے آگے کسی مضمون کی طرف رجوع کرتی ہے۔ یہ فاضل مصنف کے اس دعوے کے باوجود ہے کہ :۔

غالب و میر کے دم سے ہی سہی نام غزل
ہم نے بھی کچھ تو سنوارا ہے دوبامِ غزل

اِس میں کلام نہیں کہ موجودہ رجحانات کی روشنی میں اشک کی غزلوں میں فکر

کی گہرائی کے ساتھ ساتھ نغمگی، شعریت اور موسیقیت ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

کسی کا چہرہ جو رو برو ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے
کبھی کبھی ان سے گفتگو ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے

یہ لوگ کیسے ہیں جو کہ ساحل پہ سنگریزوں کو چن رہے ہیں
صدف میں موتی کی جستجو ہو تو کچھ طبیعت سنبھل بھی جائے

پیار کا صندل راکھ ہوا ہے جل کر ہوک کے ایندھن میں
کیا رکھا ہے گوری تیری پائل کی اِس چھن چھن میں

جناب رضا اشک کی زبان شستہ ہے۔ اسلوب بیان میں برجستگی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کلام میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے عناصر غالب ہیں۔ اُردو الفاظ کے ساتھ ساتھ عام فہم مروج ہندی الفاظ کے موزوں استعمال نے اِس مجموعہ کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ حسین مرقع ہر لحاظ سے خوب اور دیدہ زیب ہے۔

ہر دیال شوق

Accession Number.
121867
Date 11.12.88

بقیہ اُس کا کھو یا ہوا میں صت ۳۲ سے آگے

"میں ؟ —" وہ جیسے خواب سے چونک پڑا! پھر قدرے سنبھلتے ہوئے اس نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور دیر تک آنکھیں بند کئے اپنی یادداشت کے تہ خانے میں خود کو تلاش کرتا رہا۔ ●

صفدر رضا کھنڈوی

احساسِ فکر

میری جیب میں
پیسے نہیں، کاغذ ہیں
کاغذ کی غذا
چند نظمیں
چند غزلیں
اور ....
میری غذا
یہی کاغذ
یہی نظمیں
یہی غزلیں
جو ٹہلتی ہیں آس پاس
دیتی ہیں مجھے
نئی فکر کا احساس

احتیاط

بوسیدہ دیواروں سے
تصویروں گلدانوں سے
لپٹی ہوئی دھول
آپ ہی کی ہے بھول
بے دردی سے نہ جھاڑیئے
لازمی ہے احتیاط
ورنہ ....
اڑی ہوئی دھول
واپس نہیں آئے گی
سارے محلے میں پھیل جائے گی۔

قارئین کی نظر میں



"تعمیرِ ہریانہ" پابندی کے ساتھ نِکل رہا ہے۔ آپ حضرات اسے بڑی نفاست و عمدگی سے نکال رہے ہیں۔ ہم عصر ادب کے قاری کو اس کے ذریعہ سے اچھا مواد دستیاب ہو رہا ہے۔ کوشش جاری رکھیئے کہ ہر شمارہ میں علمی و تحقیقی مضامین بھی ضرور شامل رہیں۔ اس التزام سے آپ کے جریدہ کے معیار میں اور بلندی آئے گی۔ ادھر اس طرف آپ نے توجہ مرکوز کی ہے۔

فضا ابن فیضی

محبوب رسالہ "تعمیر ہریانہ" ستمبر زیرِ نظر ہے۔ غزلوں کا معیار بُلند ہو گیا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر بشیر بدر، نصیر پرواز، خمار جالندھری، قاصر مجیبی، ظہیر رحمتی، شفیع اللہ خاں راز، اختر شاہجہانپوری، ناظم میواتی کی غزلیں اپنے اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے قابلِ تحسین و ستائش ہیں۔ ایک مدیر کا کام محض مشہور و معروف فنکاروں کی تخلیقات یکجا کر کے شائع کرنا ہی نہیں بلکہ اُن تخلیقات کے انتخاب و تدوین سے ایک سمت تعین کرنا بھی ہوتا ہے، آپ اسے خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

انور پانی پتی

"تعمیرِ ہریانہ" اکتوبر ۸۶ء نظر نواز ہُوا۔ بڑی مسرت ہُوئی کہ میرے پردیش نے "اُردو" سے اس بے مروت دَور میں یُوں ناتہ جوڑا..... یہ امر لائقِ صد تحسین ہے۔ جس طرح..... "سو بیمار" کی اُما کو اپنے دیس کا اخبار اتنے سال بعد دیکھنے کو مِلا تو اُسے ایسا لگا جیسے لڑکپن کی کوئی بھولی بسری یاد سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ ٹھیک ایسا ہی مجھے محسوس ہُوا۔ میرے پردیش کی اس ادبی نگارش نے چالیس سال بعد مجھے ایک بار پھر ہریانہ کی یاد سے سرشار کر دیا۔

میں نے "تعمیر" کے تمام صفحات پر نظر گردانی کرنے کی جسارت کی۔ خُوبیوں کے ساتھ ساتھ کہیں خامیاں بھی نظر آئیں۔

اوم کرشن راحت کے قلم میں دم ہے..... "سو بیمار" پسند کیا جائیگا۔ کُمار پاشی اور اُن کی "خواہشِ بے جا" دونوں خُوب ہیں۔ کرشن ادیب کی غزل اچھی ہے۔ فارُوقی شفق کا یہ شعر لائقِ توجّہ ہے۔ ؎

پہلی سی گرم جوشی نہ باتوں میں وُہ خلُوص
تم دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل گئے

چندر پرکاش جوہر بجنوری اور ترلوک ناتھ اذہر کے یہ شعر خوب ہیں۔ ؎

آرزُو کی رہ گُذر میں غم کی قندیلیں جلیں
پھُول بھی اس راہ میں بن بن کے پتھر آئے ہیں

٭

بنتا ہے وُہی خُون رگِ جانِ وطن میں
بہتا ہے جو مزدُور کے ماتھے سے پسینہ

ڈاکٹر قمر الدین کا مضمون "حسینی براہمن" کچھ کچھ معلوماتی ہونے کے ساتھ مقصدی بھی ہے۔ بشیر مالیرکوٹلوی کا "سرپرائز" منفرد اور اچھا ہے۔ احساس بکٹری کے نمسکار دیس واسیوں کے لئے ایک تازیانہ ہے۔

جنید حزیں لاری ہجومِ حزن و ملال میں راہِ راست نہ پا سکے۔ ان کی غزل مجموعۂ تضاد ہے۔ خاور خاں سرحدی کی غزل کا مطلع بہت عمدہ ہے۔ ؎

ترے فراق کا صحرا عظیم تر ہی سہی ٭ ہمیں بھی آتا ہے آنکھوں کو آب جُو کرنا

خالد عابدی کے افسانے خوشبو کے رنگ کا عنوان "نظری حسن" ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ بات بنائی تو چاہی مگر بن نہ سکی۔

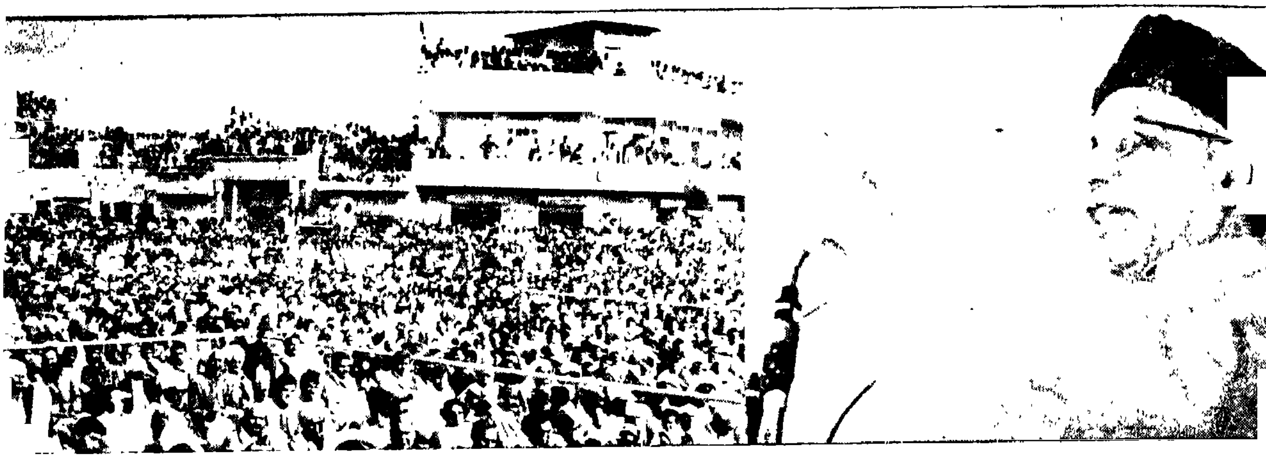
زخمی بدایونی کی کُہنہ مشقی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے اچھے شعر کہنے کا خوب سلیقہ ہے۔ ؎

غمِ فُرقت میں اشکوں کی فراوانی نہیں جاتی
کوئی موسم ہو اس دریا کی طغیانی نہیں جاتی

صفدر امام قادری اور رباقی غازی پوری بس ٹھیک سرحد پر کھڑے ہیں نہ اچھوں میں نہ..... جی۔ ڈی احمر کا "اشتہار" سماج کی زبوں حالی کا مرقع ہے۔

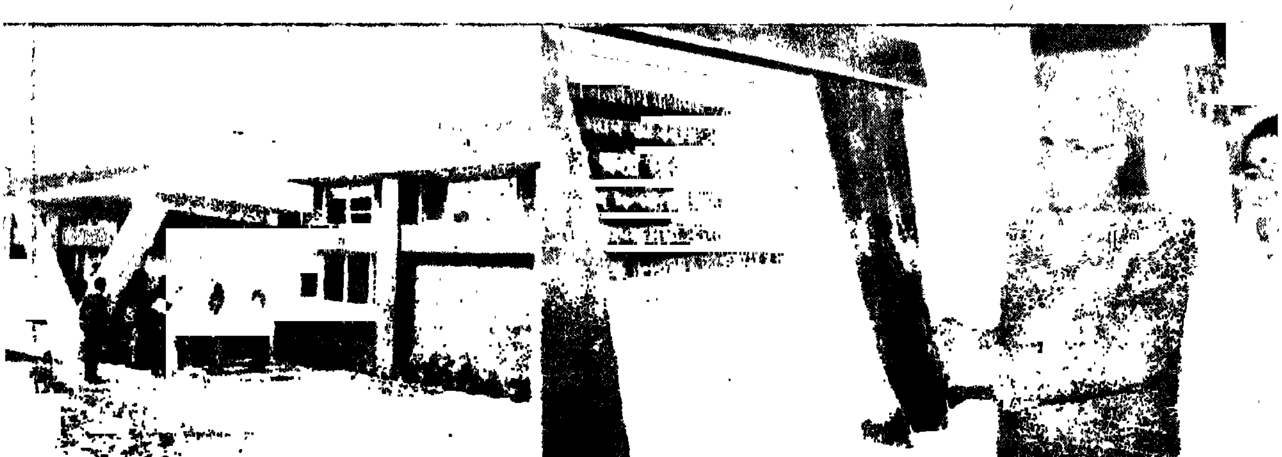
صادق علی

پبلشر اور چیف ایڈیٹر بھاسکر چیٹرجی نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمۂ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۸۹-۱۱، ۲۹۱ سیکٹر ۱۷، سی۔ چنڈی گڑھ سے جنوری ۸۷ء کے لئے شائع کیا۔ طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یُو۔ ٹی چنڈی گڑھ۔

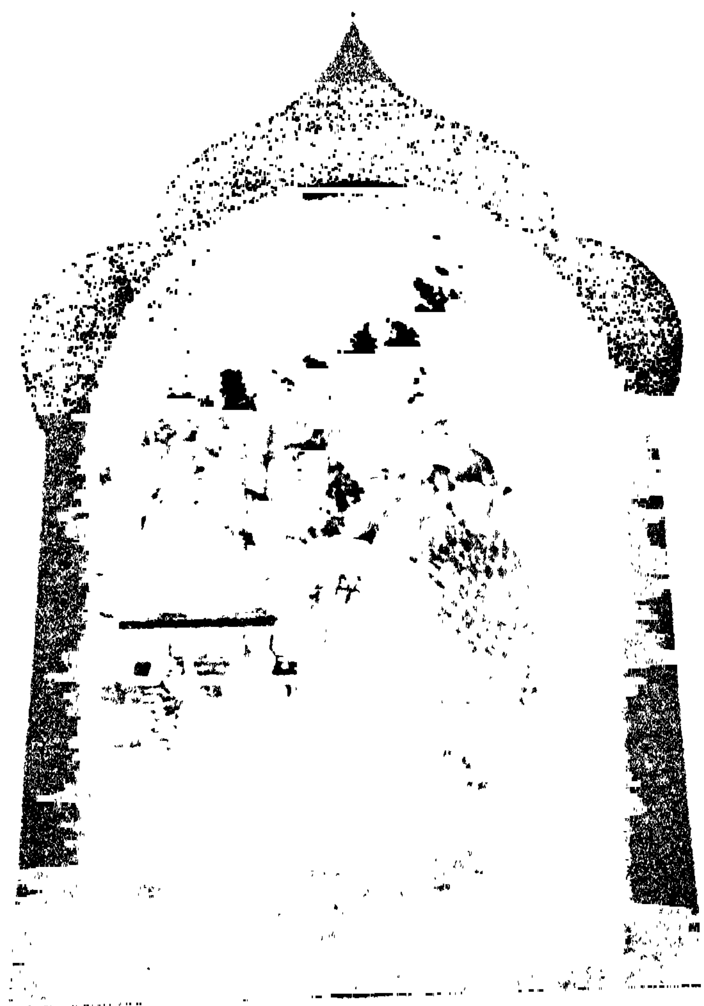


وزیرِ اعلیٰ ہریانہ۔ عالیجناب بنسی لال ۲۵ دسمبر ۱۹۸۶ء کو توشام میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے۔

۰۰ جنوری ۱۹۸۷ء کو عالیجناب بنسی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ نے نولتھا (کرنال) میں پرائمری ہیلتھ سینٹر کا افتتاح فرمایا۔ تصویر میں وزیرِ زراعت محترمہ بسنی دیوی بھی نظر آ رہی ہیں۔



REGD NO. NW/CH-15
TAMIR-E-HARYANA
JANUARY, 1987



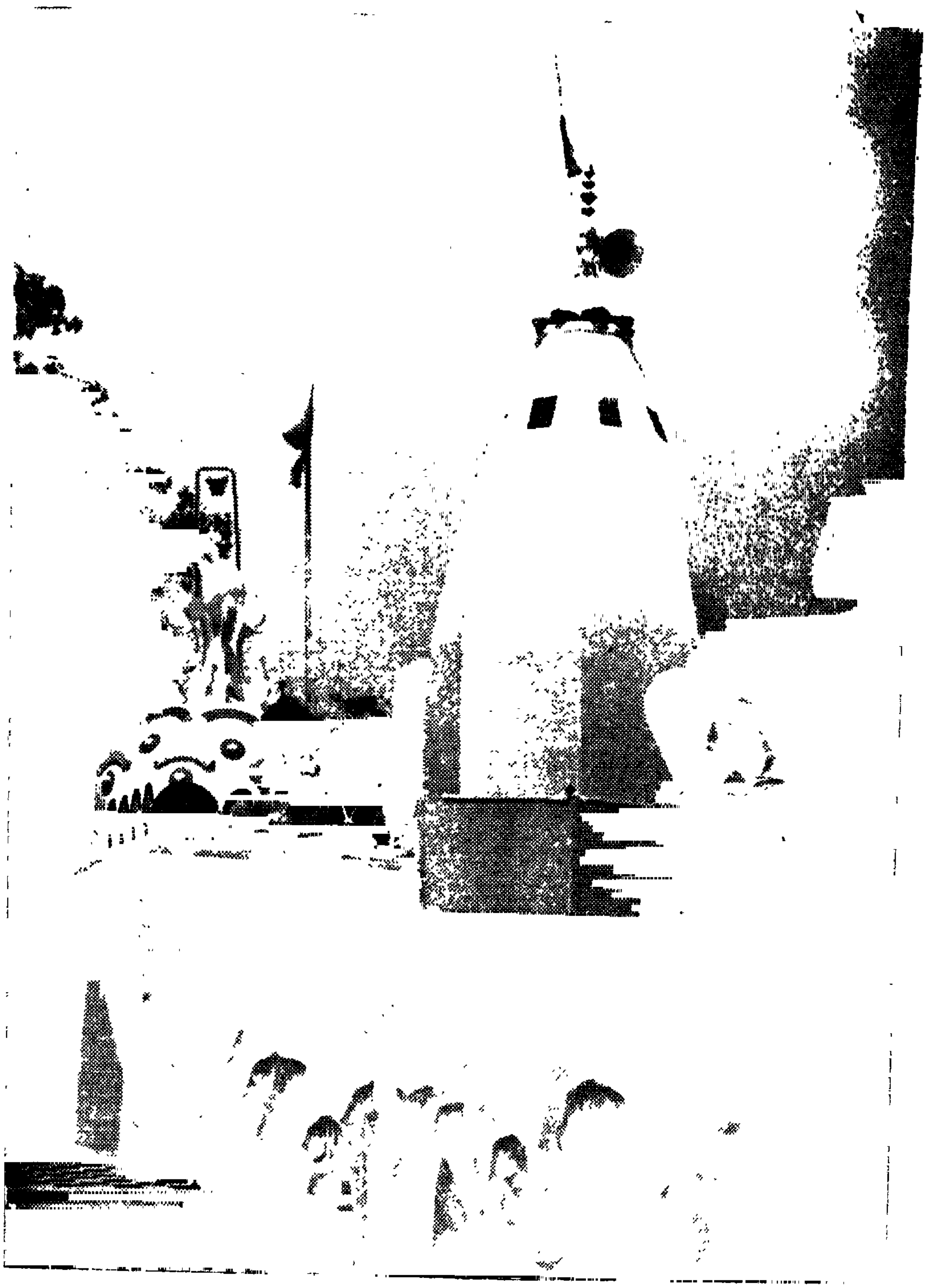
ہاتھی کی سواری
ڈبچک ٹورسٹ کمپلیکس ــــ ہوڈل

تعمیر ہریانہ

فروری۔ مارچ ۸۷ء

20 APR 1987
Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J.M.I. New Delhi





سکینٹری (انبالہ) میں شیوجی مہاراج کا قدیم مندر

M.T. New Delhi

خصوصی شمارہ

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ
فروری / مارچ ۱۹۸۵ء
جلد ۱۵
شمارہ ۲-۳

تعمیر ہریانہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے : زرِ سالانہ ۵ روپے
اس شمارے کی قیمت ایک روپیہ

مدیرِ اعلیٰ ـــ رنجیت ایسر
مدیر ـــ سلطان انجم
سرورق ـــ بادشاہ
خط و کتابت : مدیر تعمیر ہریانہ، ایس سی او ۱۸۹-۱۹۱، سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷
مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

ترتیب



پیغام

سید مظفر حسین برنی ۔ گورنر ہریانہ

یوم جمہوریہ کی ۴۰ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر میں ہریانہ کے عوام کو دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اِس مبارک موقع پر ہم اُن محبّان و شہیدانِ وطن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

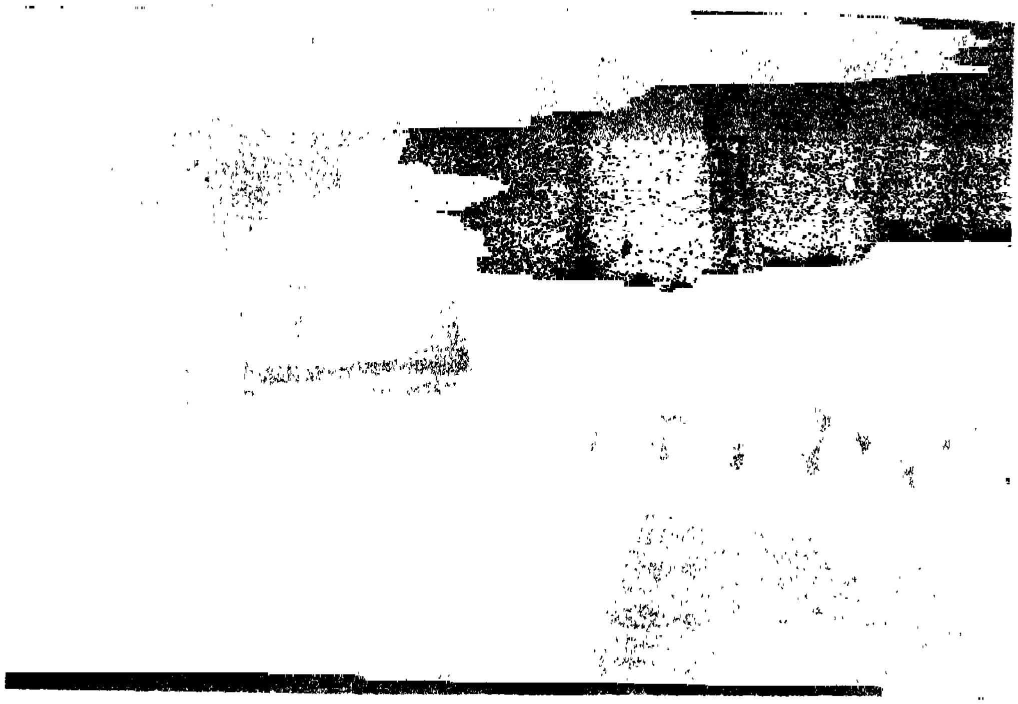
جنگِ آزادی کے دوران سخت جدوجہد کرتے ہوئے راشٹرپتا مہاتما گاندھی نے ہمیں "رام راجیہ" کا تصور دیا تھا۔ ایک خوشحال مثالی ریاست، جہاں لوگ بلا تفریقِ مذہب و ملّت، رنگ و نسل، امن، سکون اور بھائی چارے کی فضا میں ایک ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔ بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے بھی ہمیں سوشلزم اور سیکولرزم کا راستہ دکھایا اور ایک مضبوط، متحد اور جدید ہندوستان کی تعمیر کی۔ ہم خوشحالی اور ترقی کی اِس راہ پر عزمِ راسخ اور یقینِ محکم کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے۔

آغاز سے ہی ہریانہ اپنے عظیم رہنماؤں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ عوام سماجی و اقتصادی انصاف سے مستفید ہوسکیں، اِس غرض سے ہماری حکومت ترقیاتی سکیموں کو سماج کے ہر طبقے تک اور خاص طور پر سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں تک پہنچانے میں لگی ہوئی ہے۔

ہریانوی عوام کی زندگی کا دارومدار زراعت پر ہے۔ ہمارے محنت کش عوام کھیت اور سرحد دونوں محاذوں پر بہتر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ میری سرکار ہمیشہ زراعت اور کسانوں کی فلاح و بہبود پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہے۔ سائینسی زراعتی تکنیک، آبپاشی کے لئے خاطر خواہ پانی اور دیگر حوصلہ افزا سہولیات کے طفیل زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ خوردنی اجناس کی پیداوار تین گنا سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ اب اناج کی پیداوار ۱۰۵ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہوچکی ہے اور ۲۳ لاکھ ٹن فالتو اناج کے مرکزی ذخیرے میں

دیا گیا ہے۔

ہریانہ نے صنعتی شعبہ میں بھی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بڑی اور اوسط درجہ کی صنعتوں کی تعداد دوگنی ہو چکی ہے اور چھوٹے صنعتی یونٹوں میں ۱۵ گنا اضافہ ہوا ہے۔ ہریانہ نے دیگر شعبوں میں بھی دوسری ریاستوں پر سبقت حاصل کی ہے۔ ہر گاؤں میں بجلی کی سہولیات فراہم کرنے کے بعد ہریانہ ملک کی پہلی ریاست ہے جس نے



گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ء کو کورو کشیتر میں یوم جمہوریہ تقریبات کے موقع پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرتے ہوئے۔

اپنی تمام ہریجن بستیوں کو بجلی کی سہولیات سے ہم کنار کرایا اور اس کے ساتھ ہی ریاست کے تمام گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑا۔ ہریانہ ٹورزم کو اب یہ مرتبہ حاصل ہو چکا ہے کہ اس کے سیاحتی مراکز ملک بھر میں مشہور عام ہیں۔ ہریانہ روڈویز اپنی بہترین خدمات کے لئے دو بار ملک کی بہترین ٹرانسپورٹ تسلیم کی جا چکی ہے۔

ہریانہ میں تعلیم اور طبی سہولیات میں توسیع ہوئی ہے۔ ہریانہ میں اب بنیادی تعلیم مفت اور ضروری قرار دی گئی ہے۔ ہر کلومیٹر میں ایک پرائمری سکول اور پانچ کلومیٹر کے دائرہ میں ایک ڈسپنسری یا ہسپتال موجود ہے۔ پریوار کلیان پروگرام کو ایک عوامی تحریک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

ریاست میں اب تک پینے کے مسائل والے ۸۷ فیصد گاؤں میں پینے کے صاف پانی کی سہولتیں فراہم کرائی جا چکی ہیں۔ فضائی آلودگی سے ماحول کو پاک رکھنے کے لئے ہر سال کروڑوں پودے لگائے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہریانہ میں بہت جلد ایک ماحولیاتی تحفظ کونسل قائم کی جائے گی۔

ریاست سے غریبی کو ختم کرنے کے لئے اب تک ۵ لاکھ کنبوں کو مالی امداد اور تقریباً ایک لاکھ ایکڑ فالتو زمین ۲۰۳ ہزار بے زمین لوگوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ سماج کے کمزور طبقے کے ۳ لاکھ افراد کو مکان بنانے کے لئے ..اگز کے رہائشی پلاٹ دیئے گئے ہیں۔

میری حکومت اپنے سرکاری ملازمین کے تحفظ اور اُن کے مفاد کی بہتری پر پُوری توجہ صرف کر رہی ہے۔ اِس نظریہ کے تحت ہم نے ہریانہ میں بھی مرکزی حکومت کی طرح چوتھے تنخواہ کمیشن کی سفارشات کو لاگو کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

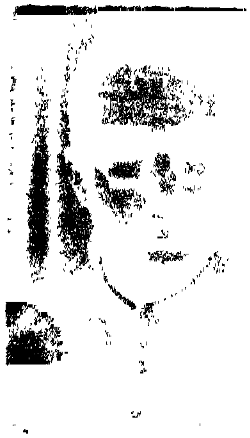
یہ تمام بے مثل کامیابی محنت کش ہریانوی عوام کے بے پناہ تعاون کے سبب ہی ممکن ہو سکی ہے، جنہوں نے سرکار کو ترقیاتی سکیموں کے نفاذ میں ہر طرح سے مدد دی اور ریاست میں آپسی اِتحاد اور بھائی چارے کی فضا کو بنائے رکھا ہے۔ مَیں اِس مُبارک موقع پر ریاستی عوام کو اپنی دِلی مُبارکباد پیش کرتا ہُوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ ریاست کو بامِ ترقی تک لے جانے میں اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔ ●

بقیہ تابناک مستقبل کی جانب گامزن ہریانہ صٓ۱ سے آگے

کام کی تھکن مٹانے اور تفریح کے لمحات کے لئے قومی شاہراہوں، ضلع صدر مقاموں اور ریاست کے دُور دراز علاقوں میں ٹورسٹ کمپلیکس قائم کئے گئے ہیں۔ قدرتی ماحول میں بنے یہ کمپلیکس مسافروں کو سبھی جدید آسائشیں اور راحتیں میسّر کرواتے ہیں۔ ہریانہ ٹورزم مشاورتی خدمات سے دیگر ریاستوں کو پیشہ ورانہ مہارت بہم پہنچانے کے لئے بھی مشہور ہے۔ حکومت ہریانہ نے حال ہی میں ٹورزم کو فروغ دینے اور بڑی تعداد میں پرائیویٹ صنعت کاروں کو اِس شعبے کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ٹورزم کو "انڈسٹری" قرار دے دیا ہے۔ ہریانہ ٹورزم کی کامیابیاں دوسری ریاستوں کے لئے مثال بن گئی ہیں۔

پکی سڑکیں اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ سڑکیں سماجی۔ ثقافتی بندھنوں کو مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ہریانہ اپنے سبھی گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑنے والا سرِفہرست صُوبہ ہے۔ ہماری روڈویز بہترین سروس اور آرام دہ سفر کی مظہر ہے۔ ہمارے پاس ۳۲۰۰ بسیں ہیں جو روزانہ ۹ لاکھ ۱۵ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ اِن بسوں میں ۱۲ لاکھ ۸۹ ہزار مُسافر سفر کرتے ہیں۔ ہریانہ روڈویز کو حکومتِ ہند لگاتار کئی سال سے ملک کی بہترین روڈویز قرار دے رہی ہے۔

ہریانہ تعمیرِ نو اور ہمہ پہلو ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کے لئے پُرعزم ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب ہریانہ سبھی شعبوں میں ترقی کے لحاظ سے ملک کی دیگر ریاستوں میں سرِفہرست مقام حاصل کرے گا۔ ●



تابناک مستقبل کی جانب گامزن ہریانہ

بنسی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

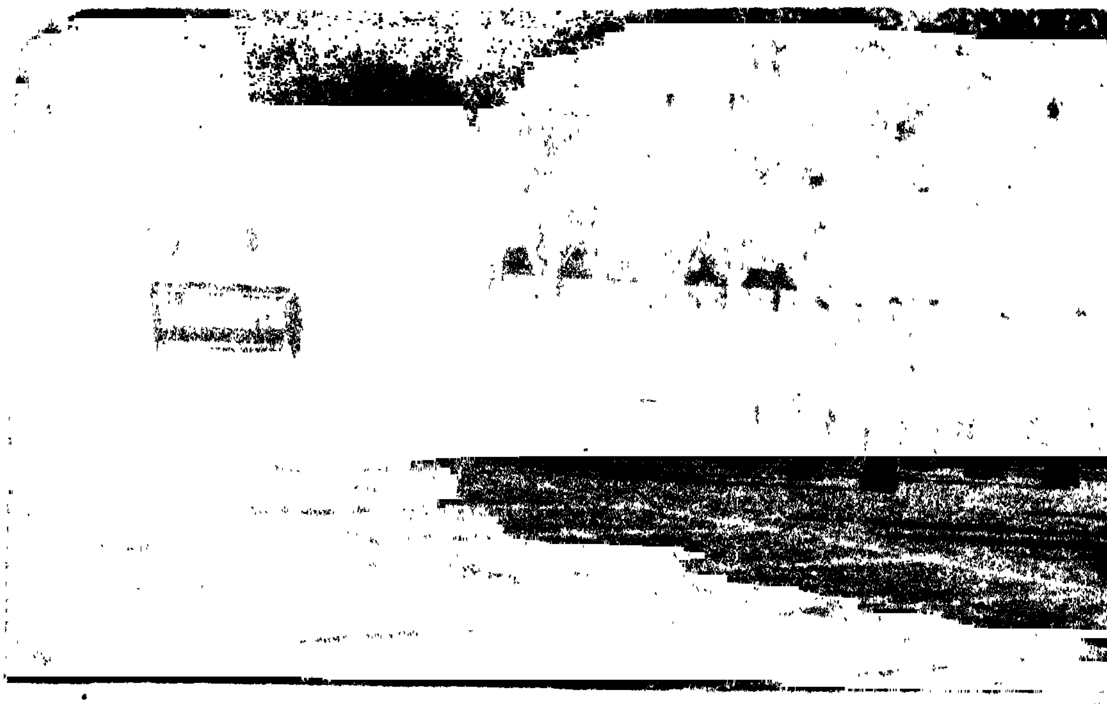
میں یومِ جمہوریہ کی ۳۷ویں سالگرہ پر ہریانہ واسیوں کے لئے دِلی مبارک باد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ۳۷ سال قبل آج ہی کے مقدس دن ہندوستان نے اپنا آئین لاگو کر کے جمہوری نظام کو اپنایا تھا۔ یہ دن ہمیں مکمل خودمختاری کے حصول کے لئے ہمارے بیشمار محب الوطنوں کی سخت جدوجہد اور قربانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارے کندھوں پہ اس پوزیشن کو قائم رکھنے اور آگے بڑھنے کی بڑی ذمے داری ہے۔

ایک چھوٹی اور کم عمر ریاست ہریانہ نے اقتصادی خوشحالی اور سماجی انصاف پر مبنی سماج کے قیام کے لئے ہمارے آئین کے معماروں کے خواب کو تعبیر بخشنے میں کافی حصہ ڈالا ہے۔ ہم غریبی، جہالت اور بیماری کے خاتمہ کی غرض سے سکیمیں شروع کر کے روشن تر مستقبل کی تعمیر میں صدقِ دل سے مصروف ہیں۔

ہریانہ بنیادی طور پر ایک زرعی ریاست ہے۔ اس کے ۸۰ فی صد سے بھی زیادہ لوگوں کا انحصار زراعت پر ہے۔ اس لئے سرکار کسانوں کی فلاح اور اُن کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مالیہ کا خاتمہ اور آبی راستوں کو پکا کرنے کے خرچ کی وصولی سے نجات اس سمت میں اُٹھائے گئے چند اقدامات ہیں۔ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں کسانوں کی امداد کے لئے آبیانہ، تکاوی اور کوآپریٹو قرضوں کی وصولی کو آئندہ فصل تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی قسموں، زراعت کے سائنٹیفک طریقوں، فصل کے لئے منصوبہ بندی، پودوں کی حفاظت کے ذرائع، قرضوں کی فراہمی، آبپاشی کی سہولیات میں توسیع سے کسی وقت اناج کی کمی والا ہریانہ اب وافر اناج پیدا کرنے والی ریاست بن چکا ہے۔ خوردنی اجناس کی پیداوار ۱۹۶۶ء کی ۲۵ لاکھ ۹۲ ہزار ٹن سے بڑھ کر اب تقریباً ۸۲ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔

کھیتوں کی ایک اہم ضرورت پانی ہے۔ اس کے بغیر سبز انقلاب اور لہلہاتے کھیتوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ روایتی بہاؤ آبپاشی کے علاوہ نہایت ناہموار علاقوں میں آبپاشی کے لئے فوارہ اور لفٹ آبپاشی سسٹم کو اپنایا جا رہا ہے۔ پانی کو رسنے سے بچانے کیلئے نہروں اور

آبی راستوں کو یکجا کیا جا رہا ہے۔ ان سب طریقوں سے ہماری آبپاشی صلاحیت کافی بڑھ گئی ہے۔ ستلج یمنا لنک نہر کے ذریعہ راوی بیاس کے پانی میں سے اپنے حصے کا پانی حاصل ہونے پر یہ صلاحیت اور بڑھ جائے گی۔ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ ستلج یمنا لنک نہر کی تعمیر کا مکمل خرچ مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ اس کے علاوہ ہریانہ نے اس پر اب تک جو رقم خرچ کی ہے وہ بھی لوٹا دی جائے گی۔



وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب بنسی لال ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ء کو کرنال میں یوم جمہوریہ تقریبات کے موقع پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرتے ہوئے۔

اسی طرح بجلی کے بغیر بھی کھیتوں اور فیکٹریوں میں پیداوار بڑھانا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہم نے مانگ اور سپلائی کے فرق کو کم کرنے کے لئے کئی طریقے اپنائے ہیں۔ بجلی کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے ہائیڈل اور تھرمل پاور کے امکانات کا پتہ لگایا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے پاور ٹرانسمیشن کو مضبوط کیا جا رہا ہے۔ موجودہ پاور پلانٹوں کی صلاحیت بڑھائی جا رہی ہے اور نئے پلانٹ لگائے جا رہے ہیں۔ صنعتی شہر فرید آباد میں مرکزی حکومت کے تعاون سے ۱۰۰ میگاواٹ کا نیا گیس ٹربائن پاور پلانٹ لگایا جائے گا اس سے صنعتی شعبوں میں بجلی کی بڑھتی ہوئی مانگ کافی حد تک پوری ہو جائے گی۔

ہریانہ سبھی گاؤں میں بجلی پہنچانے والا ملک بھر میں پہلا صوبہ ہے۔ سبھی ہریجن بستیوں اور ۱۰۰ سے بھی زیادہ گاؤں کی گلیوں میں بجلی پہنچ چکی ہے۔ ۵۲،۶۴۳ ہریجن گھروں کو ایک ایک پوائنٹ کے گھریلو کنکشن دیے گئے ہیں۔

صنعتیں ریاست کی معیشت کو مستحکم کرتی ہیں اور نوجوانوں کے لئے روزگار کے نئے نئے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ ریاست میں صنعتوں کی ترقی کے لئے کئی قدم اٹھائے گئے ہیں۔

غیر ممالک میں آباد ہندوستانیوں کو ریاست کی صنعتوں میں سرمایہ اور ٹیکنالوجی لگانے کی ترغیب دلانے کی غرض سے کافی رعائتیں دی جا رہی ہیں۔ جلد ہی ۱۳۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے چھ ملین ٹن کی صلاحیت والا تیل صاف کرنے کا کارخانہ پانی پت کے نزدیک بہولی میں لگایا جائے گا۔

برآمدات کے ذریعہ زرمبادلہ کمانے والی اکائیوں کے لئے بے حد مراعات میسر ہیں۔ دیہی اور شہری علاقوں میں اقتصادی عدم توازن کو بہتر بنانے اور شہروں کی جانب کوچ کرنے کے رجحان کو روکنے کے لئے دیہی صنعتی سکیم شروع کی گئی ہے۔ اس سکیم کے تحت تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں، سماج کے کمزور طبقوں، کسانوں، تجارت کرنے والوں، اونچی ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کو دیہی علاقوں میں چھوٹے صنعتی یونٹ قائم کرنے میں مدد دی جا رہی ہے۔ ایسے یونٹوں کے قیام میں خصوصی رعائتیں دی جاتی ہیں۔ ریاست میں الیکٹرانکس نگم (ہرٹرون) الیکٹرانکس کو بڑھاوا دینے میں لگی ہوئی ہے۔ اُدیوگ وہار گوڑ گاؤں میں فضائی آلودگی سے پاک الیکٹرانکس کمپلیکس تیزی سے بن رہا ہے۔ انبالہ میں اقوام متحدہ کے تعاون سے قائم کی گئی ایک ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ایجنسی جو "انسٹرومینٹس ڈیزائن اینڈ ڈویلپمنٹ ایجنسی" کے نام سے معروف ہے، الیکٹرونکس اور الیکٹرو آپٹیکل آلات سازی کے لئے قائم کی گئی ہے۔

ہریانہ میں صحت اور طبی سہولیات کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی ہے اب ہم طبی سہولیات پر فی کس ۴۵ روپے ۸ پیسے خرچ کر رہے ہیں جبکہ ریاست کے وجود میں آنے کے وقت صرف ایک روپیہ ۳۳ پیسے فی کس خرچ کئے جاتے تھے۔ اب ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، پرائمری ہیلتھ سینٹروں اور سب سینٹروں کے ذریعہ لوگوں کی طبی ضرورتوں کو پورا کیا جا رہا ہے۔ روہتک میڈیکل ہسپتال کا درجہ بڑھا کر پی جی آئی کے برابر کیا جا رہا ہے۔ سماج کے نچلے طبقے کو ترقیاتی سکیموں کا فائدہ پہنچانے کے لئے چھوٹے پیوار کا آدرش بھی نہایت اہم ہے۔ ریاست میں لوگوں نے خاندانی فلاح و بہبود کے پروگراموں کو اپنی خوشی کے ساتھ اپنایا ہے۔ یہ امر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ریاست اس پروگرام کے نفاذ کے لئے لگاتار چار برسوں سے انعام حاصل کر رہی ہے۔

پینے کا صاف پانی لوگوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ پینے کے پانی کی کمی والے اور پانی کے مسائل والے گاؤں میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لئے کارگر اقدام کئے جا رہے ہیں۔ پانی کے مسائل والے ۵۲۹۰ گاؤں میں سے ۴۴۴۰ گاؤں میں پینے کے صاف پانی کی سہولیات میسر ہو چکی ہیں۔ باقی گاؤں میں ۱۹۹۰ء کے آخر تک یہ تمام سہولیات فراہم کر دی جائیں گی۔

سماج کے کمزور اور پچھڑے طبقات کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے کئی فلاحی سکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے تاکہ ان لوگوں کو سماج میں باعزت مقام حاصل ہو سکے۔ نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت کم آمدنی والے پریواروں کو روزگار شروع کرنے کے لئے رقم دی جا رہی ہے تاکہ وہ غریبی کی سطح سے اوپر اٹھ سکیں۔ اب تک ۱۸۹۷۰ ایکڑ فالتو زمین کمزور طبقوں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ ہریانہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی بھی اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کو رعایتی شرح سے پلاٹ مہیا کرتی ہے۔ بے سہارا عورتوں، بیواؤں اور ان پر انحصار رکھنے والوں کے لئے "گھر" چلائے جا رہے ہیں۔ یتیم اور بے سہارا بچوں کو بہتر نگہداشت کر سکنے والوں کے پاس رکھا جاتا ہے تاکہ انہیں گھر جیسا ماحول مل سکے۔ انٹیگریٹڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت بچوں، حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں، ۵ سے ۴۴ برس کی مہیلاؤں کو گھر جیسا ماحول میسر کروانے کے لئے ضلعی صدر دفتروں پر تیزی سے ہوسٹل بن رہے ہیں۔

ملک کی ترقی میں تعلیم کی اہمیت کے مدنظر ہم بچوں کی تعلیم کی طرف زیادہ دھیان دے رہے ہیں۔ تعلیم کی شرح اور سطح دونوں کے سدھار کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نہ صرف تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھی ہے بلکہ طالب علموں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم کو فروغ دینے کے لئے خاطر خواہ ماحول پیدا کرنے کی سبھی کوششیں جاری ہیں۔

(بقیہ ص پر)

غزلیں



آزاد گلاٹی

بدن کی قید سے خود کو رہا تو کرنا ہے
ہوا کو خاک سے آخر جدا تو کرنا ہے

زمیں ہمارے موافق بنے ـ یا ہم اِسکے
جو زندہ رہنا ہے' یہ فیصلہ تو کرنا ہے

زمیں جلا کے کرے' آسماں جھکا کے کرے
ہمارے عہد کو اب ارتقا تو کرنا ہے

شناخت اپنی کہاں تک چھپا کے رکھیں گے
ہمیں خود اپنا کبھی سامنا تو کرنا ہے

کسی بھی شاخ پہ ملتا نہیں' کوئی پتہ
یہ کیسا زورِ ہوا ہے ـ پتہ تو کرنا ہے

یہ قرضِ زندگی ٹھہرا ـ اسے ہمیں آزاد
نفس نفس سہی آخر ادا تو کرنا ہے

☼

حامدی کاشمیری

وسیع میدان تنگ دیکھوں
حصارِ تیغ و تفنگ دیکھوں

چلوں تو بے آب و رنگ صحرا
رکوں تو دریلئے رنگ دیکھوں

میں شاید اس کا سراغ پاؤں
ہر ایک تحریرِ سنگ دیکھوں

ہوا نہ ہو کوئی حملہ آور
رو میں بدیش میں خدنگ دیکھوں

زمین مستور تیرگی میں
میں ماہتاب اننگ دیکھوں

☼

صالحہ عابد حسین

مولانا ابوالکلام آزاد

ماں باپ نے محی الدین احمد نام رکھا تھا۔ نوجوانی میں شعر کہتے تھے۔ شاید اسی زمانے میں آزاد تخلص رکھا ہو۔ قوم نے ان کی بے مثال ادبی، علمی اور تقریر کرنے کی قوت دیکھ کر ابوالکلام کا خطاب دیا۔ اس طرح ان کا پورا نام ابوالکلام محی الدین احمد آزاد ہوتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جو کسی خوش قسمت دیس میں سینکڑوں سال میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ان کی ذہانت، علمی قابلیت، ان کے ادبی کارنامے، مذہبی تصنیف قوم اور دیس کی زندگی بھر کی خدمتیں، ہر ایک خوبی اپنی اپنی جگہ ایسی ہے کہ ایک بھی کسی انسان میں ہو تو وہ بہت شہرت و عزت پا سکتا ہے۔ لیکن یہ ساری صفتیں مل جل کر ایک شخصیت کے روپ میں ڈھل جائیں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن اس بڑے انسان میں جسے ساری دنیا صرف مولانا آزاد یا ابوالکلام آزاد کے نام سے یاد کرتی ہے، یہ صفات جمع ہو گئی تھیں۔

مولانا آزاد ؒ ان ہستیوں میں سے ہیں جن کو زمانہ بھلا نہیں سکتا بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان کی بزرگی بڑھتی جاتی ہے۔ جن کا نام تاریخ میں زندہ رہتا ہے۔

ان کی کئی حیثیتیں بہت اہم ہیں۔ اور ادب میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں۔ بڑے مذہبی عالم ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے مذہب بلکہ دوسرے بڑے بڑے دھرموں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور بڑی انصاف پسندی اور رواداری اور عقیدت سے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ بہت بڑے سیاسی رہنما رہے ہیں جن کا ملک کی آزادی اور قوم کی تربیت میں "قابلِ ذکر اور اہم حصہ ہے۔ وہ دوبار کانگریس کے صدر چنے گئے۔ ان ہی کی صدارت کے زمانے میں ملک کو آزادی کی نعمت ملی۔ آزادی کے بعد پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے دس سال تک ملک کی علمی اور تعلیمی زندگی بہتر کرنے میں بسر کئے۔ غرض ان کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا مختصر سا ذکر کرنے کے لئے بھی کتابیں چاہئیں۔ یہاں تو آپ کے سامنے صرف ان مولانا آزاد کا ایک خاکہ پیش کر رہی ہوں جن کو تھوڑا سا قریب سے دیکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے اور جن کی عنایت اور شفقت کی دولت نصیب ہوئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک مشہور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک بڑے پیر تھے جن کے ہزاروں مرید اور عقیدت مند تھے۔ لیکن مولانا کو یہ پیری مریدی پسند نہیں تھی اور انھوں نے کبھی اس کو نہیں اپنایا۔ ایسے وقت بھی آئے جب ان پر بڑی تنگی اور تکلیف کا زمانہ گزرا۔ وہ ایک اشارہ کرتے تو ان کے والد کے مرید ان کے پیروں میں دولت کے ڈھیر لگا دیتے مگر ہمارے مولانا نے بڑے وقار اور شان کے ساتھ یہ زمانہ جھیلا۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ قریبی سے قریبی

دوست کو یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کسی مالی پریشانی میں ہیں۔ یہی نہیں وہ سیاسی جلسوں، کانگریس کے اجلاس وغیرہ میں جاتے تو کرایہ تک نہیں لیتے تھے بلکہ سارا خرچہ خود اٹھاتے۔ ویسے وہ بڑے صاحبِ ذوق اور نفاست پسند تھے اور جب ان کے پاس پیسہ ہوتا تو ضرورت مندوں کے لیے اور سیاسی کاموں میں صرف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رہن سہن پر بھی اسے شوق اور سلیقے سے صرف کرتے تھے۔ صاف شفاف اعلیٰ درجہ کے کھدّر کے کپڑے پہنتے۔ ان کا گھر سلیقے، نفاست اور خوبصورتی سے سجا ہوتا۔ مہمانوں کی حلوے، عمدہ چائے، مٹھائی وغیرہ سے خاطر کی جاتی۔ بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما سبھی ان کی عزت اور قدر کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے دل میں بھی ان کی بڑی عزت تھی اور وہ ان سے صلاح مشورہ لیا کرتے تھے ہمارے محبوب لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو تو ان دو چار لوگوں میں سے تھے جن کی مولانا سے گہری دوستی تھی اور نہرو جی مشکل اور الجھے ہوئے مسئلوں میں آزادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی بے تکلّف ان سے مشورہ اور مدد لیتے تھے۔ ویسے تو ہزاروں لوگ ان کی دل سے عزّت کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا کے مخالف نہیں تھے۔ نہیں بہت سے مخالف تھے اور بہت سخت! جن میں زیادہ تر خود ان کے ہم مذہب لوگ تھے۔ مگر مولانا کا دل اتنا بڑا تھا کہ سخت سے سخت مخالف اور دشمن تک کے لیے کبھی وہ کوئی برا لفظ نہیں کہتے تھے اور ہر ایک کو معاف کر دیتے تھے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد غیر معمولی ذہانت لے کر دنیا میں آتے تھے۔ ایک بڑے مفکر کا قول ہے کہ ایک من ذہانت کے لیے سو من صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ذہانت کے ساتھ ساتھ اگر انسان میں صبر و ضبط، حوصلہ اور برداشت کی صلاحیت نہیں تو وہ گمراہ بھی ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد کو ذہانت کی دولت کے ساتھ صبر کی نعمت بھی قدرت نے دی تھی۔ ان کے والد بہت بڑے عالم تھے بچپن میں انھوں نے اپنے ہونہار سپوت کو خود تعلیم دی اور ساتھ ہی بڑے بڑے دوسرے عالموں سے بھی انھیں پڑھوایا۔ اور چودہ سال کی عمر میں انھوں نے اتنا علم حاصل کر لیا جتنا لوگ تیس سال کی عمر تک میں بھی مشکل سے کر پاتے ہیں اور ان کے "دستارِ فضیلت" (آپ اسے اس وقت کی ڈاکٹریٹ یا ماسٹر کی ڈگری سمجھ لیجئے) بندھ گئی۔ لیکن ان کے والد پرانے زمانے کے آدمی تھے وہ ادب و شعر کے مخالف تھے۔ لیکن ہمارے من چلے نوجوان آزاد کو شعر و ادب سے قدرتی لگاؤ تھا اور پڑھنے کا بے پناہ شوق۔ وہ پرانی کتابوں کی دکان پر سے کتابیں کرایہ پر لاتے اور جیب خرچ کے پیسے بچا بچا کر موم بتّیاں خرید کر رکھ لیتے اور جب سارا گھر سو جاتا تو لحاف کے اندر موم بتّی رکھ کر آدھی آدھی رات تک پڑھتے رہتے۔ اس سے ایک بار بستر میں آگ بھی لگ گئی جس سے راز فاش ہو گیا اور ان کو والد کے غصّے کا نشانہ بننا پڑا۔ مگر پڑھنے کے شوق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ساتھ ہی ان کو موسیقی کا بھی شوق تھا۔ بھلا مولوی سا گھر اور گانا بجانا!! مگر انھوں نے اسے بھی سیکھا اگرچہ بعد میں یہ شوق جاری نہ رہ سکا۔ مگر ذوق باقی رہا۔ ساہتیہ کلا اکیڈمی ان کے ادب کی محبت کا اور للت کلا اکیڈمی موسیقی اور کلا کے شوق کا ثبوت ہے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ ایک بار جو پڑھ لیا دل پر پتھر کی لکیر بن کر رہ جاتا تھا۔ انھیں ہزاروں اردو، فارسی، اور عربی کے شعر، مقولے بلکہ پوری پوری عبارتیں یاد رہتی تھیں۔ اس لئے وہ اپنی ان کتابوں میں بھی جو جیل میں لکھی ہیں بے تکلّف سینکڑوں شعر اور مقولے لکھتے ہیں۔ مولانا کا آرٹ کا ذوق بہت عمدہ تھا۔ وہ شعر ہو یا نثر، مصوّری ہو یا موسیقی سب کی ان کو پرکھ تھی۔ لیکن خود ان کا ذوقِ جمالی ادب کے میدان میں ظاہر ہوا۔ وہ ابھی بیس سال کے بھی نہ تھے کہ اردو پڑھنے والی دنیا میں ان کا نام مشہور ہو چکا تھا۔ ان کے اخبار "الہلال" اور "البلاغ" بڑے اونچے درجے کے علمی ادبی اخبار سمجھے جاتے تھے جو آزادی کے علمبردار بھی تھے۔ ان کو پڑھ کر لوگ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس کا ایڈیٹر اور ان مضامین کا مصنف کوئی بوڑھا تجربہ کار عالم ہے مگر جب ایک خوبصورت نوجوان ابوالکلام کو

پانے تو حیرت زدہ رہ جاتے۔ اردو کے مشہور شاعر مولانا حالی جب ان سے پہلی بار ملے تو بڑی سادگی سے کہا آپ کے والدِ محترم کا اخبار "الہلال" میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جس نوجوان سے وہ یہ کہہ رہے ہیں وہ خود ہی "الہلال" کا ایڈیٹر ہے تو انھیں بہت حیرت ہوئی۔

یوں تو انھوں نے سینکڑوں مضمون اور کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں اور ہر چیز اپنی جگہ اونچا درجہ رکھتی ہے مگر ان کی دو کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک ان کی اہم مذہبی کتاب سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے یہ اگرچہ مذہبی تصنیف ہے مگر مولانا کے قلم نے اس میں ایسے ایسے موتی بکھیرے ہیں، قدرتی مناظر کی ایسی دلکش تصویریں کھینچی ہیں۔ ایسی پرجوش اور پر اثر عبارتیں لکھی ہیں جن پر حسین سے حسین شعر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری کتاب "غبارِ خاطر" جو ہے تو خطوں کی شکل میں مگر دراصل یہ اعلیٰ درجے کے مضمون ہیں جس میں انھوں نے اپنے خیالات، اپنی رائیں، اپنے جذبات اور زندگی کے کچھ واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب اپنا جواب آپ ہے۔ ابتدا میں مولانا آزاد ذرا مشکل اور علمی زبان لکھتے تھے! مگر "غبارِ خاطر" کی زبان اتنی سادہ اور حسین ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جو بات وہ کہتے ہیں دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

مولانا نے زیادہ تر لکھنے لکھانے کا کام جیل میں کیا ہے کہ لکھنے کے لئے جس سکون، جس خاموشی اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ جیل سے باہر کی زندگی میں ملنا مشکل تھا۔ مگر ویسے لکھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے انھوں نے بہت سویرے کا وقت مقرر کیا تھا۔ جب دنیا میٹھی نیند کے مزے لیتی۔ علم و ادب کا یہ پریمی چار بجے صبح سے اٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا۔ اسی لئے اتنی مصروف زندگی کے باوجود وہ اتنا بہت سرمایہ اردو ادب کے لئے چھوڑ گئے۔

ویسے وہ زیادہ ملنے جلنے کے شوقین نہ تھے۔ گپ شپ میں وقت برباد نہ کرتے تھے۔ پڑھنا اور لکھنا ان کا سب سے بڑا شوق تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اکل کھرے یا آدم بیزار تھے۔ نہیں اس کے باوجود وہ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے تھے۔ ہزاروں آدمی مختلف مسئلوں کو لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ مذہبی نکتے سمجھنے کے لئے، سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے، ان کے علم سے فیض پانے کے لئے۔ ادب اور شعر سے ذوق رکھنے والے اور ویسے ہی عقیدت اور محبت رکھنے والے، وہ ان سب سے ملتے پھر ساتھ کام کرنے والے لوگ، اور بڑے بڑے سیاسی لیڈر۔ مولانا سبھی سے ذوق سے ملتے، اور سب کی مشکلوں کا حل یا ذہن کی تسکین کر دیتے تھے۔ ان میں سچے معنوں میں بڑے آدمی کا یہ کمال بھی تھا کہ ان سے مل کر ایک عجیب خوشی اور ذہن کو سکون ملتا تھا جیسے کوئی دولت پالی ہو۔ ان کا برتاؤ بڑوں سے یعنی "بڑے لوگوں سے" اور چھوٹوں سے عزت و احترام کا انداز ہوتا تھا۔ "میرے بھائی" کہہ کر بات کرتے تھے اور کسی طرح سے اپنی علمیت یا بڑائی کا رعب نہ ڈالتے تھے۔ مگر ان کا سنجیدہ چہرہ، ذہانت کے نور سے چمکتی آنکھیں، باوقار اندازِ گفتگو، ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ ان کی بڑائی کا احساس خود بخود دل میں بیٹھ جاتا تھا۔ علمی باتیں کرتے تو لگتا علم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا چلا جا رہا ہے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے تو لگتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں!

مولانا آزاد کی گھریلو زندگی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کی بیوی زلیخا بیگم جب برسوں پہلے مولانا جیل میں تھے اس وقت فوت ہو گئی تھیں۔ وہ بڑی آن بان والی عورت تھیں اور مولانا کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کی خدمت کی سچے دل سے قدر کرتیں اور ہر دکھ اور ہر مصیبت میں صبر اور خاموشی سے ان کا ساتھ دیتی رہیں۔ وہ سخت بیمار ہوئیں اس وقت مولانا احمد آباد جیل میں تھے اور بہت پریشان۔ انگریز حاکموں نے اس شرط پر انھیں بیوی کے پاس جانے کی اجازت دینی چاہی کہ وہ خود درخواست کریں اور اس دوران وہ کسی سیاسی معاملے میں زبان نہ کھولیں مگر مولانا کی اصول پرستی نے اسے گوارا نہ کیا اور بچھڑنے والی جیون ساتھی کی آخری صورت دیکھنے کی حسرت کو اصول پر قربان کر دیا اور بدیسی حاکموں کی اس

ناانصافی کی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا اور یہ وفاشعار بیوی شوہر کی صورت کو ترستی جنت کو پیاری ہو گئیں۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ بیوی کی وفات کے بعد تو بالکل ہی انھوں نے اپنے کو ملک و قوم کی خدمت میں فنا کر دیا۔ سارا دیس ان کا وطن تھا اور ساری قوم ان کا خاندان۔ مولانا اپنے ملازموں اور کم حیثیت کے لوگوں سے بھی بہت عزّت سے پیش آتے۔ ان کے پرانے ملازم ان کی وفات کے بعد رو رو کر ان کا ذکر کرتے تھے اور کہتے کہ ایسا آقا کہیں نہیں مل سکتا۔ جن نوجوانوں میں قابل جوہر دیکھتے تو ان کی بڑی ہمت بڑھاتے اور ہر ممکن مدد کرتے۔ چھوٹی اور چھچھوری گھٹیا باتوں سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ خود ان سے ایسی کوئی بات ہو جائے تو یہ ممکن ہی نہ تھا۔ غصّہ بہت کم آتا اور اگر آ جاتا تو بڑے حوصلے سے اُسے پی جاتے تھے اور جواب اسی انداز سے دیتے کہ کوئی سخت جملہ یا نازیبا بات منھ سے نہ نکلتی تھی۔ ایک بار پارلیمنٹ میں جب وہ وزیر تعلیم تھے تو کسی مخالف نے ان پر ایک جھوٹا الزام لگایا۔ مولانا کو سخت غصّہ آیا مگر اس وقت وہ خاموش رہے پھر اگلے دن جب جواب دینے کھڑے ہوئے تو ان کی تقریر میں اگرچہ سچے غصّے کی جھلک تھی مگر کوئی سخت لفظ تک نہ تھا۔ مگر کیا روانی، کیا جوش، کیا زور تھا اور پھر ایسی دلیلیں اور سچے پکے ثبوت۔ اس تقریر کو سننے والے دم بخود سُن رہے تھے۔ یہ تقریر پارلیمنٹ کی چند بہترین تقریروں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے، اس میں اصلاح کرنے اور تعلیمی کام کرنیوالوں کی بھلائی کے تعلیمی اداروں کی بہبودی اور اصلاح کے بڑے اہم اور قابلِ قدر کام انجام دیئے۔ ان کے زمانے میں تعلیم کے سیکشن میں نہایت اعلیٰ پایہ کے ماہرین تعلیم محکمے میں جمع ہو گئے تھے۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ ہندوستان کے ان مایۂ ناز سپوتوں میں سے ہیں جن کو ہمارا دیس کبھی بھلا نہیں سکتا۔ دور سے دیکھنے میں ان کی عظمت، شان اور وقار، ان کے علمی درجہ، مذہبی مقام، سیاسی تدبّر کا لوگوں پر رعب پڑتا تھا مگر جن لوگوں کو ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اکثر ملنے کی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں صرف یہی صفتیں نہ تھیں بلکہ کچھ ایسی کشش بھی تھی جس کے سامنے سر ہی نہیں دل بھی جھک جاتے ہیں۔ ان کا شفیق چہرہ، دلکش مسکراہٹ، آنکھوں میں دل سوزی، لہجے میں اپنائیت، باتوں میں شیرینی کے ساتھ دل میں قوم، ملک اور انسانیت کے درد کی جھلک، ان کی شخصیت میں محبوبیت کا وہ رنگ بھر دیتی تھیں جو بے اختیار دلوں کو موہ لیتی ہے!!

مولانا آزاد فرماتے ہیں ؎

تمہیں کہتا ہے مُردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خُوبیاں باقی

تسنیم فارُوقی

ایکتا

یہ ڈیم، کارخانے، مشینیں یہ سبز کھیت
کس کام کے یہ سب جو ادھوری ہے ایکتا
سانسیں جہاں جہاں ہیں وہاں تک خبر کرو
اَب ملک میں ہوا سے ضروری ہے ایکتا

اِس مرض کی بھی کوئی دوا چاہیئے
ہم کو ہر موڑ پر سوچنا چاہیئے
ایکتا کے کھلونے بہت بن چُکے
اب ہمیں واقعی ایکتا چاہیئے

کشمیری لال ذاکر

دُوسرا مَرد

میری زندگی میں آیا دوسرا مرد میرا بیٹا ہے۔ میں نے اُسے مرد اِس لیئے کہا ہے کہ اب اس کی عمر بیس[۲] برس سے اوپر ہو گئی ہے۔ اور ایک آدھ برس میں اُسے ووٹ ڈالنے کا بھی حق مِل جائے گا۔

پہلا مرد جو میری زندگی میں آیا تھا وہ میرا خاوند ہے۔ پدم پال۔

میرا اپنا نام جگتار ہے۔ جگتار کا مطلب ہے جگ کا کلیان کرنے والی۔ دنیا کا بھلا کرنے والی۔ میں دنیا کا تو بھلا کر سکی ہوں یا نہیں لیکن اپنا آپ ضرور بگاڑ چکی ہوں پینتیس برس پہلے والی جگتار تو اب پہچان میں بھی نہیں آتی۔ اُس کا تو رنگ روپ ہی بگڑ گیا ہے۔ جینو منڈی میں میرے ساتھ پڑھنے والی کوئی لڑکی کبھی مِل جاتی ہے تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔

"جگتار تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتی صرف ہنس دیتی ہوں اور یوں ہنستے ہوئے کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک جوان اور صحت مند عورت نہیں ہنس رہی بلکہ ردّی اخبار سے بنا ہوا ایک خالی لفافہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ عورت کبھی ایک بیکار خالی لفافہ بھی بن سکتی ہے اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوتا ہے جب میں ناری نکیتن میں ظلم اور نا انصافی کا شکار ہوئی کسی عورت کو خالی وقت میں ردّی اخبار کے کاغذوں سے لفافے بنانے ہوئے دیکھتی ہوں۔ یہ اُس کے خالی وقت کو اچھے ڈھنگ سے گزارنے، اُسے مصروف رکھنے اور اس کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا ایک تعمیری ذریعہ ہے۔ ایسی ہی ایک عورت سے بات کرتے ہوئے ناری نکیتن کی وِزٹ پر میں نے پوچھا تھا۔

"تم یہاں کیسے چلی آئیں؟"

"شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔"

"تقدیر تو آدمی خود بناتا ہے۔"

"بناتا ہوگا لیکن عورت تو صرف لفافے ہی بنا سکتی ہے شریمتی جی۔"

میں اُس مجبور عورت کا جواب سُن کر سکتے میں آگئی تھی۔ اس کا وہ تلخ لہجہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اس کی آنکھوں میں گُھلا درد میرے تمام جسم میں سنسنی سی پھیلا گیا تھا۔

"مگر کیوں؟"

"عورت جب کٹ جاتی ہے تو اس کی اپنی حیثیت بھی ایک خالی لفافے کی طرح ہو جاتی ہے۔ ردّی کاغذ سے بنا ہوا ردّی کا لفافہ۔"

میں ناری نکیتن کی اُس خوبصورت، نوجوان عورت سے زیادہ بات نہ کر سکی تھی۔ اپنے آپ کو ڈری ہوئی محسوس کرتے ہوئے لوٹ آئی تھی۔

اُس شام مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ عورت جو

کسی مرد کے بھروسے کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اُسے اپنا پیار، اپنا وشواس، اپنا جسم اور اپنی آتما تک سونپ دیتی ہے وہ ایک دم لُٹ ہی تو جاتی ہے۔ پیار کے ایک بول کی ماری عورت جب لُٹ جاتی ہے تو ایک آدمی کیا اُسے سارا سماج قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جسم کا کٹ جانا شاید بہت بڑا حادثہ ہے ایک عورت کی زندگی میں اور وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے جو صرف ایک ہی مرد کے ہاتھوں لُٹ کر اسی کی ہو جاتی ہے۔ کیا وہ واقعی خوش نصیب ہے؟ میرا خیال ہے نہیں۔ اُس نے اپنا پیار دے کر عمر بھر کی غلامی خرید لی ہے۔ اس نے اپنا وشواس، اپنا پیار، اپنے خواب، اپنی تمنائیں، سبھی کچھ بیچ کر اپنے لئے ایک محفوظ چہار دیواری خریدی ہے جو اس کے لئے آخر ایک غیر محفوظ قیدخانہ بن جاتا ہے۔ یہ سودا کتنا مہنگا ہے!

زندگی بھر کے خواب اور ان کے عوض زندگی بھر کی غلامی!

یہ دوسرا مرد جو اچانک میری زندگی کو جھنجھوڑنے لگا ہے۔ میرا بیٹا ہے بلرام۔

لیکن اس وقت میں اس کی بات نہیں کروں گی۔

اس سمے میں اپنے جیون میں آئے پہلے مرد کی بات کروں گی۔

جو میرا خاوند ہے۔ پدم پال۔

پدم پال اور میں دونوں جیتو منڈی کے رہنے والے ہیں۔ جیتو منڈی پنجاب میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ قصبہ ریاست نابھ کے راجہ کی جاگیرداری میں تھا۔ یوں تو اناج کی بڑی بھاری منڈی تھی یہاں لیکن اس کی شہرت کی وجہ دوسری تھی۔ جیتو منڈی کے کچھ لوگوں نے اپنے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ خوب سزائیں پائی تھیں۔ لیکن آخر راجہ کی غلامی سے نجات بھی تو حاصل کر لی تھی۔ ان لوگوں میں جنھوں نے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ میرے پتاجی بھی تھے۔ بغاوت کے عوض انہیں کئی برسوں کی قید ملی تھی۔ میں ان دنوں پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ پدم پال بھی اسکول جاتا تھا۔ پتاجی جیل گئے تو ایک دم مشہور ہو گئے اور ایک بڑے نیتا بن گئے۔ میری ماں اور پدم پال کی ماں دونوں بہت اچھی دوست تھیں۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنی دوستی پدم پال اور مجھ میں منتقل کر دی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت نہ مجھے نہ پدم پال کو۔ پر میں تھی بہت خوبصورت۔ شاید اسی لئے پدم پال کی سانولی، بے ڈھب اور موٹی سی ماں نے مجھے اپنے آنگن کے لئے چُن لیا تھا۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ پدم پال کی ماں مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ نہ بیاہ سے پہلے نہ بیاہ کے بعد۔

پدم پال اونچے قد کا خوبصورت لڑکا تھا۔ وہ اپنی ماں پر نہیں گیا تھا ورنہ اس کا رنگ روپ اور طرح کا ہوتا۔

پدم پال جب اسکول سے نکلا تو مانو بچپن سے نکل کر ایک دم جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ بڑے لگتے ہیں۔ پدم پال ان ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ اب اکثر ہمارے گھر بھی آنے لگا تھا۔ میری ماں نے کئی بار ٹوکا بھی لیکن وہ باز نہیں آیا۔

"میں تو تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔ ماسی جی کے لئے تو نہیں آتا۔" پدم پال نے ایک بار کہا تھا۔

"مجھے دیکھنے کیوں آتے ہو؟"

"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"میں تو تمہارے گھر کبھی نہیں جاتی؟"

"تم لڑکی جو ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"لوگ بُرا مانتے ہیں۔"

"تمہارے یہاں آنے کا لوگ بُرا نہیں مانتے؟"

"میری اور بات ہے۔"

"تمہاری اور بات کیوں ہے؟"

"میں تمہارا منگیتر ہوں۔"

پدم پال نے یہ جواب دیا اور مسکراتے ہوئے ہمارے گھر سے باہر نکل گیا۔ پدم پال کی یہ مسکراہٹ میری زندگی کی پہلی ہار تھی۔

اُس سمے میں نے اسے ہار نہیں سمجھا تھا۔ اپنی جیت سمجھا تھا۔

ہم پال میرے لئے پاگل ہو رہا تھا۔

جینتو منڈی میں کالج نہیں تھا اس لئے پدم پال اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے پٹیالہ چلا گیا اور وہاں اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں دسویں کر کے گھر بیٹھ گئی۔ لیکن میرے پتا جی آزاد خیال آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے رتن اور پربھاکر کے امتحان پاس کرنے اور پھر پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کی صلاح دی۔ نہ صرف صلاح ہی دی بلکہ خود ہی پڑھانے بھی لگے۔ پدم پال کالج میں پڑھ رہا تھا۔ میں گھر پر امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ بات پدم پال کو تو پسند تھی لیکن اس کی ماں کو نہیں۔ اس نے اپنی تینوں بیٹیوں میں سے کسی کو بھی آٹھویں درجے سے آگے نہیں پڑھنے دیا تھا۔ کئی بار اس نے میری ماں سے بھی کہا کہ وہ مجھے کیوں آگے پڑھا رہی تھی۔ ماں اسے ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتی کہ یہ فیصلہ اس کا نہیں میرے پتا جی کا تھا۔ یہ ایک اور وجہ تھی جس سے میرے اور پدم پال کی ماں میں بعد میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ وجوہات تو خیر کئی تھیں۔ بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کی اپنی بیٹیاں نہ خوبصورت تھیں نہ پڑھی لکھی۔ اس لیے ان کے بیاہ کی بھی بہت بڑی سمسیا تھی۔

ادھر پدم پال نے بی اے کیا تو اس نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ میں نے بھی بی اے انگلش کر لیا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ پدم پال کی شادی سے پہلے اس کی کم سے کم دو بیٹیوں کی شادی ہو جائے۔ کوشش تو وہ سر توڑ کر رہی تھی لیکن جہاں بھی بات چلتی کسی نہ کسی کارن ٹوٹ جاتی۔ لڑکیوں کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا ایک بڑا کارن بن جاتا۔

پدم پال کچھ مہینے تو اپنی ماں کا ساتھ دیتا رہا اور اپنی بہنوں کے لئے لڑکے تلاش کرتا رہا لیکن آخر وہ تنگ آ گیا۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان تھا تو ہمارے گھر آیا۔ اتفاق سے ماں اس وقت گھر پر نہیں تھی۔

"ماں گھر پر نہیں ہے تم چلے جاؤ۔" میں نے بڑی رُکھائی سے کہا تھا۔

"لیکن تم میری بات تو سنو۔"

"ماں کی غیر حاضری میں تم مت آیا کرو۔"

"تم اپنی ماں سے آخر کب تک چوکیداری کرواتی رہو گی؟"

"جب تک میں اس گھر میں ہوں۔"

"اس کے بعد؟"

"پھر تو تمہاری ماں میری چوکیداری کرے گی ہی!"

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری یا تمہاری چوکیداری کرے!" پدم پال نے کہا تھا۔

وہ اب تک کھڑا ہی تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کبھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں چاہتی تھی کہ وہ بیٹھے ہی۔

"تم جلدی سے کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"پانی وانی بھی نہیں پلواؤ گی؟" پدم پال کے ہونٹ واقعی سوکھ رہے تھے۔

میں جب رسوئی سے پانی لینے گئی تو پدم پال کمرے میں رکھی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا، جس کی سیٹ پر ابھی دو دن پہلے میں نے کم روئی ڈال کر ایک ہلکی سی گدی رکھی تھی۔ میں نے ٹوکا نہیں۔ پدم پال کو واقعی بہت پیاس لگی تھی۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا تھا۔

"اور پانی لاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے اپنی قمیض کے بازو سے ہی اپنے گیلے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی بات کہو۔"

"جگتار، میں چاہتا ہوں کہ جلدی ہی ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کا فیصلہ تو میرے اور تمہارے گھر والے کریں گے۔ تمہارے چاہنے سے کیا ہوگا؟" میں نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا۔ پانی کا خالی گلاس ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھا در اصل میں پدم پال کے اس سجھاؤ کے لئے تیار نہیں تھی۔

"جہاں تک میری ماں کا سوال ہے۔ وہ تو پہلے اپنی بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اس میں غلط بات کیا ہے؟ اُن کی شادی تو پہلے ہونی ہی چاہیئے۔"

"میں بے شک بوڑھا ہو جاؤں؟"

"نہیں، تم اتنی جلدی بوڑھے نہیں ہو گے۔" میں مسکرا رہی تھی۔ ماں کی غیر حاضری کے کارن ... من پر جو بوجھ تھا۔ اب کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"تو تمہیں جلدی نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"دو کارن ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں پہلے اپنے لیے کوئی کام کاج تلاش کرنا چاہیئے۔ بے کار آدمی کو شادی ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ دوسرا کارن یہ ہے کہ جب گھر میں تین جوان لڑکیاں ہوں تو گھر کا ماحول خوش گوار نہیں ہوگا۔"

"تو کیا کروں؟"

"ان دونوں مسئلوں کا حل سوچو۔" میں نے جواب دیا۔

پدم پال ایکدم اُداس ہو گیا تھا۔ اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ میں اُس کی تجویز نہیں مانوں گی اور اُسے کسی نئی اُلجھن میں ڈال دوں گی۔ وہ چُپ چاپ اُٹھ کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

"تم ناراض نہ ہو پدم پال۔ شادی تمہیں سے کروں گی، تھوڑا اور انتظار کرو۔"

پدم پال رونے کے سے انداز میں مسکرایا اور چلا گیا۔ میں نے اُسے ناراض تو نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ مایوس ضرور تھا۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر راناؔ گنوری۔ کیتھل۔

غزل

قطرہ دریا مت سوچا کر
اَدنیٰ اعلیٰ مت سوچا کر

کہہ جایا کر جو کہنا ہو
کون سنے گا مت سوچا کر

سوچ سمجھ کر کام کیے جا
اور نتیجہ مت سوچا کر

سوچ سوچ کر میں نے آخر
یہ ہی سوچا مت سوچا کر

تیری سوچ سے کیا ہوتا ہے
راناؔ اتنا مت سوچا کر

٭

چند میٹھی یادیں

ڈاکٹر گیان چند

جن لوگوں کے پاس ماضی تو ہوتا ہے لیکن مستقبل نہیں ہوتا، وہ اپنے حال کو یادوں کی برات، یادوں کے چراغ، یادوں کے کارواں اور یادوں کے نگار خانے سجائے رکھتے ہیں۔ میں سال خوردہ ہوں لیکن ابھی اس منزل میں نہیں پہنچا جہاں میرے پاس یادوں کے سلسلے میں بیٹھنے کے سوائے کوئی مشغلہ نہ ہو۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اس شغل کے لئے خاطر خواہ فرصت ملے گی۔

امتداد زندگی کے ساتھ یادوں کا انبار تو بڑھتا ہی جارہا ہے۔ میں کبھی کبھی اسے ٹٹول کر کھول کر چند رنگین یادیں دیدہ دل کے سامنے گزار لیتا ہوں۔ یہ یادیں بالکل رنجی ہیں۔ میں ان کے نہاں خانے کو چشم آفتاب کے سامنے بھی نہیں لانا چاہتا۔ آپ کو اس میں کیوں کرلے جاؤں۔ آپ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ میری یادیں لذت نگاہ کے شیرے میں ڈوبی ہیں اس لئے میں انہیں اپنے باطن میں چھپائے بیٹھا ہوں۔ آپ باور کیجئے مجھے اس دولت سے کوئی بہرہ نہیں ملا۔ کہتے ہیں در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی لیکن میرے ایام جوانی کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جسے رمزیات کے خوش رنگ پردے میں لپیٹ کر پیش کرنے کی ضرورت ہو۔

جوانی سے پہلے بچپن کو لیجئے۔ اب تو یہ یقین کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے کہ کبھی میں بھی طفلک ناداں تھا۔ میں تو طفولیت کے دن بھلا چکا تھا لیکن اس مضمون کی خاطر بچپن میں لوٹنے پر مجبور ہوں۔ میرے وطن سیوہارے سے قریب ایک چھوٹا ریلوے اسٹیشن

چکراج مل تھا۔ میرے ماموں وہاں اسٹیشن ماسٹر تھے ہم لوگ ماں کے ساتھ کبھی کبھی وہاں جاکر رہتے تھے۔ کسی ریل یا مال گاڑی کے آنے سے پہلے ہم پٹری پر ایک تار کا ٹکڑا رکھ دیتے تھے۔ جب اس پر سے ریل گزرتی تو وہ دب کر چپٹا ہو جاتا تھا۔ یہ کھیل ہمیں کتنا خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ مال گاڑی گزرتی تو ہم اسکے ڈبے گنتے۔ کبھی کبھی ستر ڈبے تک ہوتے تھے۔

میں ماضی کے دھندلکے میں سے اپنے عہدِ طفولیت کی بازیافت کرتا ہوں۔ اب جو کچھ معمولی لگتا ہے۔ اس دورِ معصومی میں وہ سب غیر معمولی تھا۔ ریل کا سفر اور اس کے متعلقات کتنے دل فریب معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تھرڈ کلاس میں بھی بھیڑ کا تصور نہ تھا۔ جب میں پانسات سال کا رہا ہوں گا ان دنوں وطن مالوف سے مرادآباد تک یعنی محض پانچ اسٹیشنوں کا پسنجر گاڑی کا سفر کتنا سہاونا معلوم ہوتا تھا۔ بالکل وہی ولولہ ہوتا تھا جو آج کسی کو بیرونِ ملک جانے میں ہوگا۔ مرادآباد کے اسٹیشن پر ایک شیڈ میں بہت سے انجن کھڑے ہوتے، سیاہ دیو جیسے، بھاپ چھوڑتے سیٹی بجاتے اِدھر سے اُدھر ٹہلتے۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ٹاٹا کی فولاد کی فیکٹری کی سیر پہ لے آیا ہو۔

مجھے بات کرنی تھی میٹھی یادوں کی۔ معلوم نہیں یہ یادیں میٹھی ہیں کہ نہیں۔ بعض یادیں کھٹی، کڑوی یا چٹپٹی ہوتی ہیں۔ مطالبہ ہے کہ میں صرف میٹھی یادوں کا بیان کروں۔ شاید مراد یہ ہے کہ ایسی

رتبان سے نکالی گئی ہوں۔ کوشش کرتا ہوں
ستا ذی رفیق حسین کے یہاں مسلم یونیورسٹی
۔ کہنے لگے کہ متنجن کھائے چالیس سال ہو
دلی رکابدار ہے جو متنجن پکانا جانتا ہو؟
شخص کا نام لیا۔ میں لاکھ اردو کا مدرس سہی
ر قوم کا۔ میں کیا جانوں متنجن کیا بلا ہوتی ہے
یہ نہ آیا کہ آخر نسیم صاحب کون سا مثالی متنجن
چالیس سال سے نصیب نہیں ہوا۔ اب
ڈالتا ہوں تو پاتا ہوں کہ میں نے بھی تقریباً
جر کا حلوہ نہیں کھایا۔ اگرچہ ہر سال سردیوں
ں لیکن یہ وہ حلوہ نہیں ہوتا جو آزادی سے
دَور میں گھر میں بنا کرتا تھا۔ اِس میں میووں
شمش، پستے، بادام، کاجو وغیرہ کی وہ باڑھ
دب کر رہ جاتی۔ ایک عجیب گہرا، رچا ہوا،
ذائقہ ہوتا جو موجودہ حلووں میں ناپید ہے۔
با کہ بقیہ عمر میں کبھی اِس قسم کا گاجر کا حلوہ

ے کہ اِس پیر مرد کی یادوں میں گاجر کے حلوے
کوئی یاد نہیں۔ یقیناً ہیں۔ میں نے حلوے کا ذکر
لہ اِس کا میٹھا ہونا مستند اور مسلّم ہے۔ آیئے
ین کو پھلانگ کر تو جوانی کے میخانہ بے خودی
ں۔ گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد رام گنگا کے کنارے
رہتا تھا۔ ہر طرف اردو کی فضا تھی۔ دِلوں پر جگر
ہوئے تھے۔ ہوسٹل کے ریڈیو پر ایک مشاعرہ
ں نظم تھی عروسِ شبِ یونہی مہکو ابھی تو رات بہت ہے۔
نظم گا تی تھی آئیں تجھے من میں بسا لوں اے بانی کے باسی
را آ ئیں تجھے سینے سے لگا لوں، تو نہیں تھا۔
سرور جہاں آبادی کی نظم "ماریا سیمیں" سے ماخوذ
مصرع ہے آ کلیجے سے لگا لوں تجھ کو ماریا سیمیں۔
کی غزل کے مقطع کا دوسرا مصرع تھا زخم کھاتے جایئے

اور مسکراتے جایئے۔ جگر نے غزل سنائی کہ محفل میں تیری آہ کیے جا رہا
ہوں میں۔ ہمارے ہوسٹل اور کالج میں کئی شاعر تھے۔ اُس عہد کا
تندرست، کھلا اردو کا ماحول اب کہاں۔ آزادی کے بعد میں اردو
کے کئی مرکزوں میں رہا لیکن اب اہلِ اردو کے دلوں پر ہزیمت کی دھند
چھائی ہے۔ اردو کا وجود ایک کوہسارِ بے دل کے تلے دبا ہے۔ لاکھ
جگر داری کی باتیں کریں لیکن ہم اپنی جنگ ہار چکے ہیں۔
مراد آباد اور الہ آباد میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سہ سالہ
بے روزگاری کا منہہ دیکھا۔ پھر کالج میں ملازمت مل گئی۔ سہ سالہ
ملازمت کے بعد ازدواج کے مختلوئے حیرت و قصرِ اسرار میں داخلہ
ملا۔ ماہِ عسل اور اِس کی بے اعتدالیوں پر خاموشی انسب ہے۔

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ایسی یادوں کو تحت الشعور کے دھندلکے میں ہی دفن رہنے دوں مبادا
کسی صاحبِ دل کی نظر پڑ جائے۔
زمانۂ طالب علمی میں ایک بار، اور ملازمت کے بعد کئی بار
پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے یہاں جانا ہوا۔ گھنٹوں نشست
رہی۔ ان کی گفتگو میں اردو کی رضا کا رفتہ، معلومات کا بحرِ زخار
دیکھا، استفادہ کیا۔ اردو ادب کی دنیا میں کھو گیا اور کئی بڑے بڑے
ادیبوں مثلاً مولانا عرشی، پروفیسر سرور، اعجاز صاحب، احتشام
صاحب وغیرہ سے ملاقاتیں اور باتیں اب محض یادیں بن کر رہ گئی
ہیں، ایسی یادیں جن میں اب حسرت کا شائبہ بھی آ گیا ہے۔
اب داخل کو چھوڑ کر مظاہر کے بیانات پر جایئے۔ غالب کا
کا مصرع ہے

زہے روانیٔ عمر سے کہ در سفر گزرد

مجھے ایسے سفروں کا کافی موقع ملا ہے جس میں نظر نے
فطرت و صنعت کی حسن کاریوں سے بھر پور بہرہ اندوزی کی ہے۔ دو
چار سماں پیش کرتا ہوں۔
ایک فلم جھنک جھنک پائل باجے میں مسعود کے مناظر
باغ کو دیکھا۔ پھول، فوارے اور نور ہی نور۔ اِس باغ و بہار کو
بچشمِ خود دیکھنے کی تمنا ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں دیکھا۔ چار سال بعد
اپنے اہل و عیال کو لے جا کر دکھایا۔ کاویری ندی کا باندھ۔ طبقہ
بہ طبقہ پھولوں کے خیابان کھلے۔ ندی کا پانی کئی تختوں میں اوپر

سے نیچے گرتا اور اس سے بلند فوارے اُچھلتے' ان کے نیچے رنگ برنگی روشنیاں۔ شدّاد کی بہشت کا عالم تھا۔ دو بار دیکھا ہے تیسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

۱۹۴۴ء اور ۱۹۷۹ء میں کشمیر کی سیر کی۔ کس کس مقام کا نام لوں۔ پہلگام کی پہاڑیوں پر سبزہ اور بلند و بالا' چیڑ کے جوانانِ چمن۔ بیچ میں لدّر کا پہاڑی نالہ۔ سفید پانی شوریدہ سری کے ساتھ بولڈروں سے ٹکراتا' بکھرتا' سمٹتا' اُچھلتا' کودتا چلا جاتا تھا۔ کیا چشمہ ہے اور کیا پہاڑی پس منظر ہے ان پر سنزا دستیاحوں کا حسنِ رہگزر۔

تین سال پہلے مغرب کی سیر کی۔ امریکہ میں سان فرانسسکو میں ایک نہایت ڈھلوان سڑک ہے جس کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں کے تختے ہیں۔ سڑک میں مسلسل پیچ و خم ہے۔ دُنیا کی سب سے انوکھی پُراسرار سڑک کہلاتی ہے۔ اس کے بیچ موٹر سے اوپر سے نیچے اُتریئے' معلوم ہوتا ہے پھولوں کے پہاڑ کے بیچ لہراتے آتے ہیں۔

اور امریکہ ہی کا دوسرا شاہکار ڈیسنے لینڈ ہے جو ایک طلسم ہوشربا معلوم ہوتا ہے۔ اتنا بڑا تفریحی شہر' انسان کی صنعت کا کمال' ہر طرف سیر تماشہ۔ اس میں بیسیوں منظر گاہیں ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے کئی دن چاہئیں۔ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی It is a small small world اس میں زیرِ زمیں نہروں کا سلسلہ ہے جس میں سیاحوں کو بجلی سے چلنے والی کشتیوں میں گزارا جاتا ہے۔ دونوں کناروں پر مناظر تراشے گئے ہیں' مصنوعی باغ' پھول' پودے' آراستہ مکان۔ ان میں ملکوں ملکوں کی پریوں جیسی گڑیاں ہیں جو رقص کرتی ہیں' ساز بجاتی ہیں۔ ساتھ ہی اس مخصوص ملک کی ممتاز عمارت کا چھوٹا سا ماڈل ہوتا ہے مثلاً ہندوستانی سیکشن میں چھوٹا تاج محل بنایا ہے۔ رنگ برنگی روشنیاں ہیں۔ پس منظر کے لئے ہلکا سا سنگیت بجتا رہتا ہے جس کی لہروں پر کشتی اس طبقے سے اُس طبقے میں داخل ہوتی ہے اور باہر نکلتی ہے۔ مَیں نے زندگی میں جو بہترین مناظر دیکھے ہیں وہ برنداون باغ اور ڈیسنے لینڈ کا یہ بلاک سیب ہے۔ انہیں بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور جب دیکھ نہیں سکتا تو دیدہ و دل کے آگے ان کی میٹھی یادوں کی نظم گزارتا رہتا ہوں لیکن فرصت کم حوصلہ ان یادوں کا جی بھر کر نظارہ بھی تو نہیں کرنے دیتی۔

کرشن کمار طور

غزل

کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے یہ اثرات پھر
سینۂ شب پہ چمکتا ہے سمندر رات پھر
ایک برقِ زرد لہرائے گی تو نقشہ تمام ہو گئے
کیوں ڈرائے رکھتا ہے مجھ کو مرا اظہارات پھر
اب رہے گا زیست میں یہ لمحہ اک عذاب
اب کھلے گا اک فسوں منظر یہ منتظرات پھر
ہوں میں کیا اور کیا مری پہچان اب اس کے بغیر
میں جسے سینے میں رکھتا ہوں سبھی اثرات پھر
امتحاں ہونے نہ ہونے کا نہ ہو در پیش طور
اک صدا سی تم کو بھی ہے میرے اعذرات پھر



ہولی اور اردو شاعری

ڈاکٹر مظفر حنفی

راوی : مختلف قوموں اور ملکوں کی تہذیب الگ الگ ہوتی ہے اور اِس تہذیب کی جھلکیاں بھی رنگا رنگی کی حامل ہوتی ہیں۔ تہوار، رسم و رواج، میلے ٹھیلے اور عقیدوں کے اظہار میں اختلاف سے قومیں اور فرقے ایک دوسرے سے منفرد اور ممتاز ہوتے ہیں لیکن جب مختلف تہذیبیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ گنگا جمنی تہذیب اس بات کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

(ذرا سا وقفہ۔ پس منظر سے موسیقی کی لہریں بلند ہوں اور پھر دھیمی ہو جائیں)

راویہ : ہماری اِس گنگا جمنی تہذیب نے اختلاف سے زیادہ اشتراک پر زور دیا ہے۔ رسم و رواج، آدابِ معاشرت اور رہن سہن کا طریقہ ایک ہی خطۂ زمین پر ایک جیسے جغرافیائی اور سماجی حالات میں زندگی بسر کرنے والوں کو ہم رنگ بنا دیتا ہے۔ رسموں کا اپنے علاقوں اور رہن سہن سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ بسنت اور ہولی کے تیوہاروں کو دیکھئے، اب یہ کسی خاص مذہب کے تیوہار نہیں رہ گئے بلکہ قومی تیوہار ہو گئے ہیں۔ یہ فصلی جشن ہیں جنہیں ہندوستان میں بسنے والے مختلف عقیدوں اور مختلف علاقوں کے لوگ اپنے اپنے طور پر مناتے ہیں۔

(موسیقی کی لہریں اُبھر کر آہستہ آہستہ مدھم ہوں)

راوی : حضرت امیر خسروؒ نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا دل بہلانے کے لئے لگ بھگ سات سو برس پہلے جو بسنتی نظم کہی تھی وہ آج بھی کروڑوں انسانوں کا جی موہ لیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں مذہبی شخصیتیں ہیں۔

راویہ : خسروؒ نے کسی بہت نیک شگن میں بسنت پر نظم لکھی ہوگی کیونکہ اُن کے بعد سے آج تک اردو کے شاعروں میں بسنت پر شعر کہنے کی رنگین روایت چلی آ رہی ہے۔ شاد عارفی کہتے ہیں

بہار بادلوں کی طرح گلستاں پہ چھا گئی
ہوا میں تازگی، فضا میں دلکشی سما گئی
بسنت کی خبر کلی کلی کو گدگدا گئی
وہ گدگدی جو ہر کلی کے لب پہ مسکرا گئی

راوی : وِداعِ شب سے جاگ اُٹھے طیورِ نغمہ بافتہ
دو صد اصول ساختہ ترانہ ہا نواختہ
اُڑی پھننگ سے بلندیوں کی سمت فاختہ
اسی پھننگ پہ کسی کو ساتھ لے کے آ گئی
ترنجِ زر کو مات کر رہے ہیں زرد سنترے
یہ مرغزار ہیں کہ فرشِ مخملیں ہرے بھرے
پکارتے ہیں کھیت اِلٰی کے اِدھر سے اب
جو بھی نظر جمی کہ زعفران میں نہا گئی

(نظم کے اختتام پر موسیقی کا ایک فوارہ سا اُبل پڑے)

راویہ: سادھو، سنتوں، پیروں اور صوفیوں کا تو خیر مذہب ہی انسان دوستی ہوتا ہے لیکن بادشاہوں اور نوابوں نے بھی یہ ہندوستانی تیوہار بڑی اپنائیت اور خلوص کے ساتھ منائے ہیں۔ قدیم دکنی دور میں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایسی بہت سی نظمیں مل جائیں گی جن میں وہ اپنی نو پیاریوں کے ساتھ بسنت نہایت اہتمام کے ساتھ مناتا ہوا نظر آتا ہے۔

راوی: اس موقع پر اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کی یاد بیساختہ آجاتی ہے جو خود شاعر تھے اور فنونِ لطیفہ کے قدر داں بھی۔ وہ اپنے دربار میں رہس کرتے، اس میں خود بھی حصہ لیتے اور جی بھر کر بسنت مناتے تھے۔

راویہ: انہیں کے دور میں امانت لکھنوی نے اندر سبھا لکھی تھی جو لوک ناٹک کی حیثیت سے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ اردو کے اس ابتدائی ڈرامے میں بسنت پر ایک نظم تو غضب کی ہے۔

(پس منظر سے موسیقی بتدریج اُبھر آئے، مندرجہ ذیل اشعار ساز پر ترنم سے پڑھے جائیں)

مغنیہ: ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ میں، میدان میں سرسوں
صحرا وہ بسنتی ہے، یہ گلزار بسنتی
گیندوں کے درختوں میں نمایاں نہیں گیندے
ہر شاخ کے سر پہ ہے یہ دستار بسنتی
مُنہ زرد دوپٹے کے نہ آنچل میں چھپاؤ
ہو جائے نہ رنگِ گلِ رُخسار بسنتی
کھلتی ہے مرے شوخ پہ ہر رنگ کی پوشاک
اودی، اگری، چمپئی، گلنار بسنتی

(موسیقی مدھم ہو کر پسِ منظر میں چلی جائے)

راوی: واہ کیا رنگین اشعار ہیں اور کیسے جذبے کے ساتھ کہے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بسنت کا تیوہار دراصل موسم کی تبدیلی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ ماگھ (سردی) کی پانچ تاریخ کو بسنت یہ خوشخبری سناتا ہے کہ سردی کی ٹھٹھرن اور کپکپی سے ہندوستانیوں کو نجات مل رہی ہے۔ دھوپ میں تیزی آگئی ہے۔ درختوں پر نئے پتے نکل رہے ہیں، جَو اور گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں جھومنے لگی ہیں، باغوں میں آم پر بور آرہا ہے اور سرسوں کے پھولوں نے دُور دُور تک سونا بچھا دیا ہے۔ انسان ہوں یا جانور، پیڑ پودے ہوں یا پرندے سب پر جیسے جوانی پھوٹ پڑتی ہے۔

راویہ: دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب یورپ کے ممالک میں موسم بہار کا دور دورہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں سے برف پگھل کر اُترنے لگتی ہے اور وہ رنگ برنگے پھولوں سے لد جاتے ہیں اور تب سے مغربی ملکوں میں اسی موسم میں سب خوشی کے تیوہار اور میلے ٹھیلے منائے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے پڑوسی ملک ایران میں "جشنِ نوروز" بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور شاید پوری دنیا اس موسم میں خوشی کے ترانوں سے گونجنے لگتی ہے۔

(طربیہ موسیقی کا وقفہ)

راوی: خوشی کے ان مواقع پر اردو کے شاعروں کے نغمے اپنی اپنی لطافت، شیرینی اور غنائیت کی بنا پر امتیازی شان رکھتے ہیں۔ دسہرہ، دیوالی، ہولی، بسنت اور ایسے دوسرے تمام تیوہاروں پر مذہب اور ملت کی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر اردو کے تخلیق کاروں نے بڑھ چڑھ کر اظہارِ مسرت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کا اظہارِ مسرت شعر کی شکل میں جلوہ گر ہوگا۔

راویہ: دراصل اردو کی پیدائش ہی دو بڑی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ یوں تو ہر زبان دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی

ہے لیکن اردو بطورِ خاص یہ فریضہ انجام دیتی ہے کیونکہ محبت، آشتی، رواداری اور وسیع النظری اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ہم بسنت کی باتیں کر رہے تھے جب کسان اپنی محنت کو کھیتوں میں بارآور ہوتے دیکھ کر مست ہو جاتا ہے اور پیلے پیلے پھولوں کے گوہر لوٹتا ہے، مرد ان پھولوں کو اپنے کانوں میں سجاتے ہیں اور اچھی فصل کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس دن بسنتی یا زرد رنگ کی پوشاک زیبِ تن کی جاتی ہے اور پکتی ہوئی فصلوں کو مہکا رہے رچے بسے کھیتوں کے گرد یا باغ باغیچوں میں لڑکیاں گھومتی پھرتی ہیں۔ اس دن نئی فصل کا اناج پہلی بار استعمال کیا جاتا ہے۔ گیہوں اور جَو کی ادھ پکی بالیاں بھون کر دیوتاؤں اور بزرگوں کی نذر کی جاتی ہیں۔ آم کی منجری چڑھائی جاتی ہے۔ اکثر ہر قسم کے اناج کے نئے دانے ایک ساتھ ملا کر گھی اور گڑ کے ساتھ کوٹ لیتے ہیں اور ایک لذیذ مٹھائی سی بن جاتی ہے جسے بچے بوڑھے اور جوان سبھی مزے لے کر کھاتے ہیں۔

راوی: بسنت کے ساتھ ہولی کا چولی دامن جیسا ساتھ ہے

(موسیقی یکلخت اُبل پڑے اور مندرجہ ذیل بند ساز کے ساتھ گا کر پڑھے جائیں)

مغنی: کچھ طبلے کھڑکے تال بجے، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجے
کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجے
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھمی اور مرچنگ بجے
کچھ گھنگھرو چھنکے چھم چھم چھم، کچھ گت گت پر آہنگ بجے
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

مغنیہ: ہر جا گہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے، سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے، تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا، یہ رنگ دکھایا ہولی نے

(موسیقی کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہ کر بتدریج مدھم پڑتا جائے)

راویہ: ہولی کا یہ رنگین اور جھمکتا ہوا روپ ہمیں نظیر اکبرآبادی نے دکھایا۔ دراصل بسنت کو ہولی کی چھوٹی بہن سمجھنا چاہیئے۔ اس دن سے ہولی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ کہیں ابتدا شورازی کے دن سے ہوتی ہے۔ کچھ جگہوں پر ارنڈی کے پودے گاڑ دیئے جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے ان کے چاروں طرف ہولیکا کی صورت اُبھرنے لگتی ہے۔ چھوٹے بچے اور نوجوان روزانہ ادھر ادھر سے لکڑیاں، گھاس پھوس اور کاٹھ کباڑ جمع کر کے ہولیکا کی جسامت بڑھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ محلے اور گاؤں والوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے کہ ان کی ہولیکا اونچائی اور چوڑائی میں دوسروں سے بڑی ہو۔ اس عمل کے پیچھے یہ حکمت بھی کارفرما ہے کہ اس بہانے گاؤں گھر میں کوڑا کرکٹ نہ صرف صاف ہو جاتا ہے بلکہ اس کو جگہ جگہ جلانے سے فضا کی آلودگی بھی دور ہو جاتی ہے اور بارش کے موسم میں وباؤں سے حفاظت ہوتی ہے۔ شاد عارفی نے اس تمام سلسلے کو اپنی نظم ہولی میں نہایت خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

راویہ: (تحت میں) ماگھ سے کترا کے پھاگن کا مہینہ آگیا
چیت کے ماتھے پہ ہلکا سا پسینہ آگیا
فصل نے پک کر صدائے دعوتِ شیراز دی
رُت پھری پھر کر بہارِ باغ کو آواز دی
جوشِ فیضانِ نمو سے ہر کلی گدرا گئی
مسکراہٹ پھول سے بولی کہ ہولی آگئی

مغنیہ: (تحت میں) بھولے بسرے خواب کا جادو جگانے کیلئے
رات وہ آئی جو تھی ہولی جلانے کے لئے
وقت سے پہلے کشادہ چوک میں مندر کے پاس
ہار برچھیوں کے لائے لوگ بے حد و قیاس
سینکڑوں اُپلے امنڈ آئے تو لاکھوں لکڑیاں

ڈھیر بن کر رہ گیا ٹھٹھرا ہوا آتش نشاں
ہو گیا مقدار سے جب جمع ایندھن دوگنا
اک ہری لکڑی کے گرد اگرد ہاتھوں نے چنا
ایک نے منتر پڑھا کچھ، اور پڑھ کر آگ دی
آگ دم بھر میں بھڑک اٹھی کچھ ایسی لاگ دی
اُٹھ کے شعلوں نے لگائی لو جو دیپک راگ سے
شاخِ معلومہ کو جب کاروں نے کھینچا آگ سے
آتشِ نمرود سے پہنچی نہ ہولی کو ـــــ گزند
ہو گیا گلزارِ ابراہیم کا جھنڈا بلند

راوی: سبحان اللہ! کیسی دُھلی دُھلائی جیتی جاگتی تصویر ہے ہولیکا دہن کی۔ معلوم ہوتا ہے شاعر عارف کے ہاتھ میں قلم نہیں، کوئی بولتا ہوا کیمرہ ہے۔ پھر ہولیکا، نمرود، پرہلاد اور گلزارِ ابراہیم کو ایک دوسرے سے ہم آمیز کر کے خاطر خواہ نتیجہ برآمد کرنا بڑی مہارت کا کام ہے۔

راویہ: مختلف مذہبوں میں اِس طرح کی ملی جلی داستانیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مذہب بنیادی طور پر نیکی کا سبق دیتا ہے۔ جس طرح ظالم بادشاہ نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تھا، کیونکہ وہ نمرود کو خدا نہیں مانتے تھے۔ نتیجے میں حضرت ابراہیمؑ کا تو بال تک بیکا نہ ہوا، اُلٹے آتشکدہ گلزار بن گیا بالکل ویسا ہی معاملہ بھگت پرہلاد کے ساتھ پیش آیا۔

راوی: پانچ سالہ پرہلاد بھگوان کے بھگت تھے اور ان کا ظالم باپ ہرناکشیپ خود کو بھگوان سے بڑا مانتا تھا۔ پرہلاد نے اُسے سمجھانا چاہا تو ظالم بادشاہ نے خفا ہو کر اپنی بہن ہولیکا کو حکم دیا کہ وہ دہکتی ہوئی آگ میں پرہلاد کو لے کر بیٹھ جائے تاکہ پرہلاد بھسم ہو جائیں۔ ہولیکا کو وردان تھا کہ آگ اُسے نقصان نہیں پہنچائے گی لیکن اِس بار بھگت پرہلاد آگ سے زندہ سلامت نکل آئے اور ہولیکا بھسم ہو گئی۔

راویہ: چنانچہ اس واقعے کی یاد تازہ کرنے کے لئے اور انسانوں کو نیکی کی جانب مائل کرنے کیلئے ہولی کا تیوہار منایا جانے لگا۔

راوی: کچھ روائتوں کے مطابق راجہ یدھشٹر کے زمانہ میں ہستنا پور میں ایک ہولناک وبا پھیلی۔ راجہ یدھشٹر جب اس کی روک تھام میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے شری کرشن جی سے صلاح مانگی۔ شری کرشن جی نے بتایا کہ یہ وبا ہولیکا راکھشنی کے بد اثرات کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ شہر بھر میں لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی جائے۔ لہٰذا اِس دن کے بعد ہر سال لکڑیوں کے ڈھیر کو نذرِ آتش کرنے کی یہ روایت ہولی کے نام سے موسوم کی گئی۔

راویہ: بنگال میں اس روایت کا تعلق ایک راکھشش میدھاسر سے بتایا جاتا ہے جو شری کرشن جی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ چنانچہ آج بھی ہولی کے دن اس راکھشش کا پتلا جلایا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک اور روایت ہے اِس کے مطابق اِس روز شری کرشن جی نے پوتنا راکھشسنی پر فتح پائی تھی اور یہ تیوہار اس فتح کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

راوی: بعض لوگ ہولی کا تعلق آریوں کے قدیم کا موری تیوہار سے بتاتے ہیں۔ اس میں کام دیو کی پوجا کی جاتی تھی۔ غالباً اسی تعلق کی بنا پر ہولی کے موقع پر رنگ اور خوشبوئیں ایک دوسرے پر چھڑکی جاتی ہیں۔

(موسیقی ابھر آئے اور کچھ وقفے کے بعد مندرجہ ذیل نظم ساز کے ساتھ ترنم میں پڑھی جائے۔)

کورس: ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے
گلشن پہ رنگ و نور کی بدلی سی چھائی ہے
پودوں کو ہے خمار، ہوا پی کے آئی ہے
پھولوں کو دیکھئے تو عجب دلربائی ہے
رنگینیوں سے آج مری آشنائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے
کانٹوں کو بھی عبیر لگاتی ہوئی کلی
اُڑتا ہوا گلال فضا میں گلی گلی

ہر سمت ناچتی ہوئی مستوں کی منڈلی
منسٹی مغلظات ہیں، نغمہ سرائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

مغنّی : ہنستے ہیں یار لوگ حسینوں کے حال پر
کاجل لگا ہے کان میں سیندور گال پر
دس بیس کا ہجوم مٹھائی کے تھال پر
ٹیسو کی بالٹی پہ بھی زور آزمائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

کورس: رعنائیوں کی بات گلِ تر سے پوچھیئے
مستی کا حال بادہ و ساغر سے پوچھیئے
کیسا تھا سیلِ رنگ مظفر سے پوچھیئے
اشعار کہہ رہے ہیں کہ ہولی منائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

راویہ : سیلِ رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی یہ نظم ڈاکٹر مظفر حنفی کی تخلیق ہے۔ حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب کی ابتدا سے ہی صوفیوں اور سنتوں نے ہندوستانیوں کو آپسی بھید بھاؤ مٹا کر ہولی جیسے تیوہاروں میں برابر سے شرکت کرنے کی روایت قائم کر دی تھی۔ سات سو سال سے زیادہ پرانی امیر خسرو ؒ کی اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا سے عقیدت کا اظہار بھی ہولی ہی کی صورت میں ہوا ہے۔

(موسیقی میں پاکیزگی پیدا کر دیں۔ مندرجہ ذیل بند ساز کے ساتھ کلاسیکل انداز میں پڑھیئے)

مغنّی : دَیا رے موہے بھجو یارے لو
شاہ نجام کے رنگ میں لو
کپڑے رنگنے سے کچھ نہ ہوت ہے
یا رنگ میں مَیں نے تن کو ڈبو یا ہے

دَیا رے موہے بھجو یارے
وا ہی کے رنگ سے تن دے شوخ رنگ
خوب ہی مل مل دھو یارے
پیر نجام کے رنگ میں بھجو یارے

(موسیقی رفتہ رفتہ دھیمی ہو)

راوی : سبحان اللہ! ایک ایک لفظ اپنے پیر کے تئیں خسرو کی عقیدت جھلکی پڑتی ہے۔ یہ سلسلہ بھی خاصی دور تک گیا ہے۔ وارثیہ سلسلے کے اکثر شاعروں نے حتیٰ کہ حسرت موہانی جیسے ثقہ شاعر نے بھی خود کو گوپی اور اپنے پیر کو کرشن تصور کر کے اُن کے ساتھ خوب ہولیاں کھیلی ہیں حالانکہ امانت لکھنوی خالص دُنیا دار شاعر تھے لیکن اس روایت کا اثر ان کی ہولی پر بھی نظر آتا ہے۔

(مندرجہ ذیل نظم حسبِ سہولت ساز کے ساتھ ترنم میں یا تحت میں پڑھی جائے۔)

پہلی مغنّیہ: با لاگی کر جوری۔ شام موسے کھیلو نہ ہوری
گوئیں چراون میں نکسی ہوں ساس نند کی چوری
سگری چُنر رنگ میں نہ بھجوؤ اتنی سنو بات موری

دوسری مغنّیہ: چھین جھپٹ مورے ہاتھ سے گاگر
جور سے بہیاں مروری
دل دھڑکت ہے سانس چڑھت ہے
دیہہ کپنت گوری گوری۔ شیام موسے کھیلو نہ ہوری

پہلی مغنّیہ عبیر گلال لپٹ گیو مکھ پر ساری رنگ میں بوری
ساس ہجارن گاری دے گی بالم جنیا نہ چھوری
شیام موسے کھیلو نہ ہوری

دونوں گانے والیاں: پھاگ کھیل کے تم نے رے موہن کا گت کینی موری
سکھین میں اُستاد کے آگے ہوئیوں تھوری تھوری
شیام موسے کھیلو نہ ہوری

(موسیقی دھیرے دھیرے پس منظر میں لے جائیں)

راوی : امانت کی اس انتہائی دلچسپ، پُر تاثیر اور تلمیحاتی ہولی کے ساتھ پھر اودھ کی یاد آتی ہے جہاں کے عظیم المرتبت نواب آصف الدولہ نہ صرف خود اپنے درباریوں اور متعلقین کے ساتھ ہولی کھیلتے تھے بلکہ انہوں نے میر تقی میر جیسے عظیم شاعر سے اس جشنِ ہولی کی روداد مثنوی کی شکل میں منظوم بھی کرائی تھی۔

مغنی: (تحت میں) ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
رنگ افشانی سے پڑتی تھی بہار
رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
مرغ گلشن گل رخاں کو جان پھول
بیٹھے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہیں لال

راویہ: نواب سعادت یار خاں رنگین دربار اودھ کے ایک ممتاز رکن بھی تھے اور اعلیٰ پائے کے شاعر بھی جب خود نواب ہولی کے رنگوں کی بوچھار اڑاتا ہو تو پھر اس کے درباری کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ سعادت یار کا تو تخلص ہی رنگین تھا چنانچہ انہوں نے بھی اپنی نظموں میں ہولی کی مرقع کشی کے ساتھ محاکات کا جادو جگایا ہے۔

مغنیہ: (تحت میں) چلتی ہے دو طرف سے پچکاری مینہہ برستا ہے رنگ کا بھاری
بادل آئے ہیں گھر گلال کے لال۔ کچھ کسی کو نہیں کسی کا خیال
ہاتھ میں جس کے ڈال ہزارا ہے۔ ایک عالم کو اس نے مارا ہے
بھر کے پچکاری وہ جو ہے چالاک۔ مارتی ہے کسی کو دور سے تاک
اور اٹھا کر کسی نے بھاری گیند۔ کینٹھی میں کسی نے ماری گیند
اور مٹھی میں اپنی بھر کے گلال۔ ڈال کر رنگ منہ کیا ہے لال

راوی: جس دن ہولی جلتی ہے اس کے دوسرے دن رنگ اور پھاگ کھیلا جاتا ہے، اور اس دن سے بسنت کا پہلا مہینہ چیت شروع ہو جاتا ہے اِس زمانے میں بسنت رت جسے ہندوستان کا موسم بہار سمجھنا چاہیئے، اپنے شباب پر ہوتا ہے۔

راویہ: بھونروں کی گونج سے فضا مترنم ہو جاتی ہے آم کی منجر لوں سے ماحول مہکتا ہے، کھیتوں میں گیہوں، چنے مٹر، تلہن اور ارہر کی فصلیں پک کر کسانوں کے دلوں میں خوشی کے جذبات کو بیدار کرتی ہیں۔ ظاہر ہے

اس کا اظہار ہولی جیسے رنگین تیوہار کے وسیلے سے ہی ہو سکتا ہے۔

راوی: اس تیوہار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ راگ اور رنگ کے بغیر ہولی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عوام الناس کا تیوہار ہے۔ اِس میں پوجا پاٹھ، یا دوسرے مذہبی کاموں کی جگہ لوگوں سے ملنے جلنے، گانے بجانے، رنگ، گلال اور عبیر لگانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یار دوست، اقربا، اور رشتے دار مل جل کر کھاتے پیتے ہیں اور ہنسی مذاق کرتے ہیں۔

راویہ: یہ شاید واحد تیوہار ہے جس میں اونچ نیچ کی تفریق بالکل مٹ جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا، بڑی سے بڑی شخصیت کو رنگ بھی سکتا ہے اور اس کے ساتھ بے تکلفانہ مذاق بھی کر سکتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہولی کا اصلی مزا بڑے شہروں سے زیادہ گاؤں میں آتا ہے۔ سلام سندیلوی نے ہولی مناتے ہوئے ایک گاؤں کا نقشہ بڑے دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے۔

(ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ حسب سہولیت تحت یا ساز کے ساتھ ترنم میں)

کورس: ہولی آئی ہولی آئی، رنگ گلابی ساتھ میں لائی
بچے، بوڑھے، عورت، مرد، جوان سبھی پر لالی چھائی
پوری پکی، گوجیا نکلی، بنے سموسے، چڑھی کڑھائی
ڈھول بجاتے، ہولی گاتے، لوگ پھر رہے ہیں گاؤں میں
لے کر اپنی اپنی ٹولی۔ آئی ہولی۔ آئی ہولی
برس رہا ہے گلال سب پر، چاروں اور چلی پچکاری
کھیل رہے ہیں رنگ آپس میں، پیار سے دونوں نر اور ناری
لالوں لال ہیں کرتے، دھوتی، جوتے، ٹوپی، جمپر، ساری
سکھ، آنند، سنیہ کو لے کر، پریم کی دیوی کے پاؤں میں
آنکھ ہے اپنی جگ نے کھولی آئی ہولی، آئی ہولی

راوی: اور خوشیاں مناتی ہوئی ان ٹولیوں میں وہ برہن بھی شامل ہے جس کا ساجن اس ہولی پر پردیس سے گاؤں نہیں آسکا۔ اس برہن کے دلی جذبات بھی باسط بسوانی سے پوشیدہ

نہیں رہ سکے۔

مغنیہ: ہولی تن من پھونک رہی ہے، دور سکھی گردھاری ہے
دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے اور زخم جگر بھی کاری ہے
ہائے اکیلی کھیل رہی ہوں، ساری ڈوبی ساری ہے
خونِ تمنا رنگ بنا ہے، آنکھوں کی پچکاری ہے

راویہ: اکثر علاقوں میں تو رنگ کھیلنے کا سلسلہ ایک مہینے تک جاری رہتا ہے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو، اگر کوئی ایسا رشتہ دار مثلاً سالی، سلہج، بھابی، سمدھی، سمدھن، دیور، بہنوئی وغیرہ کسی تقریب میں جمع ہو جاتے ہیں تو آپس میں پھاگ کھیل کر ہولی کی یاد تازہ کر لیتے ہیں

راوی: اور ہندوستان کے سبھی حصوں میں تقریباً سبھی مذاہب کے ماننے والے شادی کے موقع پر اُبٹن ہلدی کھیل کر ایک طرح سے ہولی ہی مناتے ہیں۔

راویہ: اردو کی مختلف اصنافِ سخن میں ہولی کو جگہ ملی ہے مثلاً قصیدہ، مثنوی، واسوخت وغیرہ۔ اردو غزل بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ریاض مجید کہتے ہیں:

مغنیہ: (تحت میں) نیک سمے نے ہاتھ میں تیری چاہت کا کشکول دیا
رنگ چھڑکتی رُت نے ہم کو تیرے در کا فقیر کیا

راوی: مختار شمیم کی غزل کا شعر ہے:
سبز در سبز درختوں میں جلا آگ کا پھاگ
اُجلا اُجلا ہے مرے خواب کی تعبیر کا رنگ

راویہ: انور شعور کی غزل میں ہولی کا ایک روپ اُبھرتا ہے:
وہ رنگ رنگ کے چھینٹے پڑے کہ اس کے بعد
کبھی نہ پھر نئے کپڑے پہن کے نکلا میں

مغنی: اور امیر قزلباش کا یہ چلبلا شعر بھی ہولی کے مزاج سے کتنا ہم آہنگ ہے:
میں دور تھا تو اپنے ہی چہرے پہ مل لیا
اس زندگی کے ہاتھ میں جتنا گلال تھا

راویہ: بمل کرشن اشک فرماتے ہیں:
ایسا بھی کیا پیار کہ جس سے کل دنیا پیلی پڑ جائے ہو
کیسر آنچل آنچل دیکھوں، ہلدی دامن دامن ڈھونڈوں

مغنی: اور زیب غوری کی غزل میں رنگوں کی بھی ہوئی تھالی موجود ہے
زیب نہ بن نقال آئینہ، جیتی جاگتی آنکھیں کھول
اپنا ذہن اُتار کے رکھ دے، رنگوں کی اس تھالی میں

مغنیہ: شمس الرحمان فاروقی کا محبوب پرہلاد کی طرح آگ میں غسل کر کے نکھرتا ہے:
نازک ہے مثلِ ماہ مگر سرمئی بدن
اے جاں تجھے یہ کس نے دیئے غسل آگ کے

راوی: وزیر آغا کی غزل کا یہ شعر بھی اپنا الگ ذائقہ رکھتا ہے:
اُٹھے نہا کے شعلوں میں اپنے تو یہ کھُلا
دونوں جہاں میں پھیلی ہوئی تیری باس تھی

راویہ: انگلستان میں رہ کر بھی ساقی فاروقی کو اپنے وطن کا یہ تیوہار اس طرح یاد آتا ہے:
جانے یہ کون سی نیکی مرے کام آئی ہے
ورنہ یہ شعلۂ عصیاں تھا جھُلسنے والا

راوی: اور مظفر حنفی ہولی میں رنگوں کی بوچھار سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
کانٹے بھی خوب ہیں کہ سخاوت کے جوش میں
اپنا لہو گلاب کے چہرے پہ مل دیا

راویہ: اردو زبان میں اگر "دن عید، رات شب برات" جیسے محاورے اور کہاوتیں پائی جاتی ہیں تو "گھر میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا" بھی مستعمل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہولی کے موقع پر بے سروسامان اور مفلس عوام بھی خوشیاں منانے سے باز نہیں آتے۔

راوی: اس بے سروسامانی پر اردو کی صنف رباعی یاد آتی ہے جس کی جھولی میں لے دے کے کل چار مصرعے ہوتے ہیں لیکن

سلیم انصاری

ہجر کی پہلی رُت

مُجھے یاد آتا ہے
اِک دِن کسی نے
مرے بازوؤں کو پکڑ کر کہا تھا
مرے ہمسفر
میرے ننّھے فرشتے
مجھے چھوڑ کر
تو کسی دُور کے اجنبی شہر میں جب چلا جائے گا
مَیں تجھے
اپنی یادوں کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سجا کر رکھوں گی
اپنے ہونے کی خاطر
وہیں پا کر رکھوں گی
تو مگر شہر کی کھوکھلی رونقوں کی اندھیری گپھا میں
اُترتا چلا جائے گا
اپنے سیج سے مُکرتا چلا جائے گا
مَیں کہاں تک تجھے
ایک بے نام رشتے کی سچائیوں کے لئے
عُمر بھر قید کر پاؤں گی!!

دُرگا داس قاصرؔ

غزل

دم توڑ دیا ہجر میں گھبرا کے کسی نے
دیکھا نہ شبِ وعدہ مگر آ کے کسی نے
سب انجمنِ دہر میں بڑھا تک رہے ہیں
نیرنگ کہاں دیکھے ہیں دُنیا کے کسی نے
احباب کے احسان بہت ہیں مرے سر پر
پُوچھا بھی مرا حال مگر آ کے کسی نے
بھولے سے جو کی مَیں نے جفاؤں کی شکایت
شرمندہ کیا اَور بھی شرما کے کسی نے
معمول میں شامل تھا گو انکار و تغافل
جاں دے ہی دی لیکن یہاں گھبرا کے کسی نے
کیا حال بتائیں تمہیں ہم اہلِ عدم کا
بھیجی ہی نہیں کوئی خبر جا کے کسی نے
بھیجا ہے تسلی کے لئے موت کو قاصرؔ
شاید تجھے محتاجِ سکوں پا کے کسی نے

فراق کے یہاں رباعی بھی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔

(موسیقی اُبھرے اور تحلیل ہو جائے۔ بہت بھاری آواز میں مندرجہ ذیل دو رباعیاں پڑھی جائیں)

مغنی: پیکر ہے کہ چلتی ہوئی پچکاری ہے
فوارۂ انوارِ سحر جاری ہے
پڑتی ہے فضا میں سات رنگوں کی پھوار
آکاش نہا اُٹھتا ہے بلہاری ہے

دوسرا مغنی: جب پچھلے پہر پریم کی دُنیا سوئی
کلیوں کی گرہ پہلی کرن نے کھولی
جوبن رس چھلکاتی اُٹھی چنچل نار
رادھا گوکل میں جیسے کھیلے ہولی

(کچھ دیر تک موسیقی .... فیڈ آؤٹ)

منظر سلطان

نوحہ

وہ پیڑ
جس کے تلے ہم نے بیٹھ کر برسوں
گیان دھیان کی باتیں
سنی تھیں
سمجھی تھیں
عمل کی مشکل و دشوار رہ گذاروں پر
غم جہان کو
برتنے کا فن بھی سیکھا تھا

وہ پیڑ
جس کی گھنی چھاؤں کے تلے ہم نے
سلگتی دھوپ میں جائے پناہ پائی تھی
ہر ایک سمت فروزاں تھے شفقتوں کے دیئے
اندھیری رات کی تقدیر جگمگائی تھی

وہ پیڑ
جس کی گھنی ڈالیوں کے گھیرے میں
مشاہدات جہاں
تجربات روز و شب
شعور و فکر کی زندہ سبھائیں ہوتی تھیں

وہ پیڑ
جس کی جڑوں سے لپٹ کے راتوں میں
سکون و چین کی بنسی بجایا کرتے تھے
بدن کی ساری حرارت بھلا کے خوابوں میں
نئے دنوں کے گھروندے بنایا کرتے تھے

یہ کیا ہوا
کہ وہی پیڑ گر گیا منظر
نظر میں دھند بھرا آسماں
زمیں بنجر
اٹھاؤ ہاتھ
مصیبت میں ہم دعا مانگیں
سکون دل کو میسر ہو
اور کیا مانگیں ـــــــــ !!

افسانہ

راج شرما

اُفق کے اُس پار

"کتنے بجے ہیں؟" نقاہت بھری آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی جان پڑتی ہے۔ میں غنودگی کے بوجھ کو جھٹک کر مستعدی دکھاتا اُس کے سر کے پاس جھک گیا ہوں۔

"دو بجے ہیں" میں اُسے بتا رہا ہوں۔

اُس کی آنکھیں کچھ پل مجھے گھورتی رہتی ہیں۔ پھر وہ پلکیں مُوند لیتا ہے۔ مجھے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک عجیب رحم، دُکھ اور بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کے سر کے بال جُھلسے ہوئے ہیں۔ چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی کے بال جل چکے ہیں۔ ہاتھوں میں پٹیاں بندھی ہیں۔ چھاتی پر جلے ہوئے گوشت کے لوتھڑے دوائی میں لت پت، ٹانگیں جھلسی ہوئیں۔ اُس کے سارے جسم پر ڈاکٹروں نے دوائی لگا رکھی ہے۔ ایک عجیب سی سڑاند، بدبُو اور ڈیٹول کی ملی جلی سی ہوا کمرے میں پھیلی ہُوئی ہے۔

اُسے آنکھیں مُوندتے دیکھ، میں پھر اسٹول پر بیٹھ جاتا ہُوں۔ ناول اُٹھا لیتا ہوں۔ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر پڑھ نہیں پاتا۔ اُس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ پھر نگاہیں بھٹک کر کمرے میں دوسرے مریضوں کی طرف چلی جاتی ہیں۔ سب کرب کی کسی نہ کسی حالت میں ہیں۔ کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے تو کوئی درد کی شدت کو دبانے کی کوشش کرتا کرتا سونے کا بہانہ کر رہا ہے۔

"میں جل رہا ہُوں۔ ہائے، مجھے اِس آگ سے بچاؤ" وہ پھر سسک رہا ہے۔ میں اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سہلانے کی کوشش کرتا ہُوں۔

"صبر کرو، ہمت دکھاؤ، تم ٹھیک ہو جاؤ گے"۔ میرے مونہہ سے ڈھارس بھرے یہ الفاظ نہ جانے کیسے نکل جاتے ہیں۔

پاس کے مریض کا تیماردار اُس کی آواز سے اُونگھتے اُونگھتے جاگ گیا ہے۔ مجھ سے مخاطب ہے۔

"آج، اِن کے بھائی صاحب؟"

"ہاں، آج ہم نے اُنہیں گھر بھیج دیا ہے"

"آپ؟...... اِن کے ..... ؟؟"

"میرے دفتر میں ہی میرے ساتھ ہی کام کرنے والا، یہ میرا ایک دوست ہے۔"

"ہُونہہ" شائد اُس کی تسلّی ہو گئی ہے۔ وہ بھی شائد آج ہی اپنے مریض کی تیمارداری کے لیے رُک گیا تھا۔

ایک عجیب سے رشتے کا احساس ہو رہا ہے۔ ہسپتال میں، اِس کمرے میں، اِن مریضوں کے پاس۔ "ہائے، پانی" وہ پھر سسکی سی لیتا ہے۔

میں اُٹھ کر پانی کی پیالی اُس کے لب تک تھوڑا سا سہارا دے کر اونچا کرتے ہوئے اُس کے مُونہہ سے لگا دیتا ہوں۔ دو گھونٹ پانی اُس کے حلق سے نیچے اُترتا ہے۔ میں اس کے سر کو پھر سرہانے پر ٹیکا دیتا ہوں۔

میں اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اُس کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ سُننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے ماتھے کو سہلائے جا رہا ہوں۔

"گرمی، بہت گرمی لگ رہی ہے۔ مجھے، جسم جھُلس رہا ہے۔ میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔ اُسے کسی جواب، کسی ڈھارس کی پرواہ نہیں، ضرورت بھی نہیں شاید۔ وہ بڑبڑا رہا ہے۔

"یہ کون ہے؟ یہ حرامزادی، یہاں کیوں آئی ہے؟....." اُسکی آواز واضح ہے۔

"کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" وہی تیمار دار پوچھتا ہے۔ "تکلیف بہت جان پڑتی ہے۔

"ہاں!" میں اُس کے پہلے سوال کو گول کر جاتا ہوں۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے پہلے سوال کو دُہرائے، میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور اُس سے کہتا ہوں۔

"بھائی صاحب، ذرا دھیان رکھنا، میں ابھی آیا۔"

اندر سے باہر کاریڈار سے گزر کر کھُلی چھت پر آگیا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ رات اندھیری ہے آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں اور دُور ایک طرف شہر کی سڑک پر جل رہی ٹیوب لائیٹوں کی روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ میں تازہ ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو لمبے لمبے سانس لیکر بھرنا چاہ رہا ہوں۔ کمرے میں پھیلی بدبُو، میرے ذہن کو پریشان رکئے جا رہی تھی۔ پھر میں سگریٹ سُلگا لیتا ہوں۔ اپنے ذہن کو آرام کا احساس دینے کے لئے سگریٹ کا کش کھینچتا ہوں۔ دُھواں بکھیرتا ہوں۔ دُھوئیں کے چکر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ برآمدے میں لگی ٹیوب لائٹ کی مٹیلی سی روشنی میں دُھواں عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا محسوس ہوتا ہے۔

ایک چہرہ اُبھرتا ہے

"یار، بلڈر کی کے دوزخ سے نجات حاصل کرکے ہی رہوں گا۔"

"کیسے؟" میرا دل پوچھ رہا ہے۔ دل کی دھڑکن تو تام ہونا!

"میں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ رنگوں کی دوکان کھول رکھی ہے۔"

"تم ساڑھیاں بھی تو بڑی مارکیٹ میں بیچتے رہے ہو۔"

"ہاں اور اس سے پہلے لاٹری کی ٹکٹیں بھی! میں نے دوسرے بھائی کے ساتھ ایک چھاپہ خانہ بھی لگا لیا ہے، میرا ایک لڑکا رنگ والی دوکان میں حصّہ دار ہے اور دُوسرا چھاپہ خانہ میں۔ اِس کے علاوہ ایک بھائی کی جلد سازی کی دوکان پر رات کو کام کرتا ہوں۔"

"آخر، تم یہ سب کچھ کیسے کر لیتے ہو۔"

"میں دفتر کے اوقات سے پہلے اور بعد، یہی کچھ تو کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ جلدی ہی میں نوکری چھوڑ دُوں گا۔ آخر کب تک اِس دلدل میں پھنسا رہوں گا؟"

"تم نے تو دفتر سے قرضہ بھی لے رکھا ہے۔ وہ بھی تو....."

"اِس کا کیا ہے؟ ذرا کام چل نکلنے دو۔ پھر دیکھنا یکمُشت اَدا کر دوں گا۔"

خلا میں سایہ کو دیکھتا محسوس کرتا ہوں۔ سوچتا ہے غیرارادی طور پر، اِتنی بڑی بڑی باتیں اِتنے بڑے بڑے خواب! اتنے بڑے بڑے محل؟.....

"گھر تو بہُت دیر سے جاتے ہوگے!"

"ہاں، گھر جا کر کرنا بھی کیا ہے؟ چار لڑکے ہیں۔ ایک لڑکی ہے۔ بیوی کو اور کیا چاہیئے؟"

سگریٹ کے کش پر کش، دُھواں ہی دُھواں، خلا میں گھورتا ہوں۔ وہاں کوئی بھی نہیں۔ ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔

یہ جو بستر پر نیم جلی حالت میں پچھلے دس دِنوں سے پڑا ہے۔ یہ جو خواب دیکھتا ہے۔ یہ جس نے زندگی میں آگے بڑھنے اور کچھ بننے کی سوچی تھی۔ عمل بھی کیا تھا مگر؟....

اگر یہ نہ بچ سکا تو.....

میرا ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔

سگریٹ کے کش تیز ہو جاتے ہیں۔ میں اندھیرے کو گھورتا ہوں نظریں گھما کر برآمدے میں لگی ٹیوب لائیٹ کو دیکھتا ہوں، پھر برآمدے میں پھیلی روشنی کے سہارے اِس وارڈ کی طرف جھانکتا ہوں جہاں وہ بستر پہ پڑا ہے۔

پھر میرے دماغ میں اُس دوسرے مریض کے تیماردار کا سوال گھوم جاتا ہے۔ میں جواب گول کر گیا تھا مگر اب سگریٹ کا کش لیتے اندر بیٹھے کو جیسے بے بسی کو نگل جانا چاہ رہا تھا، گھورتا ہوں تو میرے دماغ میں اُس عورت کے نقوش صاف اُبھر آئے ہیں۔

درمیانہ قد کی عورت ہے۔ ایک عام عورت۔ آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے۔ پانچ بچوں کی ماں، جس کے والد نے پچھلے دنوں اسی جگہ کھڑے ہو کر کہا تھا "میری لڑکی کی زندگی، اِس آدمی نے دوبھر کر رکھی تھی۔ وہ بے چاری تو نرک بھوگتی رہی ہے۔ بھوگتی چلی آ رہی ہے۔ کتنی خوبصورت تھی جب اُس کی شادی ہوئی مگر ...... یہ آدمی۔ خیر اب تو یہ میری لڑکی کا سُہاگ ہے۔ بھگوان کرے، ٹھیک ہو جائے!!"

سگریٹ کی تلخی سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ موسم کی خنکی بھی اور پھر مجھے یاد آتا ہے کہ جب کبھی میں ان کے گھر گیا، میں نے اِس کی بیوی کو شکایت کرتے ہی سُنا۔

"گھر دیر سے آتے ہیں؟"

"کسی کی کوئی فکر نہیں!!"

"اپنے بھائیوں کو ہی کما کر دیں گے!!!"

اور جب وہ تلخ ہو کر کہتا "بڑے بھائی نے مجھ یتیم کو پالا۔ پڑھایا۔ نوکر کروایا۔ دوسرے بھائی نہیں پڑھ سکے تو کیا میں اپنا فرض بھول جاؤں اور تمہیں بھی تو ...."

"مجھے کیا؟" وہ تلخی سے کہتی، "میں تو صرف تمہارے بچے پیدا کرنے کے لئے ہوں بس" اُس کی زبان میں تلخی تھی۔ ترشی تھی۔ ایک تیزی، تلوار جیسی یا قینچی جیسی، جو کسی مہمان تک کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔

یہاں تو ہر روز کا یہی جھگڑا ہے۔ میری منزل بہت دُور ہے۔ اور یہ مجھے اِس چار دیواری میں قید کرنا چاہتی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے —

"آؤ، آؤ چلیں؟"

لگاتار سگریٹوں کے کش کھینچنا، نیند سے بوجھل مگر جاگنے پر بضد آنکھوں کو رُومال سے صاف کرتا ہوں۔ تخیل میں اُبھرے نقوش بکھر گئے۔ میں ہر ماحول کو دیکھ رہا ہوں۔ اِس ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ٹیوب لائٹیں لگی ہیں۔ گھاس کے میدان، جو دن میں مریضوں اور اُن کے تیمارداروں سے بھرے رہتے ہیں۔ اِس وقت خالی ہیں، بالکل خالی مگر خوبصورت سے لگ رہے ہیں۔ میں وہیں سے ہسپتال کے اِدھر اُدھر پھیلے وارڈوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ خاموشی ہے۔ کبھی کبھی کسی طرف سے رونے اور چیخنے کی آواز بلند ہوتی ہیں۔ شاید کوئی مریض دم توڑ گیا ہے۔ مگر پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے جھیل کے ساکت پانی میں پتھر کے گرنے سے ایک لمحہ کے لئے ہلچل پیدا ہوتی ہے مگر پھر پہلی سی حالت ...... ساکت، شانت غیر متحرک ....!

میں وارڈ میں واپس آ گیا ہوں۔ وہ بڑبڑا رہا ہے۔

"سالی، اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟"

میں اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ بڑبڑانا بند کر دے۔ ایک سایہ سا دیکھتا ہوں۔ وہ اِس بیڈ کے نزدیک آ رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں۔ اُس نے اپنے سر کو ایک میلی سی چادر سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ سایہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہے" میرا مختصر سا جواب ہے۔

"جل رہا ہوں۔" وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ اچانک، جیسے اُس نے میری آواز سُن لی ہو، وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ چھت کی طرف گھورتا سا لگتا ہے۔ وہ پھر گردن گھماتا ہے۔ میری طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگتا ہے۔ "دوزخ کی آگ کی باتیں کرتے تھے نا ہم، دس دن سے اُسی آگ میں جل رہا ہوں۔" اُس کی آواز میں لکنت سی آ گئی — "زندگی بھی تو نرک ہی تھی اپنی۔ دوزخ ہی تو تھا میں۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟ پھر خود ہی کہنے لگتا ہے "وہی ہوگی!"

میں ڈھارس دیتا ہوں۔ اُس کا ماتھا سہلانے لگتا ہوں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا" اس کی تسلی نہیں ہوتی شاید۔ "یہ مجھے آرام سے مرنے کیوں نہیں دیتی۔ جینے تو نہیں دیا اس نے" وہ کہہ رہا ہے — "میں نے پولیس کو کہہ دیا ہے کہ آگ اتفاقیہ سٹوو کے پھٹنے سے لگی تھی۔ مگر یہ سچ نہیں" میں اُس کے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔

وہ اپنے مونہہ کو آزاد کرانے کے لئے سر ہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں ہاتھ اُٹھا لیتا ہوں۔ وہ پھر کہنے لگتا دوسری دنیا میں

غزل

شہرت فتحپوری

شہر میں ننگِ آبرو ہم تھے
سب کا موضوعِ گفتگو ہم تھے

نیزہ نیزہ ہمارے سر تھے علم
سر سے پا تک لہو لہو ہم تھے

شعلہ شعلہ سرشکِ دیدۂ تر
آگ کی تھی، اک آبجو ہم تھے

جو صلیبوں پہ سنگسار ہوئے
وہ سزاوارِ آرزو ہم تھے

کون لیتا اسے ہمارے سوا
زہر کا آتشیں سبو ہم تھے

موت بھی آ کے شرمسار گئی
زندگی تیری آبرو ہم تھے



تو...... دوسری دنیا جو حدِ نظر سے پرے ہے! وہاں تو...
وہاں تو؟

دوسرا تیماردار اٹھ کر میرے پاس آگیا ہے۔ وہ اسکی حالت دیکھ رہا ہے۔

"اسکی حالت ٹھیک نہیں" وہ میرے کانوں میں کہتا ہے۔ "یہ آخری سنبھالا لے رہا ہے۔"

ساتھی تیماردار ڈیوٹی نرس کو بلانے چلا گیا ہے۔ میں اس کے ماتھے کو سہلا رہا ہوں۔ "وہ دیکھو وہ میرا پیچھا کر رہی ہے.... بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

گھڑی پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ پانچ بجے ہیں۔ صبح ہو رہی ہے روشنی مگر، مگر خاموش ہو گیا ہے۔ میں اسکی طرف دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنے پٹی بندھے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے یا شاید کسی کو پرے ہٹانے کی.....

پھر اسکا سر لڑھک جاتا ہے......

وہ مر گیا ہے۔

میرا دوست مر گیا ہے۔

ایک خواب ختم ہو گیا ہے۔ ایک محل گر گیا ہے۔ میں لپک کر باہر نکلتا ہوں۔ نرس آرہی ہے۔ میں اس کے ساتھ واپس وارڈ میں آگیا ہوں۔ اس کی آنکھیں بند کر دی ہیں۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتی ہے۔ بیڈ کے ساتھ لٹک رہے پیڈ پر کچھ لکھتی ہے، چند لفظ۔

پھر وہ سایہ لپک کر اندر آگیا ہے۔

وہ بدحواس ہے۔

وہ مفلوج سا لگ رہا ہے،

میں اس سے پوچھتا ہوں۔ "اب کہاں اطلاع دوں؟"

وہ کچھ نہیں بولتا.... شاید اب اس کے پاس بولنے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا۔

سانیٹ

منوہر لال ہادی

اَے مُسافر، آتما کے دیپ کی لَو کم نہ کر
ورنہ تجھ کو ہر قدم پر گھیرے گی تیرگی
یہ ستم گر چھوڑ دے گی تیری چشم کو کبھی
اِس دیئے کی پاسبانی ہے کٹھن تو غم نہ کر

تجھ کو بخشی ہے خُدا نے اپنی ضَو کی ایک بُوند
تاکہ آجائے تجھے خوں میں اُجالا گھولنا
کُو بہ کُو دیپک جلانے کے لیئے پر تولنا
اِس حقیقت کو سمجھ، غافل نہ رہ، آنکھیں نہ مُوند

اِس دیئے کی لَو کو اِتنا تیز کر، میرے ندیم
خود خُدا کو اِس کی تابانی پہ رشک آنے لگے
اَور مِری ظلمت گزیدہ آنکھ شرمانے لگے
من کے گلشن میں چلے بادِ صبا، بادِ نسیم
ضَو کا قطرہ پھیل کر ہو جائے بحرِ بیکراں
تیرا سینہ ہو بصیرت بیز، دِل شبنم فشاں

آزاد غزل

ڈاکٹر امر ونا قمر

تجھ سے ملنے کے اگر خواب کبھی مبہم ہو جائیں
غم بھی خوشیوں کی طرح کم ہو جائیں

پھیر لیں سب سے نظر
آکہ ہم دونوں بدلتا ہُوا موسم ہو جائیں

روز اِک دُوسرے سے گھنٹوں اُلجھتے رہنا
اِسی خواہش میں کہ ریشم ہو جائیں

ہم نے گھر چھوڑ دیا
شاید ہم لوگ بھی گوتم ہو جائیں

کوئی دِیوار گِرے
میں یہ دلدوز سماں دیکھوں تو آنکھیں مِری پُرنم ہو جائیں

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی

ہندوستان نے جہاں دوسری مایۂ ناز ہستیاں پیدا کیں وہاں ایک قابلِ قدر شخصیت رشید احمد صدیقی کی بھی ہے۔ دورِ جدید میں رشید احمد صدیقی کی ذات ایک خاص عظمت و اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے انشاء و ظرافت کا البیلا انداز پیش کر کے اُردو ادب کے دامن کو کافی وسعت بخشی۔ ان کا اسلوب، ان کی زندگی، مشاہدۂ تجربہ، انسانی و اخلاقی اقدار سے عبارت ہے۔ انہوں نے فکر و فن کے ایسے جلوے پیش کیے جہاں نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے اور اذہان ٹھہر جاتے ہیں۔ کرداروں کے نقشے اور جلوے ان کے فن کو جاندار، شاندار بلکہ زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ رشید صاحب نے جس جس طرح سے اُردو کی خدمت کی اُس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی ادبی کارنامے رشید احمد صدیقی کو شہرتِ عام کا خلعت اور بقائے دوام کی سندِ عزت عطا کرتے ہیں۔ رشید صاحب کی ذات پر اقبال کا یہ مصرعہ "جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب" صادق آتا ہے

رشید صاحب ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ جونپور کے ایک قصبے "مریاہو" کے رہنے والے تھے۔ پورب کا علاقہ مردم خیز علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں صدیوں تک علم و ادب کی شمع روشن رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد رشید صاحب علی گڑھ تشریف لائے۔ بی۔ اے کے بعد فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ طالب علمی کے دوران وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سیکریٹری رہے۔ اور اس زمانے میں انہوں نے مضامین لکھنے بھی شروع کیے۔ علی گڑھ منتھلی کا (جو بعد میں علی گڑھ میگزین کہلایا، اس زمانے میں اُردو کے مؤقر رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔) رشید صاحب عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اُردو ادب میں ایسے نثر نگار کم ہیں، جو زمانۂ طالب علمی ہی میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہوں۔ ان میں رشید صاحب کا نام ممتاز ہے۔

رشید صاحب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اُردو کے لیکچرار ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی میں شروع شروع میں اُردو صرف بی۔ اے میں لازمی تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ایف۔ اے اور بی۔ اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اُردو شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں رشید صاحب اُردو کے ریڈر ہوئے۔

طنز و ظرافت کے میدان میں رشید احمد صدیقی اپنی عدیل و نظیر نہیں رکھتے۔ ان کے تجربات میں وسعت اور ہمہ گیری ہے اور وہ مزاح پیدا کرنے کے اُن تمام وسائل پر پوری قدرت رکھتے ہیں جن کے ذریعہ مزاح پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مختلف النوع افراد، جماعتوں اور پیشوں کے حالات سے صحیح واقفیت رکھتے ہیں اور ان کی بوالعجبیوں کو اپنے مزاح اور تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولوی، پروفیسر، شاعر، مشاق، روشن خیال بیوی، وکیل، گواہ، فلسفی، چور، فنکار اور مقرر خاص خاص کردار ہیں جن کے قول و عمل تنافر اور تفاوت کو وہ مضحکہ خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔

رشید صاحب کے یہاں شوخی کے ساتھ ساتھ بھرپور

ظرافت بھی نظر آتی ہے۔ مگر اس ظرافت اور طنز کا معیار بہت بلند ہے۔ دیکھنے والا اسے شوخی سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر غور کرنے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ رشید صاحب نے سوسائٹی کی دکھتی رگوں پر نشتر لگائے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ پتہ نہ چلے۔ یہ شوخی سنجیدگی کے ساتھ اس طرح دست و گریباں ہے جیسے گلاب کے پھول اور کانٹے آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں

رشید صاحب مزاحیہ تاثرات کی تشکیل کے لئے مختلف وسائل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی سہ حرفی صنعت (ALLITERATION) کے بہت دلدادہ ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں اس صنعت کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ بذاتِ خود یہ صنعت مزاح کا موجب نہیں بن سکتی، لیکن جب ایک مخصوص سیاق و سباق میں استعمال کی جاتی ہے تو نتیجہ حسب دلخواہ برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً ذیل کے جملوں کو پڑھئے، جن میں مزاح کا مدار سہ حرفی صنعت سے کام لینے میں ہے تو کہیں ایک ہی لفظ کو مختلف مفہوم میں استعمال کرنے پر۔ بہر حال الفاظ کی صوتی حیثیت غور طلب ہے۔

" ہوس کی کوئی نہ کوئی حد ہونی چاہیئے۔ بصورتِ دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گذر جائے۔"

" ایک دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔"

" قوم کو خطرے میں پاتے ہیں تو چندہ وصول کرکے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں اس لئے کہ روپیہ پیسہ خطرے کی چیز ہے، جس کے پاس ہوگی، وہ خطرہ میں ہوگا۔"

کسی چیز کو بگڑتے دیکھ کر، کسی شخص کی ہیئت کذائی کا مشاہدہ کرنے یا بعض اوقات ایسے افعال کے سرزد ہو جانے سے جو ہماری توقع اور ہمارے معمول کی شکست کریں، ہمیں بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے لیکن اِس قسم کی ہنسی میں بھی اعتدال، ضبط اور خوش مذاقی کو برقرار رکھنا اچھے مزاح نگار ہی کا کام ہے۔ رشید صاحب کے یہاں اِس کے بعض نمونے دیکھیے۔

" ان میں سے بعض ایسے فربہ تھے کہ خیال آیا کہ شاید ایک نہیں دو ہوں۔ اس لئے ایک طرف مڑ کر دیکھنے لگا کہ کہیں ان کے پیچھے بھی تو دو ہاتھ اور دو منہ نہیں ہیں

کیونکہ اس قسم کی چیز ہندوستان میں کسی زمانے میں پائی جاتی تھی۔"

" ہمارے محلہ کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اِس کی چیخ نکل گئی ہے۔"

" مجسٹریٹ صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اور بیگموں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا اِس لئے وزن میں مزید اضافہ ہوگیا۔"

رشید صاحب کا مزاح نگاری کا فن کرداروں کی پیشکش میں بڑی آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ کرداروں کے نئے نئے نمونے پیش کرتے ہیں، جو جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے مخصوص افراد کی کمزوریوں کا خاکہ نہ اُڑایا ہو۔ ان کے نگارخانے میں ہمیں بعض تصویریں بڑی دلچسپ نظر آتی ہیں۔ ایسے مطالعے بہت قریب کے مشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مزاحیہ نگار ایسے مرقعے پیش کرنے میں قدرے بے رحمی برتتا ہے اِس لئے کہ تخلیقی عمل کے دوران وہ ہمدردی اور جانبداری کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے، تو مزاح پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

" مولانا سہیل سے میری ملاقات ۱۵ء میں ہوئی اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کا الیکشن لڑتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب سنتے ہیں صرف مقدمے لڑاتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا ایسی ہو اُس کا انجام یہ کیوں نہ ہو۔"

رشید احمد صدیقی اونچے طبقے تک محدود ہیں۔ وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ عوام کی خوشی کی خاطر کہاں تک اپنی خوشی اور اپنے ذوق کو کچل کر آسان لفظ استعمال کئے جائیں۔ مضامینِ رشید میں بے شمار جملے ایسے ملتے ہیں جو مصنف کی بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور جنہیں پڑھ کر بیک وقت ہنسنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

" عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں، جو نہ تعزیراتِ ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے.... انگریزوں کو آئی سی۔ ایس نے خراب کیا اور

عشاق کو شعرا نے ۔"

"کرسمس کا زمانہ تھا، جب انگریز کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا ہے ۔"

"کسی منچلے کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے، جتنا کسی پبلک مشاعرہ میں بھلے مانس شاعر کا کلام سُنانا ۔"

رشید احمد صدیقی مُردوں سے خوف نہیں کھاتے لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں ۔ انہوں نے ہر زندہ انشاء پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے، خوب تعریف کی ہے ۔ اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا دبی زبان سے کوئی جملہ کہہ بھی دیا ہے تو جھٹ اس کی پیٹھ بھی تھپک دی ہے تاکہ وہ چیں بہ جبیں نہ ہونے پائے ۔ اس طرح رشید صاحب نے مُردوں کو اپنا ہیرو بنایا ہے اور ان کی زندگی کے نقوش سے اپنے فن کو اُجاگر کیا ہے ۔ رشید صاحب کے قلم میں وہ جادو ہے کہ انہوں نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے اور اُنہیں حیاتِ جاوداں عطا کر دی ہے ۔ یہ مسیحائی ان کے اسلوب اور مرقع نگاری نے کی ۔

رشید احمد صدیقی نے نصف صدی تک زندگی کے لاتعداد کرداروں کو ان کے ہر رنگ روپ میں دیکھا ہے اسی لئے ان کے یہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ، تجربے کی صداقت اور تازگی بھی اُبھری ہے ۔ مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے اپنے افکار کو قارئین پر لادنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باتوں باتوں میں غیر رسمی طور پر، ان کا اظہار کیا ہے ۔ اسی لئے ان کا تاثر بھی شدید ہے ۔ رشید صاحب کے یہاں فکر کی گہرائی، اسلوب کی تازگی، اور تجربے کی صداقت کا اندازہ ان کی تصنیف "ہم نفسانِ رفتہ" کے ان چند جملوں سے لگایئے :

"انسان کی سیرت اور شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھُلتا ہے، کہیں اور نہیں کھُلتا ۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمع قائم نہیں رہ جاتا ۔"

"جب تک کوئی معلّم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیئے ۔"

"علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی، طلبا کے ہاتھوں کبھی سُننے میں نہیں آئی تھی ۔ اب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا ۔ اگر ایک عالِم کی موت عالَم کی موت ہے، تو ایک عالِم کی بے حرمتی کو کیا کہیں گے ۔"

"کسی آدمی کے بڑے ہونے کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے ۔"

"آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کُن ہوتی ہے ۔"

ان چند اقتباسات کے مطالعہ سے رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے بہت سے پہلو نظر کے سامنے اُبھر آتے ہیں، جس سے یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کشادہ نظری کے ساتھ ساتھ کشادہ دلی کی بھی فراوانی ہے ۔

اختصار اور جامعیت رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا جوہر ہے ۔ اپنے اکثر مضامین میں وہ ایک کارٹونسٹ کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے پُر اثر اور دلچسپ اسکیچ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ وہ خاص مواقع اور واقعات کی تصویر ہی نہیں کھینچ دیتے بلکہ اُنہیں نظروں کے سامنے متحرک کر دیتے ہیں ۔ کفایتِ الفاظ ان کی نثر نگاری کی خاص صفت ہے ۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں معنویت کی ایک وسیع دُنیا آباد دکھائی دیتی ہے ۔ چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

"ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے ۔ اکثر شفاخانے میں، ورنہ جیل خانے میں ۔"

"شاعر کا گویّا اور گویّے کا شاعر ہونا کوئی اچنبھے کی بات ہے، نہ بُری بات ۔ صرف بات کا پھیر ہے ۔"

"اخبار نویس کو بعض حواس کی بالکل ضرورت نہیں

ہے۔ مثلاً آنکھ اِس کے لئے بالکل زائد ہے،
اِس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔"

رشید احمد صدیقی کے طرزِ تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتیں معنی و مفہوم کے اعتبار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے شخصیت کے وہ گوشے بھی نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جو بعض اوقات سیرت کے کمزور پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اِس سے اِس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں میں کتنے اٹل اور اپنی بات کے اظہار میں کتنے بے باک ہیں۔

رشید صاحب سیاق و سباق کی تبدیلی سے ترسیل و اظہار کے لطیف پیرائے پیدا کرنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ لفظوں کے اچھے نبّاض اور رمز شناس ہیں۔ ان کے یہاں خیال کی لالہ کاری بڑی حد تک لفظوں کے حُسن اور فقروں کی جادوگری کی رہینِ منت ہے۔ بے ساختہ، رواں، دلنشیں اور خوبصورت اندازِ بیان نے ان کی مزاح نگاری میں جان ڈال دی ہے۔

مزاحیہ مضامین میں اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کی خاص اہمیت ہوتی ہے اس لئے کہ ظریفانہ تحریروں میں مزاح کا انحصار بڑی حد تک الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی برمحل نشست پر بھی ہوتا ہے۔ اگر مزاح نگار برجستہ اور موزوں الفاظ کا انتخاب نہ کر سکے، بلیغ فقروں اور لطیف اشاروں سے کام نہ لے، تو ممکن ہے کہ بسا اوقات وہ مضحکہ خیز واقعات اور مواقع کو بھی ظریفانہ رنگ دینے سے قاصر رہے۔ رشید صاحب کی ظرافت کا انحصار واقعات کی ترتیب اور ان کے محل وقوع کے ساتھ ساتھ مصنف کے تبسم ریز فقروں، اسلوب کی گدگداہٹ اور مخصوص لفظیات پر بھی ہوتا ہے۔ وہ ضرورتاً مزاحیہ الفاظ ڈھال بھی لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم کو "بیمہ کا ایجنٹ"، "اگر ڈاکٹر نہ ہوتے"، "اگر میں فاؤنٹین پین ہوتا"، "ایڈیٹر" اور "پاسبان" سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے الفاظ اور ترکیبیں وضع کرنے میں انہوں نے عربی اور بالخصوص فارسی سے بہت مدد لی ہے۔ وہ اپنے دور کے ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں، جن کی تقلید آسان نہیں۔

رشید صاحب کے اسلوب میں غالبیات نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ کسی شاعر کے کلام سے لوگوں نے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا کہ انہوں نے غالبؔ سے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب میں کلامِ غالبؔ سے خوشہ چینی کرتے ہوئے غالبؔ کی ترکیبوں کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ، ان کی تراکیب، ان کا طرزِ ادا اور ان کا حُسنِ بیان رشید صاحب کی تحریروں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

رشید صاحب کے موضوعات علمی نہیں ہوتے بلکہ زندگی سے براہِ راست متعلق ہوتے ہیں۔ وہ انشائیے کے تحت آتے ہیں۔ ان میں تحقیق نہیں بلکہ مطالعۂ افکار، مشاہدات اور تجربات کا خزانہ ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تجربات کے جواہر ریزے ستاروں کی طرح بکھرے ہیں۔ وہ کسی شئے یا شخصیت کے بارے میں اتنا ہی لکھتے ہیں جتنا وہ اس سے واقف ہیں۔ ان کے مضامین اور شخصیات کے مرقعے، سب میں تجرباتِ زندگی کی روشنی کارفرما نظر آتی ہے۔ دورِ جدید میں ایسا عظیم انشاء پرداز اور منفرد صاحبِ اسلوب ادیب مشکل ہی سے نظر آئے گا۔

غزلیں

ساحل احمد

زرد فرشتہ لگتا ہے
موسم سچّا لگتا ہے
گردِ کدورت اڑتی ہے
شہر پرایا لگتا ہے

لمس تمہارے ہاتھوں کا
ریشم جیسا لگتا ہے
آنسو جلتی آنکھوں میں
دکھ کا گہنا لگتا ہے
طور طریقہ موسم کا
ایک مُعمّا لگتا ہے

زہر موسم کا پیوں گا میں بھی
خود بدن سبز رکھوں گا میں بھی
گر یوں ہی رنگ ڈسے گا مجھ کو
خود وہی رنگ بنوں گا میں بھی
جب تلک زخم رہے گا تازا
یاد دشمن کو کروں گا میں بھی
میں تو کچّا سا مکان ہوں ساحلؔ
اب کے بارش میں ڈھوں گا میں بھی

قمر سنبھلی

تمام عمر کا حاصل، وقار کھو بیٹھا
وہ آبِ آئینۂ اعتبار کھو بیٹھا
زباں سے حرفِ صداقت نکل گیا شاید
ہنر وروں میں وہ اپنا وقار کھو بیٹھا
نہ بچ کے آ سکا خوش فہمیوں کے جنگل سے
ردائے سر کا وہ ایک ایک تار کھو بیٹھا
نہ سمجھا کوئی بھی میری شکستگی کا سبب
میں اپنی ذات سے راہِ فرار کھو بیٹھا
ہے آج نجم و قمرؔ پر تو دسترس میری
خود اپنے دل پہ مگر اختیار کھو بیٹھا

رؤف خوشتر

پچپن ۵۵ کے دِن بھی . . .

آزادی ملتے ہی سعادت مند والد (بیچارے) اپنے اپنے بچوں کے متعلق بڑی آزادی سے سوچنے لگے تھے کہ اب اُن کے سوچنے پر کوئی پابندی نہیں، ہر کوئی اپنے فرزندِ دلبند و بے عقلمند کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے پر تُلا ہُوا تھا۔ (شاید اُن کو علم ہو گیا تھا کہ آزاد مُلک میں ڈاکٹر اور انجینئر ہی مزے سے رہ سکیں گے۔)

اُس زمانے میں ڈاکٹر یا انجینئر سازی کا مرض اتنا عام ہو گیا تھا کہ ہمارے پسر ناشناس والد صاحب بھی اس متعدی بیماری کی لپیٹ میں آگئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن ہم سے مشورہ کئے بغیر (باپ جو ٹھہرے) اعلان کر دیا۔

" اب ہم اپنے کالے کو بھی ڈاکٹر بنا کر ہی دم لیں گے "۔

اُن کو اِس اعلان سے کون روک سکتا تھا۔ پہلی بار دستور میں اظہارِ خیال کو آزادی سے خطرہ محسوس ہُوا تھا۔ پھر ہمیں ڈاکٹر بنانے کا مرض اب اُن کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ ہمیں ممتاز و مصروف (خانگی ٹیوشن اور غیر تدریسی کاموں میں) اساتذہ کے پاس ایسے گھسیٹ کر لے جاتے جیسے کوئی قصائی کے پاس بکرے کو لے جاتا ہے۔ اساتذہ حضرات اپنی مصروفیت (دہی کوچنگ) میں سے کچھ وقت نکال کر ہمیں ٹھونک بجا کر (بلکہ ابا کی جیب بجا کر) اطمینان کر لیتے اور اپنے حلقہ میں شریک کر لیتے۔ اس طرح ہم ٹیوشن بالجبر جھیلتے رہے ــــ اور دبے لفظوں میں کہہ بھی دیا کہ ہم ڈاکٹر تو کیا مریض بھی نہیں بن سکتے۔ لیکن سُنتا کون تھا۔

لہٰذا پُوری ایمانداری اور تندہی سے ڈاکٹر نہ بننے کے لئے اپنی نااہلیت و ناقابلیت کے ریکارڈ ہر مارکس کارڈ پر ایچ۔ ایم۔ ڈی ریکارڈوں پر رُخِ سگ کی طرح لفظ فیل FAIL لازماً لکھوانے کی صورت میں قائم کر کے اپنے ذہن میں یُوں سمجھتے کہ ڈاکٹر بننے سے بچنے کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہے تھے۔ لیکن والد صاحب کب ہار ماننے والے تھے اُن کا استدلال کہ یہ لال تو ڈاکٹر بن جائے کیوں کہ وہ ڈاکٹر بنتے بنتے رہ گئے تھے (کاش کہ بنتے) بقول اُن کے اُس وقت نہ مریض زیادہ تھے نہ مرض۔ نہ مواقع تھے نہ میڈیکل کالج۔ اس لئے وہ ڈاکٹر بننے کی بجائے تحصیلدار بن گئے اور ساری نوکری رشوت اور بالائی آمدنی کے بغیر گذار دی اس لئے تحصیلدار اور دُوسرے زرخیز عُہدوں (صدر بلدیہ) پر فائز ہونے کے باوجود اُن کی زندگی ایک مکان ایک بیوی اور ایک سائیکل سے عبارت ہے۔ جی ہاں بعض لوگ صحت مند جسم کے علاوہ صحت مند ضمیر بھی رکھتے ہیں۔ وہ اُس شاندار نسل سے تعلق رکھتے ہیں ـــ جو حُبِّ وطن سے سرشار ہوتی تھی۔ اب تو حُبِّ دہن اور حُبِّ بدن کی بھرمار ہے۔

خیر والد صاحب ہر روز ایک سیب نہ کھاتے ہُوئے بھی ڈاکٹر سے دُور رہیں اور یُوں عملی طور پر انہوں نے انگریزی کہاوت : (An Apple a day, makes man doctor away) (روزانہ ایک سیب کھائیے اور ڈاکٹر سے دُور رہیئے) کو غلط ثابت کر دیا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ہمیں

ڈاکٹر بنانے پر مُصر تھے۔ اور یُوں اُن کی ادھوری خواہش وراثت کے طور پر ہمارے ناتواں کاندھوں اور دماغ پر آ گری۔

جب ہم جیسے تیسے اور پیسے "تاک جھانک اور کئی مراکز کی خاک پھانک کر بھی میٹرک درجہ اوّل میں کامیاب نہیں ہو پائے تو محلہ کے لوگوں نے اطمینان کی سانس لی کہ وہ ہمارے ہاتھوں بے موت مرنے سے بچ گئے (بعض تو اسی خوشی میں مرنے لگے تھے کہ ہمارا میڈیکل میں داخلہ نہیں ہو سکا) ادھر ہم بھی خوش ہوئے کہ انجکشن اور دوائیاں ہم سے دُور رہیں گے۔

پھر ابا نے دُوسرا اعلان کر دیا کہ ہم میں حیوانات کے ڈاکٹر بننے کے جراثیم زیادہ ہیں۔

ہم نے کہا۔ کہیں آپ اس لیے تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ بچپن سے ہمیں اُلو۔ گدھے۔ بندر (بعض جانوروں کے نام ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر ہیں) جیسے القاب سے نوازتے رہے ہیں؟ یا پھر ہماری گھوڑ اور بھینس دوڑ سے آپ ناراض تو نہیں؟ یا پھر ہماری طوطے اور کبوتر بازی و مُرغ بازی آپ کی نظروں میں کھٹک رہی ہے؟ دیکھیے خُوشی اور کھیل کے چند بے ضرر لمحات ان معصوموں اور بے زبانوں کے ساتھ گذارنا اور بات ہے ڈاکٹر بن کر علاج کرنا اور بات ہے۔ رہی عقائد کی بات تو ہم کو ڈارون کی تھیوری پر رتی برابر بھی ایمان نہیں"۔

"وہ ہمیں چمکارتے ہوئے کہنے لگے "چل بندر کہیں کے"۔ پھر ہانکتے ہوئے اپنے دوست کے پاس لے گئے جو حیوانات کے ڈاکٹر تھے تاکہ ہم وہاں رہ کر حیوان شناس حیوان مزاج اور ماہرِ حیوان علاج ہو جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کا مکان ایوانِ حیوانات ثابت ہو رہا تھا۔ مکان میں فرنیچر پر ہرنوں اور شیر چیتے کی کھالیں تھیں باہر کا منظر صحن کے بغیر ہی صحنِ داؤدی لگ رہا تھا۔ جہاں لاغر گھوڑے بیمار بھینس، لاچار گائیں بندھی ہوتی تھیں۔ ہمیں پہلی رات ہی جانوروں کی آوازوں سے بُخار آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرغوں کی دوا دیکر ہمیں سُلایا۔ نتیجہ میں ہم مُرغ کے ساتھ ہی علی الصبح جاگ گئے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب کہنے لگے میاں انسانوں کے ڈاکٹر سے کہیں اچھا ہے کہ جانوروں کے ڈاکٹر بنیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیں تنگ نہیں کرتے۔ ہمارے علاج کی شکایت نہیں کرتے اور یُوں بھی اِن دِنوں انسانوں اور جانوروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اپنی بھینس کی شکایت کی۔ کہ وہ عجیب عجیب حرکتیں کر رہی ہے اور چلاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوائی دے کر آہستہ سے کہا کہ بھینس کے علاوہ گھر والی کو بھی دے سکتے ہو۔

پھر ایک خاتون تشریف لائیں اور اپنے پالتو طوطے کی شکایت کی اور دوائی طوطے اور شوہر کے لیے لے کر گئیں۔

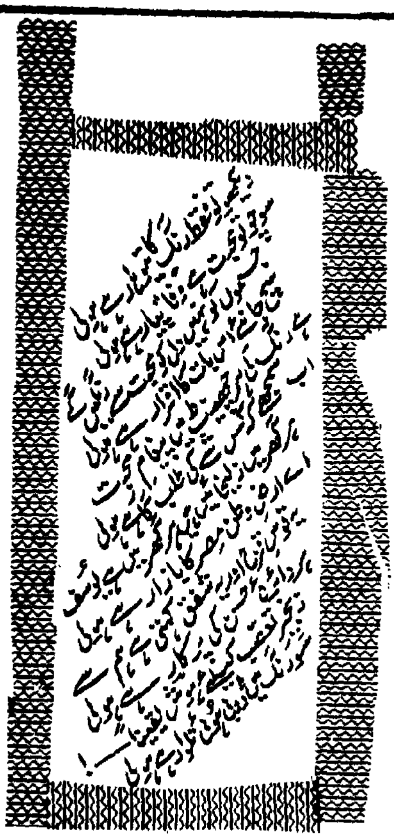
ایک دن ایک شخص کُتے کو گود میں لیے آیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب میرے لال کو دیکھیے کیسے پیلا پڑ گیا۔ اس کے بغیر مَیں زندگی گزار نہیں سکتا۔ میرا سب کچھ یہی ہے"۔

"کیوں بھائی اس میں کیا بات ہے۔ یہ سگ تمہارا سگا تو نہیں؟"

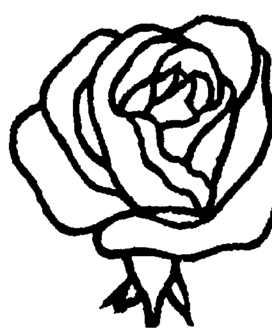
"صاحب سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی بچپن ہی میں کُتوں سے چڑ تھی اور سگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل" والی بات پر کاربند تھا لیکن یہ معمولی کُتا نہیں ہے۔ اِس کی رگوں میں شاہی خاندان کے کُتوں کا خون دَوڑ رہا ہے۔ جارج ہفتم کے کُتوں میں سے ایک سگ اس کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ کبھی میں آپ کو اس کا حسب و نسب اور شجرہ بتاؤں گا جو سنہری حرفوں میں لکھ کر ڈرائینگ رُوم میں سجایا ہے"۔

پھر ایک صاحب بیمار گھوڑے کو ساتھ لائے ۔ انہیں ملال تھا کہ اُن کا لال ریس سیزن میں بیمار ہو گیا۔ انہوں نے بھی روتے ہوئے وہی کہا جو کُتے والے صاحب نے کہا تھا۔ یہاں بھی حسب و نسب اور شجرہ بیان کیا جا رہا تھا کہ کیسے اس کے آبا و اجداد نے جیک پاٹ حاصل کر کے ہزاروں کو لاکھوں روپے دلوائے تھے۔ تو لوگ اپنے حسب و نسب کو چھوڑ کر اپنے شجرہ کو شجرِ ممنوع بنائے ہوئے ہیں اور اپنے جانوروں کا شجرہ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

پھر تو ہمیں اس سگ پرستی، اسپ نوازی گریہ و گریہ سے گھن آنے لگی اور ہم وہاں سے فرار ہونے کے لیے ایسی غیر طبعی حرکات کرتے رہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بیمار پڑ گئے۔ جب ہم نے ان کا علاج خود اُن کی دواؤں سے کرنا چاہا تو وہ بھلا کر بولے۔



ہوک



ہوش نعمانی

"کیا میں میری دواؤں کو نہیں جانتا۔ وہ تو بے زبان جانور بنا کر ملکِ عدم کی طرف چُپ چاپ کُوچ کرتے ہیں۔ تو کیا تم مجھے بھی میری دوا پلا کر ...... نہیں نہیں تم اسی وقت گھر سے چلے جاؤ۔"

تو صاحبو! یُوں "بڑے با آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے" گنگناتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے مطب سے نکلے اور سیدھے گھر آئے۔ ابا سے کہہ دیا کہ نہ ہم ڈاکٹر بن سکتے ہیں اور نہ ہمیں بننا ہے۔

پھر آرٹس کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ڈگریاں لے کر پیشہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور مریضوں کی بجائے طلباء سے پوچھتے ہیں۔ ع

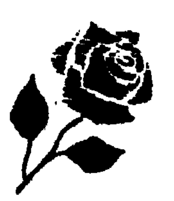
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ان پُرانے دِنوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہم ہر صبح ریڈیو کھول کر پُرانی فلموں کے نغمے سُنتے ہیں اور کھو جاتے ہیں اس حسین دور میں اور کہتے ہیں:۔ ؎

یادِ ماضی کباب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے عارضہ میرا

ویسے اپنی زندگی میں سُکھ ہے چین ہے اور سکون ہے۔ لیکن ان دِنوں کی یاد آتی ہے جب ۱۹۵۵ء میں ہمارا معصوم بچپن رُخصت ہو رہا تھا اور لڑکپن آ رہا تھا، جب خالص گھی، خالص روپیہ اور خالص خلوص کی طرح وہ ہمارا مسرت! ہنگاموں سے بھرپور کھلنڈرا دَور یاد آتا ہے تو ہم بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں۔

بچپن کے دِن بھی کیا دن تھے



آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

پس نوشت

ماسٹر اُلفت رائے نے خط ختم کیا گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے! باپ رے!! وہ کئی دن سے یہ کام مُلتوی کرتے آئے تھے وقت ہی نہ ملتا تھا انہیں۔ لوگ نوکری سے ریٹائر ہوتے ہیں تو اُن کا وقت نہیں کٹتا۔ یہاں اس کے بالکل اُلٹ تھا انہیں تو اب قطعاً فرصت ہی نہ ملتی تھی صبح سے رات تک دُکان پر لوگوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا دن میں صرف دو تین گھنٹے کھانے اور آرام کے لئے نکال پاتے تھے لیکن اگر اُس وقت بھی کوئی آواز دیتا اور مسئلہ فوری نوعیت کا ہوتا تو وہ 'نہ' نہیں کہتے تھے، کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ تیس سال وہ اسی گاؤں میں مُعلم رہے تھے یہاں کا پرائمری سکول شروع ہی اُن کی زیرِ نگرانی ہوا تھا اور وہ بطور ہیڈ ٹیچر کچھ سال پہلے یہاں سے ہی سبکدوش ہوئے تھے۔ یُونانی حکمت اُنہیں وراثت میں ملی تھی اُن کے باپ دادا بے حد شُہرت یافتہ حکیم تھے لہٰذا معلمی کے ساتھ ساتھ ماسٹر اُلفت رائے نے یہ کام جاری رکھا تھا، سرکار کی طرف سے اُنہیں سند بھی ملی ہوئی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے اپنا سارا وقت اسی کام کے لئے وقف کر دیا تھا اور بے حد مصروف ہو گئے تھے اُن کے لئے یہ کوئی پیشہ نہیں تھا بلکہ خدمتِ خلق کا ایک ذریعہ تھا۔ کبھی اپنی زبان سے کسی مریض سے کوئی فیس وغیرہ اُنہوں نے طلب نہیں کی، جو کوئی اپنی بساط کے مطابق رکھ جاتا ٹھیک تھا، غریب لوگوں کے لئے وہ ایک فرشتۂ رحمت سے کم نہ تھے اُنہیں اُن پر مکمل اعتماد تھا اور ماسٹر اُلفت رائے جی کو خدا پر! وہ دوا سے بڑھ کر دُعا کے اثر کے قائل تھے!! اور بیشتر حالتوں میں اُن کی دوا یا دُعا کارگر ثابت ہوتی۔ لیکن جہاں کہیں وہ محسوس کرتے کہ کوئی معاملہ اُن کے بس کا نہیں تو وہ مریض یا اُس کے رشتہ داروں کو آگاہ کر دیتے تھے۔ 'ہر وقت' مریضوں کے علاوہ دُوسرے بے شمار لوگ ماسٹر جی سے ملنے چلے آتے تھے، کتنے ہی لوگ اپنی گھریلو مُشکلات اپنے ذہنی مسائل کے بارے میں اُن کی صلاح لیتے کتنے ہی رشتے ماسٹر جی کی دُکان پر طے ہوئے کتنے ہی جھگڑے اُن کے دخل سے ختم ہوئے۔ ماسٹر جی بے حد مطمئن تھے اپنے کام سے اُنہیں زیادہ مالی فائدہ نہیں تھا نہ ہی یہ اُن کا مقصد تھا لیکن اس سے انہیں بے پناہ رُوحانی تسکین تو میسّر ہوتی تھی۔

ماسٹر جی نے اپنے بڑے لڑکے کو جو کچھ عرصہ پہلے ایم بی بی ایس کر کے کسی دُور اُفتادہ گاؤں کی ڈسپنسری میں تعینات ہوا تھا، آج یہ خط لکھا تھا بلکہ اپنے لڑکے کے خط کا جواب لکھا تھا، تین چار روز سے وہ

وقت نکالنے کی کوشش کرتے رہے تھے آج بھی رات کو بے وقت ملا تھا۔ یا انہوں نے کسی طرح نکال ہی لیا تھا دکان کا دروازہ اندر سے بند کر کے وہ بیٹھے تھے خط شروع کیا ہی تھا کہ بجلی دغا دے گئی تھی لیکن وہ بجلی پر منحصر نہیں تھے انہوں نے لالٹین جلا لی تھی اور لکھنا شروع کیا تھا باہر ٹھنڈی تیز ہوا چلنے لگی تھی جو آہستہ آہستہ آندھی کی صورت اختیار کر گئی تھی لالٹین کی لو بار بار ہچکولے کھاتی رہی دروازے کھڑکیاں بجتے رہے لیکن وہ لکھتے رہے۔ چار پانچ روز سے اُن کے من پہ ایک بوجھ تھا اس لئے وہ قدرے تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے شاید پہلی بار انہوں نے کسی خط کے جواب کو اتنی اہمیت دی تھی۔ ورنہ گھریلو مسائل و مشکلات کے بارے میں وہ اپنے بچوں سے کم ہی بات کرتے تھے اپنی ذہنی پریشانیوں کے بوجھ کو خود ہی برداشت کرنے کے قائل تھے لیکن اُن کا لڑکا اب ماشااللہ ایم بی بی ایس تھا ایک گزیٹیڈ پوسٹ پر تعینات۔ بعد ذہین اور سمجھدار اُس سے کھل کے بات کیوں نہ کی جائے لاد پھر اُس کے خط میں کچھ ایسی باتیں تھیں جن کا جواب دینا لازمی تھا اُس کی نئی نئی نوکری تھی زندگی کا تجربہ بھی بہت کم تھا اور وہ ایک اجنبی سے علاقے کے کسی غیر معروف گاؤں میں مقیم تھا اِس لئے اُسے تفصیل سے لکھنا ضروری تھا اِسی لئے ماسٹر جی لکھتے گئے۔ گھر سے دو تین پیغامات بھی ملے تھے لیکن ایک فرض بیچ میں چھوڑ کر وہ کیسے جا سکتے تھے اُن کے بیٹے نے اشارتاً لکھا کہ ماسٹر جی کی تھوڑی کوشش سے اُس کی موجودہ تعیناتی کی بجائے اُسے کسی شہر کا سٹیشن مل سکتا تھا۔ اُس نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ متعلقہ محکمہ کے سیکریٹری کبھی اُن کے طالب علم رہے تھے اور اُس محکمہ کے وزیر صاحب تک بھی اُن کی رسائی ناممکن نہیں تھی اُس نے اپنی موجودہ تعیناتی کی مشکلات کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا اپنی بے زاری کا اظہار کیا تھا اُس گاؤں میں اچھی سوسائٹی نہ ہونے کا ذکر کیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ذرائع آمد و رفت کے تنگ بھگ نا امید ہونے کے بارے میں انہیں مطلع کیا تھا۔ ماسٹر جی خط پڑھ کر قدرتی طور پر مضطرب ہوئے تھے انہیں اپنے لڑکے کی قابلیت پر فخر تھا۔ انتہائی پسماندہ علاقے کے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے اس طالب علم نے بڑے بڑے کالجوں میں دھومیں مچا دی تھیں۔ انہوں نے اُسے اپنے بیٹے کو جواب دیا تھا: "برخوردار!

ہماری تعلیم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ادھر کسی لڑکے نے اونچی تعلیم حاصل کی اُدھر اُس نے اپنے گاؤں اپنے ہم وطنوں سے ناطہ توڑ لیا۔ شہر میں بسنے کی خواہش کا جواز ہو سکتا ہے لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ آپ کی ضرورت اس وقت سب سے زیادہ کہاں پر ہے۔ شہروں میں اعلیٰ سے اعلیٰ طبی سہولیات میسر ہیں جبکہ گاؤں میں لوگ بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ کیا ان کی زندگیوں کی کوئی قیمت نہیں کیا یہ انسان نہیں ہیں۔ ہمارے ہی سگے سمبندھی کیا ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہیں جو گاؤں ملا ہے وہ ایک پہاڑی علاقہ ہے میرا دیکھا ہوا ہے وہاں تو حالات اور بھی خراب ہیں میلوں تک کئی کئی گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہیں اور پھر اچھی سڑکیں نہ ہونے سے شہروں تک رسائی نہایت مشکل ہے ایسے گاؤں میں تو ڈاکٹر صحیح پرماتما کا روپ ہے اور بیش بہا خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ تمہیں یہ سنہری موقع ملا ہے اِسے مت گنواؤ وہاں سے اپنی تبدیلی کا خیال بھی ذہن سے نکال دو۔ آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں کہ میں آپ کی تبدیلی کروا سکتا ہوں لیکن آپ نے اِس بارے میں میرے خیالات جان لئے"۔۔۔۔۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ اپنی بہن کی سگائی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بے حد متفکر ہیں رنج تو مجھے بھی بہت ہوا ہے آپ کی بہن اور خاص طور پر آپ کی ماں نے بہت محسوس کیا ہے لیکن میں نے انہیں سمجھا دیا ہے اور وہ مطمئن ہیں آپ بھی یہ بات بھلا دیں میں تو سوچتا ہوں کہ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہوا ہے۔ ہم ایسے لالچی لوگوں سے نباہ نہ کر پاتے سگائی توڑنے کا ایک ہی کارن تھا نا؟ کہ جہاں انہوں نے اب رشتہ طے کیا ہے۔ وہاں سے وافر جہیز مل جانے کی توقع ہے بلکہ باقاعدہ سودے بازی کے بعد یہ معاملہ طے ہوا ہے ایسے لوگوں سے کبھی بھی کسی صورت میں بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے ایسے لوگوں سے رشتہ قائم ہو جانا ایک بدنصیبی ہی ہوتی۔ بھگوان نے ہماری بھولی بیٹی کی لاج رکھ لی اُس کی رکشا کی ہے۔ رشتے مل جائیں گے اِس سے اچھے۔ آپ دیکھ لینا۔ اِس سلسلے میں کسی طرح کا بوجھ من پر نہ رکھو ۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ کے خط کا آخری پیرا پڑھ کے مجھے حیرانی تو نہیں لیکن کچھ کچھ رنج ضرور ہوا۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہمارے گاؤں اور آس پاس کے حالات تشویشناک ہیں یہاں تک آپ کا لکھنا صحیح تھا تمہارا فکرمند ہونا بھی جب

کیونکہ آپ کا مجھے گاؤں چھوڑنے کی صلاح دینا اُف !! اگر نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے تو میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہوں گا۔ میرے کچھ اصول ہیں برخوردار!! یہ میرا دوسرا امتحان ہے، ۱۹۴۷ء میں ہم ہجرت کرکے یہاں آئے تھے آپ لوگ تو پیدا ہی اِدھر آکے ہوئے، آپ کے دادا نے اُجڑتے وقت بلوائیوں کے ایک مجمع سے جو غالباً بڑے ارادے سے جمع ہوئے تھے روک کر کہا تھا۔

"میرے بھائیو!! اگر آپ کے عقائد اور ایمان کا یہی حکم ہے تو ہم لوگ تیار ہیں، اچھی طرح سے سوچ لو: کیا نہتے، مجبور اور اپنے سے کمزور لوگوں کو قتل کرکے تم سر اُونچا کرکے جی سکو گے اگر ایسا ہے ــــ تو آگے بڑھو:"

وہ لوگ لوٹ گئے تھے، ہم لوگوں کو انہوں نے اپنی حفاظت میں سرحد پار بھجوایا تھا اور ہم لوگ آج تک اُس واقعے کو بھلا نہیں پائے، دونوں طرف کے لوگ۔ ہمارا اُٹوٹ رشتہ اُس روز سے قائم ہوا تھا۔

میں آج بھی اُسی عقیدے کو مانتا ہوں۔ میرا مطب سب کے لئے کھلا ہے۔ یہاں دُکھ درد سب کے سانجھے ہیں اور پھر آخری منزل بھی سبھی کی ایک ہے۔ میرے گاؤں کے لوگ ہی نہیں دس بارہ گاؤں کے لوگ بچے بوڑھے مرد و زن پڑھے لکھے اَن پڑھ امیر غریب سب مجھے پوجنے کی حد تک پیار کرتے ہیں اس پیار کی قیمت اگر لامحالہ مجھے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑی تو ہرگز ہرگز نہیں جھجکوں گا ــ اِسی علاقہ میں ہم نے زندگی کے بہترین دن بھی کاٹے ہیں اب اگر مصیبت یا مشکل آ پڑی ہے تو اکٹھے یہیں جھیلیں گے!!"

ماسٹر جی اس طرح لکھتے گئے تھے، دیئے کی لَو بڑھتی گھٹتی رہی تھی، طوفان کا زور بڑھتا گیا تھا کئی بار دیئے کے یکسر بجھ جانے کا امکان ہوا لیکن دیا جلتا رہا اور ماسٹر جی اپنے دِلی جذبات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے رہے وہ یہ بھی بھول گئے ......: کہ وہ ایک عمر رسیدہ قسم کا خط لکھ رہے ہیں۔ خط ختم ہو گیا تو وہ بھی زمین پر آ گئے اور پھر ایک باپ کی حیثیت سے کچھ ضروری ہدایتیں صحت کا خیال رکھنے کی تلقین، خط باقاعدگی سے لکھنے کا استفسار!! ماں کی طرف سے آشیرواد!! اور بہنوں کی طرف سے پیار!!! وغیرہ، وغیرہ!!!

خط ختم ہو چکا تھا انہوں نے اسے دوبارہ سہ بارہ پڑھا تھا ایک بے پناہ اطمینان ایک ناقابلِ بیان سرور اُن کے ذہن و دل پر چھا گیا تھا۔ پھر یکایک انہیں ایک خیال آیا تھا انہوں نے قلم دوبارہ تھام لیا تھا خط کے ایک کونے میں ایک دو فقروں کے لئے جگہ تھی انہوں نے لکھا تھا۔

پس نوشت: بیٹے! ڈاکٹری کا چارج سنبھالنے کے بعد میرا آپ کے نام یہ پہلا خط ہے اس لئے ایک بات کہوں گا سب سے اہم ایک ڈاکٹر کا دھرم ہے کہ اُس کے مطب کے دروازے ہر وقت ہر ایک کے لئے کھلے رہنے چاہیئں۔ آپ نے ہمارے گاؤں میں پریکٹس کے خطرات کی بات کہی تھی اُس کے پیشِ نظر کہتا ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے کبھی میرے قاتل نے بھی میرے دروازے پر دستک دی تو میں اُسے اپنا مریض ہی سمجھوں گا ...."

طوفان اب پورے زوروں پر تھا، دیا بُجھ بُجھ جا رہا تھا، کہ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی، غالباً انہیں گھر سے بُلاوا آیا تھا وہ لوگ کھانے پر اُن کا انتظار کر رہے ہوں گے ...... اُنہوں نے دروازہ کھولا۔ "تڑاک تڑاک تڑاک تڑاک"۔ ماسٹر الفت رائے گر پڑے۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ تین چار نوجوانوں میں سے سب آگے والے کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا کافی زیادہ خون، انہوں نے تمام تر طاقت مجتمع کی اور لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے ..... تم ..... اے ... ٹی ..... ایس ..... کا ..... ٹیکا ..... ضرور ...... لگوا لینا ــ وہ اپنے قاتل سے نہیں ایک مریض، صرف مریض سے مخاطب تھے۔ ....

> تخلیقات بھجواتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔
>
> تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔
>
> تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے

پرکاش تیواری

غزلیں

جان کا روگ، تمنّاؤں کا قاتل ٹھہرا
لمحہ جو کشمکشِ زیست کا حاصل ٹھہرا

جس نے بھی آئینہ دیکھا وہ ہوا افسردہ
عکس جو اپنا تھا وہ اُس کے مقابل ٹھہرا

کیا زباں کھولوں کہ دستور عجب ہے یارب
تیری دنیا میں جو مفلس ہے وہ جاہل ٹھہرا

تُند لہروں میں اُترنا پڑا اُس کی خاطر
میرا قاتل یہ چمکتا ہوا ساحل ٹھہرا

اس طرف میں تھا، اُدھر کتنے حوادث پرکاش
میرا ہی دل تھا جو ہر درد کے قابل ٹھہرا

بربادیِ حیات کا لیکھا تھا سب کہاں
تھا وقت کی کتاب میں ذکرِ طرب کہاں

کس کس جگہ گئے تھے ہمیں یاد بھی نہیں
زخمی ہوا نہ جانے یہ پائے طلب کہاں

دل میں ہوس چھپی ہو، یہ کوئی عجب نہیں
مرتا کوئی کسی پہ ہے یاں بے سبب کہاں

سوجھی یہ آج بادِ بہاری کو جانے کیا
منہ چوم کر گلوں کا چلی بے ادب کہاں

کب سے تڑپ رہا ہوں غموں کی گپھاؤں میں
پرکاش ڈھونڈتے ہو مجھے روز و شب کہاں



صغیر افراہیم

پریم چند اور ہریجن

عہدِ قدیم سے ہندوستانی سماج میں ہریجنوں کی حالت بڑی قابلِ رحم رہی ہے۔ اُن کے ساتھ اعلیٰ ذات کے لوگ انتہائی شرمناک سلوک کرتے۔ وہ نجس محض خیال کیے جاتے۔ اُن کا چھوا کھانا پاپ سمجھا جاتا۔ اُن کو کھانے کے لیے بچا جوٹھن دیا جاتا۔ گاوٴں سے دور الگ اُن کی بستیاں ہوتیں جہاں وہ اپنے باڑوں میں جانوروں کی طرح رہنے کے لیے مجبور کر دیے گئے تھے۔ اُن کا علیحدہ کنواں ہوتا جہاں سے وہ پانی حاصل کرتے۔ اُن کے مقابلہ میں جانوروں کی اہمیت کا اظہار اس موقع پر غیر مناسب ہے مگر یہ لوگ اُن سے بھی بدتر خیال کیے جاتے اور ان کی جانوں کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ یہ لوگ انسانی حقوق سے یکسر محروم تھے۔ نہ تعلیم حاصل کر سکتے، نہ مذہبی کتابوں کو چھو سکتے، نہ مندروں میں جا سکتے اور نہ ہی دیگر انسانوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ اُن کی اپنی نہ کوئی زمین ہوتی کہ کھیتی کرتے، نہ کوئی ایسی جگہ جہاں اپنی ذاتی رہائش بنا سکتے۔ تمام دن گھر کے سارے افراد سے بیگار لی جاتی اور محنت کا کوئی خاص صلہ اُنہیں نہ دیا جاتا۔ اُن کی عورتوں سے بھی خدمت لی جاتی اور پوری طرح ان کا بھی استحصال کیا جاتا۔ ذات پات کی تفریق اور انسانوں سے غیر انسانی سلوک پریم چند کیونکر برداشت کر پاتے۔ اُنہوں نے اس اہم مسئلہ کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر اتنی سفاکی سے پیش کیا ہے کہ عوام الناس ان کے بھیانک نتائج سے واقف ہو کر اپنا طرزِ فکر و عمل تبدیل کر لیں۔

برسہا برس کے سماجی، اقتصادی ارتقاء کے نتیجے میں ہندوستان میں جو طبقاتی نظام وجود میں آیا، اُس نے یہ انتہائی مظلوم اور ستم رسیدہ طبقہ پیدا کیا۔ اس طبقہ یعنی ہریجنوں کے روح فرسا معاشی، معاشرتی اور نظریاتی استحصال کی پریم چند نے کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ اِن کا افسانہ "دودھ کی قیمت" اِس موضوع کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے اور ان کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے مذکورہ افسانہ میں دکھایا ہے کہ گاوٴں کے زمیندار ٹھاکر مہیش ناتھ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس کی پرورش کی تمام ذمہ داری گودڑ کی بہو بھونگی کے سپرد کی گئی۔ بھونگی نے اپنے لڑکے منگل کو دودھ پلانے کے بجائے ٹھاکر کے لڑکے کو دودھ پلایا لیکن ایک سال کے بعد ہی بھنگن کا دودھ چھڑا دیا گیا کہ کہیں بچہ کا دھرم بھرشٹ نہ ہو جائے۔ گودڑ اسی سال پلیگ سے اور پانچ سال بعد بھونگی سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو گئے۔ یتیم منگل اپنے کتے "ٹامی" کے ساتھ زمیندار کے یہاں پرورش پاتا رہا کیونکہ:

> "گھر میں اتنی جھوٹن بچتی تھی کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے پل سکتے تھے..... مکان کے سامنے ایک نیم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو مٹی کے

سکورے اور ایک دھوتی جو سریش بابو کی
اُترن تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہر ایک
موسم میں وہ جگہ ایک سی آرام دہ تھی۔"[1]

لیکن ایک دن وہ اُس "آرام دہ" جگہ سے بھی ذلّت کے ساتھ نکال دیا گیا تو "ٹامی" نے اُس سے کہا کہ:

"اِس طرح کی ذلّتیں تو زندگی بھر سہنی ہیں
— یوں ہمت ہاروگے تو کیسے کام چلے گا۔ مجھے
دیکھو نا جب کسی نے ڈنڈا مارا تو چلّا اٹھا۔ پھر
ذرا دیر بعد دُم ہلاتا ہُوا اُس کے پاس جا پہنچا۔
ہم دونوں اِسی لئے بنے ہیں بھائی —"[2]

بالآخر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے وہ پھر اُسی جگہ پہنچ گئے اور ضمیر کو کچلتے ہوئے "لات کی ماری ہوئی روٹیاں" کھانے لگے۔ پیتل چاٹنے کے بعد اُس نے ٹامی سے کہا کہ:

"سریش کو اماں نے ہی پالا ہے —— لوگ
کہتے ہیں دُودھ کی قیمت کوئی نہیں چکا سکتا اور
مجھے دُودھ کا یہ دام مِل رہا ہے۔"[3]

پریم چند نے اس جگہ منگل کے سہارے ہریجن کی سماجی حیثیت کی وضاحت کی ہے جس نے افسانہ کے ماحول کو اس کی فضا سے ہم آہنگ کرکے موضوع کو مزید پُراثر بنا دیا ہے۔

پریم چند 'میدانِ عمل' میں مذکورہ مسئلہ کو بڑے تیکھے انداز سے پیش کرتے ہیں اور اس سے متعلق واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حساس ذہن میں چنگاریاں سی اُٹھنے لگتی ہیں۔ ٹھاکر دوارہ میں ایک ماہ سے مدھو سودن جی کی کتھا ہو رہی ہے۔ اِس کتھا کو سُننے کے لئے اچھوت بھی پہنچتے ہیں اور مندر کے اُس حِصّہ میں جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں جہاں جُوتے، چپل وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ کسی طرح مندر کے اندر خبر ہو جاتی ہے کہ اچھوت دروازے کے پاس بیٹھے کتھا سُن رہے ہیں۔ اس خبر سے مندر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ برہمچاری جی نے:

"اپنا سر پیٹ لیا، یہ بدمعاش روز یہاں
آتے تھے اور سب کو چھوتے تھے۔ ان کا چھوا
ہُوا پرشاد روز لوگ کھاتے تھے۔ اس سے
بڑھ کر اندھیر اور کیا ہو سکتا ہے۔"[4]

دھرم کے بھرشٹ ہو جانے کی وجہ سے:

"دین داروں کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ کئی آدمی جوتے
لے لے کر ان غریبوں پر پل پڑے۔ بھگوان کے مندر
میں بھگوان کے بھگتوں کے ہاتھوں بھگوان کے
بھگتوں پر جوتوں کی بارش ہونے لگی۔"[5]

پریم چند اس ظلم کے خلاف اپنے خیالات کو ڈاکٹر شانتی کمار کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں: "آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لئے، لگائیے خوب کس کس کر اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بندوقیں منگائیے اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے۔ اور تم دھرم کو ناپاک کرنے والو، تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا سکو کھاؤ۔ تمہیں اتنی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں —— یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں، موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔"[6]

---

[1] "دُودھ کی قیمت" مجموعہ پریم چند کے مختصر افسانے۔ ص ۱۰۲
[2] 〃 〃 〃 〃 ۔ ص ۱۰۶
[3] 〃 〃 〃 〃 ۔ ص ۱۰۸
[4] میدانِ عمل، پریم چند۔ ص۔ ۲۲۴
[5] 〃 〃 ۔ ص۔ ۲۲۵
[6] 〃 〃 ۔ ص۔ ۲۲۶

ہریجنوں کے ساتھ روا سلوک کے نتیجے میں جو پیش آمدہ حالات کی بظاہر اُس عہد میں کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی پریم چند اُن خطرات کو بخوبی بھانپ لیتے ہیں اور ان کا قلم اُس جانب واضح نشاندہی کرتا ہے۔ چھوت چھات کی لعنت جس تباہ کن معاشرے کی تخلیق کرسکتی ہے پریم چند اس سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں سے پورے معاشرے کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اچھوتوں کے ردِ عمل کی شدت کو انہوں نے گئودان میں بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ پنڈت ماتا دین نے سلیا چمارن کو شادی کے وعدے پر اپنے گھر میں رکھ کر اُس سے رُوبرُو جنیو ہاتھ میں لے کر کہا تھا سلیا! جب تک دم میں دم ہے تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا۔" مگر اس کا یہ وعدہ ایک سراب کی مانند تھا:

"سلیا کا سب کچھ لے کر بھی وہ بدلے میں کچھ نہ
دینا چاہتا تھا۔ سلیا اب اس کی نگاہ میں صرف
کام کرنے کی مشین تھی اور بس۔ اس کی محبت
کو وہ بڑی چالاکی سے نچاتا رہتا تھا۔" [۷]

تنگ آکر سلیا کے باپ ہرکھو نے ایک موقع پر معاملہ کو اس طرح اُٹھایا:

"ہمارے ساتھ کھاؤ پیو، ہمارے ساتھ اُٹھو
بیٹھو۔ ہماری اِجّت لیتے ہو تو اپنا دھرم ہمیں دو۔" [۸]

ہرکھو کی اس دلیری اور صاف گوئی پر پنڈت ماتا دین کا باپ پنڈت داتا دین برہم ہوکر جواب دیتا ہے:

"ہرکھوا! تیری لڑکی وہ کھڑی ہے، لے جا، جہاں چاہے۔
ہم نے اُسے باندھ نہیں رکھا ہے۔ کام کرتی تھی
مجوری لیتی تھی۔ یہاں مجوروں کی کمی نہیں ہے۔" [۹]

داتا دین کی بات سُن کر سلیا کی ماں بے قابو ہو اُٹھتی ہے اور غضبناک انداز میں کہتی ہے۔ "ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے، اس کے ساتھ ماتا دین کو بھی لے جائیں گے جس نے اسکی اِجّت بگاڑی ہے۔" [۱۰] معاملہ کی نزاکت، انتقام کی سُلگتی ہوئی آگ اور ہرکھو کی للکار سن کر چماروں کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ پنڈت ماتا دین پر یلغار کر دیتے ہیں۔

پریم چند کے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں کسی ایک ذات یا برادری تک محدود نہیں تھیں۔ وہ تمام انسانوں کے لئے سوچتے تھے۔ اُن کے اندر کا فن کار عام انسانوں کی محرومی پر تڑپ اُٹھتا اور فن کے رُوپ میں زندگی کی سچی عکاسی کرتا تھا۔ ہریجنوں کی حالتِ زار پر اُنہوں نے خصوصی توجہ دی ہے۔ وہ اُن کے وجود کو ہندو مذہب اور انسانیت کے نام پر بدنما داغ ملتے ہیں اور اس کلنک کو اپنی تخلیقات کے ذریعے مٹانے کی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ "صرف ایک آواز" میں وہ ٹھاکر درشن سنگھ کی زبانی کہتے ہیں:

"جن لوگوں کے سائے سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں،
جنہیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے
اِن سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار، ہمت اور بے نفسی
سے کام لینا پڑے گا۔ اُسی ایثار سے جو کرشن
میں تھا۔ اُس ایثار سے جو رام میں تھا.... ہم
مضبوط دِل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے
ساتھ برادرانہ سلوک کریں گے، اُن کی تقریبوں میں
شریک ہوں گے اور اپنی تقریبوں میں اُنہیں
بُلائیں گے۔" [۱۱]

---

[۷] گئودان، پریم چند۔ ص۔ ۴۰۷
[۸] " " ص۔ ۴۰۹-۴۱۰
[۹] " " ص۔ ۴۱۰
[۱۰] " " ص۔ "
[۱۱] "صرف ایک آواز" مجموعہ پریم پچیسی۔ ص۔ ۲۴۷-۲۴۸

مُشتاق احمد نوری

افسانہ

تاڑ کا سایہ

وہ ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ اس کی آنکھیں انگارے کی مانند دہک رہی تھیں وہ ریگستان میں بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح تھا۔ سارے راستے حالات کی آندھی میں چھپ گئے تھے حدِ نظر تک صرف ریت ہی ریت تھی۔

وہ اپنی کشمکش سے جلد نجات پانا چاہتا تھا۔ اسے جلدی اس لیے بھی تھی کہ اب شمیم اس راز کو زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ شمیم کا یہ چھٹا مہینہ تھا۔ اب بچے کا ڈھانچہ مکمل ہو جائے گا، پھر اس میں جان ڈال دی جائے گی پھر۔۔۔ پھر ۔۔۔۔۔ پھر ۔۔۔۔۔ اور پھر یہ سلسلہ اسے ایک ایسے گلشن میں لے جاتا جہاں ہر طرف پھول بکھرے ہوتے۔ وہ پھول کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا مگر اس کی انگلیاں کانٹوں سے الجھ کر لہولہان ہو جاتیں اور کانٹوں کی چبھن اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔

وہ انجانے طور پر شبانہ سے گھبرانے لگا اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت وہ خود میں بٹور نہیں پا رہا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا کہ اس نے شبانہ کے ساتھ غداری کی ہے۔ اس کے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس سے بے وفائی کی ہے اور وہ اس کا گنہگار ہے ـــــ مگر پھر اس کی سوچ کے دھارے بدل جاتے۔ شبانہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے یہ سچ ہے مگر اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے بچے کا سکھ نہیں دے سکتی۔ اس کی موت کے بعد اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا کچھ بھی نہیں رہے گا اسے زندہ رکھنے کے لیے۔ پھر شبانہ کے پیار کے سہارے زندگی بھر کا سپنا بھی تو نہیں دیکھا جا سکتا، امید ہو تو آدمی اس کی ڈور تھامے کچھ دن زندگی گزار بھی سکتا ہے ـــــ مگر خالی گھڑا پیاس تو نہیں بجھا سکتا ـــــ؟!

اس کا ذہن اسی طرح قلابازیاں کھاتا رہتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اس میں شبانہ کا قصور بھی کیا ہے۔ یہ سب تو قدرت کا کھیل ہے۔ شبانہ تو فقط ایک کردار ہے جس نے اسے ٹوٹ کر چاہا ہے اور اس کی زندگی کا سارا دکھ درد اپنے آنچل میں سمیٹ لیا ہے۔ ایسی بیوی کو۔۔۔۔

"نہیں ۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا۔ ہرگز نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔" اس معصوم پر ہرگز یہ ستم نہیں ڈھا سکتا ـــــ"

فیصلہ کی گھڑی سوا نیزے پر آ گئی تھی مگر اس کے سارے راستے بند پڑے تھے وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا شبانہ سے اس کی یہ حالت چھپی نہ رہ سکی۔ ایک دن جب وہ اپنی دکان سے واپس آیا تو شبانہ نے اس کا کوٹ اتارتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ چہرے پر مُردنی سی کیوں چھائی رہنے لگی ہو ـــــ منور کی ساری شگفتہ مزاجی کہاں غائب ہو گئی ہے ان دنوں ـــــ؟"

"کچھ نہیں شبو۔ بس یونہی، ذرا طبیعت ٹھیک نہیں" اس نے ٹالنا چاہا۔ "یہ بہانہ اب نہیں چلے گا ـــــ کوئی نیا تلاشیے ۔۔۔۔۔"

پھر اُس نے ہنستے ہُوئے پُوچھا۔
"کہیں شمیم سے جھگڑا تو نہیں ہوگیا......؟ اُدھر وہ بھی گُم سُم رہنے لگی ہے۔"
شمیم کا نام سُنتے ہی وُہ سٹپٹا گیا۔ پھر سنبھلتے ہُوئے بولا۔
"نہیں ڈیئر یہ سب کچھ نہیں ہے۔" پھر اسے اپنی باہوں میں بھرتے ہوئے بولا۔
"پیار سے بنائی ہُوئی گرم چائے ساری شگفتہ مزاجی لوٹا لائی ہے۔"
شبانہ مُسکراتی ہوئی چلی گئی مگر اس کے لئے بہت بڑا سوالیہ نشان چھوڑ گئی۔ وہ نشان پھیلتا چلا گیا اور پھیلتے پھیلتے ایک بڑے دائرے میں تبدیل ہو گیا...... دائرہ .... چاروں طرف سے بند...... نکلنے کا کوئی بھی راستہ نہیں........
اِدھر شمیم کی بھی شوخی غائب ہو گئی تھی۔ حالانکہ سولہ سترہ سال کی عمر سنجیدہ ہونے کے لئے نہیں ہوتی مگر وہ سنجیدگی کا خول لئے سوالوں کے ریگستان میں بھٹک رہی تھی۔ آخر وہ کرتی بھی کیا؟ وہ لاکھ حوصلہ مند سہی مگر ہے تو سماج کی ایک کمزور ہستی...... ریت کی دیوار کی مانند، حالات کے ایک جھونکے سے بکھرنے والا وجود......!
جس سماج میں وہ سانس لے رہی تھی اس کے بھی کچھ اصول تھے، پابندیاں تھیں، رسم و رواج تھے، تہذیب و تمدن کے کچھ دائرے تھے جس سے نکلنا ناممکن تھا۔
وہ ہمت کر کے اگر سارے سماجی بندھن توڑ بھی دیتی، ساری بدنامیاں سہہ بھی لیتی، نئی مثال قائم بھی کر دیتی، تو کیا ہوتا......؟ کیا اس کی فتح ہو جاتی......؟ نہیں...... صرف اس لئے کہ اس میں اپنے مذہب کے بنائے ہوئے اصول کو پھلانگنے کی ہمت نہیں تھی۔ جس نے سگی بہنوں سے ایک ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی...... اسکی دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو شبانہ کو طلاق دیا جائے یا پھر اس کی موت ہو جائے۔ انہیں دو صورتوں میں شمیم اس کی ہو سکتی تھی اپنے بچے کو باپ کا نام دے سکتی۔ اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگنے دیتی کیونکہ تیسری صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

شبانہ اس کی سگی بہن ہے جو ٹوٹ کر اسے چاہتی ہے اسے اونچی تعلیم دلانے کے لئے ہی وہ اسے دیہات سے یہاں لے آئی تھی تاکہ کالج میں پڑھے اور اس کا مستقبل تابناک ہو۔ وہ یہاں اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہے اس کی ساری ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے مگر وہ یہ کیا کر بیٹھی......؟ اس میں صرف اسکا ہی قصور نہیں ہے بلکہ جاوید کا بھی ہے اور شبانہ کے اس یقین کا بھی ہے جو اس نے اپنے شوہر جاوید اور بہن شمیم پر کیا تھا۔
شمیم کے ذہن میں طوفان برپا تھا وہ خود یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ اپنی خود غرضی کے لئے شبانہ سے اس کی زندگی نہیں چھین سکتی اور نہ ہی اسے زندگی کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے ہی چھوڑ سکتی ہے۔
"مگر اسے بھی تو سہارا چاہیئے...... اپنے ہونے والے بچے کے باپ کا نام چاہیئے۔"
اسی ایک جگہ آ کر وہ اٹک جاتی اور سوچ کے سارے سلسلے بے سمتی کا شکار ہو جاتے۔
وہ سوچتے سوچتے ہار گئی..... اب زیادہ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا کیونکہ اس سچ کو طلوع ہونے سے روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سوالوں کی آندھیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ ایک ٹھونٹھ درخت سے جا لپٹی......... اور جاوید کو اپنا فیصلہ سُنا دیا۔
"اب ابارشن کے علاوہ دوسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔"
"نہیں شمیم نہیں......" جاوید چیخ پڑا تھا۔
"نہیں ہرگز نہیں..... تم ایسی بات پھر زبان پر نہ لانا۔ نکال دو اس خیال کو اپنے دل و دماغ سے...... اگر ہمارے جذبے سچے ہیں تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔"
کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر خود اس کے سامنے کوئی صورت نہیں تھی۔
"نہیں جاوید...... اتنی بڑی حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی...... کیا رات کی تاریکی سورج کو طلوع ہونے سے روک سکتی ہے؟"
"میں جانتا ہوں شمیم..... بس کچھ اور صبر کرو، مجھے سوچنے دو......!

صبر کی تلقین کرنے کے باوجود وہ سوچ کے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

زندگی کا یہ دوراہا کتنا بھیانک تھا اس کے لئے، اس کا اندازہ وہی کر سکتا تھا وہ اپنے دل کا بوجھ کس سے کہے ــــ؟ کسی دوست احباب سے دل کا یہ راز کہا بھی تو نہیں جا سکتا۔ شمیم کی بدنامی، اس کی اپنی رسوائی، سماجی پوزیشن بگڑنے کا خدشہ ــــ وہ کیا کرے آخر ــ؟

بہت سوچ وچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کم از کم وہ سب کچھ شبانہ سے کہہ دے گا۔ کچھ بھی نہیں چھپائے گا آخر تو وہی اس کی دوست ہے ساتھی اور غم گسار ہے وہی تو ہے جو آج تک اس کے دکھ درد چُن چُن کر اپنے آنچل میں سمیٹتی آئی ہے ــ ہاں آج وہ سب کچھ کہہ دے گا سب کچھ ــــــ جو اس منحوس لمحہ سے شروع ہوتا ہے ــــ جب وہ اور شمیم ......

اس فیصلے سے اُسے سکون ملا اور ایسا محسوس ہوا گویا بھٹکے ہوئے راہی کو راستہ مل گیا ہو۔

اس شام شمیم اپنی سہیلی کے ساتھ پکچر گئی ہوئی تھی، گئی کیا تھی، شبانہ نے زبردستی اسے بھیجا تھا تاکہ اس کی نامعلوم اداسی کم ہو۔ شبانہ گھر میں تنہا تھی۔ وہ بچوں کی طرح شبانہ کی گود میں سر رکھے تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر ادھورے اور مکمل جملوں میں اس نے ساری بات جُوں کی تُوں بیان کر دی کچھ بھی نہیں چھپایا...... اور آخر میں یہ کہا۔

"شبو ــــ میں تمہارا گنہگار ہوں اور تمہیں کسی بھی قیمت پر چھوڑ بھی نہیں سکتا مگر کبھی کبھی میں بچے کی کلکاریوں کے سامنے کمزور ہو جاتا ہوں۔ میں جس دوراہے پر کھڑا ہوں اس کے دونوں راستے کانٹوں سے بھرے ہیں اور میرے پاؤں کے آبلوں میں اتنی سکت نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں..... میں کیا کروں ــــ؟ تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے ــــ؟؟" اس نے سوچا تھا.......

شبانہ چیخ پڑے گی۔ اس کا منہ نوچ لے گی، شمیم کو گھر سے نکال دے گی۔ سارے محلے کو سر پر اٹھا لے گی۔ اور زمانے میں اس کی رسوائی ہو جائے گی..........

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا......

وہ شانت رہی، سمندر کی طرح....... صرف چپ چپ اسکی آنکھوں میں جھانکتی رہی اور جب وہ اس سے نگاہیں چار کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھا تو وہ خلاء کی وسعتوں میں کچھ تلاش کرنے لگی...... شاید اس سوال کا جواب، جو اس کے پاس نہیں تھا ــــ اور جس کی اشد ضرورت تھی..........

شمیم گھر آئی مگر شبانہ نے اُسے کچھ نہیں کہا صرف اس کی طرف بہت غور سے دیکھا..... دیکھتی رہی، گویا پہلی بار دیکھ رہی ہو ــ شمیم اس کی تیز نگاہوں سے گھبرا گئی۔ گرچہ اس نے ڈھیلے ڈھالے جمپر میں پیٹ کا اُبھار قدرے چھپا رکھا تھا مگر دل تو ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا.......

وہ رات تینوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ جاگ رہے تھے۔ تینوں کے نزدیک ایک ہی سوال تھا ــــ مگر جواب کسی کو نہیں مل پا رہا تھا ــــ وہ تینوں ایک ایسے گھنے جنگل میں بھٹک رہے تھے جہاں صرف سوال ہی سوال تھے........ نوکیلے ...... کانٹے دار........

کئی دن اسی ٹینشن میں گذر گئے اور اسی درمیان اچانک اسے سرکاری کام کے سلسلہ میں باہر جانا پڑا۔ کام زیادہ تھا اسلئے ہفتہ بھر لگ گیا۔ اس دوران وہ ڈیوٹی ضرور نبھاتا رہا مگر ہر پل اسکے سامنے ایک ہی سوال رہتا تھا ــــ جو لاجواب تھا ــــ

گھر واپسی پر اس کے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے۔ اس کا کلیجہ پل پل کانپ رہا تھا....... کہ نہ جانے اس کی غیر موجودگی میں کیا کیا گل کھلا ہوگا، گھر کے حالات کیسے ہوں گے دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ وہ شبانہ سے کسطرح نگاہیں ملا سکے گا ــــ

انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھکا ہارا وہ اپنی دہلیز تک جا پہنچا۔ اس نے گھنٹی بجائی اندر آواز گونج اٹھی مگر آج گھنٹی کی آواز ہتھوڑے کی مانند اس کے دل و دماغ پر برستی ہوئی لگی۔

دروازہ روز کی طرح شمیم نے ہی کھولا مگر وہ اُسے دیکھ کر مسکرائی نہیں بس چُپ چاپ کھوئی کھوئی سی الگ ہٹ گئی وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی کے گھر میں گھس گیا ہے ــــ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر شبانہ پر پڑی۔ وہ دہل گیا ــــ مگر خلافِ توقع وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھوں سے

سُوٹ کیس لیتی ہُوئی بولی۔

"کب آئے آپ ـــ؟ کیسا رہا آپ کا یہ دورہ؟ اِتنے ہی دِن میں آپ اِتنا کیسے تھک گئے ـــ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟"

وہ سوال کرتی رہی مگر وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ شبانہ کی یہ تبدیلی اس کی سمجھ سے باہر تھی ـــ کھانے کے درمیان بھی شبانہ کُرید کُرید کر اس سے سفر کی روداد دریافت کرتی رہی اور وہ ہُوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔۔۔۔۔۔

جب وہ تینوں کھانا کھا چُکے تو شبانہ اچانک اُٹھ کر کمرے کے اندر گئی اور ایک بڑا سا پیکٹ اُٹھا لائی جو لال کاغذ میں لپٹا ربن سے ہی بندھا ہُوا تھا بالکل گِفٹ پیکٹ کی طرح۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسے پیکٹ وہ اکثر سفر سے واپسی پر شبانہ کے لئے لایا کرتا تھا جس میں کبھی ساڑی ہوتی، کبھی شال اور کبھی زیور ہُوا کرتے تھے اور اتفاق سے اس بار وہ کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ پیکٹ دیکھ کر اسے بہت شرمندگی ہُوئی۔ وہ انہیں خیالات میں گم تھا کہ شبانہ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"میرے سرتاج۔۔۔۔۔۔۔۔ شادی کے بعد آپ نے جو پیار اور خوشی مجھے دی ہے اس کا بدلہ میں اپنی جان دے کر بھی نہیں چُکا سکتی۔ آپ کی اتنی ساری عنایتوں کے عوض میں نے دیا ہی کیا ہے؟ اور پھر ایک تاڑ کے پیڑ سے سائے کی توقع بھی تو نہیں کی جا سکتی۔
مگر آج میں آپ کے اتنے سارے احسانوں کے عوض یہ حقیر سا تحفہ آپ کو پیش کر رہی ہُوں ـــ خدا کے واسطے اسے ٹھکرا کر میرے یقین کو ٹھیس مت پہنچایئے گا۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی، آنکھیں بھر آئیں اور پیکٹ اُسے تھما کر وہ دوڑتی ہُوئی اندر چلی گئی۔ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔
شمیم بھی چُپ چاپ اس پیکٹ کو دیکھ رہی تھی اُسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ساری سچائی کا عِلم شبانہ کو ہو گیا ہے۔
اُس نے پیکٹ کھولا۔۔۔۔۔۔ اندر نظر پڑتے ہی دونوں بھونچکے رہ گئے۔ شمیم کا کلیجہ تو اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ اندر ایک بہت ہی پیارا گُڈا پڑا تھا جو اپنے ریشمی ہونٹوں پر پیار بھری مُسکان سجائے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر

شبانہ کی تحریر تھی۔۔۔۔۔۔

"میں آپ کے بچے کو اپنی کوکھ سے جنم تو نہیں دے سکی، ہاں اسے ماں بن کر پالوں گی ضرور ـــ طلاق لینے کے بعد میاں بیوی کے رشتے ضرور ختم ہو جائیں گے۔ مگر میری ممتا ان رشتوں سے کہیں عظیم ہوگی۔ میں نے آپ کی راہوں سے سارے کانٹے چُن کر اپنے دامن میں سمیٹ لئے ہیں کیونکہ زندگی گذارنے کے لئے کچھ تو سہارا چاہیئے، کانٹے ہی سہی ـــ آپ دونوں کو پھُولوں بھری یہ راہ مُبارک ہو۔۔۔۔۔۔"

ان دونوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آن کی آن میں تاڑ کا پیڑ پھیل کر برگد سے بھی زیادہ گھنا ہو گیا اور اُن دونوں کو جھُلستی ہُوئی دھُوپ سے کھینچ کر اپنے سائے میں محفوظ کر لیا۔۔۔۔۔۔۔"

بقیہ ڈوب جانے والا سورج صفحہ ۵ سے آگے

"یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں اگر تم اپنی خزاں رسیدہ زندگی کو بہار سے بدلنا چاہتے ہو تو ایک طریقہ ہے۔ بھیڑیئے نے اپنے چہرے پر پھر سے مکھوٹا چڑھا لیا۔ ہمارے بڑے صاحب بہار کی خوشبوؤں کے پجاری ہیں۔۔۔ اگر تم اُن کی خدمت میں خوشبو بنا کر کسی کو۔۔۔۔۔۔

جُملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس مجبور مگر خوددار نے بھیڑیئے کی تھوتھنی پر گھونسہ رسید کر دیا۔ اور قاتلوں کے چنگل سے فوراً نکل آیا۔

اور جب دن کا دیوتا انسانوں کی اس ستم ظریفی پر رنجیدہ ہو کر اپنا لُٹا یا ہُوا سارا سونا سمیٹ کر اپنے شبستاں میں جا چُکا تھا تو اس نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا ـــ ماں اور بہن دوڑ پڑیں۔
"کیا ہوا بھیا۔۔۔۔۔ تمہیں روشنیوں کا آسرا ملا؟" بہن کا ہمدردانہ سوال تھا۔
"تم نے اپنی بہن کے سہاگ کیلئے کچھ انتظام کیا؟" ماں کی تشویش تھی۔

"نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔" وہ چیخ پڑا۔ ہر جگہ عزت اور خودداری کے سوداگر ملتے ہیں۔۔۔۔۔ ہر جگہ بہار کے طلبگاروں کا قبضہ ہے۔۔۔۔ سبھی ہریالی مانگتے ہیں۔۔۔۔ کہاں سے لاؤں ہریالی؟۔۔۔۔ بنجر زمین پر ہریالی کہاں سے اُگاؤں میری ماں۔۔۔!
۔۔۔ میری بہن!۔۔۔۔ دیکھو تم خزاؤں میں اپنی زندگی گذار دینا مگر بہاروں کی طلب میں اپنا آئینہ کبھی نہیں بیچنا۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔" اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

دِن کا دیوتا کل بھی نئی زندگی کا ایک نیا پیغام لیکر آئے گا۔ ●

ناوک حمزہ پوری

رُباعیات

کیا کہیئے کہ کیا چیز ہے کیوں کر ہے رُوح
دراصل بڑا لطیف جوہر ہے رُوح
ہے اک ازلی اَمد ابدی جوہر یہ
ہے جسم ترا صدف تو گوہر ہے رُوح

جینے کی اُمنگ ابھی ذرا باقی رکھ
احساس تحفّظِ اَنا باقی رکھ
حالات کی سختی سے نمٹنے کے لئے
اِک حوصلہ دِل میں بخدا باقی رکھ

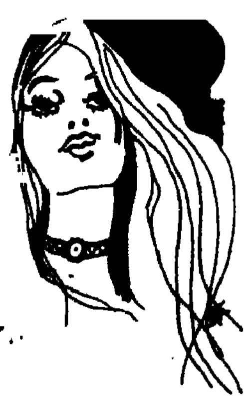
اِتنی بھی کسی کے دِل میں کد ہوتی ہے؟
اِس طرح بھی آتشِ حسد ہوتی ہے
سہتے جائیں تمھی کہو ہم کب تک
سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے

بیدار ضمیر ہو تو زِندہ ہو تم
احساس ہو زندہ جو تو زِندہ ہو تم
مُردہ ہو تم اپنے لئے جیتے ہو اگر
اَوروں کے لئے جیو تو زِندہ ہو تم

فارُوق شفق

غزل

سچ تو یہ ہے ظاہری آثار کچھ اچھے نہیں
پھُول اُگتے ہیں مگر شاخوں میں پھل لگتے نہیں
بوجھ اپنے سر سے شاخوں کا ہٹائیں کِس طرح
خوف وہ ہے پھول بھی ہاتھوں سے چھو سکتے نہیں
جانے کب لُو چلی کب فصل خوابوں کی جلی
رات کی آنکھوں سے آنسو بن کے ہم ٹپکے نہیں
اپنی آنکھیں جن مناظر سے کبھی ہٹتی نہ تھیں
اب بھی اِن میں ہے کشش لیکن مجھے جچتے نہیں
قُربتوں میں دُوریاں ہوں گی کسے معلوم تھا
اِک جگہ رہتے ہوئے سب اِک جگہ رہتے نہیں
جانے گھر کی کیا فضا ہو، جی لرزتا ہے بہت
جتنا کچھ بھی دیکھتے ہیں گھر میں کہہ سکتے نہیں
ڈھونڈتے ہیں جن کو مری آنکھ میں آنسو شفق
وہ تو اک عرصہ ہوا اس گاؤں میں رہتے نہیں



تنویر اختر رومانی

ڈوب جانے والا سورج

دِن کا دیوتا جب روشنیوں کے رتھ پر سوار ہوکر آیا تو اُسکے استقبال میں درختوں پر بیٹھی چڑیاں چہک چہک کر گیت گانے لگیں۔ استقبالیہ گیتوں سے خوش ہوکر اس نے ساری کائنات پر سونا لُٹا دیا اور دھرتی پر بسنے والے انسانوں کو نئی زندگی کا ایک نیا پیغام سُنایا۔ اور اس پیغام پر لبیک کہتا ہُوا وہ ہر روز کی طرح آج بھی عظیم درس گاہ کی عطا کردہ سند جیب میں ڈالے نکل پڑا۔ ایک نئے عزم، نئے جوش، نئی اُمنگ، نئی اُمید کے ساتھ۔

وہ فلک بوس عمارت کے اس سجے سجائے کمرے میں پہنچ گیا جہاں بے شمار لوگ فائلوں کے جنگل میں گُم خود کو بے حد مصروف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے، فائلوں کے جنگل میں بھٹکتے ہوئے، ہنس مکھ چہرے والے نے اسکا استقبال کیا۔ "فرمایئے"۔

اور اُس نے اپنی شرٹ کا دامن اُوپر تک اُٹھا دیا اور کہا۔

"اس پیٹ کے ساتھ پانچ دِنوں کا کرب ہے"۔

ہنس مکھ چہرے والا چونک پڑا۔ پھر تاسف سے گویا ہُوا۔

"ہمیں افسوس ہے..... لیکن ہم تمہارے لئے روٹیوں کا انتظام کیسے کریں؟"

"عظیم درس گاہ کی عطا کردہ یہ سند!"

"یہ تو اب عام ہو چکی ہیں۔" ہنس مکھ چہرے والے نے اپنی لاچاری ظاہر کی۔

"میری صلاحیت؟ ..... میری ضرورت؟"

"یہ سب ضمنی باتیں ہیں..... یہاں لوگ بہاروں کے طلب گار ہیں..... ہریالی چاہیئے..... دے سکو گے؟"

اِس جملے کے ساتھ ہی ہنس مکھ چہرے والے کے چہرے پر سے ایک مکھوٹا اُتر گیا۔ اب وہ اپنی اصلی شکل میں نظر آنے لگا۔ اس کی شکل بھیڑیئے جیسی ہوگئی۔

"بہار؟..... ہریالی؟" وہ بجھ سا گیا۔

"ہاں!" بھیڑیئے جیسی شکل والے کی باچھیں پھیل گئی تھیں۔

"لیکن..... لیکن..... میں تو خزاں رسیدہ ہوں..... میری طرف سے تو برسوں سے بہار گُذری ہی نہیں"۔

"تب تو پھر ہم مجبور ہیں"۔ بھیڑیئے کی تھوتھنی سُکڑ گئی۔

"دیکھیئے!..... مجھے اپنے پیٹ کے لئے روٹیوں سے زیادہ اپنی بہن کے سہاگ کی ضرورت ہے..... پلیز! آخر عظیم درس گاہ نے یہ سند کیوں عطا کی ہے؟"

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

افسانہ

جاوید اختر

خودکشی

ارتھی جا رہی تھی ـــــ

جی ہاں! ـــــ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔

"زندگی اور موت کسی کے بس کی بات نہیں" یہ صرف ایک محاورہ، کہاوت ہے یا پھر کوری حقیقت!! ـــــ

مجھے تو یہ صرف حسین و جمیل جملہ ہی لگتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں ـــ جیسے گدھا ہے اور اُس کے سینگ غائب! ـــــ جب تک چاہا زندہ رہے اور جب جی میں آیا موت کو دعوت دے دی ـــ زندگی اتار پھینکی اور موت کو پہن لیا......

اُس نے ایسا ہی تو کیا تھا........... اِنسانی فطرت کے عین مطابق

ـــ اندھیرے نے اُسے سکون دیا تھا اور وہ.......

رات کا لامتناہی سناٹا تاریکی کے ماحول پر محیط تھا۔ محلے کے سبھی کتے یہاں وہاں گلی کوچوں میں ٹانگوں میں مُنہ دبائے دُبکے پڑے تھے کہ اب انسانوں کے جاگتے رہنے کا ڈر نہیں ـــ کوئی ناگہانی آفت ہی انہیں پھر سے بیدار کر سکتی تھی۔ وہ اپنے اپنے وجود کے احاطے میں نیند میں غرق تھے ـــ آج بہت جلد وہ چُپ ہو کر سو گئے تھے غیب سے انہیں کوئی بھی اطلاع نہیں ملتی تھی کہ تم بھونکو ـــ آسمان کی جانب مُنہ اٹھا کر اپنی منحوس کُن آواز میں رو، کہ آج تمہاری گلی میں جہاں تم ٹانگیں پھیلا کر سو رہے ہو کوئی مرنے والا ہے ـــ آگاہ کر دو کہ ہم تمہارے رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو آسمان کی جانب کھینچ لیں گے ـــــ اور بتا دو، بھونک بھونک کر کہ صبح ہوتے ہی تمہارے دوست، تمہارے پڑوسی اور تمہارے ملنے جلنے والوں میں کمی ہو جائے گی ـــ بے شک ہم جو کرتے ہیں بہتر کرتے ہیں"۔

کہتے ہیں مرنے والے کی شکل کُتوں کی آنکھوں میں صاف اُتر آتی ہے ـــ اِس لئے وہ آسمان کی جانب مُنہ اُٹھا کر رونے لگتے ہیں۔

کتنی مضحکہ خیز بات ہے!

انسانوں کی موت پر کُتے روتے ہیں ـــ راتوں کو مُنہ اٹھا اُٹھا کر۔ اور ہم انسان سوئے رہتے ہیں آنکھیں بند کر ـــــ

بالکل ایسا ہی ہوا تھا ـــ

صبح ہوتے ہی گلی کے موڑ پر پیپل کے درخت کے پاس والا مکان ماتم کدہ بن چُکا تھا ـــــ اُسی جگہ ـــــ ٹھیک اسی جگہ جس گھر کی چہار دیواری سے لگ کر وہ ساری رات ٹانگیں پھیلا کر سوئے تھے ـــ اندر کمرے میں کوئی مر گیا تھا ـــ کسی نے خودکشی کر لی تھی۔

ـــ اور وہ مُنہ اُٹھا اُٹھا کر رو بھی نہ پائے تھے ـــ سارے کتوں کو شدید ملال تھا۔

آنکھیں بڑی ہو کر باہر نکل آئی تھیں۔

زبان دانتوں کے بیچ دب کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ جھولتی ہوئی مڑی گردن تن کر لمبی ہو گئی تھی۔

اور اُس کی گردن میں دائرہ بناتی ہوئی رسّی اندر تک دھنس کر اپنا وجود کھو چکی تھی ——— جب تک زندہ رہا، تڑپتا رہا اب مر گیا کوئی تڑپ نہیں ———

اندر گھر کے لوگ بلک بلک کر رو رہے تھے ——— اور باہر کتّے دن کی روشنی میں خلافِ معمول روئے تھے کہ پچھلی رات آسمانوں سے کوئی بھی خبر نہیں آئی تھی ——— محلّے کے سارے کتّوں کے مُنہ لٹک گئے تھے۔ وہ غصّے میں تھے اور اُن کے نتھنے پھڑک پھڑک کر سُرخ ہو گئے تھے، کہ یہ کیسی موت ہُوئی کہ ہمیں خبر نہ ملی۔

ہم تو انسانی موت کے پیغامبر ہیں! ——— ہم راتوں کو مُنہ اُٹھا کر روتے ہیں تو صُبح ہوتے ہی دن کے اُجالے میں کوئی نہ کوئی ضرور مر جاتا ہے ———

اُف! کتنا اذیت ناک ہے ہم کتّوں کا دن میں رونا۔ ہم دن میں رو رہے ہیں ——— وہ رات میں اچانک سب کو دھوکا دے کر مر گیا ———

لوگ باگ راتوں میں ہمیں روتا ہُوا دیکھ کر سہم جاتے ہیں اور چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں کہ ہم میں سے ضرور کوئی نہ کوئی نجات پانے والا ہے ——— لوگ ہماری چیخ و پکار کو سُن کر اپنے اپنے بیماروں کی تیمارداریاں بڑی لگن سے شروع کر دیتے ہیں ——— ہم کتنی اہمیت کے حامل ہیں! ہماری آواز بزدل راہ گیروں کو منحوس لگتی ہے ——— وہ ہمیں روتا ہُوا دیکھ کر پتھروں اور جُوتوں سے مار مار کر ہمیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے ہیں ———

لیکن یہ کتنی تکلیف دہ ہے کہ ہمیں دن میں رونا پڑ رہا ہے ——— اور انسان دن کی روشنی میں ہمیں روتا ہُوا دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔ ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "دیکھو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے اب کتّے دن میں بھی رونے لگے ہیں۔" دن میں تو انسان روتے ہیں ——— اور راتوں میں ٹانگوں میں مُنہ دبا کر سونے والے ہم منحوس کتّے ———

تو اندر گھر کے بھائی روئے ......

بہنیں روئیں بلک بلک کر چیخ چیخ کر......

ماں نے تو سر کے بالوں کو نوچ نوچ ڈالا ——— اُس پر تو پاگل پن کی سی کیفیت طاری ہو گئی ——— چہرہ دیکھ دیکھ کر کئی بار بے ہوش ہُوئی۔

اور باپ! ———

باپ خاموشی کی پتھریلی چادر میں بُت بنا خلا میں گھور رہا تھا اُس کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بُوند بھی نہ ٹپکی! ——— شاید اُس کی آنکھوں میں چھپا آنسوؤں کا سمندر خشک ہو چکا تھا ———

ارتھی اُٹھی ——— لوگ باگ ایک بار پھر چیخ پڑے ——— دوست احباب نے اپنے اپنے سر جُھکا لیے۔ ارتھی محلّے کے پار ہُوئی ——— مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ اور مُنہ اُٹھا کر روتے ہُوئے کتّے بھی خاموش ہو گئے۔

ارتھی شمشان کی طرف بڑھتی رہی ———

لوگ باگ کاندھے بدلتے رہے ———

ایک کے بعد دُوسرا ———

دُوسرے کے بعد تیسرا ———

چوتھا ——— پانچواں ——— لیکن باپ؟!

باپ خاموش تھا اور پُرسکون بھی ——— مضمحل قدموں سے سب سے پیچھے چلتا رہا ——— اُس نے ایک بار بھی ارتھی کو کاندھا نہ دیا ———

شاید اُسے معلوم تھا کہ وہ مر جائے گا۔ یا پھر وہ برسوں سے ہی آنسو بہاتا چلا آ رہا تھا۔

آخر وہ جگہ آ ہی گئی ———

شمشان! ———

چاروں طرف آگ کی لپٹیں ——— جو کل تک زندہ تھے! اُن کے جسموں کو چاٹتے ہوئے شعلے ——— اور بالآخر ——— راکھ ——— راکھ ——— راکھ۔ اور صرف راکھ ———

چتا تیار ہو گئی ——— منتروں کا جاپ ہُوا اور آگ لگا دی گئی۔ دھو دھو کرتے شعلے آسمانوں کی بلندی کو چھونے لگے ——— ماحول دُھواں دُھواں ہو گیا ——— پھر ایک پُراسرار خاموشی طاری ہو گئی۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں گونجتیں اور پھر

پہلے والی خاموشی مسلط ہو جاتی۔

خاموشی کے اس سمندر کو ایک قہقہے نے درہم برہم کر دیا۔ حلقوں میں کھڑے لوگ گھبرا گئے ۔۔۔ اور کچھ متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر گھورنے لگے ۔۔۔ لوگ بڑے متعجب تھے۔ جیسے کانٹوں پر گداز روئی کا احساس!؟ ۔۔۔

اور پھر اچانک چند لوگوں کی نگاہیں شمشان کے ایک خشک اور کفن آلود درخت پر جا ٹکیں جس کا سہارا لیئے پاپ کھڑا جنونی کیفیت اور ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

" سب کہہ رہے ہیں اور دنیا سمجھ رہی ہے ۔۔۔ محبت کی ناکامی نے مجھے خودکشی پر مجبور کر دیا ہے۔

لیکن یہ سچ نہیں ہے ...... حقیقت کچھ اور ہی ہے ...

...... حقیقت کچھ اور ...... حقیقت کچھ ......" وہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے خاموش ہو گیا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا جلتی ہوئی چتا کے قریب گیا ...... سر جھکائے دیر تک چتا کے پاس کھڑا رہا ...... پھر اچانک نگاہیں اوپر اٹھا کر اپنی آنکھیں آسمان پر مرکوز کر دیں......

پھر ماضی کے پردے اُٹھ گئے ...... اُس کی آنکھیں صاف دیکھ رہی تھیں اپنی ہی متحرک تصویریں ......

شام کا وقت ہے صبح ہی سے رم جھم رم جھم بارش ہو رہی ہے۔ وہ فیکٹری سے ابھی ابھی نکل کر گھر کو جانے والی سڑک پر آ گیا ہے۔ ہاتھوں میں خالی لنچ کا ڈبہ ہے جسے داہنے ہاتھ میں تھامے بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے ...... وہ کوئی گانا بھی گنگنا رہا ہے ...... وہ آج بہت خوش ہے۔

کیونکہ فیکٹری کے مالک نے اُسے اپنے چیمبر میں بلوا کر اُس کی ترقی کے آرڈر اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے "شاباش" کہا ہے۔ وہ خوشی کی سرشاری میں غرق گنگناتا ہوا چلا جا رہا ہے کہ اچانک بارش تیز ہو جاتی ہے ...... اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسوں کی گنتی کی ہے ...... تانگے کا کرایہ وہ ادا کر سکتا ہے ...... پیچھے سے آتے ہوئے تانگے کو اُس نے ہاتھ دے کر روکا ہے۔ بارش اور بھی تیز ہو گئی ہے، تانگے پر بیٹھے بیٹھے بھی وہ آدھا بھیگ گیا ہے ...... لیکن وہ اِس سے بے خبر اپنی بیوی کو خوشگوار خبر سنانے کے لیے ہزاروں جملے تلاش کر رہا ہے ...... بالآخر انہیں سوچوں میں غرق وہ بہت جلد خلافِ معمول گھر پہنچ جاتا ہے۔

لیکن یہ کیا!؟......

آنکھوں کے آگے بے ہنگم بھوت ناچنے لگے ہیں ...... کوئی تیز دھار تلوار اُس کے اندر تک اُترتی چلی گئی ہے ...... اور زمین اُس کے پیروں تلے سے کھسک گئی ہے ......

اُس کی بیوی اندر کمرے میں کسی اور کی بانہوں کی اسیر ہے۔ اُس نے آنکھیں پھیر لی ہیں ...... اُس نے کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا...... لیکن بڑے جذباتی انداز میں وہ اپنی بیوی سے برسوں کہتا رہا ہے ۔۔۔ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میں ضرور خودکشی کر لوں گا، کبھی بھی ۔۔۔ کہیں بھی ۔۔۔ کسی بھی شکل میں ۔۔۔"

اور آج چتا جل چکی تھی ۔۔۔ سب کچھ راکھ ہو چکا تھا۔ اور وہ اُس کی شکل میں جل چکا تھا ۔۔۔

وہ زور زور سے رونے اور بلکنے لگا ۔۔۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بلکنے لگا ۔۔۔ "بیٹے تم نے آج میری شکل میں خودکشی کر لی ۔۔۔ میں تو خودکشی نہ کر سکا کیونکہ تیری پیدائش کی چاہ نے مجھے باز رکھا ۔۔۔ اُس وقت تو اپنی ماں کی کوکھ میں آٹھ ماہ کا تھا۔ تو سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔۔۔ سب کچھ سُن رہا تھا ۔۔۔ تیرا قاتل میں ہوں بیٹے۔"

جب وہ رو چکا تو انگارے بھی سرد پڑ چکے تھے۔ رشتے دار، دوست احباب، ملنے جلنے والے خیر خواہ سب جا چکے تھے ۔۔۔ بس ایک راکھ کا ڈھیر باقی رہ گیا تھا ۔۔۔ وہ دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور راکھ کے ڈھیر کو کریدنے لگا ۔۔۔ جیسے وہ خود کو اُس میں تلاش کر رہا ہو!! ۔۔۔ ●●●●......

سلیم خان

افسانہ

سفر

جب اُس نے ہوش سنبھالا تو حاجتیں اور ضرورتیں اُسکے قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں، اور حقوق و فرائض دامن پکڑے ہوئے تھے، جن کی تکمیل ہی سفرِ حیات تھا۔ اُس کے پیش رو یہ سفر طے کر چکے تھے۔ بحر و بر کا سفر ہموار میدانوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر جہاں شگوفوں کی کلیاں اور دُکھ کے کانٹے بچھے ہوئے تھے، جن پر چل کر کبھی اُس کے قدموں سے جھرنے پھوٹ پڑے تھے دہکتی آگ گلزار بن گئی تھی اور مصائب کے اُونچے اُونچے پہاڑ ایمان کی گرمی سے موم کی طرح پگھل گئے تھے۔ گویا یہ سفر، سفر نہ ہو بلکہ ایک آزمائش ہو ایک امتحان ہو۔

یہ سفر اُس کے لئے بظاہر مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں۔ کیونکہ اُس کی جھولی میں اپنے اجداد کا ذہنی سرمایہ اور تجربہ تھا — جو زندگی کی تاریک راہوں میں بھی چاند کی طرح چمک کر اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی اُسے راستہ کافی دشوار پر خار اور پیچیدہ لگا۔ اندیشوں کے گہرے سایوں نے اُسے آگھیرا اور اس کے کمزور قدم ڈگمگانے لگے مگر کچھ راستوں پہ لوگ بڑی ہی پُر لطف شان دار عیش و نشاط کی زندگی گزار رہے تھے۔ اُس کے قدم غیر ارادی طور پر اُن لوگوں کی طرف اُٹھ گئے اور جب وہ اُن کے قریب پہنچا تو اُن کے ترقی یافتہ معاشرہ اور تمدن نے اُسے مسحور کر دیا۔ اُس کے دل میں خواہشوں کے کئی دیپ جل اُٹھے۔ آنکھوں سے رشک و حسد کی شعاعیں پھوٹ پڑیں اور اس نے بغیر سوچے سمجھے ان لوگوں کی تقلید کو اپنا شعار بنا لیا۔

اب اُس کے سامنے ایک سرسبز مخملی راہ گذر تھی، جس پر خوش رنگ خوشبو کی رنگا رنگ تتلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ آنکھوں میں خواب سجائے دوڑنے لگا۔ اور شب و روز ماہ و سال گردو نواح سے بے خبر دوڑتا رہا۔ ہر خواب کی تکمیل ایک نئے خواب کو جنم دیتی رہی اور وہ رنگینیوں کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ اُس کے احساسات کے دریچوں پر ہوس کے تالے پڑ چکے تھے اور وہ ایک مشینی انسان بن کر رہ گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ دھرتی سے آکاش تک فضاؤں اور خلاؤں میں اُڑتا چاند تاروں پر کمندیں ڈالتا رہا اور اپنی جھولی بھرتا رہا۔

ایک طویل مدت بعد جب اُس کے بالوں میں چاندی پھیل گئی۔ کمر اپنے اُوپر لدے بوجھ سے وفادار غلام کی طرح جھکنے لگی، کتابوں کے الفاظ رینگتے دکھائی دینے لگے۔ تھکے ہوئے پیروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، اُس نے آرام و استراحت کے لئے اپنا بوجھ اور آنکھوں پر چڑھی رنگین عینک اُتار دی تب اس کے وجود میں احساس کی لہریں دوڑ گئیں اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی طویل طلسمی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اور جب احساس کے سبھی دریچے کھل گئے اُس نے اپنے آپ کو جنگل میں پیپل کے ایک درخت کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے مچان پر پایا، جس کی دوسری شاخوں اور تنے پر چیل، کوّوں، گدھ اور سانپوں کی شکلوں کے انسانوں کا

بسیرا تھا۔ جن کے چہروں سے عیاری، درندگی اور حیوانیت ٹپک رہی تھیں۔ وہ حیران و پریشان ہو اُٹھا۔ اُس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ نیچے تا حدِ نظر سبزہ پھیلا ہُوا تھا۔ دُور ایک نیلی جھیل کے قریب پھلوں سے لدے درخت کے نیچے کچھ بچے پھل کھاتے کھیلتے دکھائی دیئے۔

اُن انسان نما جانوروں کے درمیان اُس کا دم گُھٹنے لگا اور اُس نے گھبرا کر جیسے ہی نیچے چھلانگ لگائی ننھی ننھی سبز گھاس میں چھپے ہُوئے سیاہی مائل آری کی طرح تیز انگنت کانٹے اُس کے ہاتھ پاؤں میں پیوست ہو گئے۔ خاردار ٹہنیوں سے اُلجھ کر اُس کا پیراہن تار تار ہو چکا تھا اور جسم پر جا بجا خراشیں آ چکی تھیں۔ رِستے زخموں کی جلن اور چبھن سے وہ کراہ اُٹھا اور مارے درد کے دُہرا ہو گیا ـــــ کچھ دیر بعد دوپہر کا آگ اُگلتا سُورج اُس کے وجود پر نیزے برسانے لگا اور جسم نمکین پسینے سے بھیگنے لگا، پیٹ سے گلے تک سب لگا اور زبان تالو چاٹنے لگی ـــــ اُس نے اپنی بکھری ہُوئی ہمت بٹور کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اُس کے بوڑھے زخمی تھرتھراتے پیر اُس کا ساتھ نہ دے سکے اور وہ بے بس ہو کر حیرت بھری نگاہوں سے ببول کی ننگی ٹہنیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو نہ سایہ دے سکتی تھیں نہ پھل ـــ!! ....

بقیہ 'نیا گھر' ص ۹۳ سے آگے

گیتا اپنی سُدھ بُدھ کھوتی جا رہی تھی۔ اور کچھ ہی دیر کے بعد کوٹھری میں پانی کی ٹپ ٹپ کے ساتھ گیتا کی ماں کی سسکیاں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ اب کوٹھری کی چھت ہی نہیں ایک دھوا کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں اور گیتا کو نیا گھر، نیا سنسار مل چکا تھا۔ بھگوان نے اِس کی ماں کی پرارتھنا سُن لی تھی۔ ....

ماہنامہ تعمیرِ ہریانہ (اُردو)

(فارم۔ ۴، ضابطہ۔ ۸) کے مطابق

مقامِ اشاعت : محکمہ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ
ایس۔سی۔او ۱۹۱۔ ۱۸۹،
سیکٹر ۱۷ سی چنڈیگڑھ

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور مدیرِ اعلیٰ کا نام } رنجیت الیسر (آئی۔اے۔ایس)
ڈائریکٹر، محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ
چنڈی گڑھ۔

قومیت : ہندوستانی

ملکیت : ہریانہ گورنمنٹ

میں، رنجیت الیسر یہ اعلان کرتا ہُوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔



(رنجیت الیسر)

چنڈی گڑھ
یکم مارچ ۱۹۸۷ء

ایاز نظر

افسانہ

نیا گھر

بارش کئی گھنٹے برس کر دم توڑ چکی تھی۔ مگر وہ کوٹھری اب بھی برس رہی تھی۔ لگتا تھا کوٹھری کی چھت ہی بادل ہو ـــــ وہ کوٹھری جس میں ایک ودھوا مالن اپنی پانچ سالہ بچی گیتا کے ساتھ ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ کوٹھڑی کے کچے فرش پر ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ٹپکنے والی چھت سے گیتا اور اُس کی ماں بھی محفوظ نہیں تھے۔

گیتا جو ابھی کچھ دیر پہلے ماں سے کچھ کھانے کو مانگتے مانگتے تھک کر چُپ ہو گئی تھی۔ اپنی ماں کے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے معصوم سے لہجے میں بولی ـــــ

"ماں یہ ہمارا گھر ٹپکتا کیوں ہے اس میں کھانے کی بہت سی اچھی اچھی چیزیں کیوں نہیں ہیں۔"

"بیٹا ـــــ بھگوان کی اِچھا ہی ایسی ہے؟" ماں نے تھکے تھکے۔ بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"ماں تم بھگوان سے کوئی اچھا سا گھر کیوں نہیں مانگ لیتیں۔ جیسے وہ سامنے رانی ماں کا گھر ہے۔ خوب اچھا سا، بڑا سا، وہاں بھی تو ایک گیتا رہتی ہے، میری جیسی ـــــ مگر اُس کے کپڑے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ پوُں! پوُں! میں گھومتی ہے۔ ماں رانی ماں کی گیتا میں اور تیری گیتا میں، اتنا انتر کیوں؟"

ایک ودھوا مالن اپنی بچی کو کیا سمجھاتی اور کیسے۔ وہ گیتا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کونے میں رکھی بھگوان کی مورتی کو دیکھنے لگی اور کہنے لگی ـــــ

"اے بھگوان! مَیں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ مگر اِس گیتا کی سُن لے۔ اِسے نیا گھر دے دے۔ کوئی چمتکار دکھا دے۔ دیکھ! اِس گھر کی چھت تو تجھے بھی بھیگنے سے نہیں بچا پا رہی ہے۔"

پھر ودھوا مالن نے گیتا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اُسے چومنے لگی۔ اُس کے چہرے پر بے چینی کی جگہ اطمینان کی لہر تھی۔ جیسے وہ بھگوان سے اپنی گیتا کے لیے نیا گھر مانگ کر مطمئن ہو گئی ہو۔

تبھی گیتا ـــ تڑپ کر ماں کی آغوش سے کود گئی ـــ اور اپنی پنڈلی کو ہاتھ سے دبا کر سِسکاریاں بھرنے لگی۔ مالن گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا ہوا میری بیٹیا؟" اُس نے فرش پر گرتی ہوئی گیتا کو اپنی باہوں میں سنبھالا۔ تبھی اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُس کے قریب سے ہی ایک کالا سانپ کوٹھری سے باہر جا رہا تھا۔

مالن گیتا کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اور گیتا کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

(بقیہ ص ۹۳ پر)

مطبوعات

نام کتاب : نغمۂ ناقوس

مؤلف و ناشر : جوہر دیوبندی، سہارنپور (یو۔پی)

صفحات : ۲۹۶

قیمت : ۳۰ روپے

●

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اردو زبان کا تعلق کسی خاص مذہب یا کسی خاص فرقے سے نہیں ہے بلکہ یہ زبان ہندوستانی کلچر کی زبان ہے۔ اُس کلچر کی زبان جس کی تعمیر میں مختلف قوموں اور مختلف مذاہب کی باہمی اخوت اور رواداری کارفرما رہی ہے۔ اُردو کا جنم ہی اس لیے ہُوا تھا کہ اس زبان کے ذریعے مسلمان اور ہندو آپس میں گفتگو کر سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والے لوگ ایمانداری سے کام نہیں لیتے ہیں ورنہ اپنے مشترکہ تہذیب و تمدن کے ماحصل سے دستبردار ہونے میں کیا دانشمندی ہو سکتی ہے؟ مگر اس جھوٹ کو کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اتنی بار دہرایا جا چکا ہے کہ اس کے جواب میں ہندو محبانِ اُردو کو یہ کہنا پڑا کہ اُردو اس مُلک کے مسلمانوں کی ہی نہیں، ہندوؤں کی بھی زبان ہے۔

غالباً اسی جذبے کے تحت جوہر دیوبندی نے نغمۂ ناقوس کے نام سے زیرِ نظر کتاب ترتیب دی ہے کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اُردو زبان و ادب کی خدمت میں اہلِ ہنود کی بہت بڑی تعداد ایک زمانے سے اپنا خونِ جگر دے رہی ہے۔ اس سے قبل جوہر صاحب "موجِ گنگ" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے چکے ہیں جس میں اُردو کے ابتدائی زمانے سے بیسویں صدی تک کے قریب ڈیڑھ سو اہلِ ہنود اُردو شعراء کا تذکرہ شامل تھا۔ زیرِ نظر کتاب اُسی پراجیکٹ کی توسیع ہے۔ اس کتاب میں جوہر صاحب نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک کے اہلِ ہنود اُردو شعراء کا تذکرہ شامل کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اعتراف کیا ہے کہ:

"مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں اس تذکرہ میں مذکورہ دور کے تمام شعرائے ہنود کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ البتہ جن جن گوشوں تک رسائی کر سکا ہوں، میں نے کی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ کافی شعرائے کو بسبب اپنی نارسائی کے اس تذکرہ کی زینت نہ بنا سکا۔"

تاہم زیرِ نظر کتاب میں قریب ایک سو آٹھ ہندو شعراء کے کلام کو یکجا کر کے اور ان کے سوانحی خاکے دے کر جوہر صاحب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس زبان میں شعر کہنے والے ہندو شعراء کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے، اس زبان کو مسلمانوں کی زبان کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ●

نام کتاب : شمارِ نفس

شاعر : نجم عثمانی

ناشر : تمثیل پبلیکیشنز، گول گھر، جھریا (بہار)

صفحات : ۹۶ ڈیمائی سائز قیمت : دس روپے

شمارِ نفس نجم عثمانی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں شاعر کی غزلوں کے علاوہ ان کی دس آزاد نظمیں بھی شامل ہیں۔ نجم کا انداز جدید شاعری کے رجحانات سے متاثر ہے اور ان کی غزلوں میں شعورِ ذات کی گرہیں کھولنے کی کوششیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ عصری حسیت جدید اُردو غزل کا خاصہ ہے اور نجم کی غزلوں میں بھی عصری حسیت کی جھلک جا بجا دیکھی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالمغنی سے لکھوایا گیا ہے — عبدالمغنی صاحب غزل کے جدید رنگ اور آزاد نظم کے مخالفوں میں سے ہیں۔ میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لئے مصنف نے ان کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ نجم کی شاعری کے بارے میں عبدالمغنی صاحب کی رائے یہ ہے کہ "ان کی غزل میں احساسات کی وہ کیفیت نمایاں ہے جو نئی غزل سے منسوب کی جاتی ہے اور جس کو دو لفظوں میں خستگی اور پراگندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے رواجِ زمانہ کے تحت کچھ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں جن میں پریشانیٔ خیال اور انتشارِ ہیئت واضح ہے۔"

یہ ضروری نہیں کہ قاری عبدالمغنی صاحب کی رائے سے اتفاق کرے، مگر سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ شاعر نے یہ کیوں ضروری سمجھا ہے کہ ان کا قاری جدید شاعری کے بارے میں اس قسم کے تاثرات پڑھنے کے بعد ان کے کلام کا مطالعہ کرے۔

بہر حال میں نے اس کتاب کے مطالعہ سے یہ محسوس کیا ہے کہ نجم کے اندر وہ جوہر موجود ہے جو شدتِ احساس مطالعہ اور مشاہدے سے آراستہ ہو کر بہتر تخلیق کے لئے بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے سے نمایاں نجم کی شعری صلاحیت سے ان کے روشن مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔

صالح ندیم

غزل

میرا وجود باعثِ انکار بن گیا
کیسے یہ سطحِ آب پہ مینار بن گیا

اِک اور بال آئینۂ دل پہ پڑا
اِک اور راستہ پسِ دیوار بن گیا

ہونٹوں کی لرزشوں کا سبب کچھ ہوا کرے
اِک جنبشِ غلط سے خطاوار بن گیا

دریا کی تہہ سے کس نے پکارا ہے میرا نام
پانی پہ دائرہ سا کوئی یار بن گیا

نام کتاب: جمالِ ہم نشیں

مصنف وناشر: محمد اسد اللہ، ورود (مہاراشٹر)

صفحات: ۱۳۲ قیمت: ۱۲ روپے

●

مزاح نگاری بڑا مشکل فن ہے۔ ہنسی ہنسی میں فرد اور معاشرے کے زخموں کو کریدنا اور مسکراہٹوں میں لپیٹ کر کڑوی سچائیوں کو بیان کرنا خاصہ مشکل ہوتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں مزاح نگاروں نے، مختلف اصنافِ سخن کے ذریعے حقیقت کے آئینے پر جمی ہوئی دھول کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ مراٹھی زبان کے مزاح نگاروں نے بھی دیگر زبانوں کے مزاح نگاروں کے شانہ بہ شانہ اس پُرخطر راہ پر قدم بڑھائے ہیں اور ان میں شری کرشن کولہٹکر ___ رام گنیش گڈکری، پی۔ وی۔ جوشی، پی۔ کے۔ اترے، مدھو کر آشٹی کر، ڈی۔ آ۔ بُوا، رمیش منتری، بال سامنت، وسنت سبنس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں محمد اسد اللہ نے مراٹھی کے نثری مزاحیہ ادب میں سے دو انشائیوں، دو کہانیوں اور دو ڈراموں کا انتخاب کر کے انہیں اُردو میں منتقل کیا ہے۔ انتخاب میں جن مزاح نگاروں کو شامل کیا گیا ہے، وہ مراٹھی کے معروف مزاح نگار ہیں اور اُردو کے قارئین کو ان کی تخلیقات سے متعارف کرانے میں مترجم نے نہ صرف مراٹھی ادب کی تشہیر کا فریضہ ہی سر انجام دیا ہے بلکہ اُردو کے قارئین کے لئے اچھی تخلیقات بھی فراہم کی ہیں۔

مترجم نے مراٹھی ادب میں طنز و مزاح کے عنوان سے ایک تعارفی مضمون بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے جس سے اُردو کے قاری کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مراٹھی ادب میں مزاح نگاری کن مراحل سے گذری ہے اور اس کے رجحانات کیا رہے ہیں۔ اس مضمون کی عدم موجودگی میں یہ کتاب ادھوری کوشش رہ گئی ہوتی ___ ہندوستان کی دو اہم زبانوں کو قریب لانے کی جو کوشش محمد اسد اللہ نے کی ہے، اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

___ ڈاکٹر نریش ___

قارئین کی نظر میں

"تعمیر" کا شمارہ ۱۲ پیشِ نظر ہے۔ اس کے مشتملات بامذاق اور مفید ہیں۔ آپ نے جو دو مقالے پیش کیے ہیں دونوں تحقیق و تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ڈاکٹر انجمن آرا بے حد کامیاب ہیں۔ انہوں نے سخن فہمی کے ساتھ غالب کی طرفداری کرتے ہوئے مرحوم کو ایک سنگین الزام سے بری کرایا ہے۔ "غالب کی ایک رباعی اور زحافِ خرم" ایک بھرپور تحقیقی مقالہ ہے۔ "خلیل الرحمٰن اعظمی کے باب میں" ڈاکٹر شمس الحق عثمانی کی ناقدانہ نکتہ رسی کی عمدہ مثال ہے۔

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ نشتر خانقاہی صاحب فکشن سے بھی تخلیقی سطح پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ آدھا ہاتھ۔ "پورا جیون" سے تو اندازہ ہوتا ہے شعر گوئی ہی کی طرح افسانہ نویسی میں بھی وہ خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ قد نام ہو تو یہ مٹی..... "ایک عمدہ تخلیقی رپورتاژ ہے۔ پڑھتے وقت تقریبات کے سارے مناظر و افراد کو چشمِ تخیل آسانی سے دیکھ لیتی ہے۔ منظومات بھی اکثر و بیشتر عمدہ ہیں۔

محض چالیس صفحات میں اتنی ساری تخلیقات، تنقیدات، تحقیقات اور اطلاعات کو خوبصورت اور پرکشش ڈھنگ سے پیش کرنے کے لیے اعلیٰ مدیرانہ صلاحیتیں درکار ہیں جو بے شک آپ کی ذاتِ گرامی کو میسر ہیں۔ دعا ہے "تعمیر ہریانہ" ترقی کی مزید منزلیں طے کرے۔

شاداب رضی

"تعمیر" کا ہر شمارہ پہلے کی بہ نسبت بہتر اور نکھرا نکھرا ہوتا ہے۔ آپ اکیلی جان ہوتے ہوئے بھی جس خوش اسلوبی سے یہ سب کام سرانجام دے رہے ہیں وہ قابلِ صد ستائش ہے۔

میری تمنا ہے اور دعا بھی کہ "تعمیر" اتنا خوبصورت ہو کر شائع ہو کہ ادبی دنیا میں ہریانہ کے ادیبوں اور اردو صحافت کا نام پیدا ہو۔

طلعت عرفانی

دسمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر نریش، شاد نوحی اور طلعت عرفانی کی غزلیں، پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون "نقدِ معائب"۔ عامرہ فردوسی کا مقالہ "فیض احمد فیض کی روایت پسندی" اور افسانوں میں "کشکول" (نور جہاں صدیقی)، "زہر" (اختر آزاد) سفید چادر (ابرار مجیب) خوب ہیں۔

شاہد سیالوی

"تعمیر" کا ۱۲واں شمارہ نظر سے گزرا۔ بہت پسند آیا۔ "نقدِ معائب" پر پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ فیض کی روایت پسندی کے موضوع پر عامرہ فردوسی کا مضمون سرسری ہے۔ نعما ابن فیضی، ڈاکٹر نریش اور طلعت عرفانی کی غزلیں اچھی ہیں۔

مظہر محمود

"تعمیر" کی روزافزوں ترقی اور معیار کی بلندی سے دلی خوشی ہوتی ہے۔ افسانے اور غزلوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ تنقید و تبصروں کے علاوہ معلوماتی مضامین بہت ہی دلچسپ ہیں۔

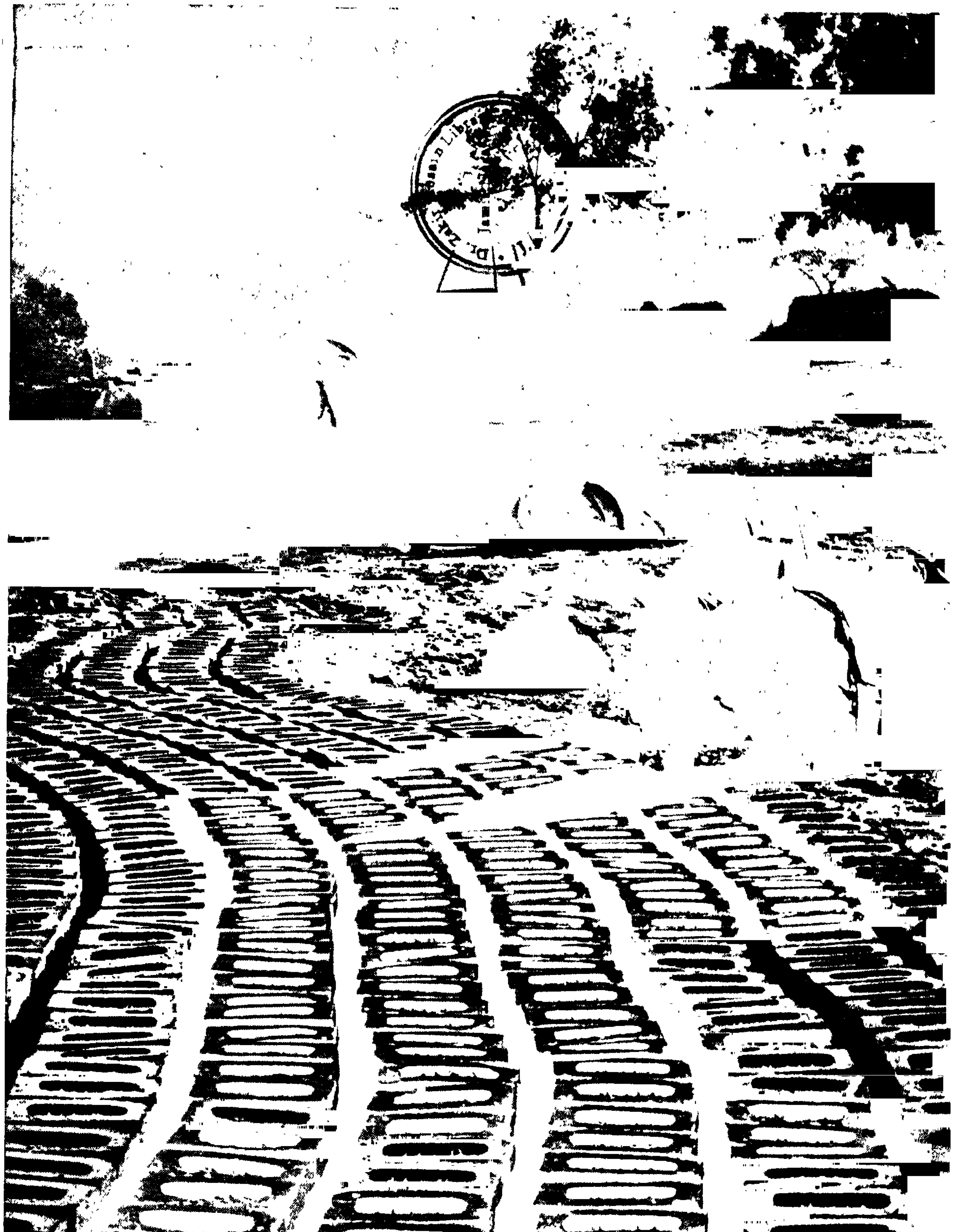
پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون "نقدِ معائب" بڑے کام کا ہے۔

مضطر تاج پوری

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے
ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ
ہریانہ ایس سی۔ او نمبر ۱۸۹-۹۱ سیکٹر
۱۷ سی، چنڈی گڑھ سے فروری/مارچ ۸۷ء
کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ



آؤ کہ کوئی بات کریں



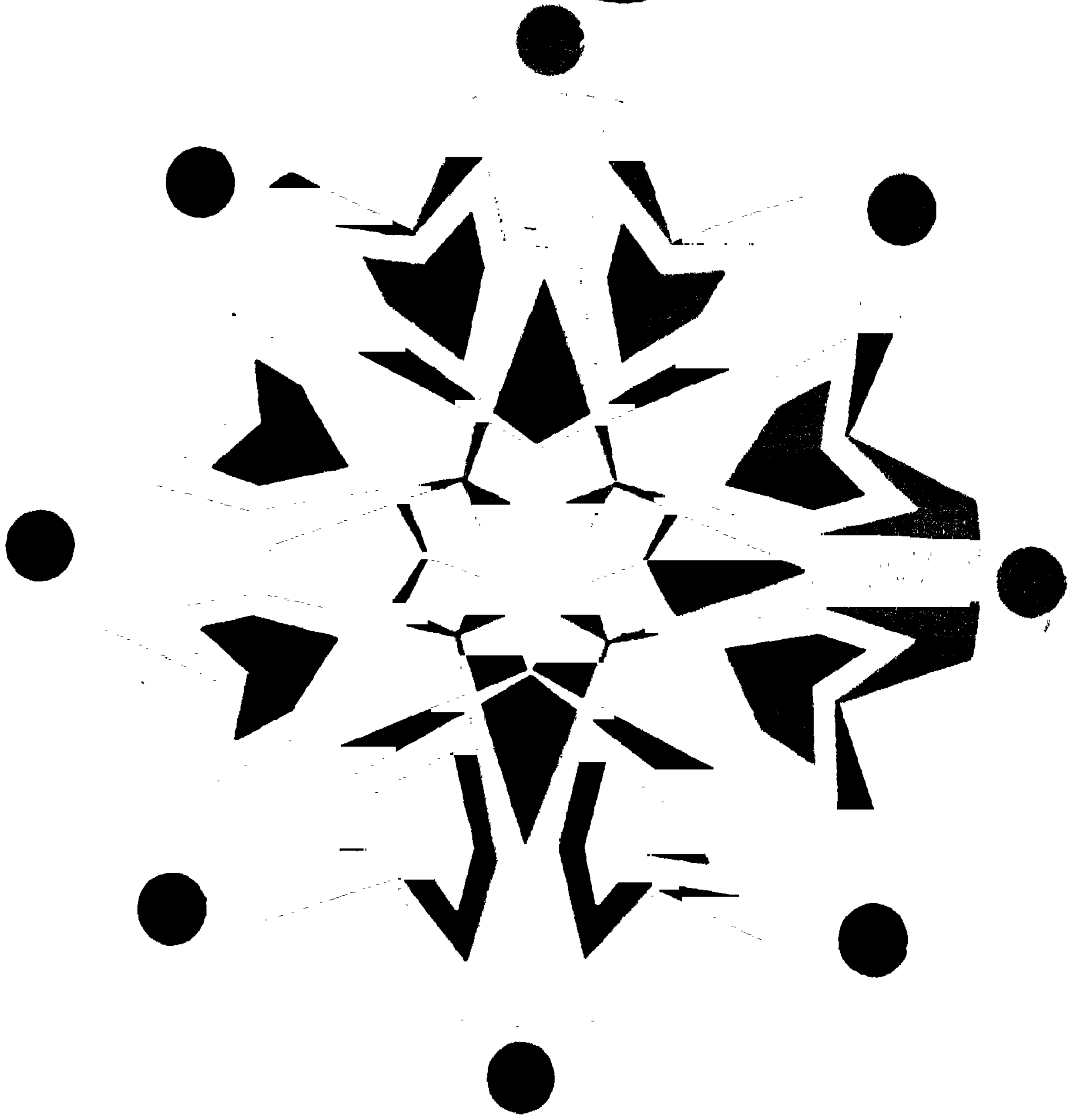
محنت ہی عبادت ہے

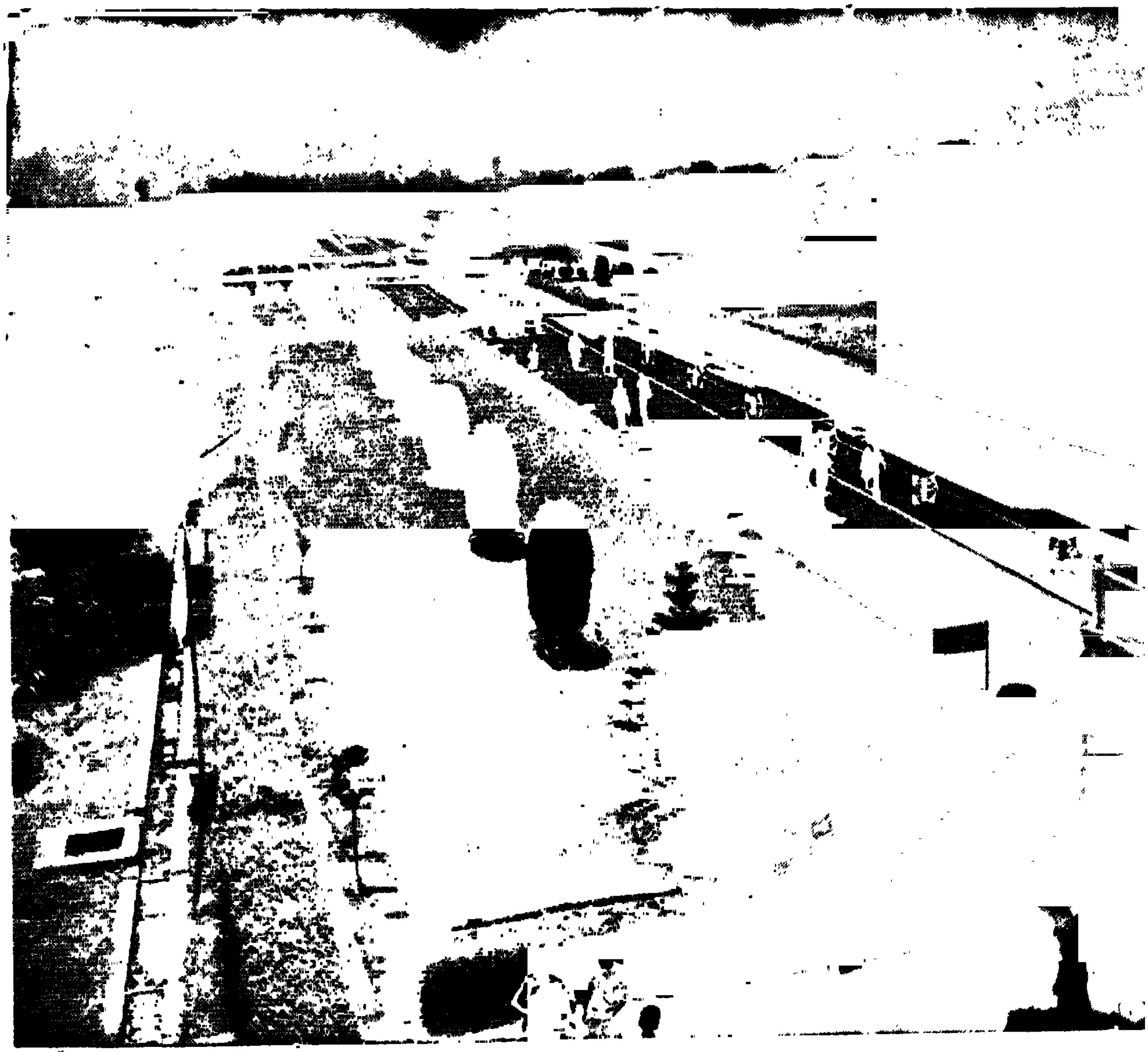
تعمیر

اپریل ۸۷ء

21 MAY 1987

Dr Zakir Husain Library
Jamia Nagar
Jamia Millia Islamia New Delhi





مُغل باغ ـــــ پنجور

آپ کا محبوب مستند ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اپریل ۱۹۸۷ء | شمارہ نمبر ۴ | جلد نمبر ۱۵

Zakir Husain Library

مدیر اعلیٰ:

رنجیت الیسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: اے۔ پی۔ بادشاہ

فی شمارہ ۵۰ پیسے

شرح سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۱

سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۔ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب

حرفِ آغاز



گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی جناب اِندر سروپ دت نادان کے مجموعۂ کلام "لہو پکارے گا" کی رسمِ رونمائی ادا فرماتے ہوئے۔ تصویر میں بائیں جانب صاحبِ مجموعہ بھی نظر آ رہے ہیں ـــــ

"لہو پکارے گا" کی رسمِ اجراء

اگر اُردو کے ادیب اور پرستار کتابیں خرید کر پڑھنے کی تحریک چلائیں اور عوام میں مطالعہ کا ذوق و شوق بیدار کرنے کے لئے قدم اٹھائیں تو اس سے اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے کاز کی بہتر خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ اس سے نہ صرف اشاعت کے صحت مند رجحانات کو تقویت ملے گی بلکہ اچھے شاعر، ناول نگار اور مصنفین بھی منظرِ عام پر آئیں گے۔

گذشتہ دنوں ۲۵ فروری ۸۶ء کو ہریانہ بھون، نئی دہلی میں ایک انتہائی سادہ اور پُر اثر تقریب میں

گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی نے جناب اِندر سروپ دت نادان کے شعری مجموعے "لہو پکارے گا" کی رسم اجرائی کے موقعہ پر اس خیال کا اظہار فرمایا۔

جناب برنی صاحب نے مزید فرمایا کہ دیگر زبانوں سے الفاظ اور رنگ و آہنگ مستعار لے کر ہی ہر زبان پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ آپ نے انگریزی زبان کی مثال دی جو لاطینی، عبرانی اور دوسری زبانوں سے بلا جھجک اور کھلے دل سے اخذ و قبول کی بدولت آج عالمی زبان کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ گورنر موصوف نے اُردو میں ہندی اور ہندی میں اُردو کے الفاظ و محاورات استعمال کرنے کے تازہ رُجحان پر اظہار مسرت کیا۔ بقول اُن کے اس طرح ہندوستانی عوام میں میل جول اور ہم آہنگی کے جذبات استوار ہوں گے۔

جناب نادان کی اُردو شاعری کو دین کا ذکر کرتے ہوئے برنی صاحب نے کہا کہ انہوں نے نئی تشبیہات اور استعاروں کا استعمال کر کے اُردو شاعری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ اس لحاظ سے دُنیائے اُردو ادب میں اب اُنہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

اِس موقع پر جناب جوگندر پال، پروفیسر قمر رئیس، جناب راج نرائن راز، جناب ابوالفیض سحر، ڈاکٹر الیس۔ ایم عباس اور جناب شارب ردولوی نے بھی خطاب کیا۔

شہید فوجیوں کی بیواؤں میں ایک لاکھ روپے تقسیم کئے گئے۔

گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۶ء کو سونی پت میں سابق فوجیوں کی سالانہ "ری یونین" کے موقع پر، جنگی بیواؤں اور سابق فوجیوں کے یتیم بچوں میں بھینسیں، سلائی مشینیں، سائیکل اور تقریباً ایک لاکھ روپے بطور مالی امداد تقسیم کئے۔

اِس تقریب کی صدارت فرماتے ہوئے جناب برنی صاحب نے کہا کہ اس ضلع کے ڈیفنس پرسونل اور سابق فوجیوں نے بے پناہ عقیدت اور معنویت کے ساتھ ملک کی خدمت کی ہے۔ اُن کی گراں قدر خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دفاعی افواج کے ۱۲ فیصد جوان ہریانہ سے ہیں اور وہ مادرِ وطن کی سرحدوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

گورنر موصوف نے مزید فرمایا کہ حکومتِ ہریانہ سابق فوجیوں کی فلاح کے لئے کئی سکیمیں مرتب کر چکی ہے۔ گذشتہ سال ریاستی حکومت نے ہریانہ میں ... ۲ سابق فوجیوں کو نوکریاں دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس عرصہ میں ... ۱۵ سابق فوجیوں کو مختلف سکیموں کے تحت اپنے کاروبار شروع کرنے کے لئے قرضے دئے گئے۔ ریاستی حکومت سابق فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کے لئے تمام کوششیں بروئے کار لائے گی۔

جناب برنی صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ ریاست میں تعمیری سرگرمیوں کے نفاذ اور قومی دھارے میں شامل ہو کر صحت مند منضبط معاشرے کے قیام میں ہاتھ بٹائیں۔

چھوٹے کنبے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے گورنر موصوف نے کہا کہ منصوبہ بند خاندان ہی قومی ترقی اور خوشحالی

کا ذریعہ ہے۔

سابق فوجیوں کی مانگوں کا ذکر کرتے ہوئے عالیجناب برنی صاحب نے فرمایا کہ راجیہ سینک بورڈ کی آئندہ میٹنگ میں سبھی جائز مانگوں پر غور کیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سونی پت میں "وار میموریل" کی تعمیر کو اولیت دی جائے گی۔

معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ضلع سینک بورڈ کے صدر اور ڈپٹی کمشنر سونی پت جناب ایس سی چودھری نے کہا کہ سال رواں میں ضلع کے ۲۲۳۳ سابق فوجیوں کو مختلف سکیموں کے تحت قرضے دیئے گئے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ضلعی انتظامیہ ضلع میں سابق فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لئے جاری سکیموں پر عملدر آمد میں ہر طرح سے تعاون دے گی۔

اس سے قبل ضلع کے سابق فوجیوں کی جانب سے گورنر ہریانہ کی خدمت میں ایک تلوار اور پگڑی پیش کی گئیں۔

علاقہ میوات کی ترقی پر زور دیا جائے گا۔

عالیجناب بنسی لال، وزیر اعلیٰ ہریانہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو ضلع فرید آباد میں ہتھین کے مقام پر ایک عظیم عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ حکومت ہریانہ علاقہ میوات میں مختلف ترقیاتی سکیموں کو لاگو کرنے کے لئے سبھی کوششیں کرے گی۔ وزیر اعلیٰ موصوف نے مزید کہا کہ ۴.۳ کروڑ روپے کی مرکزی امداد نے ترقیاتی سرگرمیوں میں تیزی لانے اور فلاحی سکیموں کو لاگو کرنے میں ریاستی حکومت کو تعاون دیا ہے۔ اس امداد سے ریاست کو نہروں سے آبپاشی کے لئے زیادہ پانی ملے گا، سڑکوں کی مرمت ہو جائے گی اور پینے کے صاف پانی کے مسائل والے گاؤں میں پانی مہیا ہو سکے گا۔

جناب بنسی لال نے کہا کہ ریاستی حکومت اس وقت تعلیمی سہولتوں پر ۱۵۰ کروڑ روپے خرچ کر رہی ہے۔ مرکز سے روزانہ ۴۰ لاکھ یونٹ بجلی کی فاضل سپلائی کے طفیل ہریانہ میں پاور سپلائی کی حالت سدھری ہے۔

وزیر اعلیٰ نے مزید فرمایا کہ کسی بھی وزیر اعلیٰ کو بینک قرضوں کو معاف کرنے کے اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ بینک قرضوں کو معاف کرنے کے وعدے غلط بیانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایسے لوگ ریاست کے مفادات سے غداری کر رہے ہیں۔ اگر بینک قرضے معاف ہو سکتے تھے تو ان لوگوں نے اپنے عہد حکومت میں ایسا کیوں نہیں کیا۔

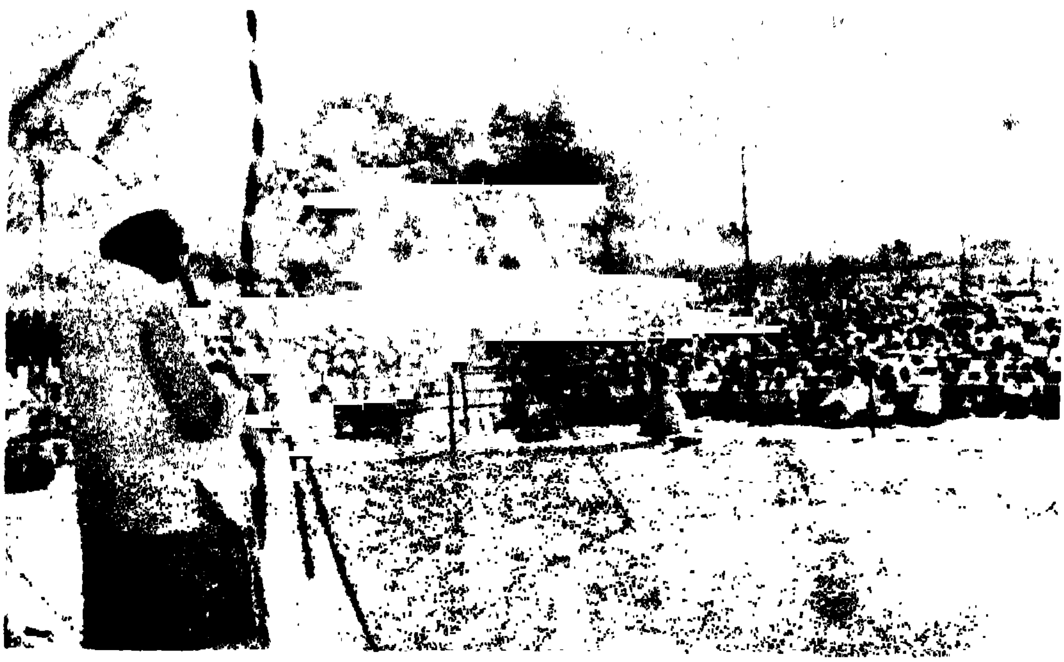
عالیجناب بنسی لال نے کہا کہ فیملی ویلفیئر پروگرام کے نفاذ میں کسی طرح کی زور زبردستی نہیں کی جائے گی۔ ریاستی حکومت نے پسماندہ طبقوں کی سرکاری اور غیر سرکاری حیثیت میں نمائندگی کو یقینی بنانے کے لئے کئی اقدامات کئے ہیں۔ علاقے کے لوگوں کی مانگوں کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے ان پر ہمدردانہ غور کا بھی یقین دلایا۔

اس موقع پر وزیر داخلہ ہریانہ، چودھری طیب حسین، وزیر تعلیم ہریانہ، محترمہ شاردا رانی اور ممبر پارلیمنٹ چودھری رحیم خاں نے بھی خطاب کیا۔

تعلیم پر ۱۷۰ کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔

(۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب بنسی لال نے ڈھنڈ (کوروکشیتر) میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہریانہ آنجہانی وزیرِ اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی نے بنایا تھا۔ انہوں نے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے فراخ دلی سے مالی امداد بھی مہیا کی۔ اس کافی مرکزی امداد سے ریاست کے سبھی شعبوں میں بے مثال ترقی ہوئی ہے۔

مختلف ترقیاتی کاموں کا ذکر کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ ۱۹۶۶ء میں جب ہریانہ وجود میں آیا تھا تب تعلیم پر ۹۶۲۸ کروڑ روپے خرچ کئے جاتے تھے۔ آج تعلیم پر ۱۷۰ کروڑ روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں اناج کے معاملے میں کمی والی ریاست اب مرکزی ذخیرے کے لئے ۳۵ لاکھ ٹن اناج دے رہی ہے۔ اس وقت یہاں صرف ۳۹ کالج تھے اور اب ریاست میں ۱۴۰ کالج ہیں۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں ہریانہ کے سبھی گاؤں میں بجلی پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۶۶ء کے ۱۹۰۰۰ ٹیوب ویلوں کے مقابلے میں اس وقت ریاست میں چار لاکھ ٹیوب ویل ہیں۔



وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب بنسی لال ۱۵ مارچ ۱۹۸۷ء کو ضلع سونی پت کے موضع جاکھولی میں ایک عظیم عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے۔

سبھی گاؤں پکی سڑکوں سے جوڑے جا چکے ہیں۔ یہ سب کچھ مرکزی امداد اور ریاست میں پائیدار حکومت کے سبب ہی ممکن ہو سکا ہے۔

وزیرِ اعلیٰ نے مزید فرمایا کہ وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی نے ریاست کی تعمیر و ترقی کے لئے ۳۰۴ کروڑ روپے

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

صابر ابوھری

رُباعیات

اُلفت کا سبق سب کو پڑھانا ہے ہمیں
اِنسان کو اِنسان بنانا ہے ہمیں
نفرت کا چلن عام کیا ہے جس نے
اُس فرقہ پرستی کو مٹانا ہے ہمیں

نفرت جو رکھے دل میں وہ انساں کیا ہے
ہمرنگِ خزاں ہو تو بہاراں کیا ہے
ساحل پہ جو لا کے کرے غرق سفینہ
وہ موج ہے کیا موج وہ طوفاں کیا ہے

ایٹم کی بنی کھان یہ دھرتی اپنی ہو
کچھ دن کی ہے مہمان یہ دھرتی اپنی ہو
مٹ جائے گا انسان اگر جنگ ہوئی
ہو جائے گی ویران یہ دھرتی اپنی

اِس جنگ کے خطرے کو مٹانا ہے ہمیں
دُنیا کو تباہی سے بچانا ہے ہمیں
ہم امن کے خواہاں ہیں ہمیشہ ہی سے
دُنیا کو بھی یہ رستہ دِکھانا ہے ہمیں

اُڑنے کو فلک پر تمہیں پَر دیتا ہے
چلنے کو ستہ آب نظر دیتا ہے
جس دَورِ کمالات پہ نازاں ہو تم ہو
دُنیا کی تباہی کی خبر دیتا ہے

کشمیری لال ذاکر

دُوسری اور آخری قسط

دُوسرا مَرد

پدم پال نے اپنے لئے ملازمت تلاش کرلی تھی۔

ایکدن اُس کی ماں لڈّو لے کر آئی تھی ہم سب کے لئے۔ ہم سب خوش تھے۔ مَیں اور بھی زیادہ خوش تھی کہ پدم پال نے میری بات مان لی تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے اپنی ماں کو کیسے راضی کرلیا تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ اُس دن پدم پال کی ماں شادی کی تجویز لے کر آئی تھی۔

اور پھر پدم پال سے میرا بیاہ ہوگیا۔

اَب سے کچھ برس پہلے زمانہ اچھا تھا۔ لڑکی کی شادی کے لئے بہت جہیز کی مانگ نہیں ہوتی تھی۔ اب کی طرح اخباروں میں ہر روز کسی نئی بیاہتا لڑکی کے مٹّی کا تیل چھڑک کر جلا دینے یا مجبور ہو کر خودکشی کر لینے کی خبریں نہیں چھپتی تھیں۔ چنانچہ نہ تو پدم پال کے گھر والوں کی طرف سے جہیز کی مانگ ہُوئی اور نہ ہی میرے پتاجی نے شادی پر فضول کیا۔ معمولی لوگوں کی شادی تھی، جو سادھارن ڈھنگ سے ہُوئی تھی۔ دِکھاوا کم تھا رکھ رکھاؤ زیادہ تھا۔ پدم پال کی بہنوں نے میرا یُوں سواگت کیا جیسے مَیں غیر نہیں تھی اُن کی سگی تھی۔ اُن کا کھلا پیار مجھے بہت اچھا لگا۔

پدم پال نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پولیٹیکل سائنس میں پرائیویٹ طور پر ایم۔ اے کی بھی تیاری شروع کردی تھی۔

مَیں نے بھی بی۔ اے کے باقی پرچوں میں امتحان دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پدم پال کی دونوں بہنوں نے بھی رتن کا امتحان دینے کے لئے کتابیں خرید لی تھیں۔ کچھ کتابیں میرے پاس تھیں جو مَیں نے اُنہیں دے دی تھیں۔

گھر کا واتاورن اچھا تھا۔ بیچ بیچ میں پدم پال اور مَیں پتاجی سے اور ماں سے ملنے بھی چلے جاتے تھے۔ حالات ٹھیک ٹھاک تھے اور کہیں کوئی الجھن نہیں تھی۔ ہاں پدم کی ماں کا مزاج کچھ سخت تھا لیکن مَیں اُس کی چھوٹی موٹی باتوں کو برداشت کر لیتی تھی۔ آپسی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے بُردباری بہت ضروری ہے۔

اڑھائی تین سال کا عرصہ بہت پُرسکون گزرا۔

میری بیاہتا زندگی کا یہی مختصر سا وقفہ میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار عرصہ تھا۔ پھر تو حالات تیزی سے بدلتے گئے تھے۔

پدم پال نے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کرلیا تھا اور اُسے سنگرور کے کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی تھی۔

مَیں نے بی۔ اے کے بعد بی۔ ٹی کا امتحان پاس کرلیا تھا اور لڑکیوں کے ایک سکول میں ملازمت کرنے لگی تھی۔

پدم کی دونوں بہنوں نے پربھاکر کا امتحان پاس کرلیا تھا

لیکن اُن کی شادی کی بات کبھی بھی سرے نہ چڑھی تھی۔
اُدھر میرے پتا جی کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں بیمار رہنے لگی تھی۔

پدم پال چونکہ ہفتے میں کئی روز گھر نہیں رہتا تھا اسلئے اُس کی ماں مجھے تنگ کرنے لگی۔ اُسے میرا اسکول میں نوکری کرنا ہی پسند نہیں تھا۔ پدم پال جب سنگرور سے آتا اُس کی ماں شکایتوں کی پوٹلی کھول دیتی۔ شروع شروع میں ماں بیٹے میں تکرار ہوتی۔ پدم پال کی بہنیں ماں کی طرف داری کرتیں لیکن میں خاموش رہتی حالانکہ جھگڑا میری ہی کسی بات کو لے کر ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے لڑائی کا محاذ بدلتا گیا اور پھر نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ گھر کے سبھی افراد ایک طرف ہو گئے اور میں ایکدم اکیلی رہ گئی ــــ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی ختم آکر ہوتی مجھ پر۔ کمان کہیں تنتی، تیر مجھے ہی لگتا۔ سبھی حملوں کا نشانہ میں ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پدم پال جس کے مُنہ میں زبان نہیں تھی اور جو میرے پیار میں پاگل ہو گیا تھا ایکدم گندی گندی گالیاں بکنے لگے گا۔ میں نے اکیلے میں جب بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی وہ اور بھی زیادہ بدمزاجی سے پیش آنے لگا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی ــــ

یہ دُوسرا، جو میرا بیٹا ہے۔ بلرام اُن دِنوں بنا نام اور بنا کسی رُوپ کے میری کوکھ میں کونپل کی طرح پھوٹ رہا تھا اور جب کونپل پھوٹتی ہے تو بہار کا پیغام آتا ہے۔ چاندی کی رمق تھرکتی ہے اور خوشبوؤں کے قافلے چلنے کو ہوتے ہیں اور مندروں میں گھنٹیاں گونجتی ہیں اور مسجدوں میں اذانیں اُبھرتی ہیں اور گرجا گھروں میں مقدس باپ کے نغمے گائے جاتے ہیں اور اس پیغام کو اور گھنٹیوں کو اور اذانوں کو اور مقدس باپ کی حمدوں کو صرف وہ عورت سُنتی ہے جو ماں بن رہی ہے۔ جس کے اندر ایک نیا انسان ڈھل رہا ہے۔ دُوسرا کوئی نہیں سُن سکتا اِس پوتر پیغام کو بہار کا اور مستقبل کا اور امن کا اور حسین دُنیا کا پیغام! ماں اس لئے درد سہتی ہے کہ اِس درد کے بطن سے ایک نیا وجود جنم لیتا

ہے، جو اِنسان کا آخری سہارا ہے۔

میرے علاوہ میری رُوح میں کسمساتے نئے وجود کا پیغام اور کوئی نہیں سُن رہا تھا سب میرا اُبھرتا ہُوا جسم دیکھتے تھے اُس کے اندر تخلیق ہوتا ہُوا وجود کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ یہ وجود پدم پال کو بھی نظر نہیں آیا، جسے میرے انگ انگ پر ترسم چھوٹے سے چھوٹے نشان کا بھی گیان تھا۔

اُس روز میں لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر آئی تھی جس نے بتایا تھا کہ بچّے کی پوزیشن کچھ ٹھیک نہیں اس کے لئے اُس نے کچھ ہدایتیں بھی دی تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر سے ہوئی ہر بات پدم پال کو بتا دوں اور اُس کی رائے بھی لوں اور اُس سے مشورہ بھی کروں۔

کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔ شام کا وقت تھا۔ میں چائے بنا کر لائی تھی۔ چائے کی ایک پیالی اُسے دی تھی اور دُوسری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"پال ڈیئر، تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"تمہیں سے مخاطب کرو، میں تمہارا خاوند ہُوں ــــ"

اُس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں سناٹے میں آگئی تھی۔

"تم کیا جانتی نہیں کہ تم میرے خاوند ہو؟"

"نہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔ اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم!"

"مجھے 'تم' کہہ کر مت مخاطب کیا کرو۔ عزّت سے پیش آیا کرو۔"

"میں تمہاری عزّت نہیں کرتی کیا؟"

"اپنے دِل سے پُوچھو۔"

"اپنے دل ہی سے پُوچھ کر تو تمہیں زندگی کا ساتھی بنایا تھا۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پدم پال کے رویّے میں پچھلے کچھ دِنوں سے تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے اُس کی وجہ گھر کی

پریشانیاں سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن حالات تو قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے آجکل؟"

"میری ماں نے تجھ پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ کالی ڈائن تمہارا گھر اُجاڑ رہی ہے۔ یہی کہتی پھرتی ہو نا لوگوں سے؟" وہ چیخا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم، کس سے کہا ہے کچھ میں نے؟"

"سب سے کہتی پھرتی ہو ایسی بے ہودہ باتیں۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

"تمہاری قسم — میں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں نکالا زبان سے۔"

"تو یہ لڑکیاں جھوٹ بولتی ہیں؟" اُس کا اشارہ اپنی بہنوں کی طرف تھا۔

"ہاں۔"

"میری ماں بھی جھوٹ بولتی ہے؟"

"بالکل جھوٹ بولتی ہے۔"

"میری ماں کو جھوٹی کہتی ہے حرام زادی۔" وہ ہاتھ اُٹھا کر میری طرف لپکا۔ میں ایک طرف ہو گئی۔ اس خیال سے کہ دوسرے کمرے میں اس آپسی تکرار کی آواز نہ جائے — میں دروازہ بند کرنے کو ہوئی تو دیکھا کہ پدم پال کی ماں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہٹ گئی۔

"دروازہ کیوں بند کر رہی ہو؟" وہ بولا۔

مجھے غصہ تو بے حد تھا لیکن میں خاموش رہی۔ پدم پال نے میری خاموشی کو اپنی بے عزتی سمجھا کہ میں نے خاموشی سے اتنی بڑی گالی برداشت کر لی تھی۔ مجھے کمزور سمجھ کر پدم پال شیر ہو گیا۔

"دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔"

"تو تم اپنی ماں اور بہنوں کے کہنے میں آ کر اپنا گھر برباد کرنا چاہتے ہو؟"

"ہو جانے دو برباد — میں اور گھر بسا لوں گا۔"

"تو بات یہاں تک آ پہونچی ہے۔ بہنوں کے لئے تو آج تک کوئی لڑکا ملا نہیں، خود دوسری بار گھر بسانا چاہتے ہو شرم کرو پدم پال۔"

پدم پال پر تو جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر مجھے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا اور پھر میز پر پڑی چائے کی پیالی زور سے مجھ پر ماری۔ چائے تو پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن پیالی کا کونہ پورے زور سے میرے ماتھے کے عین درمیان لگا۔ ماتھے سے خون بہنے لگا۔ پدم پال گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ چلا رہا تھا۔

"حرام زادیو تماشہ دیکھو تم۔" وہ اپنی بہنوں کو مخاطب کر رہا تھا جو باہر کھڑی تھیں۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا اور پھر نہیں لوٹا۔

کئی دنوں تک پدم پال گھر نہیں آیا۔

کئی دنوں تک گھر میں مرگھٹ جیسی خاموشی رہی۔

کئی دنوں تک میرے ماتھے کا زخم نہیں بھرا۔

اور کئی دنوں تک میں سکول سے چھٹی پر رہی۔

میری زندگی کی یہ دراڑ پھر نہیں بھر سکی۔ اُس دن کے بعد بھی نہیں جس دن میں نے بلرام کو جنم دیا تھا۔ میں کٹ گئی تھی اپنے گھر سے، اپنے ماحول سے، اپنے حالات سے اور خود اپنے آپ سے بھی۔ اگر عورت کو اس طرح ذلیل ہو کر جینا ہے تو میں نہیں جی پاؤں گی۔ اگر جیوں گی تو ذلیل نہیں ہوں گی۔ جنم سے پہلے میرے پیٹ میں بلرام کی پوزیشن ٹھیک نہیں تھی لیکن پیدا ہونے کے بعد اُس نے میری پوزیشن ایکدم ٹھیک کر دی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بلرام کے بعد اب میرے کوئی اولاد نہیں ہوگی۔

میری کوکھ میں اب کوئی نیا انسان پرورش نہیں پائے گا۔

وہ مقدس باپ اب میری روح میں کوئی صلیب نہیں گاڑے گا۔

میں اب کسی کو بھی کسی اور آنے والی بہار کا پیغام نہیں دوں گی۔

میرے ماتھے کا زخم تو بھر گیا لیکن زخم کی جگہ ایک جلتی ہوئی گرم مُہر میری جلد کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ تب جب بھی آئینہ دیکھتی میرے ماتھے پر چپکی مہر جلنے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ تپش کی ایک جھُلس دینے والی رَو میرے تمام جسم میں پھیلنے لگی تھی۔

بلرام ابھی دس دِن کا تھا کہ میں نے پدم پال کا گھر چھوڑ دیا۔

پدم پال سنگرور گیا ہُوا تھا۔ یہاں ہوتا تو یقیناً رو کتا اور ہو سکتا ہے میں رُک بھی جاتی اور میرا ارادہ ڈگمگا جاتا۔ اچھا ہُوا وہ یہاں نہیں تھا۔ میں نے پدم پال کی کالی کلوٹی جھگڑالو ماں کو چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی بہنوں کو بھی چھوڑ دیا جو مستقل بے کاری اور کنوارے پن کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں کو بھی چھوڑ دیا جو اُن دِنوں بہت بیمار تھی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہی تھی۔

اور یوں میں نے بیس[2] برس کا بن باس کاٹا ہے۔ سب سے ایکدم کٹ کر۔ سب سے الگ ہو کر۔ اُس حبس بھری چاردیواری سے دُور جس کے تحفظ نے مجھے کائر اور ڈرپوک اور بزدِل بنا ڈالا تھا۔

اور یُوں میری زندگی میں آیا میرا پہلا مرد پدم پال' میرے نہ چاہنے پر بھی میری زندگی سے آپ ہی آپ نِکل گیا۔ مجھے اِس کے لیئے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ ہو سکتا ہے اُس نے دوسری بار اپنا گھر بسا لیا ہو۔ جس کے طعنے وہ اکثر دیا کرتا تھا۔

—٭—

میں نے بلرام کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی ہے۔

میں سمجھتی ہوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہُوئی ہوں۔

—٭—

لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عجیب سانحہ ہُوا ہے۔

بلرام اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ اس نے کبھی مُجھ سے کوئی بات چھُپانے کی کوشش نہیں کی۔

اُس نے اُس لڑکی کا پریچے کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"ماں' یہ میری دوست رنجُو ہے"۔ اور اُس لڑکی نے بڑے اَدب سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نام ٹھیک سے بتاؤ بلرام"۔ میں نے اُس لڑکی کو اپنے بازُو میں لیتے ہوئے ذرا تیکھے انداز سے کہا۔

"رنجنا' ماں جی"۔ لڑکی نے بڑے ادب سے جواب دیا

"بلرام ایک طرف کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ گھبراہٹ نہیں تھی اُس کے رویئے میں۔ بڑا آتم وشواس تھا اُس میں'

"ہم دونوں نے اِکٹھے ہی امتحان دیا ہے"۔ بلرام بولا۔

"پہلے کیوں نہیں لائے کبھی اِسے اپنے ساتھ؟"

"ہمارا ایک فیصلہ تھا ماں جی"۔ رنجنا بولی۔

"کیا؟"

"جب تک ہم بی۔ اے کا امتحان نہیں دے لیتے۔ آپ سے نہیں مِلیں گے"۔

"کل ہمارا آخری پرچہ تھا اور آج میں اِسے اپنے ساتھ لے آیا ہُوں"۔ بلرام نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"اچھا کیا تُم نے"۔

"ماں' میں رنجنا سے شادی کر لُوں؟" بلرام نے آنکھیں جُھکا کر بڑے اَدب سے پُوچھا۔

"نہیں"۔ میرا بس ایک ہی لفظ کا مختصر جواب تھا۔

"کیوں؟" اُس نے اپنی جُھکی ہُوئی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں' بڑے یقین کے ساتھ۔

اور مجھے یہ بھی محسوس ہُوا کہ رنجنا میرے بازوؤں میں کانپ سی گئی تھی۔

"تم دونوں کا آپسی تعلق کہاں تک بڑھا ہے؟"

میرے اِس سوال پر رنجنا ایک دم لرز گئی۔

"بس یہیں تک"۔ بلرام بولا۔

"کِس حد تک؟"

"آج میں پہلی بار اِسے یہاں تک لایا ہُوں"۔

"اِس کے علاوہ؟"

رنجنا پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازوؤں کا گھیرا مضبوط کر لیا تاکہ اُسے تحفظ کا احساس ہو۔

"اِس کے علاوہ کچھ نہیں۔" بلرام نے جواب دیا۔

"شادی کے بعد اِسے کہاں رکھو گے؟"

"تمہارے پاس اور کہاں؟"

"قید کرنے کے لیئے؟"

"نہیں، تمہاری سیوا کرنے کے لیئے۔"

"اِسے غلام بنانا چاہتے ہو؟"

میرے اِس سوال کا جواب بلرام کے پاس نہیں تھا۔ وہ کچھ لمحے ایک ٹک مجھے گھورتا رہا اور پھر بولا۔

"میں نے رنجنا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے تم نے؟ تم ایک گدھے ہو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

بلرام مجھے ایکدم گھورے جا رہا تھا، خاموشی سے اور پسینے سے رنجنا بھیگتی جا رہی تھی۔

"میرے بارے میں بات کرنے سے پہلے، مجھ سے پوچھا تھا تم نے؟"

"یہ میری غلطی ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

مجھے لگا بلرام کے جواب پر میرے ماتھے کا ابھرا ہوا زخم ایک دم بڑی شدت سے جلنے لگا تھا۔

"تمہیں کسی کے بارے میں، بنا اُس کی اِجازت کے کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہونچتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔" پسینے سے بھیگی رنجنا نے اپنی آنکھیں اُونچی کر کے مجھے مخاطب کیا۔

"رنجنا نے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟" میں نے بلرام سے سوال کیا۔

"میری ماں نہیں ہے ماں جی۔" رنجنا سُبک اُٹھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے اُسکے آنسو پونچھے تو وہ اَور زور سے رونے لگی۔

"مجھے افسوس ہے رنجنا۔" میں نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

میں جب چائے بنا رہی تھی تو رنجنا چُپ چاپ رسوئی میں کھڑی رہی۔ پھر اُس نے پیالیاں صاف کر کے میز پر رکھیں اور پھر خود ہی گرم پانی کیتلی میں ڈالا اور اُس میں چائے کی پتی ڈالی اور پھر مجھ سے پوچھا،

"کتنی شکر ڈالوں آپ کی پیالی میں ماں جی؟"

"آدھی چمچ۔"

"میرے پتاجی بھی آدھی چمچ ہی لیتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں تمہارے پتاجی؟"

"سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔"

جب وہ تینوں پیالوں میں چائے بنا چکی تو صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری پیالی میرے ہاتھ میں دینے کے بعد وہ چائے پینے لگی۔ بلرام نے اپنی پیالی خود ہی اُٹھائی تھی۔

"تم بلرام سے بہت پیار کرتی ہو؟"

"جی۔" اُس نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی بلرام کے پتاجی سے بہت پیار کرتی تھی۔"

میری بات سُن کر رنجنا خاموش رہی۔

"جانتی ہو عورت کو اُس کے پیار کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وِشواس، ماں جی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"نہیں۔ یہ صرف عورت کی آرزو ہوتی ہے۔۔۔ اُسے وشواس نہیں ملتا، صرف عمر بھر کی غلامی ملتی ہے۔"

بلرام بڑی ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا

"مرد عورت کا وشواس خریدتا ہے ایک چھوٹی سی گھٹن بھری چار دیواری کے بدلے میں۔ اور ایک دن اُسی چار دیواری کی زہر بھری سڑاند میں وہ دم توڑ دیتی ہے۔"

"ایسا نہ کہو ماں!" بلرام نے مجھے ٹوک دیا۔ کتنا احتجاج اور درد تھا اُس کی آواز میں۔

"مگر ایسا ہوتا ہے میرے بیٹے۔ ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ۔ ایسا ہی ہو رہا ہے ہزاروں عورتوں کے ساتھ۔ مرد اُسے ایندھن بناتا

ہے اپنی داستاں کا ـــ عورت مرد کی بنائی ہوئی بھٹی میں عمر بھر تل تل جلتی رہتی ہے۔" میں نے بلرام کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"کیا تم رنجنا کو بھی ایسی ہی بھٹی میں جلانا چاہتے ہو؟" میں نے بڑے تیکھے لہجے میں بلرام سے پُوچھا۔

"ہرگز نہیں ماں، ہرگز نہیں۔" وہ زور سے چیخا اور پھر صوفے سے اُٹھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تم وعدہ کرتے ہو کہ رنجنا کو غلام نہیں بناؤ گے ـــ اُس کی آزادی پر پہرے نہیں بٹھاؤ گے۔"

"میں تمہاری قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔" اُس نے مجھے زور سے جھنجھوڑ دیا۔

اُسی لمحہ رنجنا میرے پاؤں پر گر پڑی۔

"اِتنا کڑا امتحان نہ لو اپنے بیٹے کا ماں جی۔" اُس کے گرم گرم آنسو میرے ٹھنڈے پاؤں کو بھگو رہے تھے۔

میں نے بلرام کو اور رنجنا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"اپنے پتا جی سے کہنا میں اُن سے ملنے آؤں گی۔" میں نے رنجنا سے کہا۔

"سچ!!" رنجنا کی آنسو بھری آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

"جاؤ، اِسے گھر چھوڑ کر آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے بلرام سے کہا اور ساتھ ہی اُس کے گال بھی تھپتھپا دیئے۔

ــ٭ــ

بلرام اور رنجنا ابھی ابھی گئے ہیں۔

اور میں اپنی زندگی میں آئے دُوسرے مرد کے بارے میں سوچ رہی ہُوں، جو میرا بیٹا ہے۔ کاش میری زندگی میں آئے پہلے مرد کا سایہ تک نہ پڑے دوسرے مرد پر۔ دُوسرا مرد جو میرا بڑا ہی معصوم اور پیارا بیٹا ہے۔

بلرام!

بھگوانداس اعجاز

دوہے

گرم دُودھ جل برف ہو | اُٹھے کہیں سے بھاپ
رنگ نہ دونوں بھاپ کے | کیوں دُودھا میں آب

٭

برف اور پانی ایک ہیں | ایک ہے شکر ایکھ
دیکھ پگھلنا برف کا | آگ پہ تپنا سیکھ

٭

الگ الگ رہتے ہوئے | سدا رہے ہیں سنگ
کبھی جُدا ہوتے نہیں | اِندر دھنُش کے رنگ

٭

پانی امرت پیار کا | کنچن جس کی دُھول
پنچھی اپنے دیش کا | شیتلتا مت بھول

٭

سب رہیں سُکھ چین سے | چلئے میرے سنگ
گاؤں کو دعوت دے گیا | ایک نقیب ملنگ

انجمؔ عرفانی

غزل

ابھی وہ خواب نُما بستیاں تلاش کریں
ہوا کی شہد بھری لوریاں تلاش کریں

پلٹ کے دیکھو وہ بچپن بُلا رہا ہے ہمیں
چلو کہ باغ میں پھر تِتلیاں تلاش کریں

جو شمع کی طرح دیتی ہیں لَو اندھیرے میں
کہاں وُہ مہندی رَچی اُنگلیاں تلاش کریں

لگے ہوئے ہیں بڑھانے میں اپنا قدِ ہُنر
نہیں ہم اُن میں جو بیساکھیاں تلاش کریں

ہمارے اشک امانت ہیں جن کے پاس انجمؔ
وہ موتیوں سے بھری سیپیاں تلاش کریں



ظہیرؔ رحمتی رامپوری

غزل

سُوکھے ہُوئے پیڑوں سے رفاقت نہیں ہوتی
ہر ایک پہ موسم کی عنایت نہیں ہوتی

بکھرتے ہُوئے آنکھوں میں کئی چاند کے ٹکڑے
دیہات میں شہروں سی شرافت نہیں ہوتی

تم پھُول لئے ہاتھ میں بے کار کھڑی ہو
لوگوں کو بڑے شہر کے فُرصت نہیں ہوتی

ہر شام ہی گرتی ہیں مری چھت میں پتنگیں
اَب پھُول سے بچّوں کی حفاظت نہیں ہوتی

یہ دیکھ کہ ہے پیار غریبی سے ظہیرؔ اَب
جب پیٹ بھرا ہو تو عبادت نہیں ہوتی

ڈاکٹر نریش

میرے محرکات

زندگی ایک ایسے سفر کا نام ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ ہر نئی منزل ایک نہ ایک نئی راہ کو جنم دے کر ایک نئے عزم اور ایک نئے سفر کی طرف اشارہ کر دیتی ہے اور زندگی پھر کسی دوسری منزل کی تلاش میں سرگرمِ سفر ہو جاتی ہے۔ منزلوں کی جستجو، نئی راہوں کی تلاش، پامال راستوں کے نشانات کی تلخ و شیریں یادیں، بچھڑے ہوئے ساتھیوں کا غم، نئے ہم سفروں کے ملنے کی اُمید — یہی مختصر تعریف ہے اس سفر کی جسے زندگی کہتے ہیں۔ یہ سفر کبھی ماں کی آغوش بن کر تھکے ہارے جسم کو لوریاں سنانے لگتا ہے اور کبھی باپ کی پُروقار آواز کی طرح عزم و تجسس کی پاسداری کا درس دینے لگتا ہے۔ اگرچہ زندگی کی ان راہوں میں محبت، کامیابی اور کامرانی کی چاندنی بھی چھٹک جاتی ہے لیکن حقیقتاً یہ سفر کڑی دھوپ کا سفر ہے۔ ایک ایسا سفر جس میں چلتے ہوئے سورج کی تمازت سے تن بدن جھلس جھلس جاتا ہے اور متعدد آبلے تلووں کو سہلانے لگتے ہیں۔ کڑی دھوپ کے اس سفر میں اگر کوئی شجرِ سایہ دار نصیب ہو جائے تو نہ دوریِ منزل کا غم دل کو ستاتا ہے اور نہ سفر کی دشواریاں سدِ راہ بنتی ہیں۔

میں نے جب کڑی دھوپ کے اس سفر کی ابتدا کی تھی تو میری مسیں بھیگنے کا زمانہ تھا۔ ایک عجیب جنون، ایک عجیب دھن، ایک عجیب لگن کا زمانہ جس میں نہ حقیقتوں کے تلخ ہونے کا اندازہ تھا نہ حالات کے ہر لمحہ دگرگوں ہونے کا احساس اور نہ دل پر ذہن کی حکمرانی کا اندیشہ۔ ہر راہ روشن دکھائی دیتی تھی اور ہر منزل کے بارے میں یہ گمان کہ میری دسترس میں ہے۔

ہندوستان طوقِ غلامی اتار چکا تھا اور آزادی کا نیا سورج اپنی نرم دھوپ سے قصرِ ہند کا آنگن بھر رہا تھا۔ میرے اندر ایک جنون انگڑائیاں لے رہا تھا کہ میرے نغمے ٹیگور اور اقبال کے نغموں کی طرح مقبول ہو کر تعمیرِ نو کی جدوجہد میں لگے ہاتھوں کو نئی طاقت اور آرائشِ حسنِ وطن میں محو ذہنوں کو نئی قوت دیں گے۔

ایک لگن کہ میں ہندوستان کی اُس تہذیب کو نئی زندگی دُوں گا جس پر گذشتہ نسلیں صدیوں صدیوں فخر کرتی رہی ہیں۔ ایک دُھن کہ میں سُورج بن کر تپوں گا تو دیس کے آنگن میں پھیلی مجہول قدروں کی تاریکی دم توڑ دے گی۔ یہ تصوّر جسے میں بہ آسانی جذبۂ حب الوطنی کی شِدّت کا نام دے سکتا ہوں، ایک سایہ دار شجر بن کر میری ہستی پر چھایا رہا۔ یہ تناور درخت آج بھی میرے تصوّر میں اسی طرح موجود ہے۔ آج بھی جب میں شہیدانِ وطن کی داستانیں پڑھتا ہوں یا ان کے مزارات کو دیکھتا ہوں تو میرا سر عقیدت سے جُھک جاتا ہے اور میرے ہونٹوں پر یہ دُعا اُبھر آتی ہے کہ اَے مالک! میرے وطن کو نظرِ بد سے بچائے رکھیو۔ یہی وہ جذبۂ حُب الوطنی ہے جو گذشتہ برس انگلینڈ کا وہ مشہور قلعہ وِنزر کیاسل جہاں ہندوستان سے لُوٹے گئے تخت و تاج کی نمائش ہوتی ہے، دیکھتے وقت مُجھ سے دامن گیر رہا اور میری حالت یہ رہی کہ ؎

ذہن میں نقشِ ماضی اُبھرتے رہے
اَور احساس مجروح ہوتا رہا
آنکھ اُلجھی رہی منظروں سے مگر
میرے اندر کا مَیں خُون روتا رہا

عُمر کے اس حِصّے میں حالات اور حادثات کی دُھوپ سے میری ہستی کو محفوظ رکھنے والا گھنا درخت تھی، میرے والد کی شخصیّت۔ گھنے درختوں کے ساتھ ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کے سائے میں نشو پانے والے پودے اکثر بونے رہ جاتے ہیں مگر اس کے بالکل برعکس —— میرے والد جناب دینا ناتھ صاحب کی شخصیّت کا گھنا درخت اپنے حِصّے کی آب و ہوا میری طرف منتقل کرتا رہا تاکہ میری کونپلوں کے پھُوٹنے میں اس کا اپنا سایہ کسی طرح بھی مانع نہ ہو۔ لہٰذا میرے ہر شوق کو، میرے ہر ولولے کو، میرے ہر ارادے کو، میری ہر کوشش کو میرے والد نے جِلا بخشی اَور مجھے ہمّتِ مرداں مددِ خُدا، کے مقولے کے معنی سمجھائے ان کا انتقال ہُوا تو میرا قلم رو اُٹھا۔ ؎

دُھوپ آلام کی تا عُمر جلائے گی نزِیش
سر پہ سایہ نہ رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

اِسی زمانے میں میرے قلم کا سفر شروع ہُوا۔ یہ سفر بھی زندگی کے سفر کی طرح کڑی دُھوپ کا سفر تھا۔ چاروں طرف حسد اَور بُغض کی دُھوپ پھیلی ہُوئی تھی۔ فن کے تقاضے اور ریاضت کے مراحل میری راہ میں بِکھرے پڑے تھے اَور مجھے اِن نوکیلے پتھّروں پر سے ہو کر گزرنا تھا۔ اُستاذی مرحُوم مولینا کمال طالب کو ٹلوی کی شخصیّت نے ایک شجرِ سایہ دار کی طرح اپنی چھاؤں مجھے عطا کی تو نہ یہ راہ دُشوار رہی اور نہ یہ سفر مُشکل رہا۔ اُستاد کی فقیرانہ طبیعت اور ایمان پرست طرزِ زندگی نے شعر و شاعری میں ہی میری رہنمائی نہیں کی —— بلکہ کلامِ پاکؐ کے تہ در تہ معانی مجھ پر افشا کر کے میرے اندر ایک نیا اعتماد پیدا کیا کہ رُوح کی طاقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور رُوح کی آواز دُنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ یہ اعتماد میری زندگی کا جُزو بن گیا اور یہیں سے میرے لیے ایک نئے ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سفر دھرتی کے سینے پر کا سفر نہیں تھا، گہرے سمندروں کا سفر تھا۔ سمندر کھنگالنا اَور اس میں سے موتی نکالنا اس سفر کی منزل تھی اور مجھے یہ احساس کچوٹا کرتا تھا کہ ؎

اپنے من میں جھانک کر بھی خود سے بیگانہ رہا
تو حقیقت آشنا ہو کر بھی دیوانہ رہا

یہ منزل ابھی بھی مجھ سے دُور ہے مگر نہ میری رفتار سے بیاباں مجھ سے بھاگتا ہے اور نہ ہر قدم دُوریٔ منزل مجھ سے نمایاں ہے۔ میری رُوح اس سفر کو گہرے سمندر کے سفر کے طور پر طے کر رہی ہے اور میرا ذہن اِسی

سفر ہو اس مقدس دھرتی پر طے کر رہا ہے جسے دُنیا ہندوستان کے نام سے جانتی ہے۔ اس مُلک کے گوشے گوشے میں تہہِ خاک ابدی نیند سو رہے بے نقیب، راکھ بن کر اس خاکِ پاک میں مدغم ہُوئے رِشی مُنی رُوحانیت کی جس شمع کو روشن کر گئے ہیں وہ مشعلِ راہ بھی ہے — اور رختِ سفر بھی۔ رُوحانیت سے فرار کے معنی ان لوگوں نے تراشے ہیں جن کے آئینۂ شعور پر حرص و آز کی دُھول جمی ہوئی تھی۔ بنی نوعِ انسان کی خِدمت، خُدا کے بنائے ہوئے بندوں سے محبت، ہر جسم میں اسی ایک نُور کا جلوہ دیکھنا اور اپنے ہر عمل کو مخلوقِ خداوند کے ساتھ وابستہ کرنا فرار کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کڑی دُھوپ کا سفر ہی تو ہے۔ مگر یہ سفر بہت آسان ہو جاتا ہے اگر روحانیت کے گھنے درخت کا سایہ اپنے سر پر اوڑھ لیا جائے۔

مَیں یہ دعوےٰ نہیں کرتا کہ مَیں نے ان اقدار کو اپنی زندگی میں مدغم کر لیا ہے لیکن یہ دعوےٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ میرے اندر کا شاعر، میرے اندر کا ادیب انتہائی ایمانداری سے ان اقدار کی پاسبانی کر رہا ہے اور میرے قلم کی ہر جنبش کا مقصد انسان اور انسان کے بیچ کے فاصلے کو کم کرنا ہے۔ چونکہ ہندوستان کا ماضی رُوحانیت کے نُور سے تابدار اور انسان دوستی کے جذبے سے معمور رہا ہے، اس لئے میرا قلم یہ کوشش کر رہا ہے کہ عہدِ ماضی کی ان اقدار کو پھر سے زندہ کیا جائے جو ہمارے حال اور ہمارے مستقبل کی بہتری کے ضامن ہیں۔ ہمارا معاشرہ غیر مساوی تقسیمِ زر اور رجعت پرستی کے چنگل سے آزاد ہو کر انسانی برابری کی اس سطح تک بلند ہو جہاں ہر ہاتھ کو کام اور ہر پیٹ کو روٹی نصیب ہو، یہ میرے ادیب کی آرزو بھی ہے اور جستجو بھی۔ انسانی ہاتھوں کی طاقت پر اعتماد اور انسان کی بُنیادی خوبیوں پر میرا یقین میرے ادیب کی راہِ جد و جہد میں کسی کڑی دُھوپ کو سدِ راہ نہیں بننے دیگا چونکہ یہ اعتماد، یہ یقین ایک ایسا شجرِ سایہ دار ہے جس کی شاخیں ماں کی ممتا کی طرح ان حدوں تک اپنا دامن پھیلا کر ہمارے سر پر اپنی محبت کا سایہ کرتی رہتی ہیں جن حدوں تک ہمارے قدموں کی رسائی ہو سکتی ہے۔

غزل

شباب للت

دے کے ذوقِ سخنوری مجھ کو
اُس نے دے دی پیمبری مجھ کو

رات بھر پیاس کے سمندر میں
لے گئی ایک جل پری مجھ کو

گاؤں دیتا ہے آب و دانہ مجھے
شہر دیتا ہے بھکمری مجھ کو

یُوں ہی بے موت مار ڈالے گا
میرا احساسِ کمتری مجھ کو

اس ہوا گھر سے لاکھ بہتر تھی
وہ گپھاؤں کی زندگی مجھ کو

سب نشے کر دیے ہرن اُس نے
کل سُنا کر کھری کھری مجھ کو

اس جہانِ فریب و فن میں شباب
مار ڈالے گی سادگی مجھ کو

وجودِ زن سے ہے...

یوسف ناظم

کہا جاتا ہے ہماری دُنیا میں جتنا بھی رنگ و روغن ہے وہ صرف عورت کے وجود کی بنا پر ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ مردوں کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ تصویرِ کائنات میں اپنی طرف سے کوئی رنگ بھر سکیں۔ زندگی بھر خود اُن کا رنگ اُڑا اُڑا سا رہتا ہے تو وہ غریب کہاں سے یہ کارنامہ سرانجام دے سکیں گے۔ بلکہ ہم تو یہ تک کہیں گے کہ یہ دُنیا قائم ہی ان لوگوں کی وجہ سے ہوئی ہے (اور اس کا تمت بالخیر بھی ان کی وجہ سے ہوگا۔ مرد تو صرف شکریے کی رسم ادا کریں گے) عورت اگر اس دُنیا میں آنا نہ چاہتی تو کیا مردوں کی عقل ماری گئی تھی کہ وہ اِدھر کا رُخ کرتے۔ مردوں کو شروع ہی سے عورتوں کے پیچھے پیچھے چلنے کی عادت رہی ہے اور اپنی اِس عادت کے سلسلے میں انہیں یہاں آنا پڑا۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے مرد تو کہیں اور رہتے تھے۔ وہ تنہا ضرور تھے لیکن محفوظ تو تھے۔ اب مرد تنہائی ڈھونڈتے ہیں اور کوئی گوشۂ عافیت انہیں مِلتا نہیں ہے ہر طرف ایک نہ ایک قوسِ قزح موجود ہے۔ کیوں کہ جب سے وجود میں آئی ہے یہ دُنیا رنگوں کا کارخانہ بنی ہوئی ہے۔

عورت کی پیدائش کا مقصد اختلافِ رائے رہا ہے اور یہی ایک مقصد ہے جس کی تکمیل کی خاطر عورتوں اور مردوں کو کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ مرد اور عورت کبھی ہم خیال نہیں ہو سکتے۔ ہاں اُن دو موسیقاروں کی بات اور ہے جن میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہو اور دونوں مِل کر "خیال" گا رہے ہوں۔ اس کے آگے ان کی ہم نوائی کا سوال نہیں پیدا ہوتا اور موسیقی میں بھی اس ہم نوائی کے لیے انہیں کتنا ریاض کرنا پڑتا ہے یہ اُنہی کا دِل جانتا ہے (دِل دُکھتا بھی ہوگا) دن رات محنت کرتے ہیں۔ گھنٹوں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ تب کہیں جاکر دونوں کے سُر ایک سے نکلتے ہیں۔ موسیقی کو اِسی لیے فنونِ لطیفہ پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ کسی دُوسرے فن میں مرد اور عورت ایک ساتھ نہیں پیش کیے جا سکتے۔

مغربی تہذیب میں عورتوں کو اوّلیت حاصل ہے کوئی جلسہ ہو رہا ہو تو مقرر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں سے پہلے مخاطب کرے حالاں کہ عورتیں اس کی تقریر سُنتی نہیں ہیں وہ یہ دیکھتی رہتی ہیں کہ کس عورت نے کیا پہن رکھا ہے اور بعض وقت تو بڑی مشکل میں پڑ جاتی ہیں کیونکہ جلسے میں کچھ خواتین ایسی بھی نظر آتی ہیں جو صرف لباس پہننے کی شوقین ہوتی ہیں۔ تکمیلِ ضابطہ کی خاطر لباس پہننے کو لباس پہننا نہیں کہا جاتا۔ مقرر صاحبان کو اس طرزِ تخاطب کی اِتنی عادت ہو جاتی ہے کہ جلسے میں اگر صرف مرد ہی مرد ہوتے ہیں تو بھی وہ

خواتین و حضرات ہی کے الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہیں اور مرد سامعین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کس کس کو خواتین سمجھا گیا ہے۔ (ویسے مقرر کی اصل تقریر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی) جلسوں میں مردوں کی تعداد اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ مرد گھر سے باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مقرر کتنا ہی کیوں نہ بولے کبھی نہ کبھی تو خاموش ہوگا۔

عورتوں کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ عورتیں بیحد نرم دل ہوتی ہیں اور ہر عورت کے پاس آنسوؤں کا ایک ریزروائر ہوتا ہے جس سے اس کے قلب کی رقت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ دُنیا کی ہر پائپ لائن خراب ہو سکتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں آسمان سے بھی پانی کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن عورتوں کے ریزروائر کبھی خشک نہیں ہوتے اس لئے ہمارے شاعروں نے بہ غلبۂ آرا ان کی آنکھوں کو ہمیشہ جھیل کہا ہے۔ جن شاعروں نے احتیاطاً عورتوں کی آنکھوں کو جھیل کہنے سے گریز کیا ہے وہ بہر حال اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی آنکھیں ساغر و مینا ہیں خواہ وہ بینائی کے معاملے میں کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں ـــ عورتوں کے نرم مزاج ہونے کے ہم بھی دل سے قائل ہیں۔ ساسوں اور بہوؤں کے آنسو تو کبھی نہیں رُکتے۔ عام طور پر یہ دونوں جب بھی ایک دُوسرے کو دیکھتی ہیں ان کا دِل بھر آتا ہے اور نرم مزاجی کی وجہ سے دونوں کی آنکھوں سے نہریں بہنے لگتی ہیں۔ نندوں اور بھاوجوں کو بھی اِسی قسم کی رقت میں مُبتلا ہوتے دیکھا گیا ہے۔ محبت کی یہ کیفیت مردوں کی قسمت میں نہیں لکھی گئی ہے۔ مرد میدانِ جنگ میں تو کچھ نہ کچھ کر لیتے ہیں لیکن گھر کے صحن میں جن ہتھیاروں کی ضرورت پڑتی ہے وہ مردوں کے پاس نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو وہ ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی ٹیکنیک سے واقف نہیں ہوتے۔ دو آنسو ٹپکانا ان کی جان پر آتا ہے۔ عورتوں کو دیکھئے وہ ہمیشہ اس کے لئے کمربستہ رہتی ہیں حالانکہ کمر ان کی ہوتی ہی کتنی ہے۔

عورتوں کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچنے کے بعد اُن کی عُمر منجمد ہو جاتی ہے۔ وہ جمود جو بالعموم ادب وغیرہ میں آیا کرتا ہے اِن کی عُمر میں آجاتا ہے۔ ویسے اس انجماد سے اُنکی سالگرہ کی تقریبات پر خلل واقع نہیں ہوتا۔ یہ بلاناغہ ہر سال منائی جاتی ہیں کیک بھی آتا ہے لیکن جو وزن اور پیمائش میں پچھلے سال سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے البتہ موم بتیوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ یہ اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ صحیح عُمر دریافت کرنے کے لئے انہیں دو سے ضرب دینا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو صورتِ حال اتنی خطرناک ہو جاتی ہے کہ سالگرہ منانے والی خاتون کی بیٹیاں پریشان ہو جاتی ہیں کہ وہ ان کی کتنی کم سنی کی پیداوار ہیں۔ بہت کم مردوں کو سالگرہ مناتے دیکھا گیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہوگی کہ مردوں کو غلط بیانی کے لئے سالگرہ منانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی مرد دروغ گوئی کے لئے کامل ایک سال صبر نہیں کر سکتا۔

کچھ رِشتے بھی ہیں جو عورتوں ہی کے توسط سے مشہور ہیں۔ مثلاً دو شادی شُدہ مرد، مرد ہونے کے باوجود آپس میں ہم زُلف ہو سکتے ہیں۔ اِس میں اُن کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ہی گھر کی دو بہنوں سے اپنی اپنی شادیاں کی تھیں۔ (ہم زُلفوں کی تعداد دو سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے) اس کے برخلاف دو بھائیوں کی بیویاں آپس میں ہم زُلف نہیں ہو سکتیں کیونکہ زُلف سے منسوب ہونے کے باوجود یہ رشتہ خالص مردانہ رشتہ ہے حالانکہ اب تو مردوں نے بھی اپنی زُلفیں کافی بڑھا لی ہیں اور عورتوں کا جی چاہے تو وہ بھی ہم زُلف کہلا سکتی ہیں ـــ مُشکل یہ ہے کہ "ہم ریش" رشتے کے لئے کوئی موزُوں لفظ نہیں ہے۔ اب دُنیا میں ایسے مرد کتنے ہیں جو داڑھی کا شغل رکھتے ہوں۔ داڑھی ہی ایک چیز تھی جس سے مرد علی الاعلان پہچانے جا سکتے تھے۔ اس سے قطع تعلق کرکے انہوں نے اپنی شناخت کے معاملے میں کافی نقصان اُٹھایا

۔ مردوں کی ثانوی حیثیت کا ثبوت اِس بات سے بھی ملتا ہے کہ خُسر جیسی عظیم شخصیت کو بھی وہ عزت حاصل نہیں ہے جو ساس کو حاصل ہے۔ ساسیں خوش دامن کہلاتی ہیں آج تک کسی خُسر کو خوش کلاہ نہیں کہا گیا۔ مشہور بھی ہوئی تو اُنکی کج کلاہی مشہور ہوئی ـــ یہ بھی بس چند گنے چُنے لوگوں کی حد تک محدود تھی۔ لوگوں کا جی چاہتا تو انہیں خوش کلاہ نہ سہی خوش قبا کہہ سکتے تھے لیکن جی چاہتا تب نا ـــ اِسی لئے مردوں کا رنگ کبھی نہیں جما۔

جمتا بھی کیسے۔ نہ یہ اپنے ناخن رنگتے ہیں نہ ہونٹ۔ مہندی جیسی نرم و نازک شے سے بھی انہیں دلچسپی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ لگایا تو خضاب لگایا اور خضاب کا رنگ بھی کوئی رنگ ہے۔ ہاں مردوں نے رنگین شاعری ضرور کی۔ عورتوں کے سراپا کے بارے میں ڈھیروں اشعار کہہ ڈالے انہیں رنگوں میں نہلا دیا ــــ عارض شہابی رنگ کے عرض کر دیئے تو ہونٹوں کو یاقوت فرما دیا۔ زلفیں سنہری رنگ میں ڈبو دیں اور آنکھوں کو دریائے نیل کے پانی سے تر کر دیا۔ کسی کے چہرے پر سبزہ اُگا دیا تو کسی کو چمپئی یا صندلی بنا دیا ــــ وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں رنگ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اس میں عورتوں کی کوشش کم اور مردوں کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

عورتیں رنگوں کے معاملے میں بے حد سخت گیر ہوتی ہیں۔ کھانا خراب پکے (بلکہ نہ بھی پکے) تو انہیں پرواہ نہیں۔ گھر کی کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہے تو کہیں گی ایسی کیا آفت آ گئی۔ بچوں نے اگر ہوم ورک نہیں کیا تو وہ اسے ان کے والد کی ذمہ داری قرار دیں گی لیکن اگر ان کے لباس، کان کے بُندوں، ناک کی کیل، پیشانی کی بندیا، ہاتھ کی چوڑیوں اور پاؤں کی چپلوں کا رنگ ایک دوسرے سے میل نہ کھائے، تو وہ اس کے لئے زمین آسمان ایک کرنے میں دریغ نہ فرمائیں گی۔ ہم نے کتنی ہی خواتین کو اس سلسلے میں ایک بازار سے دوسرے بازار اور ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ (وہ تو اور بھی آگے چلی جاتیں لیکن اس سے آگے جانے کے لئے پاسپورٹ درکار ہوتا ہے) لیکن سچ یہ ہے کہ جہاں تک رنگوں کی بات ہے اس میں صرف عورتیں قصوروار نہیں؛ ہمارا سماج خود رنگوں پر فریفتہ ہے۔ عورت سے رنگوں کے انتخاب میں کوئی غلطی ہو جائے تو سماج اسے کبھی معاف نہیں کرتا کیونکہ عورتوں کی تخلیق کا مدعا یہی ہے کہ وہ کائنات کی تصویر میں ٹھیک سے رنگ بھرتی رہیں اور مردوں کی تخلیق کی غرض و غایت شاید یہی ہے کہ وہ ان خواتین کے آگے پانی بھرتے رہیں۔

خواتین کو اس طرح رنگوں کے سلسلے میں فکرمند ہوتے دیکھ کر ہمارے چند عم دل (لیکن ذہین) دوکان داروں نے تو اپنی دوکان کا نام ہی میچنگ سنٹر رکھ چھوڑا ہے۔ شروع شروع میں تو شہر کے نوجوانوں میں کچھ ــــ یعنی تھوڑی بہت غلط فہمی بھی پھیلی کیونکہ یہ چیز غلط فہمی ہمارے یہاں ذرا جلدی پھیلتی ہے اور اس غلط فہمی کے نتیجے میں ہمارے نوجوانوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انہیں ان کا "میچ" یہیں کہیں مل جائے گا ــــ کچھ "اسپورٹسمین" قسم کے نوجوان تو یہ بھی سمجھے کہ یہاں کوئی نہ کوئی میچ ہوتا رہتا ہے لیکن وہاں انہیں ایسٹ اسٹینڈ یا نارتھ اسٹینڈ نظر نہیں آیا ــــ رنگوں نے اب اتنی زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے کہ خواتین (مشرقی) آنکھوں کو اپنے لباس کے ہم رنگ بنانے لگی ہیں جس خاتون کی آنکھوں کو آپ سنیچر کے دن سبز رنگ کے غلاف میں دیکھیں گے انہی غلافی آنکھوں کو آپ اتوار کے دن نیلے رنگ کا پائیں گے۔ عورتوں کی آنکھیں اسی طرح بدلتی ہیں لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مشہور یہ ہے کہ مرد کی آنکھ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ یہ سب وجودِ زن کے کرشمے ہیں۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے ؎

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مردوں کے چہرے بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ بہتوں کے چہروں پر کچھ نہیں لکھا ہوتا ہے باوجود اس کے کہ ان کا چہرہ کتابی ہوتا ہے لیکن بہت سے چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر تبدیلیاں اپنا رنگ دکھاتی رہتی ہیں۔ جب بھی رائے دہندگی کا موسم نزدیک آتا ہے امیدواروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

اِن کی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم
اِک رنگ آ رہا ہے اِک رنگ جا رہا ہے

امیدواروں کی فہرست بھی اب زیادہ رنگین ہوتی جا رہی ہے کیونکہ یہی ایک میدان ایسا ہے جس میں وجودِ زن کی بہتات بافراط ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے کے دن گئے اب "مرد" عورتوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ یوں تو دفاتر بھی اب مدرسوں اور کالجوں کی طرح مخلوط ہو گئے ہیں۔ اور یہ سب نمودِ زن سے متاثر ہیں لیکن اس میدان کی بات ہی اور ہے یہ کسی چار دیواری سے محصور نہیں ہوتا۔

عورتیں پہلے صرف پن گھٹ پر جایا کرتی تھیں اب سارے گھاٹ

ان کے قدم بہ قدم منفیت لازم سے کچھ کچھ فیض پاتے ہیں۔ پہلے عورتوں کو مردوں پر بہت بھروسہ تھا لیکن اب یہ ان سے بدظن ہو گئی ہیں وہ ہر جگہ اپنی نمائندگی خود کرتی ہیں بلکہ بہت سی جگہیں تو ایسی بھی ہیں جہاں عورتیں، مردوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مردوں نے اپنا سب کچھ انہیں کے حوالے کر رکھا ہے۔ دنیا کی تصویر میں پہلے یہ رنگ ذرا ہلکا تھا اب یہ شعلے کی طرح چمکتا ہے مردوں سے اگر کسی تصویر میں رنگ بھرنے کو کہا جائے تو وہ نہایت تکلف سے اور بڑی احتیاط سے برش کی نوک سے اس طرح رنگ بھرتے ہیں گویا کینوس کو رنگ منگھار رہے ہیں۔ عورتیں تحمل سے کام نہ لیکر فراخ دلی کا مظاہرہ کریں گی۔ وہ بھی اگر ان کا جی چاہا ورنہ کینوس پر رنگ انڈیل دینے میں بھی تامل نہیں فرمائیں گی۔

وجودِ زن کی اہمیت اس لئے بھی مستزاد ہو گئی ہے کہ مرد کی پسلی نے صرف ایک ہی مرتبہ کام کیا تھا اب مرد عورتوں کے دست نگر ہیں اس لئے اگر تصویرِ کائنات میں صرف تصویر کے فریم کے کام کے رہ گئے ہیں تو اس میں قصور عورتوں کا نہیں ہے۔ ●

شانؔ بھارتی

غزل

دھرتی سے آکاش میں چھانے والی تو
دریاؤں کی پیاس بجھانے والی تو
ساحل پر بھی ناؤ ڈبونا فن میرا
جذبوں میں طوفان اٹھانے والی تو
دن بھر سورج آنکھ میں بھرنے والا میں
شب بھر رنگیں خواب سجانے والی تو
میں تقدیر کا مارا اپنے حال پہ خوش
تدبیروں سے کام چلانے والی تو
روزِ ازل کے سوکھے ہونٹ کہاں لے جاؤں
دریا دریا پیاس جگانے والی تو

حرفِ آغاز صٓ سے آگے

دیئے ہیں۔ ان میں سے ۱۲ کروڑ روپے ٹیوب ویل کنکشنوں کے لئے، ۵ کروڑ روپے سڑکوں کی مرمت کے لئے، ۴ کروڑ روپے پینے کے صاف پانی کی سپلائی وغیرہ کے لئے دیے گئے ہیں۔ ریاست میں پانی کے مسائل والے ۵۲۹۰ گاؤں میں سے ۴۰۰۰ گاؤں کو واٹر سپلائی کی سہولتیں میسّر ہو چکی ہیں۔

بینک قرضوں کی معافی کا ذکر کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ کسی بھی وزیرِ اعلیٰ کو ایسے اختیارات حاصل نہیں۔ اگر کبھی یہ اختیارات ملے تو میں بینک قرضے معاف کرنے والا پہلا وزیرِ اعلیٰ ہوں گا۔

جناب بنسی لال نے علاقے کے لوگوں کی کافی مانگیں منظور کر لیں جیسے کہ ڈھنڈ میں بس اسٹینڈ کی تعمیر، سیوریج سکیم، واٹر سپلائی سکیم اور کول میں ۱۳۲ کے۔ وی پاور سب اسٹیشن وغیرہ۔

اِس موقع پر مقامی ایم۔ ایل۔ اے اور سٹیٹ پلاننگ بورڈ کے ڈپٹی چیئرمین جناب ایشور سنگھ نے وزیرِ اعلیٰ کی خدمت میں ۱۰ء۱۱ لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی، جسے وزیرِ اعلیٰ موصوف نے پردیش اور ڈسٹرکٹ کانگرس کو دے دیا انہوں نے عوام سے علاقے کی خوشحالی کے لئے حکومت سے تعاون کرنے کی اپیل کی۔

فارسٹ منسٹر جناب اوم پرکاش، کوآپریشن منسٹر جناب پیارا سنگھ سٹیٹ پلاننگ بورڈ کے ڈپٹی چیئرمین جناب ایشور سنگھ اور ممبر پارلیمنٹ جناب چرنجی لال نے بھی اِس جلسہ کو خطاب کیا۔

●

غزل

تصویر ہے دُھندلی مری موہوم ہے خاکہ مرا
صحرائے احساسات میں گُم ہوگیا ذرّہ مرا

تحریرِ باطل بن گئی اُجلے صحیفوں کی زباں
لکھا درو دیوار پر جب وقت نے چہرہ مرا

جلتی ہوئی سانسوں کو تھیں امن و اماں کی خواہشیں
خورشید سے ٹکرا گیا اِس دُھوپ میں سایہ مرا

میں پھر یقینِ ذات کی محدُود تر دُنیا میں تھا
ٹُوٹا جو میری رُوح سے ٹکرا کے اندیشہ مرا

موسم نے میری خاکِ دل دیدی ہوا کے ہاتھ میں
مِٹتی رہی ہستی مری بڑھتا رہا رُتبہ مرا

ہر شکل کو پڑھتا رہا ہر رُوح کو لکھتا رہا
اِس بھیڑ میں گُم ہوگیا اِک دیدۂ نغمہ مرا

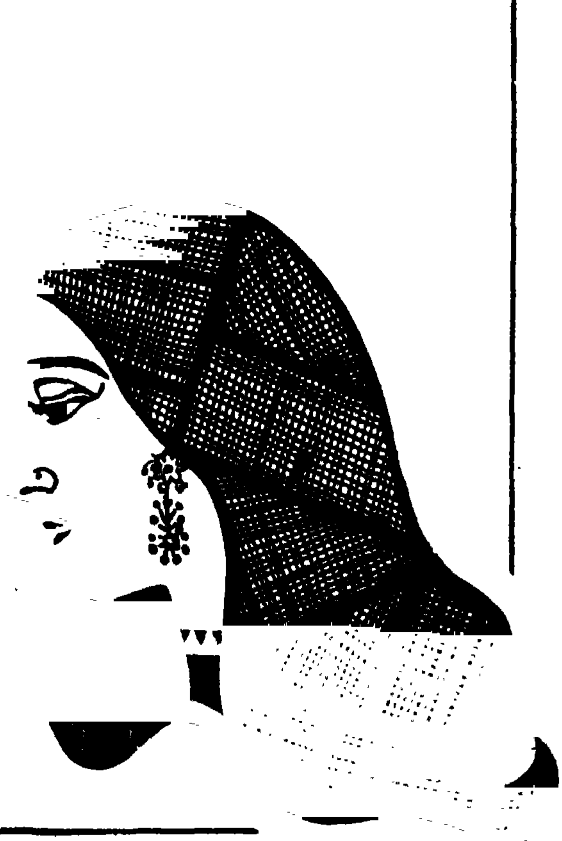
جو کچھ ہُوں اپنے آپ میں ہُوں ایک شاخِ بے ثمر
کوئی بھی اِن حالات میں کہتا نہیں قصّہ مرا

ہر آنکھ فِکرِ خواب میں ہر جسم گہری سوچ میں
اَب کوئی بھی اِس شہر میں تکتا نہیں رستہ مرا

ڈرتا ہُوں اپنے آپ سے بدظن نہ ہو جاؤں کہیں
اَے کاش کوئی توڑ دے بے نُور آئینہ مرا

میرا وجُودِ نارسا ہر آنکھ کی دَولت بنا
احساسِ غم نے رکھ دیا ہر جسم پر چہرہ مرا

میں بے امان و بے یقیں پرواز اپنی زد میں تھا
بننا پڑا آنسو مجھے تھا یہی سرمایہ مرا



نمیر پرواز

افسانہ

اختر آزاد

بابل کا مینار

مجھے اِس قبر میں صدیاں بیت چکی ہیں، اور آج پھر میری آنکھوں کے سامنے وُہی منظر ہے...... وُہی، جو میں نے صدیوں قبل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مینار ——

بابل کا مینار ——

جب پرندوں کے تازہ پنکھ نکل آتے ہیں، تو وہ کافی اونچائی پہ پرواز کرنے کے خوابوں میں اسیر ہو جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے تو اُن کے پنکھ لہُولہان ہو جاتے ہیں، اور وہ پلک جھپکتے ہی آکاش کی بلندیوں سے گر کر زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔

بالکل وہی منظر......

اُن کے بازوؤں میں قوتِ پرواز کے حوصلے سرگرم تھے، بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں، دماغ کے تاریک کمروں میں روشنیوں کا مینار اپنی تیز شعاعیں ڈالنے لگا تو انہوں نے بے چین ہو کر زمین کے ایک وسیع خطے میں اِس مینار کی بُنیاد ڈالی۔

کام جاری تھا.... اینٹ، پتھر، بالو، سیمنٹ اور چھڑ لیے مزدور کسی آٹومیٹک مشین کی طرح محوِ رقص تھے —— مینار کی بُنیاد پڑتے ہی چند ایک لوگوں کی آنکھیں حیران ہو اٹھیں۔

فرش سے عرش کا لامتناہی سفر........ واقعی یہ بات تعجب خیز تھی! بھلا کوئی کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا؟......

لیکن چند ایک کی آنکھوں سے خوشیاں بوند بوند ٹپک کر دھرتی کو سیراب کرنے لگی تھیں، اور اِس سیرابی نے کچھ دنوں کے بعد دھرتی کے بطن پر جنتی پھول کھلا دیے تھے۔

ہوا،

پانی،

خلا،

سفر میں اِن لوگوں کو کافی کامیابیاں مِلیں، جن سے اُن کے گوشت کے لوتھڑوں میں غرور کا نشہ طاری ہو گیا..... وہ لوگ راکٹ کے دُھوئیں کی طرح اپنی کامیابیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے قدیم اسرار سے نیلگوں دبیز پردوں کو اٹھانے کے لیے رواں دواں تھے..... اُن لوگوں کے انوکھے پلان پر ساری دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں، وہ لوگ ساری دُنیا کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا رنگ گھول کر، ہر ایک سے پرے، اپنا منفرد مقام بنانے کے خواب کا منظر نامہ ترتیب دے رہے تھے — تاریخ کے اوراق میں سُنہری حرفوں سے ایک ایسے باب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے، جن پر نظریں پھسلتے ہی ہر دور کی آنکھیں لہُو لہان ہو جائیں۔

مینار کی تعمیر کا کام شباب کے زینے طے کر رہا تھا۔

وقت کے مختصر سے حصّے میں اُن لوگوں نے اپنی محنت و لگن اور اپنے دماغی کیڑوں کی مدد سے مینار کی کئی منزلیں تیار کر لیں۔

لوگوں کے مُنہ سے مُسرتوں کے لاوے اُبل رہے تھے۔

اور آنکھیں ......

چمکتی ہوئیں ——— !

پھسلتی ہوئیں ——— !!

پھیلی ہوئیں ——— !!!

ٹھہری ہوئیں ——— !!!!

طلوع اور غروب ہو رہی تھیں، لیکن ان کا تاریخ کے اوراق میں کوئی ذکر نہ تھا۔

مینار شباب کے زینے عبور کر رہا تھا، اور سُوکھے شجر ثمر آور ہو گئے تھے، لیکن اُن پھلوں میں مِٹھاس کی جگہ غرور و تکبر کی کھٹاس شامل تھی۔

"اِنسان کے لئے اَب کچھ بھی ناممکن نہیں ہے ......"

ایک نے مینار کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت! ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مینار کے ہاتھ پاؤں لمبے ہوتے چلے جائیں، اور ایک دِن ...... اچانک نیلگوں سمندر میں کوئی بھیانک طوفان آجائے، پھر فتح کس کی ہوگی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا ...... وُہ خواب جو برسوں ہماری آنکھوں نے بُنا ہے، حقیقت کا رُوپ لے کر ہماری آنکھوں کے سامنے کروٹیں بدلے گا یا نہیں ....."

یونہی وقت کے دھارے میں مینار اپنا قد اُبھارتا رہا، اور واقعی قد آور لگنے لگا۔

"اچھا! تم بتاؤ اِس مینار کے بننے میں کتنے دِن لگیں گے؟"

"اِتنے کم عرصے میں مینار کی اتنی منزلیں تیار ہو گئی ہیں، اور ایک منزل کی اُونچائی اتنی ہے، اور فرش سے عرش کی دُوری اتنی ہے ...... اِتنے تو دِن لگ ہی جائیں گے۔"

"ارے واہ! تب تو اِتنے دِن کے اندر ہم لوگ عرش کی سیر بھی کر آئیں گے۔"

"بڑا مزہ آئے گا ....."

"ہاں، کیوں نہیں ...... مزہ تو آئے گا ہی کہ جنت اور جہنم ہمارے دو ہاتھوں میں دھرے ہوں گے۔"

"وُہ دیکھو مینار ...... کِتنا خوبصورت بنتا جا رہا ہے۔"

"آخر بنانے والا ہے کون؟ ....."

پھر قہقہوں کی موسلا دھار بارش،

فضا میں سرور کا نشہ،

مینار اب شباب کے زینے عبور کر چکا تھا۔

"اے مُرشد! بتاؤ کہ کیا واقعی اِس نیلی چھتری کے اُوپر کوئی رہتا ہے؟" مُرید نے مُرشد سے دریافت کیا۔

"لگتا ہے دِن رات گندے خواب دیکھنے کی وجہ سے تمہارے ذہن میں کوئی ایسا زلزلہ آگیا ہے، جس سے تمہارے دماغ کی اینٹیں اپنی جگہ سے پرے کِھسک گئی ہیں ...... جاکر غسل کرو اور پاک و صاف ہو جاکہ یہ سب ناپاکی کے اثرات ہیں۔"

دونوں مینار کی سیڑھیوں پہ چڑھتے رہے۔

باتیں گروہوں میں بٹے لوگوں کے بیچ، اور گھروں میں اپنی بیویوں کی قربت کی کشش میں اسیر لوگوں کے درمیان ہوتی تھیں، اُبھرتی تھیں، اور فضا میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔

"یہ ساری باتیں فضول اور بے بُنیاد ہیں ...... میں نے لوگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ نیلی وسعتوں کے پیچھے کوئی چُھپا بیٹھا ہے، اُسی نے اِس دُنیا کی تخلیق کی، اور ہم انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا ......"

"میں نے بھی ایسا ہی سُنا ہے، کیا اِس کا حقیقت سے ...."

"میں اِس بات کو نہیں مانتا کہ کسی نے ہمیں بنایا ہے ... میں پُوچھتا ہوں اگر کسی مُصوّر نے مٹی کے کھلونوں میں جان ڈال کر میرے وجود کی تخلیق کی ہے، تو وہ ہے کہاں؟ ...... کبھی تو اُسے میری آنکھیں دیکھتیں ......" پھر اُس نے اچانک رُک کر پہلے والے سے سوال کیا۔

"کیا تمہاری آنکھوں نے اُس مُصوّر کو دیکھا ہے؟"

"نہیں ......"

"تو پھر میں کیسے یقین کروں ...."

"مت کرو ...... لیکن تم نے اپنے باپ کو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"نہیں دیکھا، کیونکہ میری پیدائش سے قبل ہی وہ کسی آمد کے ساتھ فرار ہوگیا تھا۔"

ہاہا، ہی ہی ....

ہی ہی، ہاہا ....

"اِس مینار کو دیکھ رہے ہونا ...... " ایک ٹھگنے نے مینار کی چکنی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ یہ ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت و لگن کا ثمر ہے۔ اگر مینار کی آنکھیں ہوتیں تو وہ آنکھیں ہم سبھوں کو ضرور دیکھتیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری وہ آنکھوں میں اتنی روشنی نہ ہو کہ ہم انہیں دیکھ سکیں۔" ایک کُتے جیسی صورت والے نے بھونکتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار .... " ٹھگنے نے بُرا سا مُنہ بنایا۔ اپنے سامنے پھیلی ہوئی تمام چیزوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اپنی آنکھوں کے صحیح ہونے کا خود کو یقین دلایا۔ پھر کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"اچھا! تم ہی بتاؤ کہ اُس نے ہمیں کس طرح پیدا کیا؟" فلسفی نے سوال اُچھالا۔

"معلوم نہیں ...... " عقل کے کورے نے ہولے سے کہا۔

"تو پھر تمہیں معلوم کیا ہے، کچھ بھی نہیں ...... کان صاف کر کے سُن لو .... مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا ...... اور ہاں ایک انسان کا وجود انسان کے لہو سے جُدا نہیں ...... یہ لہو نہ ہو تو پھر وہ جرثومہ نہیں ہوگا جس نے بندر کو انسان بنایا ......"

"مجھے لگتا ہے تمہارے اندر ڈارون کی رُوح سما گئی ہے ..."

مینار اپنے آخری مرحلے میں تھا ...... فرش اور عرش کے بیچ سے دُوریوں کا لامتناہی سلسلہ معدوم ہو رہا تھا۔ اُن کے جسموں سے غرور اور اَنا کے دُھویں نکل کر فضا کو تاریک بنا رہے تھے، پھڑ پھڑاہٹوں کی آوازیں ہواؤں میں تحلیل ہو کر ہر جہت بکھر رہی تھیں۔

"اب کوئی بیرونی قوت، انسانی وجود کو عرش کی سیر کرانے سے نہیں روک سکتی۔ اگر کسی نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تو ہماری قوت اُس طاقت کو کسی گہرے سمندر میں دفن کر دے گی۔"

"یہ ایک چیلنج تھا ......"

"چیلنج ......"

"میری طاقت کا لوہا ساری دُنیا نے مانا ہے، انتظار کا سُورج بھی غروب ہو رہا ہے، اُس گمنام وجود پر سے اب تاریکی کی دبیز چادر سرکنے ہی والی ہے، کیونکہ ہم لوگ عرش کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اگر اُس کے وجود کا حقیقت سے رشتہ ہے ......"

"تو وہ کہاں ہے؟"

"کس جگہ ہے؟"

"کس حالت میں ہے؟"

"اُسے میری آنکھیں بآسانی دیکھ لیں گی، پھر ایک ملاقاتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ......"

"انٹرسٹنگ ......" صحافی نے ہواؤں میں ہاتھ اچھالا اور آسمان کی طرف ناتحلنہ مُسکراہٹ سے دیکھا۔

"عرش پر بھی ہمارا جھنڈا لہرائے گا ......" ایک بھیانک قہقہہ لگاتا ہوا غرایا۔

"اسٹار وار STARWAR"

"نہیں، ہاں نسل در نسل عرف خُدا کے مُنکر پیدا ہوں گے" دوسری طرف سے خبر آئی۔

ہر سمت قہقہوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا ...... مسرتوں اور فتح مندی کی بوندیں اُن کے جسموں سے برس رہی تھیں ...... غرور و تکبر کا رنگ اُن کے وجود پر غالب تھا ...... اُن کے قدم فرش سے خلاؤں میں منتقل ہو چکے تھے ......

فاصلے سمٹ گئے ...... مگر اب بھی عرش اور فرش کے بیچ فاصلے کی ایک ہلکی سی لکیر موجود تھی۔

ذرا دیکھو تو ہمیں ...... ہمارے بدن پر کتنے بڑے بڑے پنکھ اُگ آئے ہیں ...... اور اب ہم عرش کے کتنے قریب آ گئے ہیں ...... ہم لوگوں کی برسوں کی محنت ......

ہا ــــ ہا ــــ ہا ــــ،

ہی ــــ ہی ــــ ہی ــــ،

ہو ــــ ہو ــــ ہو ــــ،

نیلی وسعتوں کے اُس پار والے نے جب اُن لوگوں کی عجیب وغریب حرکتیں دیکھیں تو اُن کے وجود سے ایک کرن پھوٹنے لگی ......

پسِ منظر.........

نایاب مینار .... سمٹتے فاصلے ...... طویل راستے.... کلبلاتے دماغی کیڑے ...... چادر سے نکلے ہوئے پاؤں..... عرش کی بے شکن دھرتی پہ لہو کے جگہ جگہ بے شمار دھبے ...... عرش پہ لہراتا ہوا فرش کا جھنڈا .... اپنے اصول وقوانین کی موت ...."

"یہ سب بھلا وہ کیسے برداشت کرتا؟ ____

"کیا اسی دن کے لئے اُس نے دُنیا میں انسانوں کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا تھا...... اُن کے بازوؤں کو مضبوط کیا تھا۔"

دفعتاً طوفان کے آثار نمایاں ہوئے .... بارش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ...... مگر اُن لوگوں پر اس بارش اور طوفان کا تھوڑا بھی اثر نہیں پڑا، اور وہ لوگ پہلے ہی کی طرح مگن رہے۔ ...... اخبار، ٹیلی ویژن، ریڈیو چلا رہے تھے، اسٹار وار (STAR WAR)

یکایک ہوائیں پاگل ہو اُٹھیں...... عمارتیں نیست و نابود ہوتی چلی گئیں...... اشجار سجدہ ریز ہو گئے ...... مینار طوفان میں جھومتے ہوئے درخت کی مثال پیش کرنے لگا...... اُسکی اوپری پرت کرچیوں میں تبدیل ہو کر رُوئی کے گالوں کی شکل میں، فضاؤں میں اُڑنے لگی، اور تیرنے لگی، اور ہچکولے کھانے لگی......'

زوال کا وقت سرکتا ہُوا سر پر آن کھڑا ہُوا..... سُورج چھوٹے چھوٹے آگ کے گولے برسانے لگا........ زمین و آسمان نے اَنگنت سمندروں کا مُنہ کھول دیا........

انسانیت کی کشتی ہچکولے کھانے لگی......

پہاڑ، پٹھار، میدان اپنی شکل کھونے لگے۔

چیخ و پکار کی آوازیں ہر سمت سے اُچھالی جانے لگیں۔

زمین کی جل تھل سطح پر لاشیں تیرنے لگیں۔

پھر سمندر میں گہرا سکوت...... گہری خاموشی...... ایک ایسی خاموشی کہ جو اس وقت بھی تھی جب دھرتی کے اسرار پر تاریک غلاف چڑھا ہُوا تھا اور خُدا کا وجود تھا۔

اَب مینار فنا ہو چکا ہے اور وہ سب بھی جنہوں نے اپنے تازہ پنکھوں پہ بھروسہ کرتے ہوئے آسمان کی نیلی وسعتوں کو کھنگالنے کا تہیہ کیا تھا، لیکن آج بھی میری آنکھیں سلامت ہیں، اور یہ قبر بھی ......! جو میری جائے پناہ ہے۔ پتہ نہیں میری یہ آنکھیں اب کن منظروں سے گزرنے والی ہیں کہ آسمان پر آج بھی سورج اور چاند چمک رہے ہیں، اور ستارے اپنے جھرمٹوں میں اسرار کے بے پناہ امکانات سمیٹے ہوئے مُسکرا رہے ہیں، اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دھرتی پہ اُسی جگہ جہاں کہ وُہ مینار ہُوا کرتا تھا، وہیں پر ایک معصوم بچّہ اپنے انگوٹھے کو مُنہ میں دیئے آسمان کی نیلی وسعتوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ لیکن ابھی اُس کے پنکھ نہیں نکلے ہیں____!

خُمار جالندھری

غزل

حسیں دَور، وُہ دلچسپ زمانے بدلے
شبِ رنگیں کی مہک، دِن بھی سُہانے بدلے
میرے چہرے پہ شکن آئی نہ پھر بھی کوئی
رنگ کیا کیا نہ زمانے کی ہوا نے بدلے
پھر بھی تجھ سے نہ مُلاقات کی صُورت نِکلی
زندگی! ہم نے کئی ٹھور ٹھکانے بدلے
بھُول کو بھُول سمجھنا نہیں فِطرت اُن کی
وُہ تو گِن گِن کے چکاتے ہیں پُرانے بدلے
آپ بدلے ہیں تو ہر شئے میں تغیّر آیا
آپ کیا بدلے، زمانے کے زمانے بدلے

غزلیں

مہیش پٹیالوی

جس سے شبِ حیات ضیا پوش ہو گئی
جانے کہاں کرن وہ گھٹاؤں میں کھو گئی
دستک کے انتظار میں جاگی جو رات بھر
لگ کر درِ فراق سے آخر وہ سو گئی
گھر کی ہوا ہو چاہے وہ عورت کی لاج ہو
آئی کبھی نہ لوٹ کے اِک بار جو گئی
دامن پسارا جس کے لئے ہم نے عمر بھر
پھولوں کے بدلے شاخ وہ کانٹے چبھو گئی
کاٹیں کہاں سے فصلِ بسنتی رُتوں کی ہم
موجِ صبا تو بیج خزاؤں کے بو گئی
کِس درجہ بد نصیب تھی وہ موجِ شامِ زیست
نیلے سمندروں کی تہوں میں جو کھو گئی ہے
ہوگا کبھی نہ ختم تمنا کا یہ سفر
گھر کو چلو مہیش بڑی دیر ہو گئی ہے

○

قُرب چھینئے نہ فاصلے چھینئے
صرف رِشتوں کے سلسلے چھینئے
جن سے رِشتوں کے سلسلے چھینئے
اُن سے ہرگز نہ فاصلے چھینئے
زِندگانی تو کورا کاغذ ہے
رنگ بھرنے ہوں حاشیے چھینئے
یاد کرنا کوئی محال نہیں
بھول جانے کے حوصلے چھینئے
کیسی بندش کہاں کا حُسنِ خیال
شعر کہنے کو قافیے چھینئے
اِک چراغِ جمالِ طور مہیش
گھر کی دہلیز کے لئے چھینئے





غزل

ظفر مُرادآبادی

اہلِ نظر کے ظرف سے بڑھ کر نہ اُٹھ سکا
بازارِ فکر و فن کبھی اُوپر نہ اُٹھ سکا

شاعر اِک بُوئے گُل کی بھی تجسیم کر گئے
یعنی مصوّروں سے جو منظر نہ اُٹھ سکا

بے داغیوں پہ اپنی پشیمان تھا بہت
وہ شیشہ، جس پہ کوئی بھی پتھر نہ اُٹھ سکا

تہذیب بے لباس ہُوئی سب کے رُوبرُو
کوئی بھی لے کے درد کی چادر نہ اُٹھ سکا

تھی زندگی ہی زَد پہ خرابے میں شوق کے
دِل جس نے ہارا، جان بچا کر نہ اُٹھ سکا

غزل

مجبُور جالندھری

زورِ طُوفاں کا ناخدا جانے
یا کوئی ڈُوبتا ہُوا جانے

مَوت سے روز کھیلتے ہیں ہم
زِندگی کیا ہے یہ خُدا جانے

کِتنی گہری تھی زِندگی کی ندی
یہ تو میرا ہی حوصلہ جانے

سوچ کے اَدھ کھُلے دریچوں سے
کون رہتا ہے جھانکتا جانے

اپنی مجبُوریوں میں قَید ہُوں میں
کیسے مجبُور وہ ہُوا جانے

ڈاکٹر حیات افتخار

ایک چادر میلی سی

ایک مطالعہ

جدید افسانوی ادب کا خمیر جن عناصرِ اربعہ سے تشکیل پایا ہے، وہ ہیں: کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی۔ ان کی تخلیقات نہ صرف اُردو افسانوی ادب کی روایت کا اٹوٹ حصہ بن گئی ہیں بلکہ یہ نئی روایات کو جنم دینے کا باعث بھی رہی ہیں۔ اپنی بعض منفرد خصوصیات کی بناء پر جہاں یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہیں ان کے درمیان بعض مشترک خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اُن کے دو گروپ بنائے جا سکتے ہیں۔ جن میں ایک کرشن، بیدی گروپ اور دوسرا عصمت، منٹو گروپ کہلائے گا۔ لیکن ان میں بیدی کو یہ امتیاز و انفرادیت حاصل ہے کہ وہ مقابل گروپ میں بھی شامل ہونے کے مستحق قرار پائیں گے۔ ایک طرف وہ ترقی پسند تصورات کو فکری بلندی اور جذباتی دروبست کے ساتھ پیش کرنے میں کرشن چندر کے ہم پلہ قرار پائیں گے تو دوسری طرف فنی لحاظ سے ان کا شمار منٹو کے ساتھ کیا جائے گا۔ بلکہ بقول ڈاکٹر صادق "راجندر سنگھ بیدی اِس لحاظ سے کرشن چندر کے بجائے منٹو سے زیادہ قریب ہیں کہ وہ حقیقت کے اظہار کے لیے کوئی رومانی پیرایۂ بیان اختیار نہیں کرتے، تلخ حقائق کے بیان کے لیے سبک اور شیریں زبان استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے فکر و فن کے لحاظ سے جِس ضبط و توازن کا ثبوت دیا ہے وہ انہی سے مخصوص ہے"[1]

راجندر سنگھ بیدی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور اِسی لحاظ سے افسانوی ادب میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل ہے لیکن اُردو ناولوں کی دُنیا میں بھی ان کی ادبی حیثیت کسی طور کم نہیں ہے۔ بہ حیثیت ناول نگار بھی وہ عظیم تھے۔ اُن کے صرف ایک ناول "ایک چادر میلی سی" کو تقریباً تمام ناقدین نے اُردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیا ہے۔ جسے اپنی تکنیک اور مختصر سے کینوس کی بنا پر ناولٹ تسلیم کیا جاتا ہے چونکہ ناولٹ بھی ناول ہی کی ایک شکل ہے اس لیے اسے بھی ناولوں کے زُمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا یہ فن پارہ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار شایع ہُوا۔ اِس کا بنیادی موضوع ایک ہندوستانی عورت ہے۔ ہندوستانی عورت،

[1] ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ۔ ص ۱۵۴

دنیا کی ہر عورت کی طرح مجموعۂ اضداد یعنی بیک وقت شعلہ و شبنم اور زہر و تریاق ہونے کے باوجود اس وجہ سے دیگر خواتینِ عالم میں ممتاز ہے کہ یہ ایثار و قربانی کا مجسمہ بھی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دیوی کہلانے کے باوجود عورت رہنا ہی پسند کرتی ہے۔ اس معاملے میں وہ اتنی حساس ہے کہ اس پہ لاجونتی ہونے کا شبہ ہوتا ہے یعنی چھوئی موئی کا ایسا پودا جو ہاتھ لگانے سے کمہلا جائے اور صبر و قناعت کی ایسی دیوی جو "اپنے دکھ مجھے دیدو" کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ عورت کی اسی متضاد فطرت کو نمایاں کرنا بیدی کے فن کا شعار ہے اس ناول میں بھی ہندوستانی عورت کی اسی فطرت کو نفسیاتی اور سماجی پس منظر میں ابھارنے اور اس کے ذریعہ سماجی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھانے کی سعی نظر آتی ہے۔ بیدی عورت کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ اسے انہوں نے سماجی حقیقتوں کا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے۔ آل احمد سرور نے بجا طور پر بیدی کی حقیقت نگاری کو نفسیاتی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا ہے۔[1]

بیدی کے فن کی فکری بنیاد عورت کے تصور پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر افسانوں کا مرکزی موضوع عورت ہی ہے اور مرد کا کردار صرف اُن کے جذباتی اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی پیچ و خم کو مزید نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے اس کی نمائندہ مثال ان کے شاہکار افسانے "گرم کوٹ" "گرہن" "لاجونتی" "کوکھ جلی" اور "اپنے دکھ مجھے دیدو" وغیرہ ہیں۔ اس ناول کا مرکزی موضوع بھی عورت ہی ہے ایسی ہندوستانی عورت جو اپنے کمزور کاندھوں پر دکھوں کا بوجھ اور غم کے پہاڑ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کا زہر بخوشی پینے کے لئے راضی ہے۔

اِس ناول کے مرکزی کردار رانو کی صورت میں بیدی نے ہندوستانی عورت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردی ہے۔ رانو کے دکھ درد، ہنسی خوشی، جذباتی کشمکش اور نفسیاتی پیچ و تاب کے اردگرد اس ناول کی کہانی کے تانے بانے بُنے گئے ہیں۔ اس کا شوہر تلوکا یکہ چلا کر اپنا پیٹ پالتا ہے اور اپنی شراب کی لت پوری کرنے کے لئے عورتوں کی دلالی بھی کرتا ہے۔ یکایک رانو پر ایسی بپتا پڑتی ہے کہ اس کے شوہر کا قتل ہو جاتا ہے اِس واقعہ سے رانو کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ساس اسے بُرا بھلا کہتی ہے اور گھر سے نکالنے کے درپے رہتی ہے، لیکن وہ بچوں کی وجہ سے گھر چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ اس کے علاوہ اس کی بڑی بیٹی بھی جوان ہو چکی ہے۔ ایسے میں اِسکی پڑوسنوں اور سہیلیوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ رانو کی شادی اُس کے دیور منگل سے کیوں نہ کر دی جائے اس طرح اس کی بیوگی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جسے "چادر ڈالنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ پنجاب کی ایک مخصوص رسم ہے جس میں عورت مرد ایک دوسرے پر چادر ڈال کر شادی کے مقدس بندھنوں میں بندھ جاتے ہیں اس طرح کے اور بھی دیگر معاشرتی پہلوؤں کی تصویر کشی کر کے بیدی نے اس ناول کو اس خطے کے مخصوص تہذیبی مرقع کی شکل عطا کر دی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے قول کے مطابق "اس ناول کا حسن تہذیبی تصویر کشی ہی میں مضمر ہے۔"[2]

دوسری طرف رانو کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے دیور منگل پہ چادر ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ بھی ایسے دیور کو جسے اس نے اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور بڑا کیا ہو اس سے بیاہے جانے کے خیال ہی سے اسے گھن آتی تھی کیونکہ بقولِ مصنف "منگل کو رانی (رانو) ہی نے پالا۔ دنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا لیکن رانی کی نگاہوں میں اس کا بڑا بچہ۔ منگل بھی رانی کو اپنی ماں ہی سمجھتا تھا۔"[3]

یہی وجہ ہے کہ جب اس کے سامنے منگل سے بیاہے جانے کی تجویز رکھی جاتی ہے تو وہ عجیب قسم کی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی تذبذب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کردار کے اس پہلو کی ترجمانی بیدی نے جس خوبی سے کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورت جس نے ایک لڑکے کو اپنے بچے کی طرح پالا ہو اور جس کے شوہر ہونے کا

---

[1] اُردو افسانہ۔ روایت اور مسائل۔ مرتبہ: گوپی چند نارنگ ص ۳۸۱
[2] جدید اُردو ادب۔ ص ۵۶ [3] ایک چادر میلی سی ص ۱۲

وہ تصور بھی نہ کر سکتی ہو ایسے شخص کو اس کا شوہر بنانے کی کوشش کی جائے تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ نہ صرف اس سے انکار کرے بلکہ نفسیاتی پیچ و تاب کا بھی شکار ہو۔ یہ دراصل عورت اور ماں کے جذبات کی کشمکش ہے۔ وہ نہ ہی سگی ماں ہے اور نہ سوتیلی۔ اگر ایسا ہوتا تو ماں کا کردار ہی غالب آتا لیکن یہاں ایسا نہیں ہے اس لئے حالات کے تقاضوں کے تحت عورت کا کردار غالب حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور وہ بڑی ہی ہچکچاہٹ کے بعد اس بے جوڑ رشتے کو قبول کر لیتی ہے۔ اس طرح دیوندر اِسّر کے خیال کے مطابق کردار نگاری اور جذباتی کشمکش کی ترجمانی کے باعث یہ ناول حقیقت سے زیادہ حقیقی ہے۔"[1]

بیدی نے اس ناول کے ذریعہ بلا واسطہ طور پر یہ بات بھی کہی ہے کہ عورت چاہے وہ کسی بھی حالت میں زندگی بسر کرے اس کا عورت پن ہر حال میں عود کر آتا ہے اور وہ دیوی بن کر نہیں بلکہ عورت بن کر رہنا پسند کرتی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا میں عورت کے وجود کا اصل مقصد افزائشِ نسل ہے اور جنسی رشتہ اس کے لئے ذریعہ ہے منزل نہیں اور منزل تو ماں بننے ہی میں مضمر ہے اسی لئے عورت کی تکمیل اس کے ماں بننے کو قرار دیا گیا ہے اور اس سے یہ شرف اس حالت میں بھی چھینا نہیں جا سکتا کہ وہ بے جوڑ رشتے کے باعث اپنے بیٹے کی طرح پالے ہوئے دیور کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں مجبوراً باندھ دی گئی ہو، جیسا کہ خود انہوں نے اس ناول کے پیش لفظ میں کہا ہے :-

"قدرت کیا اس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس پیڑ کا جوہر کن ہواؤں سے کسی دوسرے پیڑ پر جا گرتا ہے۔ قدرت کا قانون افزائشِ نسل ہے۔ چاہے وہ کیسے ہی ہو کسی سے بھی ہو۔"[2]

چنانچہ رانو بھی اپنے اس عمل کے ذریعہ قدرت کے اسی منشا کو پورا کر رہی ہے۔ منگل جو پہلے پہل گھر کے مسائل اور ذمہ داریوں سے دور بھاگتا تھا اس نے بھی بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ حالات کے زیر اثر وہ اس حد تک تبدیل ہو جاتا ہے کہ رانو کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھنے لگتا ہے اور اس کی شادی کے لئے تمام اخراجات کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ جب رانو اس کی غریبی کا طعنہ دیتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ "میں اس کے لئے بک جاؤں گا رانو!...... چاہے اس کے لئے مجھے اِکّا اور یکّی کیوں نہ بیچنے پڑیں۔"[3]

اسی دوران کوٹلے کے مندر کا پر کرما ہوتا ہے اور وہاں میلہ سا لگتا ہے۔ منگل کے ماں باپ حضور سنگھ اور جنداں وہاں گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں رانو اور بڑی بیٹی ہے ایسے میں منگل آتا ہے اور بڑی کے لئے ایک رشتے کی خبر لاتا ہے کہ جاترا کے لئے آیا ہوا ایک گبرو جوان ہے جو کہتا ہے کہ وہ بڑی ہی سے شادی کرے گا دراصل وہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ منگل کے بھائی تلوکے کا قاتل ہے جس نے اپنی بہن کی عزت کا بدلہ تلوکے کے قتل سے لیا تھا اور جو کئی سالوں تک قید کی سزا کاٹنے کے بعد واپس آیا ہے اور خود اپنے مقتول کی بیٹی سے شادی کر کے شاید اس طرح اپنے گناہوں کا پرائشچت کرنا چاہتا ہے۔

رانو کو یہ سُن کر پھر ایک بار اسی جذباتی کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے جس کا وہ منگل سے شادی کرنے سے قبل شکار ہو چکی ہے لیکن اسے یہاں بھی اسی طرح حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے جس طرح اس نے اس سے قبل کیا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں :- "مرکزی خیال تو صرف اتنا ہے کہ انسانی زندگی مفاہمتوں سے لبریز ہے۔ ہر قدم پر ناگوار حقیقتوں اور کچھ دشمن چہروں سے سابقہ پڑتا ہے تو کبھی ماضی کے ٹوٹتے اور بے جوڑ رشتوں سے اور انسانی زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ حالات جن ناگوار حقیقتوں کی گود میں پھینک دیں، انہیں سے سمجھوتہ کر لو۔"[4]

بظاہر یہ رانو کی زندگی کا المیہ نظر آتا ہے لیکن بباطن

---

[1] اُردو ناول کے بیس سال۔ مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ اُردو نمبر جولائی ۱۹۶۸ء
[2] ایک چادر میلی سی۔ پیش لفظ۔ ص ۶
[3] ایضاً ص ۱۳۱
[4] جدید اردو ادب۔ ص ۵۶

یہ تقریباً ہر اُس ہندوستانی عورت کا المیہ ہے جس کا تعلق نچلے اور متوسط طبقے سے ہے۔ اس طرح بیدی نے رانو کی صورت میں ہندوستانی عورت کے دُکھ درد اور اس کے مسائل کو مجسم کرکے ہمیں یہ دعوتِ فکر دی ہے کہ کیوں نہ ایسے سماجی ڈھانچے کو بدلنے کے متعلق سوچا جائے جہاں عورت کے حصّے میں سوائے دُکھ درد اور گوناگوں مسائل کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی یہ بات واعظ یا مبلغ بن کر نہیں کہی ہے اور نہ انہوں نے اس طرح کا تبصرہ روا رکھا ہے۔ بلکہ مجموعی تاثر ہی فن کی جان ہے اور ان کے فکری زاویے کا تعین کرتا ہے۔ اس طرح وہ رانو کی دُکھ بھری' مسائل سے پُر' مفاہمتوں سے لبریز زندگی کا ذمہ دار ایسے سماج کو ٹھہراتے ہیں' جہاں زندگی کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قمر رئیس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "رانو بے بیکراں دکھو کی یہ کہانی نچلے طبقے کی ہر ہندوستانی عورت کی کہانی ہے لیکن اس میں رانو' تلوکا اور منگل کی کہانی سے چودھری مہربان داس' گھنشام اور بالہ ہری داس کے بہیمانہ جرائم کی کہانی کو مربوط کرکے بیدی ہمیشہ کی طرح یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مہاجنی نظام کی تاجرانہ قدروں کے تسلط نے انسان کو کتنا خوار کر دیا ہے۔ یہاں ہر رشتے' ہر جذبے' ہر آدرش یہاں تک کہ انسانی وجود کو بھی سکوں سے خریدا جا سکتا ہے"۔[1]

بیشتر ناقدین نے بیدی کی زبان پر اعتراضات عائد کیے ہیں اور اُن کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کہ وہ کھُردری زبان لکھتے ہیں جس پر اکھڑ پنجابی لہجے کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں اور بعض جگہ زبان و بیان کے مصنوعی پن اور تصنع کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ نے اِسے ان کی خامیوں میں شمار کیا ہے۔[2] اِس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ نظر رکھنی چاہیے کہ کسی فن پارے میں جس علاقے اور سماج کو پیش کیا گیا ہو اس کی سچی تصویر کشی اور پس منظر کو صحیح طور پر اُبھارنے کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جبکہ وہاں کی بول چال اور لب و لہجہ کی عکاسی بھی مکالموں کے ذریعہ کی گئی ہو۔ جب دیگر زبانوں میں اس کی علاقائی بولیوں پر مشتمل افسانوی ادب تخلیق کیا جا رہا ہو تو کیا ایسے میں پنجابی اُردو پر مشتمل افسانوی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ ناول نہ صرف ایک مخصوص علاقے کے سماجی معاشرتی اور معاشی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ متعلقہ علاقے کے لسانی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں بھی کامیاب ہے اور ایسے اُردو کے اُن گِنے چُنے ناولوں میں شمار کیا جائے گا جن سے اُردو کے افسانوی ادب کی ساکھ قائم ہے۔ ●

زاهد آمر

غزل

سُورج کو ایک روز تو ڈھلنا ہے سوچ لو
ذرّہ ہو نم کو خود ہی چمکنا ہے سوچ لو
بیٹھو نہ اِتنی دیر تبسم کی چھاوں میں
اشکوں کو بھی سفر میں نکلنا ہے سوچ لو
دُنیا تو ہر زنوں کی ہے جنت یہاں تمہیں
جینے کے انتظار میں مرنا ہے سوچ لو
دو چار سانس نام نہیں ہے حیات کا
لمحات کو صدی میں بدلنا ہے سوچ لو

---

[1] تلاش و توازن۔ ص ۶۲-۶۱

[2] ملاحظہ ہو ادب و تنقید۔ ص ۳۱۵ اور جدید اُردو ادب۔ ص ۵۷

احترام اسلام

راہ پائیں گے لوگ جانے کب
سر اُٹھائیں گے لوگ جانے کب
آنسوؤں کے اُمڈ پڑے ساگر
مُسکرائیں گے لوگ جانے کب
پیڑ کانٹوں کے ہو گئے بالغ
گُل کھلائیں گے لوگ جانے کب
مُنتظر ہے جلوسِ بیداری
ساتھ جائیں گے لوگ جانے کب
ظُلم سہنا ہے احترام گناہ
جان پائیں گے لوگ جانے کب

رہا انسان کا انسان میں بھی
ہُوا آخر کو بے ایمان میں بھی
مجھے بھی شانتی کی جستجو تھی
مسائل سے ہُوا انجان میں بھی
مری بھی جھونپڑی بدلی محل میں
ہُوا اِس دور پر قربان میں بھی
مجھے بھی بھرشٹ کر دے زندگانی
ترا عاشق ہُوں مری جان میں بھی
بہت اِتراؤ مت بانسوں پہ چڑھ کر
دِکھا سکتا ہُوں جھوٹی شان میں بھی

غزلیں



کہانی

اختر الاسلام

سوالیہ نشان

ایک گھونٹ چسکی میں اس رات بھی کچھ اضافہ ہوا۔ دن رات بڑھتی ہوئی قیمتوں نے ایک تو ویسے ہی فلاسفر بنا دیا ہے پھر گھریلو فضول خرچی اور لاپرواہی سونے پر سہاگا ہے۔ پچھلی میں بھیگے چاول بھرے ہوئے تھے۔ سوچا شاید ان کا زردہ تیار ہوگا مگر جب دسترخوان سامنے آیا تو ایسا کوئی آئٹم نہ تھا۔ دال چاول کی پلیٹیں بھوک جگا رہی تھیں۔

"زردہ کب بنے گا؟" میں نے بیوی سے پوچھا۔

"زردہ؟" اس نے چکراتے ہوئے کہا۔ "زردہ کب بنانے کو کہا تھا؟"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لکیر پھیل گئی۔

"دال چاول بنانے کیلئے بھی تو نہیں کہا تھا ——"

بیوی کے منہ پر کوئی بات آتے آتے رہ گئی۔

"پھر بھیگے چاول؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"شکرانے کے لئے ——"

"بھگوئے ہی کیوں تھے؟" یہ کہہ کر میں نے فوراً پلٹ دی

کیونکہ اب میں معاہدے کی خلاف ورزی کی کگار پر آگیا تھا۔ اس وقت میں بحث، تکرار، تضاد کے موڈ میں نہ تھا۔ ہاں یہ سوچ کر کڑھ ضرور رہا تھا کہ غیر حاضری میں کیا کچھ بربادی ہوتی ہے گھر میں۔ اگر چاول زیادہ بھیگ ہی گئے تھے تو فضا مکدر کرنے سے کیا فائدہ؟ ہاں یہ شکر ضرور کرنے لگا تھا کہ شکر ہے زیادہ چاول پکنے سے پہلے ہی بچا لئے گئے ورنہ سڑ کر بیکار جاتے۔

"ایجنسی پر کچھ آیا؟" میں نے موضوع بدلا۔

"نہیں ——"

"شبرات آگئی۔" میں نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "میدہ، سوجی، بیٹی چاہیئے تھی۔"

"چینی بھی تو نہیں ملی۔" بیوی نے ٹھوکا دیا۔

"پھر حلوہ؟"

"گھی بھی تو نہیں ہے۔" وہ بولیں۔

"تو شبرات؟ بچے تو حلوہ مانگیں گے ——"

"اور آتش بازی بھی تو ——"

"ہاں، ٹھیک کہتی ہو۔ اِس زمانے نے کمر توڑ دی ہے۔ پیر ڈھکیں تو سر کھل جاتا ہے۔ سر ڈھکیے ہیں کمر۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تم نے چھمی سے پیسے لانے کو کہا تھا۔ اُس نے کیا کہا۔ نفیس نے کہا تھا کہ کچھ روپیوں کا انتظام رکھنا۔ ملٹری ڈپو سے ایک دو کوئنٹل گیہوں کا انتظام کرا دے گا ورنہ بھوکے مر جائیں گے۔"

"چھمی یہاں ہے ہی نہیں۔" بیوی نے بتایا۔

"کب آئے گی۔"

"پتہ نہیں ـــــ"

"تو کچھ زیورات گروی رکھ دو۔" یہ بات میں نے بہت ڈرتے ڈرتے کہی تھی کیونکہ پچھلے دنوں اس موضوع پر ایک بہت بڑا معرکہ ہوا تھا۔ سسر صاحب نے اپنی صاحب زادی کا کچھ زیور گروی ڈال دیا تھا۔ جس پر میں نے بیوی کو کافی کچھ سخت سست کہا تھا اور یہ پابندی لگا دی تھی کہ زیور بالکل گروی نہ ڈالا جائے کیونکہ اس سے گھر کی برکت دور ہوتی ہے۔ جیسے تیسے وہ زیور واپس آپایا تھا۔

زیور گروی رکھنے کی بات پر بیوی صاحبہ کچھ اور تلخ یادوں میں کھو گئیں۔ مگر خدا کا شکر یہ رہا کہ وہ الف نہ ہوئیں۔ ان کے چہرے پر آئے رنگوں کو میں نوٹ کرکے ڈرتا رہا اور فوراً ہی موضوع بدل ڈالا۔

"ایک بات کہوں ـــــ"

بیوی کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا۔

"اِن میں سے کچھ چاول پیس کر کھیر ہی بنا لیتیں ـــــ"

جملہ پورا کرتے ہوئے میری حالت اُس عیّاد کی سی ہوگئی جو محلہ پڑوس سے مرغی چرا کرے جاتا ہے اور جب مرغی بولتی ہے تو اس کا منہ ایکدم بند کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کھیر کے لیے مٹھاس درکار تھی جو اُن دنوں گھر میں عنقا تھی اور پیسے نہ ہونے سے ایجنسی سے نہ آسکی تھی۔ فوراً ہی سب کچھ خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ تہوار سر پر تھا۔ بچوں کے پاس کپڑے نہ تھے۔ آتش بازی نہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ حلوہ نہ تھا۔ اِس بار نیاز کیسے دِلائی جائے گی؟ سب سوالات ایکدم گڈمڈ ہو گئے تھے۔

آمدنی کے وسائل محدود ہوں تو نظریں اِس بات کی متلاشی رہتی ہیں کہ کہیں سے کچھ مِل جائے۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں میں نے ایک صاحب کو کچھ کتابیں دی تھیں۔ اُن کی طرف پیسے واجب تھے۔ کئی بار کے وعدوں کے بعد بھی اُن صاحب نے حساب بے باق نہ کیا تھا۔ چنانچہ از خود قدم اُسی کوچہ کی طرف اُٹھ گئے۔ گھر کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ اندر سے بچی آئی اور اُس نے فوراً تیار جواب میرے کانوں میں اُنڈیل دیا۔

"پاپا نہیں ہیں۔"

اُس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ بچی کے انداز سے یہ حقیقت عیاں تھی کہ صاحبِ خانہ گھر پر ہیں۔ گھر کے دروازے بند ہیں۔ لیکن اِس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا کیا جائے؟ کیسے اُن صاحب کے گھر میں گھس کر اُن کے جھوٹ بولنے کا انہیں مزا چکھاؤں۔ اپنی بے چارگی پر چار آنسو بہاؤں اور اُن کی وعدہ خلافی پر انہیں سخت سست کہوں۔ چار و ناچار بدھو لوٹ کر واپس گھر آ گئے۔ ناکامی کے گھونٹ بھرتے بھرتے سو گئے۔

اگلے دِن دسترخوان پر کھیر موجود تھی مگر مجھے وہ بے مزہ لگی۔ بیوی کہہ رہی تھیں۔ "سوجی بازار میں پانچ روپے ہے۔ گھی بہت مشکل سے بیس روپے مِل رہا ہے۔"

"اور چینی؟" میں نے جلدی سے یاد دلایا۔

"آج شام ہی تو چھ روپے کلو منگائی ہے۔"

"بس تو ابھی رات باقی ہے۔" میں نے شوشہ چھوڑا ـــــ

اب پھر یہی بات درپیش تھی کہ بچوں کے لئے آتش بازی کیسے آئے گی؟ نئے کپڑوں کے لئے وہ پہلے ہی ترس رہے ہیں۔

عین شب برات کے دِن میں ایسا مصروف رہا کہ میری مقررہ ٹرین چھوٹ گئی۔ میرے ہاتھ میں کچھ ایسا اُلجھاؤ دار کام رہا کہ باوجود کوشش بسیار کہیں گیارہ بجے رات میں گھر پہنچنا نصیب ہوا۔

اسٹیشن سے گھر تک کے راستے میں آسمان پر اُڑتے ہوئے پتنگے، تارے، انار، سر سر اور زوں زوں کی آوازیں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ گلی محلوں میں بڑے لوگ آتش بازی چھوڑ رہے تھے۔ چھوٹے بچے وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔

گھر پہنچتے ہی میں نے کچھ روپے بیوی کے ہاتھ میں رکھے اور کہا۔ "ایک جگہ سے قرض لایا ہوں۔ اس میں کم از کم بچوں کے لئے آتش بازی تو آ ہی جائے گی۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے" وہ بولیں۔ "بچے تو سب سو گئے۔ محلے پڑوس میں جا کر وہ بہار دیکھ آئے تھے۔ پھر میں نے انہیں جلدی ہی سُلا بھی دیا ——— یہ کہہ کر کہ اگر وہ زیادہ دیر تک جاگے تو شبِ معراج کی زیارت نہ ہو سکے گی۔"

اِن باتوں کی ٹیس میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر یہ محسوس کر کے اطمینان کا سانس لیا کہ بیوی کی باتوں میں کسی بھی طنز کا شمہ برابر حصہ نہ تھا۔

"دیر سے آئے؟" کچھ رُک کر وہ بولیں۔

"ہاں ——— تم تو جانتی ہو۔ نوکری کے نو اور دسواں کام جاری ہے ———"

"سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"کیسے؟" میں نے متجسس ہو کر کہا۔

"مہترانی آئی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ ابھی دِلی سے نہیں آئے۔"

"عزت بچا لی تم نے!" میرے مُنہ سے نکلا "پھر؟"

وہ خاموش رہیں۔

"نیاز؟"

"ہو گئی۔"

"کیسے؟" میں نے متعجب ہو کر بیوی کی طرف دیکھا اور بولا "گھی نہیں تھا۔ چینی نہیں تھی، سُوجی نہیں تھی ——— کیا یہ سب سامان ایجنسی پر آ گیا تھا؟"

"اجی توبہ کرو۔ یہ ایجنسیاں تو کال کوٹھڑیاں ہیں۔" (میں بیوی کی اس نئی اصطلاح پر بہت خوش ہُوا۔ بلیک مارکیٹنگ کا خُوب استعمال کیا گیا تھا۔ ایجنسی والے پیسے میں اکثر تو بند رکھتے ہیں۔ سامان ایسے موقعوں پر لاتے ہیں جب آدمی کے پاس پیسے نہیں رہتے اور بھیڑ بھڑکا کا دور دورہ ہوتا ہے۔ کچھ بانٹا۔ جو بچا اُسے بلیک میں چلتا کر دیا۔"

"اب تو تم اچھا بھاشن دینے لگیں۔" میں نے چٹکی لی۔

وہ ہنس دی۔

"ابو جی، ہمارے نئے کپڑے ———" میری بڑی بچی آ کر بولی۔ وہ میرے آنے کے بعد سو کر اُٹھ گئی تھی۔

"ہیں؟" میں نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"میں نے اپنے کپڑوں میں سے بنا دئے۔" بیوی نے وضاحت کی۔ "وہی جوڑا تم کو جو نا پسند تھا۔ ایک، دو بار ہی تو پہنا تھا۔"

"اور حلوہ؟"

"یہ لو ———" اُنہوں نے پتیلی کا مُنہ میرے آگے کھول دیا۔ اُسکی خوشبو ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی ——— "مگر میوہ اس میں نہیں ہے۔" انہوں نے صفائی دی۔

"سُوجی کیا بھاڑ ملی؟"

"یہ انہیں چاولوں کی کرامات ہے" بیوی نے زیرِ لب مُسکرا کر کہا۔ "جن کے بھیگے رہنے پر تم نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ کہنا اور کچھ نہ کہنا چاہا تھا۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" مجھے جیسے کسی بات پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ کہو تو ابھی تمہارے سامنے تازہ حلوہ بنا دوں ——— چاولوں کا؟" میں ہنس کر رہ گیا۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ مگر میرے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان آ کر کھڑا ہو گیا کہ ایسے حالات کا ایک کم زور عورت کب تک مقابلہ کر سکے گی؟ اِن حالات کا مقابلہ تو اُسی وقت ممکن ہے جب آمدنی میں جائز ذرائع سے اضافہ ہو۔ تاہم آمدنی میں اضافہ کی رفتار ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی۔

پھر؟ خاموشی کے گھونٹ بھرے جائیں؟

میرے اندر سے آواز آئی ——— لیکن کب تک؟

بھیم سین تیاگی

غزل

شب ہے منہ کھولے نگلنے کے لئے
ہے کوئی ہمراہ چلنے کے لئے؟

روشنی سب سے ملا کرتی نہیں
کچھ دیئے جلتے ہیں جلنے کے لئے

خلق کی آواز کو روکے گا کون؟
یہ نہیں سیلاب ٹلنے کے لئے

ہے مسرت کی سحر کیوں بے قرار
شام سے پہلے ہی ڈھلنے کے لئے؟

تنگ ہے دن رات کی دھڑکن سے دل
کچھ خموشی دے بہلنے کے لئے

عزیز الرحمٰن بھاگلپوری

غزل

ناکامیوں کی آگ نہ بدقسمتی کی آگ
مجھ کو جلا رہی ہے مری آگہی کی آگ

ہر سمت آسماں پہ دھواں پھیلنے لگا
چاروں طرف سے پھوٹ پڑی گمرہی کی آگ

جلتے رہے ببول کے پودے سرس کے پیڑ
افلاک سے برستی رہی چاندنی کی آگ

میں رات بھر اکیلا پڑا جاگتا رہا
تشنہ لبی بڑھاتی رہی تشنگی کی آگ

نیرنگیٔ حیات مبارک ہو آپ کو
مجھ کو بہت عزیز ہے یہ سادگی کی آگ

مطبوعات

عکس در عکس

مصنف : شاہد ساگری

قیمت : چالیس روپے

ملنے کا پتہ : بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ۔ بھوپال۔

اس کتاب میں کل ۴۴ معروف شعراء کا کلام برائے تضمین منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں ثاقب لکھنوی کے اشعار پر دو الگ تضمین ہیں۔ متفرقات میں اختر بستوی۔ مظہر امام اور واحد پریمی کے نام درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ۴۴ نقادانِ فن نے اپنے تاثرات دیئے ہیں۔ یہاں سحر بھوپالی کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ یعنی جتنے شاعر ہیں اتنے ہی نقاد ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے کتاب کا نام بہت خوبصورت ہے۔

سحر بھوپالی نے اپنی رائے میں لکھا ہے کہ غالباً پہلی بار شاہد ساگری نے اس شعوری کوشش کو یک جا کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کرنیکا فیصلہ کر کے ایک بھولی بسری صنف کو اہلِ علم و دانش کے ذہنوں میں تازہ کرنے کی جانب جس طرح توجہ دی ہے وہ یقیناً لائقِ ستائش ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے کیا خوب کہا ہے کہ مصنف نے پینتالیس مختلف شعراء سے پنجہ کشی کی ہے۔ کسی اور نے اس نوعیت سے یہ کاوش نہیں کی۔ بہرحال اس سے پہلے بھی تضمینیں کتابی شکل میں آ چکی ہیں لیکن وہ ایک ہی شاعر کے کلام پر ہیں۔ مثلاً آتش بہاولپوری کی "نذرِ اقبال"۔

تضمین مشکل فن ہے اور مشکل کام میں ہاتھ ڈالنا اور بھی مشکل۔ یہی وجہ ہے کہ تضمین۔ پیروڈی۔ مستزاد۔ قصیدہ۔ بھولی بسری چیزیں ہو چکی ہیں۔ وہی شاعر تضمین کا حق ادا کر سکتا ہے، جس میں خود شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ فن سے پوری واقفیت ہے۔ اظہار کا سلیقہ ہے۔ زبان و بیان پر گرفت ہے۔ متعلقہ شاعر کے خیالات کی معنوی تہوں تک پہنچ کر اپنے الفاظ سے دلکش انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ یہ کام مہارت کا ہے کیونکہ اصلی شاعر کے رنگِ سخن سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ مصنف نے نہایت چابکدستی سے اس فن میں کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

شمیم کرہانی کی غزل میں تضمین ملاحظہ ہو۔

لوچ اور نزاکت کو لے جاؤں کہاں آخر
نرمی و شرافت کو لے جاؤں کہاں آخر
رنگینی و نکہت کو لے جاؤں کہاں آخر
اس دل کی لطافت کو لے جاؤں کہاں آخر
پتھر کا زمانہ ہے شیشے کی جوانی ہے

کتابت۔ طباعت۔ کاغذ بہت اچھا ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

رام لعل نابھوی

شرارِ جستہ

شرف الدین ساحل

قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ : علیم پبلشنگ ہاؤس، حیدری مسجد روڈ
موہن پورہ، ناگ پور - ۱۸

•

"شرارِ جستہ" نظموں، غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ بیشتر نظمیں بظاہر مصنف کے ذاتی عقیدے اور مطمحِ نظر کی عکاسی ہیں مگر ان نظموں کے معانی و مفاہیم کی شناوری کے بعد آپ کو ایسے گوہر ہاتھ لگیں گے جن کی آب و تاب کے سامنے آج کے باطل نظریات کی صناعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری معلوم ہوگی۔ صالح قدروں کی پاسبانی، برائی کے انسداد کی کوششیں، مظلومین سے ہمدردی، خدا کے بندوں سے پیار اور اُن کے دُکھ درد بانٹنے کی تلقین وغیرہ قریباً سبھی مذاہب کے بنیادی عقائد میں شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان احساسات کی توسیع ایک عظیم انسانی خدمت قرار پائے گی۔ اس پس منظر میں "شرارِ جستہ" کی ایک نظم "تحفۂ رقوم" کا یہ بند اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے۔ ؎

اگر خلوص و محبت کے تم ہو اک پیکر
تو پھر یہ کس لیے دُرِّ یتیم روتے ہیں
حقیقی بھائی ہے محتاج دانے دانے کو
حریمِ درد میں بیوہ بہن تڑپتی ہے
پڑوسی بھوک کی شدّت سے تلملاتا ہے

"ربِ کائنات"، "کھیتی" اور "علمائے سو سے" اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

ساحل کی غزلیں بھی اس مخصوص لب و لہجے سے کافی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ تاہم اِن کے اشعار کی سادگی اور پُرکاری میں کوئی کمی نہیں آنے پائی۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے : ؎

وہ جس کے در پہ ہمیشہ فنا ہوئی حسرت
اسیر تھا وہ مگر دل کا تنگ ایسا تھا

٭

ملا خلوص سے اِتنا کہ دھیان تک نہ ہوا
وہ راہزن تھا یہ مجھ کو گمان تک نہ ہوا

٭

جو سمجھ لیتے ہیں مفہومِ حیاتِ ابدی
زندگی اُن کو یہاں مثلِ سزا لگتی ہے

٭

فکرِ معیشت میں ساحل
کس کا چہرہ زرد نہیں

٭

اُمید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں جاذبِ نظر سرورق اور عُمدہ کتابت و طباعت والے اس شعری مجموعے "شرارِ جستہ" کو پذیرائی نصیب ہوگی۔

❁

چراغ شہرِ جگر کے

مرتب : قمر قدیر ارمؔ

قیمت : ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ : اِرم پبلیکیشنز۔ قصرِ قمر، بارہ دری، مُراد آباد - ۲۴۴۰۰۱

•

"چراغ شہرِ جگر کے" مُراد آباد کے معروف و غیر معروف شعرا کے کلام کا ایک ضخیم اور خوبصورت مجموعہ ہے جسے قمر قدیر ارمؔ نے مرتب کر کے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس انتخاب میں نہ صرف شہرِ جگر کے شاعروں کا کلام ہی یکجا کیا گیا ہے بلکہ شاعروں کے مختصر کوائف بھی درج ہیں۔ ایک باب میں شہر کے فعال ادبی اداروں جیسے بزمِ کیفؔ، حالیؔ اکیڈمی، کیفؔ میموریل سوسائٹی اور بزمِ اسیرؔ شادانی وغیرہ کی سرگرمیاں بیان ہوئی ہیں۔ "شہرنامہ شہرِ جگر کا" اس شعری انتخاب کی ایک اور قابلِ ذکر خوبی ہے۔ ۱۳ صفحات پر محیط یہ مضمون مُراد آباد کے قابلِ دید تاریخی مقامات، اس کے باغات

محلّوں، کوچوں اور بازاروں کا تذکرہ ہے۔ بالغرض یہ شہر نامہ شاملِ کتاب نہ ہوتا تو چراغ شہرِ جگر کے ایک ادھوری کوشش قرار پاتی۔

جہاں تک کتابت وطباعت کی دیدہ زیبی اور معیار کا تعلق ہے ایسی نفاست آجکل اُردو مطبوعات میں کم ہی نظر آتی ہے۔

سناٹوں کا زہر

عین الحق بلیاوی

اعزازی قیمت : پچاس ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : عین الحق بلیاوی، محلہ قاضی پورہ بلیا (یو۔پی) ۲۷۷۰۰۱

•

یہ مصنف کی اوّلین کاوش ہے اور ...... بقولِ مصنف "ضلع کا پہلا افسانوی مجموعہ" بھی۔ اسی لئے غالباً صاحبِ مجموعہ نے یہی بہتر سمجھا کہ اس میں افسانوں کے ساتھ ساتھ مضامین اور چند نثری نظمیں بھی شامل کر لی جائیں۔ اس سے موصوف کا شوق تو پورا ہوا مگر ترتیب و تزئین کا حُسن بے توجہی کا شکار ہو گیا۔

عین الحق کی تخلیقات میں سے "سناٹوں کا زہر"، "چھین لو انسان" اور "ایک بھوت کھڑا تھا" کو نسبتاً بہتر افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک اُبھرتے ہوئے حساس قلم کار کا پرتو موجود ہے۔

اُردو کے اکثر مصنفین اُردو خواں طبقے سے ہمیشہ نالاں رہے ہیں کہ یہ لوگ کتابیں خرید کر پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اگر "سناٹوں کا زہر" جیسے ۶۶ صفحات پر مشتمل مختصر سے مجموعے کی (اعزازی) قیمت پچاس روپے لکھ دی جائے تو شاید باذوق قارئین بھی کتب خریدنے سے گریز کرنے لگیں گے۔ •

سلطان انجم

غزل

رام لعل سالک

نہ بے پروں کے لئے فکرِ دام پیدا کر
کھلی فضا میں نہ ہرگز غلام پیدا کر

کوئی بھی دل نہ محبت سے اب رہے محروم
بفضلِ عشق وہ لطفِ مدام پیدا کر

قیودِ گردشِ ایام سے ہو بالاتر
جہانِ عشق میں وہ صبح و شام پیدا کر

سرورِ ذاتِ الٰہی سے بت رکھے سرشار
شراب خانۂ دل سے وہ جام پیدا کر

نہیں ہے ہستیِ مطلق میں فکرِ مرگ و حیات
اس آگہی سے حیاتِ دوام پیدا کر

تجھے نہ فکرِ تجسس ہو اور نہ شوقِ وصال
تو اپنی ذات میں حسنِ تمام پیدا کر

جہانِ عشق میں جس کی نظیر مل نہ سکے
کسی کے عشق میں سالک وہ نام پیدا کر



ماہِ دسمبر ۸۶ء کا تعمیرِ ہریانہ ملا۔ شکرگزار ہوں ـــ ڈاکٹر عنوان چشتی کا مضمون (نقدِ معائب) بہت عمدہ ہے۔ مقالہ نگار نے معائبِ سخن کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے علمِ قواعد کی طرف جو توجہ دلائی ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت مسلّم ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ بہت سے معائبِ سخن قواعد کے اصولوں سے انحراف کرنے یا ان سے بے تعلق ہونے سے پیدا ہوتے ہیں اور اچھی اور سچی شاعری کرنے کے لیے قواعد کا علم ضروری ہے۔ عامر فردوسی نے اپنے مقالہ "فیض احمد فیض کی روایت پسندی" میں شاعر کے شعری و ادبی اکتسابات کا جائزہ لینے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اپنے ہمعصر ترقی پسند شعراء میں فیض کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ سماجی حقیقت نگاری کے ذوق شناس ہوتے ہوئے بھی فنی اظہارات کی سطح پر خود کو متوازن رکھا اور اپنے شائستہ و شفاف لب و لہجہ کو غبار آلود نہیں ہونے دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے شعری تجربوں کا کینوس بہت محدود ہے۔ افسانوں میں "مور، رقص اور تماشائی" (نورالحسنین) "سفید چادر" (ابرار مجیب) "کشکول" (نورجہاں صدیقی) "بدلتی قدریں" (عثمان اختر) کامیاب افسانے ہیں۔ حصۂ غزل میں مظہر امام، ڈاکٹر نریش، دھرم پال عاقل، طلعت عرفانی، شاعر جمالی اور شاد نوحی پسند آئے۔ خاص طور سے مظہر امام کے درج ذیل شعر نے بڑا لطف دیا۔ ؎

انہیں کو یاد کیا جب تو کچھ نہ یاد آیا
وہ لوگ جن کا زمانے میں نام لیتا تھا

فضا ابن فیضی

ماہ دسمبر ۸۶ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ صوری اور معنوی حیثیت سے متاثر کرتا ہے۔ رسالے کا پہلے کی نسبت کافی نکھار آیا ہے۔ "فیض احمد فیض کی روایت پسندی" مضمون بہت پسند آیا۔ "نقدِ معائب" میں پروفیسر عنوان چشتی نے اشعار میں جن عیوب کی طرف دھیان دلایا ہے وہ بھی بہت خوب ہے اور معلوماتی مضمون ہے۔ ڈاکٹر نریش کی غزل معیاری اور تاثراتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف گوہر

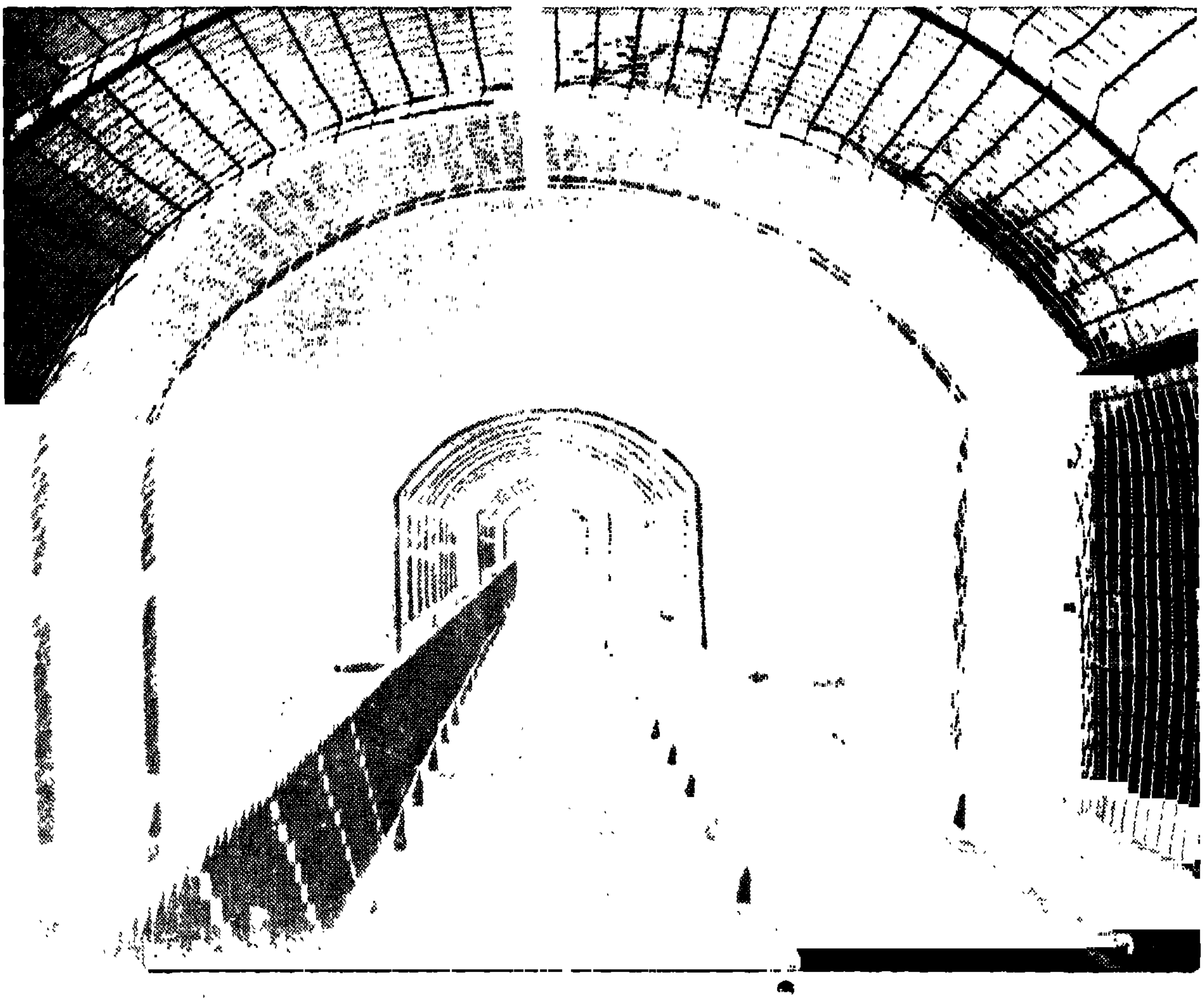
"تعمیر ہریانہ" دسمبر ۸۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا ـــ تخلیقات معیاری ہیں اور دلچسپ بھی۔ مقالے مفید اور معلوماتی ہیں ـــ افسانے سبق آموز اور دلکش۔ نورالحسنین کا "مور، رقص اور تماشائی" اور ابرار مجیب کا "سفید چادر" فکر انگیز اور فنکارانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ نورجہاں صدیقی کا "کشکول" بھی کچھ کم نہیں۔ مشرقی تہذیب اور بدلتی قدروں کا بھرپور عکاس ہے۔ لیکن افسانہ "بدلتی قدریں" (عثمان اختر) صرف مقصدی ہے۔ کافی طویل ہونے کے باوجود خاتمہ پر ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے۔ غزلیں سبھی اچھی لگیں۔

جاوید فریدی پنڈولوی

دسمبر ۸۶ء کے شمارے میں فضا ابن فیضی، ڈاکٹر نریش، مظہر امام اور پروفیسر عنوان چشتی جیسے معتبر نام "تعمیر" کے اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ علاوہ ازیں شاد نوحی، پرکاش ناتھ پرویز، دھرم پال عاقل، طلعت عرفانی، رانا گنوری، منظر سلطان، سردار منتظر کی غزلیات بھی معیاری ہیں۔ نثری حصے میں پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون مدلّل، ٹھوس اور معلوماتی ہے۔ افسانے قابلِ تعریف ہیں۔

قاضی حسن رضا

پبلشر اور چیف ایڈیٹر بنجیت ایسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمۂ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ ۱۸۹-۱۹۱، سیکٹر ۱۷، سی۔ چنڈی گڑھ سے اپریل ۸۷ء کے لئے شائع کیا۔ طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو۔ ٹی چنڈی گڑھ۔



تلیئر ٹورسٹ کمپلیکس ـــــ روہتک

Regd. No. NW/CH—15

TAMIR-E-HARYANA

April, 1987

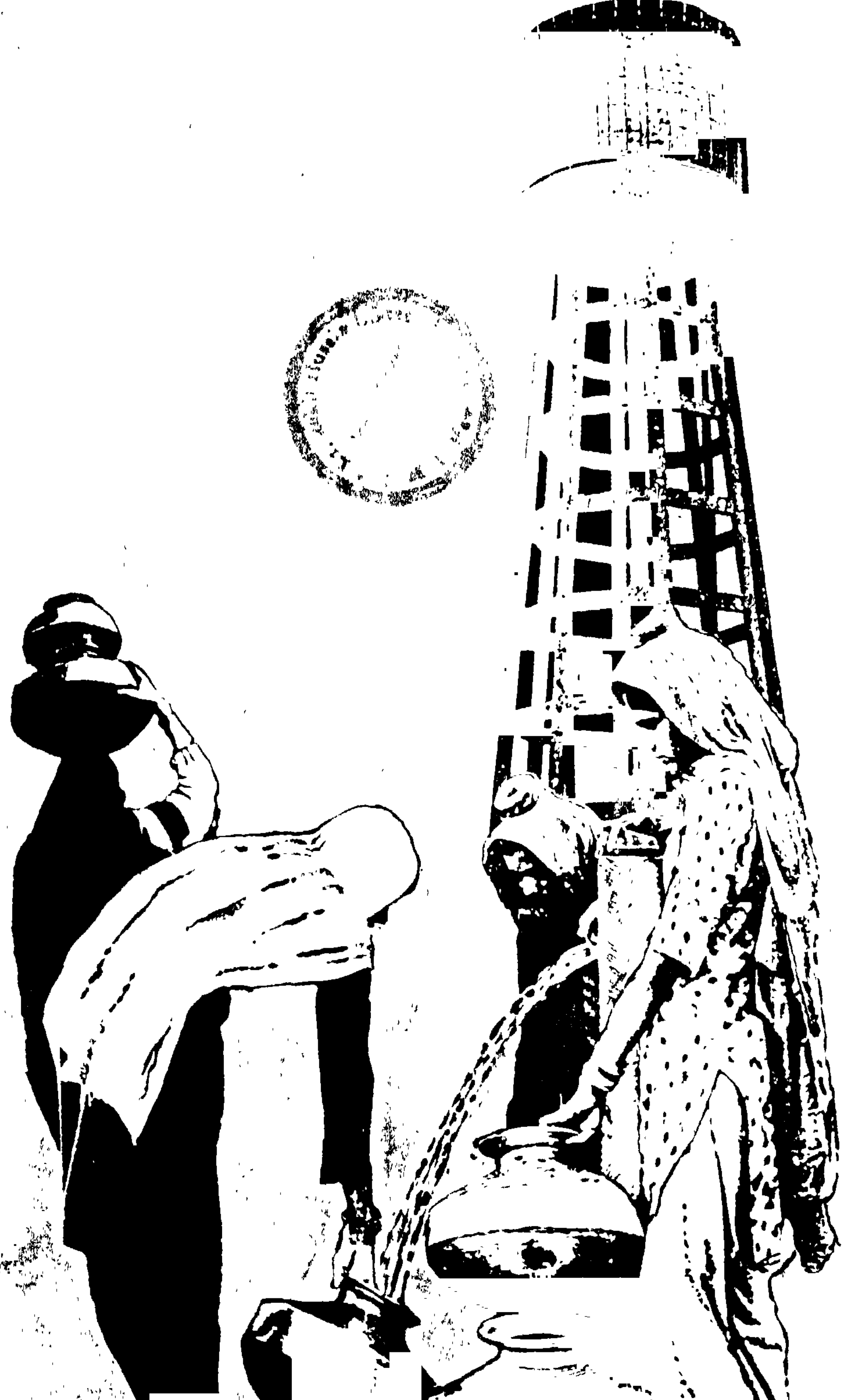


Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

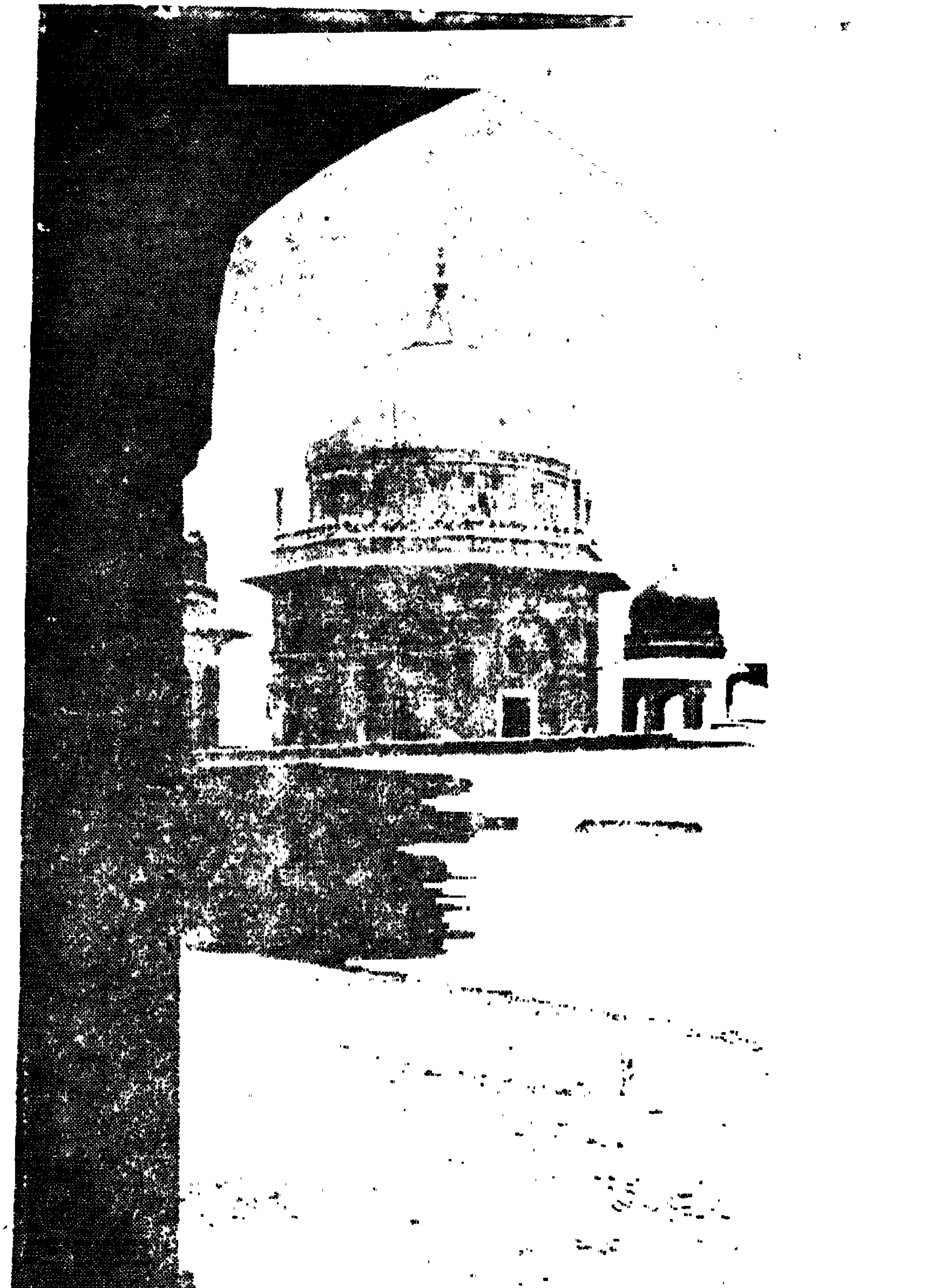
تعمیر ہریانہ

۱۶۱

19 3 JUL 1987



مئی ۱۹۸۴ء



شیخ چلّی کا مقبرہ ---- کورو کشیتر

Husain Library
Nagar
Delhi

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

مئی ۱۹۸۷ء	شمارہ ۵	جلد ۱۵

مدیر اعلیٰ

رنجیت ایس سر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: منجیت

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

معرفت تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او۔۱۸۹۔۱۹۰۔۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ ـــ ۱۶۰۰۱۷۔

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

خوشحالی کا نقیب — ہریانہ

سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ

میری سرکار نے ترقی کی برق رفتاری کو برقرار رکھا ہے۔ جس سے ہریانہ کا نام مشہور ہوگیا ہے۔ ترقی کے فائدے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خصوصاً انتہائی غریب اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کے افراد کو بھی حاصل ہیں۔

محدود وسائل کے باوجود بھی ہم نے ہر شعبۂ حیات میں ترقی کی ہے۔ امن و قانون اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے پر ہمیں زیادہ دھیان دینا پڑا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہماری پڑوسی ریاست میں کچھ گمراہ لوگوں کی بدامنی، متشددانہ اور اشتعال انگیز سرگرمیوں کے باوجود بھی ہم مختلف فرقوں میں مکمل اتحاد قائم کر سکے ہیں۔ حد درجہ اہم صورتِ حال کے پیشِ نظر ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے میری سرکار ہمہ تن مصروف ہے۔

میری سرکار اس بات پر بھی زور دے رہی ہے کہ ستلج یمنا لنک نہر کے تعمیری کام کو جلد مکمل کرنے کے لئے مرکزی حکومت اسے اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مجھے یقین ہے کہ میری سرکار ایک عالمی معیار کے شہر کی صورت میں اپنی راجدھانی بنانے پر ہونے والے کل خرچ کو مرکزی حکومت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہریانہ نے معاشی اور اقتصادی طور پر بے حد ترقی کی ہے۔ میسر تخمینہ سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست ہریانہ کی آمدنی ۱۹۷۰-۷۱ء کی قیمتوں کے حساب سے ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۱٬۷۸۴ کروڑ روپے تک بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۸۴-۸۵ء کی آمدنی پر یہ اضافہ ۱۲٫۶ فیصد ہے۔

نئے بیس نکاتی پروگرام کو لاگو کرنا میری سرکار کی ترقیاتی پالیسیوں کی بنیاد رہا ہے۔ معاشی امداد پروگرام کے تحت (۱۹۸۶-۸۷ء کے ۶۷٬۵۸۸ کنبوں کے مقررہ نشانہ کے مقابلے) جنوری ۱۹۸۷ء تک ۶۰٬۱۳۹ کنبوں کو اقتصادی امداد دی گئی۔ ان میں سے ۳۹٬۲۸۱ خاندان درج فہرست ذاتوں کے تھے۔

بجلی ہماری ہمہ پہلو ترقی کی بنیاد ہے۔ میری سرکار کی اس شعبے پر مانگ۔سپلائی کے فرق کو ختم کرنے کے لئے اور بھی زور دینے کی تجویز ہے۔ ابتدائی سکیم نئے بجلی گھر چالو کرنے اور موجودہ بجلی گھروں کے کام میں سدھار لانے کی ہے۔ کئی نئے پراجیکٹ شروع کئے جا رہے ہیں۔ سن ۱۹۸۶ء کے دوران ایک ۲۲۰ کے۔وی سب اسٹیشن چار ۱۳۲ کے۔وی، سب اسٹیشنوں، ایک ۶۶ کے۔وی سب اسٹیشن اور چھ نئے ۳۳ کے۔وی سب اسٹیشنوں کو اب تک بجلی دی گئی ہے۔

زراعت کے شعبے میں ہریانہ کی کامیابی کا راز سینچائی ہے۔ ہریانہ کے وسیع خشک علاقوں کی آبپاشی کے سبب ہی ریاست میں خوشحالی آئی ہے۔ آبپاشی کی صلاحیت میں اضافہ کرنے اور آبپاشی کے طریقۂ کار کو جدید بنانے کے لئے ایک سکیم شروع ہے۔ یہ سکیم پوری ہونے پر جمع کئے گئے پانی سے ۲ لاکھ ہیکٹیئر فاضل رقبے میں آبپاشی ہو سکے گی۔ اس سال ۲۴۰۰۰ ہیکٹیئر مزید رقبے کو زیر آبپاشی لایا جائے گا۔ جس سے کل ۱۶٫۴۰ لاکھ فاضل ہیکٹیئر رقبے کو آبپاشی سے فائدہ ہوگا۔ ریاست کی معیشت زراعت پر منحصر ہے اس لئے میری سرکار زرعی پیداوار کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ہریانہ ایگریکلچرل یونیورسٹی کے ذریعہ نئی ٹیکنالوجی کا استعمال، بیج اور کھاد کی دستیابی اور مارکیٹنگ کی سہولتوں کے باعث زرعی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

گذشتہ خریف کے دوران نقصان اٹھانے والے کسانوں کو میری سرکار نے ربیع کی مختلف فصلوں کے بیجوں پر ۲۵ فیصد اقتصادی امداد دی ہے۔ اس کام پر تقریباً ایک کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ کسانوں کو گندم کی فصل کو کھر پت وار سے بچانے کے لئے ۵۰ فیصد اقتصادی امداد دی جا رہی ہے۔ اس پر لگ بھگ ۱۱۲ لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ میری سرکار حصار، بھوانی، مہندرگڑھ، گوڑگاؤں، فرید آباد، روہتک اور سونی پت کے خشک سالی سے شدید متاثر ہوئے سات اضلاع کے کسانوں کو کھادوں پر ۲۵ فیصد امداد دینے کے لئے ۲٫۶۵۰ کروڑ روپے بھی خرچ کر رہی ہے۔

میری سرکار کے پاس زراعت کے ساتھ ساتھ دوسرے مددگار پیشوں کو فروغ دینے کے لئے بھی اہم سکیمیں ہیں۔ پشو پالن پروگراموں کا اہم مقصد دودھ، انڈوں اور اون کی پیداوار میں اضافہ کرنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے سن ۸۸-۱۹۸۷ء میں مویشیوں کے علاج کے لئے ۴۰ نئی ڈسپنسریاں کھولی جائیں گی اور ۳۰ ڈسپنسریوں کا درجہ بڑھا کر ان کو مویشیوں کے ہسپتال بنایا جائے گا۔

ہیفیڈ کی اس سال ایک چاول مل اور آئندہ برس ایک اور چاول مل لگانے کی تجویز ہے۔ ایک جو۔دودھ پلانٹ اور زنک سلفیٹ پلانٹ بھی لگایا جا رہا ہے۔ حکومت ہند۔ کرنال، بھونہ اور کیتھل میں چینی کی تین نئی کواپریٹو ملوں کو لائسنس دینے پر غور کر رہی ہے۔

ریاست کے اضلاع میں جاری مختلف ترقیاتی پروگراموں میں سے قومی دیہی روزگار پروگرام کا بھی ذکر کرنا چاہیئے، جس سے پائیدار کمیونٹی اثاثے بنانے کے ساتھ ساتھ غریب دیہاتیوں کو روزگار بھی دیا جاتا ہے۔ جنوری سن ۱۹۸۷ء تک ۴۰٫۶۰ لاکھ 'مین ڈیز' کا کام مہیا کرنے کی توقع ہے۔

میری سرکار خطۂ میوات کی سربلندی اور اس کی ہمہ پہلو ترقی کے لئے فکرمند رہی ہے وہاں واٹر سپلائی سکیمیں اولیت کی بنیاد پر شروع کی گئی ہیں۔ اور ۴۹۱ دیہات میں سے ۲۰۰ گاؤں کو نلوں کے پانی کی سہولت میسر کرائی گئی ہے۔ سن ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ۹۱ گاؤں میں کام تیزی سے چلایا گیا ہے اور جلد ہی ۴۰۱ گاؤں کو اس سکیم میں شامل کر لیا جائے گا۔ آئندہ برس

خطۂ میوات کی ترقی کے لئے مختلف سکیموں پر عمل کرنے کی غرض سے ۲۵۰ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس سے خطۂ میوات اور ریاست کے دوسرے حصوں میں علاقائی عدم توازن کم ہو جائے گا۔

درج فہرست ذاتوں، پسماندہ طبقوں اور دیگر کمزور ذاتوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے ہریانہ ہریجن کلیان نگم اور ہریانہ پچھڑے ورگ کلیان نگم نے سال رواں میں درج فہرست ذاتوں کے ۲۹,۰۰۰ مستفید ہونے والوں اور پسماندہ طبقے کے ۴,۰۰۰ افراد کی امداد کی ہے۔ درج فہرست ذاتوں کی بیواؤں، بے سہارا اور معذور عورتوں کی بیٹیوں کی شادی کے لئے امداد دینے کی غرض سے ایک نئی سکیم آئندہ مالی سال سے شروع کی جائے گی۔ اس سکیم کے تحت شادی سے متعلقہ اخراجات کی تکمیل کے لئے انہیں ۲,۵۰۰ روپے کی امداد دی جائے گی۔

پسماندہ طبقوں کی ۵۰ یا زیادہ آبادی والے ہر گاؤں میں پسماندہ طبقے کا ایک نمبردار مقرر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی پنچایت میں پسماندہ طبقے کا کوئی نمائندہ نہیں ہے اور گاؤں میں پسماندہ طبقوں کی آبادی ۲۰ فیصد سے زیادہ ہے تو اس میں ایک ممبر پسماندہ طبقے کا مقرر کیا جائے گا۔ ان طبقوں کے ممبران گاؤں کی شاملات زمین کے ۱۰ فیصد پٹے کے حقدار ہوں گے۔

ہریانہ میں صنعتی ترقی ہوئی ہے۔ جس پر ریاست کو فخر ہے۔ چھوٹے پیمانے کی اکائیوں کی تعداد ۶۱۴۷ سے بڑھ گئی ہے۔ اس برس اب تک ۵,۰۷۹ اکائیاں قائم ہوئی ہیں۔ سنہ ۱۹۸۷-۸۸ء میں دیہی صنعتی کرن سکیم کے تحت ۴,۵۰۰ اکائیاں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس سے ۱۲,۱۵۰ لوگوں کو روزگار ملے گا۔

مزدوروں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے قیمتوں کے عدد اعشاریہ کو دھیان میں رکھ کر مزدوری کی شرح کے ڈھانچے میں ترمیم کی گئی ہے۔ اس وقت غیر تربیت یافتہ کاریگر کی کم از کم اجرت ۴۴۰٫۵۰ روپے ماہانہ یا ۱۶٫۸۷ روپے یومیہ ہے اور کھیت مزدور کو کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور سے ایک روپیہ زیادہ دیا جا رہا ہے۔ یہ شرح پنجاب کے علاوہ ہمسایہ ریاستوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔

تعلیم انسانی وسائل کے تمام تعمیری پروگراموں کا محور بن گئی ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے میری سرکار کی معیار برقرار رکھتے ہوئے، تعلیمی سہولیات کو اور زیادہ وسعت دینے کی تجویز ہے۔ تاکہ یہ سہولتیں لوگوں کو با آسانی میسر ہوں۔ اب تک ہم چھ سے گیارہ سال عمر کے زمرہ میں ۱۶٫۹۵ لاکھ اور گیارہ سے چودہ سال عمر کے زمرہ میں ۶٫۷۵ لاکھ بچوں کے نام درج کر سکے ہیں۔ لڑکیوں کے داخلے کے لئے خصوصی کوششیں جاری ہیں۔ اس غرض سے ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران صرف لڑکیوں کے ۵۰۰ پرائمری سکول کھولنے کی تجویز ہے۔ ان میں سے ۲۰۰ سکول پہلے ہی کھولے جا چکے ہیں۔ عہد حاضر کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے ۱۸۰ اسکولوں میں کمپیوٹر تعلیم کے پروگرام شروع کئے جا چکے ہیں۔

کھیل کود کو بڑھاوا دینے اور نوجوانوں کی فلاح کے لئے ۴۳ سکیمیں لاگو کی جا رہی ہیں۔ ان سکیموں میں جمنازیم اور تیرنے کے تالابوں کی تعمیر اور ان کھیلوں میں جدید اور سائنسی طرز پر تربیت دینا شامل ہے۔ سنہ ۱۹۸۶-۸۷ء کے دوران ہریانہ کے کھلاڑیوں نے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں میں ریاست اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔ سیول کے ۱۰ویں ایشیائی کھیلوں میں تمغہ حاصل کرنے والے ہریانہ کے چھ کھلاڑیوں کو ۲۵,۰۰۰ — ۲۵,۰۰۰ روپے کا نقد انعام دیا گیا ہے۔ فرید آباد میں بین الاقوامی معیار کا ایک کرکٹ اسٹیڈیم بنایا گیا ہے۔ انبالہ میں جمنیزیم ہال پورا ہونے والا ہے میری سرکار

کی تجویز ہے کہ ہونہار کھلاڑیوں کی تلاش کے لئے کچھ کھیل کود نرسریاں اور ایک سپورٹس کالج بھی شروع کیا جائے۔

دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی اچھی صحت کے لئے بنیادی ضرورت محفوظ اور نلوں کے ذریعہ صاف شفاف پانی کی سپلائی ہے۔ اس منصوبے کے آخر تک پانی کے مسائل والے سبھی گاؤں میں پینے کا پانی بہتر کرانا میری سرکار کا اہم مقصد ہے۔ سالِ رواں میں ۵۰۰ گاؤں اس سکیم کے تحت آجائیں گے۔ سنہ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۳۵۰ مزید دیہات اس سکیم میں شامل کر لئے جائیں گے جس پر میری سرکار ۲۵ء۷۰ کروڑ روپے خرچ کرے گی۔ شہری علاقوں میں واٹر سپلائی اور سیوریج سہولتوں میں سدھار پر ۱۲ء۷ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

حکومتِ ہند نے عالمی بینک کے تعاون سے تقریباً ۱۶ء۴۰ کروڑ روپے کی لاگت سے مورتھل سے کرنال تک قومی شاہراہ نمبر ۱ (شیر شاہ سوری مارگ) کو چار سڑکوں والا بنانے کی سکیم کو منظوری دے دی ہے۔ یہ کام سنہ ۱۹۹۱ء تک پورا کیا جائے گا۔ اس سے نہ صرف کرنال اور دہلی کے درمیان کئی گنا بڑھے ٹریفک پر ہی قابو پایا جا سکے گا بلکہ اس اہم شاہراہ پر جان و مال کے نقصان اور بے جا ٹریفک کو بھی کم کرنے میں مدد ملے گی۔

ہریانہ سیر و سیاحت کے شعبے میں بھی ایک مثال بن گیا ہے۔ اس کے ٹورسٹ کمپلیکسوں میں نسبتاً کم قیمتوں پر سبھی آسائشیں میسر ہیں۔ سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اور مقامی لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سیر و سیاحت کے مزید مرکز قائم کئے جا رہے ہیں۔ کنگ فشر کمپلیکس، انبالہ جدید ترین کمپلیکس ہے۔ جلد ہی کورکشیتر میں ایک یاتری نواس بنایا جائے گا جس میں ۱۰۰ بستروں کا انتظام ہوگا۔

میری سرکار نے ہریانہ کے مجاہدینِ آزادی، آزاد ہند فوج کے سابق فوجیوں اور اُن کی بیواؤں کو اعزازات سے نوازا ہے۔ اس وقت ۵۵۴ر۳ مجاہدینِ آزادی کو جن میں آزاد ہند فوج کے ۳۸۴ر۲ سابق فوجی شامل ہیں، دو سو روپے ماہانہ کے حساب سے مالی امداد دی جا رہی ہے۔ میری سرکار بہادر فوجیوں، سابق فوجیوں، اُن کی بیواؤں اور بچوں کی فلاح کو پہل دیتی رہی ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۸۷ء تک ۱۵۵۰۷ سابق فوجیوں کو ۸۳ء۷۶ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے ہیں۔ میری سرکار کی جنوبی ہریانہ میں دوسرا سینک سکول کھولنے کی تجویز ہے۔

میری سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ چوتھے تنخواہ کمیشن کی سفارشوں پر حکومتِ ہند کے اعلان کردہ ترمیم شدہ تنخواہ سکیل ہریانہ کے ملازمین پر بھی لاگو کئے جائیں۔ یہ نئے سکیل جنوری سنہ ۱۹۸۶ء سے لاگو ہوں گے ـــــ اور ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۸۷ء تک کا بقایا رقم ملازمین کے جی۔پی۔ایف کھاتوں میں جمع کی جائے گی۔

یہ میری سرکار کے ذریعہ سالِ رواں میں ہریانہ کے عوام کے لئے سرانجام دیئے گئے اہم کام اور ہمارے آئندہ ۵ برس کے منصوبے ہیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ میری سرکار نے آئین کے رہنما اصولوں کی روشنی میں نئی زندگی کو حقیقی صورت عطا کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ (بجٹ تقریر کے چند اقتباسات)

(س۔ا)

بجٹ ۱۹۸۷-۸۸

(روپے کروڑوں میں)

کمپونینٹ	بجٹ اندازے 1986-87	ترمیم شدہ اندازے 1986-87	بجٹ اندازے 1987-88
۱	2	3	4
(۱) اوپننگ بیلنس			
Opening Balance			
(۱) اے۔جی۔ کے مطابق	(+)43.01	(—)31.81	(—)81.87
(ب) ریزرو بینک آف انڈیا کے مطابق	(—)0.41	(+)4.86	(—)45.20
(۲) ریونیو اکاؤنٹس			
Revenue Accounts—			
وصولیابیاں	1040.14	1069.22	1275.07
خرچ	907.16	979.03	1084.34
سرپلس	(+)132.98	(+)90.19	(+)190.73
(3) کیپیٹل خرچ (نیٹ)	186.65	210.78	184.76
Capital Expenditure (Net)			
(4) پبلک ڈیٹ			
Public Debt—			
لیا گیا ڈیٹ	749.10	721.83	597.48
Debt Incurred			
دوبارہ ادائیگی	626.71	505.12	464.96
نیٹ	(+)122.39	(+)216.71	(+)132.52

4	3	2	1
			(5) قرضے اور پیشگیاں
236.68	246.55	166.45	پیشگیاں
35.43	25.86	30.40	وصولیاں
(—)201.25	(—)220.69	(—)136.05	نیٹ
			(6) پبلک اکاؤنٹ
			Public Account —
(+)40.08	(+)37.91	(+)37.41	اَن فنڈڈ ڈیٹ (نیٹ)
(+)22.75	(+)26.10	(+)2.19	جمع اور پیشگیاں (نیٹ)
(+)10.50	(+)10.50	(+)1.00	ریمی ٹینس (نیٹ)
(+)73.33	(+)74.51	(+)40.60	نیٹ
			(7) سال کا کلوزنگ بیلنس
			Year's Closing Balance—
(—)71.30	(—)81.87	(+)16.28	(ا) اے۔ جی۔ کے مطابق
(—)34.63	(—)45.20	(—)27.14	(ب) ریزرو بینک کے مطابق



مظفر حنفی

غزل

مرنا برحق ہے جب چھپ کر تیر چلائے تو
لاکھوں تیر انداز ہیں لیکن میرے سائے تو!

کیا ہی پرشرمندہ ہیں سینے کے یہ پھول
میں چوٹیں کھا کر جیتا ہوں، کیوں شرمائے تو

دشمن پیچھے سے آلیں دھیمے چلنے میں
تیز چلوں تو ڈر لگتا ہے چھوٹ نہ جائے تو

پنکھ جُٹا کر آتا ہوں میں دھیرج سے لے کام
ایسے ہی کچھ بیٹھے رہیو جان بچائے تو

میں ستیا پا لمس کی خواہش، لَو دیتا ہے خُون
اور اُدھر میلا ہوتا ہے ہاتھ لگائے تو

میرے پیروں سے لپٹی ہے مریادا کی ڈور
سچ کہتا ہوں میں چاہوں تو بھاگ نہ پائے تو

جی بھر کر خوش ہولے جب تک مٹھی میں ہے رات
کل مجھ کو واپس جانا ہے، لاکھ منائے تو

گھور اندھیرے میں نکلے گا اپنے گھر سے کون
بیٹھا ہے بیکار مظفر دیپ جلائے تو

شاہد میر

غزل

یقیں کے لفظ گماں ساتھ لے کے آئے ہیں
چراغ اپنا دھواں ساتھ لے کے آئے ہیں

نہ بادباں ہے نہ کشتی کنارِ دریا ہم
بس ایک عزمِ جواں ساتھ لے کے آئے ہیں

رُکے رُکے سے یہ آنسو کسی کی پلکوں پر
سُراغِ کاہکشاں ساتھ لے کے آئے ہیں

ہوا کے سامنے ہونا ہے لب کُشا اُن کو
جو مثلِ شمع زباں ساتھ لے کے آئے ہیں

بکھر چکا ہے ہر اک تارِ پیراہن شاہد
قلوصِ ریگِ رواں ساتھ لے کے آئے ہیں

نشتر خانقاہی

یہ دائرے کی یاترا...

ببلو نے پانی سے بھری تھالی کے بیچوں بیچ اسٹیل کی چھوٹی سی کٹوری اُلٹ کر رکھی اور پھر فرش پر ایک لائن میں رینگتے ہوئے چیونٹوں میں سے ایک کو پکڑ کر اس نے کٹوری کے پیندے پر چھوڑ دیا۔

چیونٹوں کی لمبی قطار جو رسوئی گھر کے سامنے کی دیوار پر لگے مٹھائی کے ایک ریزے کی طرف دھیمے دھیمے بڑھ رہی تھی، مسلسل بڑھتی رہی۔ ایک ساتھی چیونٹے کے کم ہو جانے یا پکڑے جانے کے واقعہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیسے جیون کی اندھی دوڑ میں کس پر کیا گزری۔ اُن میں سے کوئی بھی یہ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

چیونٹے ایک منظم قطار میں مٹھائی کے ریزے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دیوار کے چکنے پلاستر پر قطار کا اگلا چیونٹا چڑھنے کی کوشش میں بار بار نیچے پھسل جاتا۔ اور پھر نئے سرے سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش شروع کر دیتا۔

ببلو نے کٹوری کے پیندے پر رینگتے ہوئے اُس چیونٹے کی طرف شرارت بھری آنکھوں سے دیکھا، جسے اُس نے فرش سے پکڑ کر ابھی ابھی کٹوری پر چھوڑا تھا۔

اسے اس کھیل میں ایک عجیب سا لُطف ملا۔

برابر والے کمرے میں اسکی ماں سلائی مشین پر بیٹھی پتاجی سے کسی معاملہ میں بات چیت کر رہی تھی۔ پتاجی کبھی جھنجھلاتے، کبھی دھیمے لہجہ میں بات کرنے لگتے۔ مشین کے شور میں لپٹی ہوئی ان کی آواز بیچ بیچ میں اپنا سلسلہ توڑتی ہوئی ببلو کے کانوں میں پہنچتی، لیکن ببلو اپنے کھیل میں کچھ ایسا مگن تھا کہ کسی بھی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔

یہ گرمیوں کی ایک تھکا دینے والی دوپہر تھی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ تھما تھما سا دھرتی پر تیز دھوپ بکھیر رہا تھا۔ سورج کی ایک کرن رسوئی گھر کے روشندان سے ہوتی ہوئی پانی سے بھرے اُس تھال کو چوم رہی تھی، جس کے سامنے ببلو چیونٹے اور پانی کے دائرے کے اس کھیل میں اپنی سُدھ بُدھ بسرائے بیٹھا تھا۔ اُس نے روشندان سے آتی ہوئی روشنی کی اس ننھی سی کرن کی طرف دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ دھوپ کی اس اُجلی چمکیلی لکیر میں دھول کے بہت چھوٹے، بہت ہی مہین ذرے، سفید دودھیا چنگاریوں کی طرح ناچ رہے ہیں لیکن پانی کو چومتی ہوئی کرن کا چمکیلا عکس، جب اُس کی آنکھوں میں چبھنے لگا تو اُس نے روشندان کے سامنے لگے تار پر کپڑا پھیلا دیا۔ دھوپ کی لکیر غائب ہو گئی۔ ساتھ ہی دھول کے وہ ننھے ننھے ذرے بھی روپوش ہو گئے۔ جو اب تک مہین مہین چنگاریوں کی طرح چمک رہے تھے۔

لمحہ بھر کے لئے ببلو کا ذہن مختلف خیالوں سے بھر گیا۔

اُس نے سوچا، دھول کے یہ باریک ذرے کہاں گئے؟ کیا وہ صرف دھوپ ہی تھی، جو انہیں چمکا رہی تھی؟ کیا دھوپ کے بنا ان کا کوئی وجود نہیں تھا؟

چھٹی جماعت کا طالب علم ببلو دھوپ اور دھول کے ان خفیف ذروں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچ سکا۔ تبھی سلائی مشین کی جھنجھناہٹ میں لپٹی پتاجی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ وہ ممی سے کہہ رہے تھے۔

شاردا، تم سمجھتی کیوں نہیں؟ ہماری کوشش، ہماری جدوجہد کے راستے محدود ہیں۔ ہم ایک ایسے دائرے کے اندر گھوم رہے ہیں، جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ سامنے نہیں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے، جیسے ہم سمندر کے بیچوں بیچ ایک ٹاپو پر کھڑے ہوں اور کنارے پر پہنچنے والے پہلی بار کے یاتریوں نے وہ ساری کشتیاں جلا دی ہوں، جو ہمیں ساحل تک لے جا سکتی تھیں۔"

"تم بات کو الجھانے کی کوشش مت کرو پرمود! سچائی کو پہیلیوں اور مثالوں کے پردے میں ڈھک کر مطمئن ہونے سے کام نہیں چلتا۔" شاردا کی آواز میں تیکھا پن تھا۔

ببلو نے کچھ پل سامنے کے کمرے سے آتی ہوئی آوازوں پر دھیان دیا۔ اور پھر اپنے کھیل میں گم ہو گیا۔ چھوٹے بچے دوپہر کی نیند کا آنند لے رہے تھے۔ پنکی اور رانی دونوں گھر بچوں کے شور سے یکدم خالی تھا۔ شیرا، دوپہر کا کھانا کھا کر چارپائی کے نیچے اوندھا ہو گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کی دنیا اب اس کے لئے نہ ہونے کے برابر تھی۔ پرمود اپنی آئے دن کی بڑھتی ہوئی الجھنوں سے تھک کر اسے صبح سویرے ٹہلانا کب کا چھوڑ چکا تھا۔ شیرا، صبح شام یونہی بلا کسی وجہ کے گھر کے آنگن میں گھوما کرتا۔ اور کبھی کبھی بھونکنے کے نام پہ بھونکنے کی ریہرسل کر لیا کرتا۔ زندگی کتنی محدود ہو گئی تھی۔

سکوت اور ہلچل کے درمیان سانس لیتے ہوئے اس گھر میں ببلو پانی سے بھرے تسلے کے نزدیک بیٹھا دلچسپی سے چیونٹے اور پانی کے دائرے کا کھیل دیکھنے میں گم تھا۔

چیونٹا کٹوری کے پیندے پر تیزی سے بھاگتا۔ چاروں طرف کے دائرے کی یاترا پھرتی سے طے کرتا۔ پھر نیچے، پانی سے اوپر ابھرے ہوئے تسلے کے کناروں کا چکر کاٹتا۔ کٹوری کی گولائی پر جہاں پانی کا دائرہ شروع ہوتا تھا کچھ پل کے لئے ٹھٹھکتا، کچھ سوچتا اور پھر پانی سے باہر نکلنے کا راستہ نہ پا کر دوبارہ اوپر کی طرف دوڑنے لگتا۔

چیونٹا جب بھی پانی کے اندر ڈوبی ہوئی کٹوری کے آخری کنارے تک آتا، ببلو کا من ایک عجیب سی گدگدی سے بھر جاتا۔ وہ سوچتا، چیونٹا اب ایک سوت اور آگے سرکے گا۔ پانی کے اندر چھلانگ لگائے گا، پھر تیر کر پانی سے باہر آنے کی کوشش میں پھدک پھدک کر پانی بھرے تسلے کے اندر ڈوب جائے گا۔ لیکن ایسا خیال پورا نہ ہوتا۔ چیونٹا، پیندے کے چاروں طرف گھوم کر نیچے اترتا۔ کٹوری کی گولائی کے چکر کاٹتا اور جیسے ہی اس کی گردن پانی کے نزدیک پہنچتی، وہ پھر تیزی کے ساتھ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگتا۔

اتنی دیر کے اس دلچسپ تماشے کے بعد ببلو نے محسوس کیا کہ چیونٹا باہر نکلنے کی اس مسلسل جدوجہد سے بری طرح تھک گیا ہے۔ اور اب اس نے کٹوری کے اوپر آ کر اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ وہ ایک جگہ تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ تبھی پتا جی کی آواز نے اس کی یکسوئی میں خلل ڈال دیا۔

"تم کیا کر رہے ہو ببلو، کچن میں بیٹھے ہوئے؟"

"کچھ نہیں، کھیل رہا ہوں، پاپا!" ببلو نے بے دھیانی میں مختصر سا جواب دیا اور پاس پڑا ہوا ایک تنکا اٹھا کر اس نے تھک ہار کر بیٹھے ہوئے چیونٹے کو چھیڑا۔

اچانک ماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ اس کے پاپا سے کہہ رہی تھی۔ "تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ چھٹی کے دن ببلو کو لے بیٹھو، اسے ارتھمیٹک ہی سکھا دیا کرو۔"

ببلو نے ماں کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے چیونٹے کی طرف دیکھا۔ تھکا ہارا کیڑا دوبارہ کٹوری کے پیندے پر تیز رفتار کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔ اس نے کٹوری کی چکنی سطح پر کئی چکر کاٹے، پھر وہ پیندے سے نیچے اترا۔ اور چاروں طرف تیزی سے چکر کاٹتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا، جہاں سے پانی کی حد شروع ہوتی تھی تو پل بھر کے لئے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں سے پانی کو چھوا۔ سونگھا، اور اب کی بار پھر باہر نکلنے کا راستہ نہ پا کر تیزی سے اوپر کی طرف لپکا۔ اب چیونٹا کٹوری کے پانی سے باہر نکلے ہوئے حصے پر دھیرے دھیرے گھوم رہا تھا۔

اس کے چاروں طرف پانی تھا۔ اور اوپر کٹوری کا بہت چھوٹا سا ٹاپو۔ جس کی سیماؤں سے نکلنے کی کوشش میں وہ کتنی ہی بار تھک گیا تھا۔ جب بھی وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا، چپ چاپ آنکھیں موند لیتا، تبھی ببلو تنکے سے اس پر وار کرتا، چیونٹا پھر اسی

رفتار سے کٹوری کے چاروں طرف دوڑنے لگا، دوڑتا ہی رہتا
بیلُو دیر تک اسی کھیل میں ڈوبا رہا۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ چیونٹا اب پانی کے اس فاصلے کو پار نہیں کر سکے گا جو اس کے اور دُھرنک پھیلی ہوئی دھرتی کے بیچ رکاوٹ بن گیا تھا۔

ماں کے ہاتھ میں بجتی ہوئی سلائی مشین اب خاموش ہو گئی تھی لیکن پِتا کے ساتھ اس کی گفتگو اب بھی جاری تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"کتنے ہی پروگرام اس ماہ بھی پورے ہونے سے رہ گئے۔ سوچا تھا کہ اپنی سہیلی اُوشا کی شادی پر ایک اچھا سا تحفہ دوں گی۔ لیکن نہیں دے سکی۔ سوچا تھا۔ گرمی کے موسم میں اپنے اور بچوں کے لئے کپڑے بنتے ہیں، لیکن نہیں بن سکے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔

پِتا جی نے بیچ ہی میں ماں کی بات کاٹ دی۔
"شاردا، تم جانتی ہو، محدود دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم جیسے لوگوں کو زندگی گزارنی پڑتی ہے، کئی بار چاہتا ہوں کہ یہ دائرہ ٹوٹے لیکن ٹوٹ نہیں پاتا۔

تبھی بیلُو نے کٹوری کے پیندے پر بیٹھے ہوئے چیونٹے کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے اُلٹا کر کے کٹوری کے بیچوں بیچ چھوڑ دیا۔ چیونٹے کی ٹانگیں چار چھوٹی چھوٹی سوئیوں کی طرح تیزی سے ہلنے لگیں۔ وہ سیدھا ہو کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن کٹوری کی چکنی سطح پر وہ اپنے آپ کو سیدھا نہیں کر پا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو پیروں کے بل سیدھا کر سکا۔ سیدھا ہو کر وہ پھر اسی تیزی سے بھاگنے لگا لیکن کٹوری کے چاروں طرف گھوم کر جیسے ہی وہ پانی کے نزدیک آیا تو باہر کا راستہ نہ پا کر پھر کٹوری کی طرف لپکنے لگا۔

پرمود اُٹھ کر کچن میں آ گیا تھا۔ اس نے ایک نظر بیلُو پر ڈالی اور پھر پانی سے بھرے تھال کی طرف دیکھ کر اس بے بس چیونٹے کو دیر تک دیکھتا رہا جو پانی سے باہر نکلنے کی کوشش میں اب بُری طرح تھک گیا تھا۔

پرمود خاموش دیر تک کھڑا رہا۔
اس نے سوچا کیا میں بھی ایک چیونٹا ہوں اور پانی سے بھرے سمندر کے بیچوں بیچ اس چھوٹے سے ٹاپو پر بیٹھا ہوں۔ اور باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہیں۔ اور کشتیاں دُور کنارے پر جلا دی گئی ہیں لیکن۔۔ لیکن۔۔!!
بیلُو، باپ سے ڈر کر کہیں اور بھاگ گیا تھا۔ ●......

بقیہ فراقؔ کی غزلوں میں لب و لہجہ کا مسئلہ ص ۱۸ سے آگے

پہ کاری۔ برجستگی۔ وارفتگی وارہانہ پن۔ شگفتگی۔ دلکشی یہ تمام خصوصیتیں ایک کامیاب غزل گو کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ الفاظ کا لوچ۔ لہجہ کا دھیما پن۔ بیان کی طرفہ ادا کی گھلاوٹ اور آواز کی کوملتا بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور ایک ہی عہد کے مختلف فنکاروں کو ان کے کلام میں لب و لہجہ کی مختلف کیفیت ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جوشؔ، جگرؔ، سیمابؔ اور فراقؔ ایسے معاصرین ہیں جن کا لب و لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور یہی اختلاف اور انفرادیت فراقؔ کے یہاں بھی ان کے لب و لہجہ کا مخصوص نشان ہے اسی نشان اور امتیاز نے ہر بڑے شاعر کے یہاں لب و لہجہ کا مسئلہ پیدا کیا۔ فراقؔ بھی اس مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں اور اپنے لب و لہجہ کی پرورش کرنے میں شعوری طور پر کوشش کی ہے جس کے وہ خود بھی معترف تھے ؎

میں نے اس آواز کو پالا ہے مر مر کے فراقؔ
آج جس کی نرم لَو ہے شمعِ محرابِ حیات

بقیہ نوجوانوں کی قوت ص ۲۷ سے آگے

آلۂ کار بن سکتی ہے۔ یہ طاقت بھارت کے ۲۱ ویں صدی کے سفر کیلئے ضروری ایندھن کا کام دے سکتی ہے۔ نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کے پروگرام اس مقصد کو سامنے رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور وہ ہمارے نوجوانوں کی صحت مندانہ ترقی اور ابھی پھوٹنے پھلنے والی نسلوں کے لئے صحیح فضا پیدا کر سکتے ہیں۔

فراق کی غزلوں میں لب و لہجہ کا مسئلہ

ہر بڑے فنکار کے یہاں اس کا لہجہ ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ لہجہ بھی ایک ایسی شناخت ہے جو اپنے عہد کے ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے ممیز کرتی ہے۔ میر کا لب و لہجہ سودا، درد اور مظہر سے اگر مختلف نہ ہوتا تو میر کی شناخت مشکل تھی۔ لب و لہجہ کی یہی شناخت فراق کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی آواز دور سے پہچان لی جاتی ہے۔ اور اپنے عہد کے دوسرے شعراء کے مقابلے میں انھیں امتیاز عطا کرتی ہے۔ امتیاز کا مطلب برتری نہیں پہچان ہے۔

فراق کی ادبی شخصیت بڑی اہم ہے کیونکہ نقد و شعر دونوں میں ان کی حیثیت درجۂ امتیاز کی حامل ہے۔ ان کی شاعری اور تنقید کا اسلوب نیا بھی ہے اور روایت سے وابستہ بھی۔ بلاشبہ فراق اپنے عہد کے ان شاعروں میں تھے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حیات و کائنات کی موسیقیت سے ہم آہنگ ہونے کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ اس میں ایک انوکھا حسن، ایسا رس اور ایسی لطافت تھی جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ فراق، حالی سے بہت متاثر تھے وہ خود کہتے ہیں۔

"جب مجھ پر حالی کا جادو چپ چاپ چل گیا اور ایک خاموش ہنگامہ میرے اندر پیدا ہو گیا تو میں نے دل ہی دل میں یہ سوچا کہ لوگ حالی کے یہاں شعریت اور تغزل کے قائل کیوں نہیں ہوتے جس وقت حالی کے الفاظ کان میں پڑے اس وقت دلی میں زندگی اور شاعری کے چراغ کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی۔"

یہ حقیقت ہے کہ حالی کے کلام میں جو پُرکاری، خلوص اور سادگی ہے۔ اس کا جادو آہستہ آہستہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ فراق حالی کے کلام کے معترف ہی نہیں بلکہ اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ حالی کے کلام کا مطالعہ فراق کے شاعرانہ مزاج کی تعمیر میں بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فراق کے کلام میں حالی کے کلام کی سادگی و پُرکاری کے ساتھ ہی مصحفی کے کلام کی دھیمی آنچ اور کسک بھی ملے گی۔

فراق جب پیدا ہوئے تو ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا جوان ہوئے تو یہ آزاد ہوا۔ فراق نے ملک کی جنگِ آزادی میں علمی اور عملی ہر طرح سے حصّہ لیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انھوں نے جوش کی طرح انگریزوں کے خلاف نعرہ بھی بلند کیا لیکن ان کا نعرۂ انقلاب و آزادی جوش کی گھن گرج سے مدھم ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ۔

"میری کوشش رہی ہے کہ ایک بلند ترین،

اور خیر و برکت سے معمور کائنات کی تخلیق
کروں۔ اپنی شاعری کے ذریعہ انسانیت کو
گہرا اور بلند بناؤں۔ ان کا دل، ایک چوٹ
کھائے ہوئے انسان کا دل تھا۔ غزل میں
فراق کا لہجہ نرم رفتار سادہ، اور بڑا پُرکار ہے۔
وہ خود کہتے ہیں ؎

تڑپ کو ہم نے بنایا سکونِ بے پایاں
ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

اور ان کا یہ شعر ؎

فراق راہ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑے کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

یہ حقیقت ہے کہ غزل پر اتنے حملے ہوئے کہ بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگائے اور انھوں نے نظم کے آنچل میں پناہ لی۔ جوش کی مثال سامنے ہے۔ لیکن فراق کی سبک روی اور لہجہ کی نرمی اور لَے کا دھیما پن ہمیشہ قائم رہا۔

شاعری کی کوئی بھی صنف ہو اسے پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کی حیات، کائنات اور ماحول پر بھی نظر رکھی جائے۔ جس طرح الفاظ شاعری کی نئی قدروں کے تعین میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ شاعر کی حیات، کائنات کی طرف بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن صحیح رہنمائی اس وقت ہوتی ہے جب ہم پہلے سے شاعر کی حیات اور کائنات سے واقف ہوں۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، گورکھپور کے ایک مقبول وکیل منشی گورکھ پرساد عبرت کے یہاں پیدا ہوئے۔ وہ ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ مگر انگریزوں کی غلامی انھوں نے پسند نہیں کی۔ ملک کی قومی آزادی کی تحریک میں شامل ہوئے۔ سیاست میں حصّہ لیا۔ جیل گئے اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ غرضیکہ انفرادی یا اجتماعی زندگی کی کامرانیاں ہوں یا محرومیاں۔ فراق نے اپنے مشاہدات اور تجربات ہی کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

"حیات و کائنات کے متعلق خیالات و نکات جب منتہاؤں تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ بھرپور معنویت لئے ہوئے شعری لفظی میں ڈھلنے لگتے ہیں۔"

فراق چونکہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ، اندازِ بیان کا مدّ و جزر اسلوب کے نشیب و فراز کا عکس ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ فراق کے یہاں غالب کا فکر و فلسفہ تو نہیں ہے لیکن ان کی غزلوں میں میر کی کوملتا ضرور ہے یہی وہ نرمی ہے جو گھن گرج کے ماحول میں بھی فراق کا نشانِ امتیاز بن جاتا ہے۔ غزل کی روایت کو زندہ رکھنے میں شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، اور جگر مرادآبادی کی صف میں فراق کو بھی شامل کرتے ہیں۔ فراق نے اردو کی عشقیہ شاعری کو ایسا آفاقی آہنگ عطا کیا جس میں قدم قدم پر ہمیں میر کا دھیما پن اور الفاظ کی کوملتا محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی تہذیب کی صدیاں بولتی ہیں۔ وہ انگریزی کے رومانی شاعروں میں Shelley، Wordsworth اور Keats سے متاثر ہیں خود Shelley کہتے ہیں:

"Most wretched men are cradled into
poetry by wrong,
They learn in suffering what they
teach in song."

فراق کے الفاظ ان کی آواز کا لوچ نرمی اور دھیما پن ہی ان کی اصل شناخت ہے جو انھیں ایک طرف میر سے قریب کرتی ہے تو دوسری طرف ان کی غزلوں میں ہندو دیومالا کے اثرات انھیں میر سے الگ کر دیتے ہیں۔ میر کہتے ہیں ؎

اب جان جسمِ خاکی سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

میر کے یہاں لب و لہجہ کا یہ دھیما پن فراق کو بھی متاثر کرتا ہے جس کا اعتراف خود فراق نے کئی جگہ کیا ہے ؎

صدقے فراق، اعجازِ سخن کی کیسی اڑا لی یہ آواز
ان غزلوں کے پردے میں تو میر کی غزلیں بولے ہیں

ہر طرح کے خیالات کی پیشکش الفاظ اور لہجے کے اُس
دھیمے پن کے ساتھ فراقؔ کے یہاں موجود ہے۔ لب و لہجہ کا
دھیما پن الفاظ کی تو ملتا، جملوں کی نرمی، ان کے اشعار میں اس
اس طرح پائی جاتی ہے جیسے ان کے دل کا گداز بے ساختہ ان
کے کلام میں موج زن ہو ؎

کس لئے کم نہیں ہے درد فراق
اب تو وہ دھیان سے اتر بھی گئے

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

ایک غزل گو کی حیثیت سے فراقؔ ایک کامیاب غزل گو
اس اعتبار سے بھی ہیں کہ ان کی غزلوں کا رچا ہوا لہجہ دلوں کو
کھینچتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی پیشکش اسلوب پر غالب
نہیں آتی بلکہ عشق کا موضوع ہو یا انقلاب کا، رومانی تصورات
ہوں یا ہیجانی جذبات۔ ان کے لفظوں کی گرفت لب و لہجہ کی
قید سے باہر ہو جاتی ہے۔ فراقؔ میرؔ اور غالبؔ کی ہم نوائی کا
دعویٰ کرتے ہیں ان کے نزدیک بزم زندگی کی تبدیلی رنگِ شاعری
کی تبدیلی کی ضامن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے
عہد کے تمام چھوٹے بڑے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش
کیا ہے۔ لیکن لہجہ کا یہ تو وہی ہے جس کی خود انھوں نے پرورش
کی ہے ؎

سن لو کہ فراقؔ آج یہاں گرمِ نوا ہے
اس دور میں اقلیمِ سخن کا وہ شہنشاہ

غالبؔ و میرؔ و مصحفی
ہم بھی فراقؔ کم نہیں

غزل کی خوبیاں بھرپور تغزل کے ساتھ، فراقؔ کی
غزل کے اس شعر میں ملاحظہ ہوں ؎

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

صیاد اور اسیرانِ قفس وغیرہ کی علامتیں روایتی
ہیں۔ لیکن جس قید و بند کے حالات میں فراقؔ نے آنکھ کھولی
تھی۔ اس پس منظر میں قطعی موزوں اور برجستہ ہیں۔ اسی لئے
یہ کہا گیا ہے کہ اشعار کی تفہیم اس عہد کے سیاسی اور سماجی
حالات کے تناظر میں کی جانی چاہیئے۔ فراقؔ کو سمجھنے کے لئے عہد
فراقؔ کے نشیب و فراز، شکست و ریخت پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔
انھیں حالات میں ہم فراقؔ کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ اور
یہی وجہ رہی ہے کہ میرؔ کی طرح فراقؔ کے سامنے بھی لب و لہجہ
ایک مسئلہ ہے ؎

یہیں ہیں گل، یہیں بلبل، یہیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب بھی دیکھا ہے قید خانے میں

کوتاہیٔ نصیبِ جنوں کچھ نہ پوچھئے
ہاتھوں میں آچکا تھا گریباں بہار کا

اور جب ہاتھوں میں بہار کا گریباں آ گیا یعنی آزادی
مل گئی تو یہ حال ہے ؎

سر بھی انھیں ملا در و دیوار بھی مگر
کم ہو سکی نہ وحشتِ زنداںیاں کبھی

حقیقت یہ ہے کہ فراقؔ محبت کے شاعر ہیں اُردو
زبان کے روایتی شاعر ہوں یا ترقی پسند۔ وہ اپنی غزلوں میں
تغزل کو برقرار رکھنے کے لئے عشق اور رومان کی کارفرمائیوں
کو ہمیشہ بروئے کار لائے ہیں۔ بقول غالبؔ ؏

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی سلسلے میں فراقؔ کے بھی شعر ہیں۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی تری رہگذار ہے پھر بھی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی

فراق محبت کے شاعر ہیں اور انھوں نے محبت کی کیفیتوں کو غزل کے لب و لہجہ میں اس طرح پیش کیا ہے گویا وہ ان تمام کیفیات سے گذرے ہیں۔ شاعر اپنے محبوب کو کبھی پیار سے ظالم کہتا ہے اور کبھی اس کی ادائیں قاتلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فراق کے یہاں محبوب کی اداؤں میں انسانیت ہے ؎

تجاہل ہے تغافل ہے، کشاکش ہے تکلف ہے
ادائے تو بہ تو سے وہ ہمارے ہوتے جاتے ہیں

اور جب اپنائیت محبت میں بدل جاتی ہے تو مصیبت بھی بن جاتی ہے ؎

محبت کی مصیبت میری جان المختصر یہ ہے
وہی ہم دونوں چاہیں پہ بعنوان دگر چاہیں

اور پھر شاعر کی محبت بھری داستان، زندگی میں ہجر و وصال کے مرحلے بھی پیش آتے ہیں ؎

شب فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

فراق کو وصال بھی راس نہ آیا ؎

وصال کو بھی بنا دے جو عین درد فراق
ابھی سے چھوٹنے کا غم سہا نہیں جاتا

فراق کے اشعار میں ان کے اپنے رنگ کے ساتھ ہی حالی کی سادگی اور مصحفی کا لہجہ بھی ملا ہوا ہے۔ لیکن اردو شاعری کی روایت سے انحراف بھی فراق کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ ان کا محبوب مائل بیداد نہیں بلکہ وہ بھی درد و محبت کی کسک سے دو چار ہوتا ہے ؎

مائل بیداد وہ کب تھا فراق
تو نے اس کو غور سے دیکھا نہیں

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

زمانہ بدلتا ہے۔ انقلابات آتے ہیں۔ لیکن محبت کے کام کبھی نہیں بدلتے ؎

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

اس شعر میں آپ نے محسوس کیا کہ میر کا عکس موجود ہے۔ لیکن میر کے یہاں جینا خود بھی ایک نازک کام تھا۔ فراق کے یہاں کام کی یہ نزاکت عشق میں بیان کی گئی ہے۔ ممکن ہے فراق یہ کہنا چاہتے ہوں کہ جینا خود بھی عشق ہے۔ زندگی اور عشق کی یہ ہم آہنگی نئے تصور کی راہ کھولتی ہے یہیں سے یہ نقطۂ نظر بھی نمایاں ہوتا ہے کہ زندگی عشق ہے اور عشق زندگی میر کا شعر یہ ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

میر اور فراق کے یہاں صرف الفاظ اور تراکیب کا فرق ہے۔ فراق کے یہاں زندگی محبت ہے اور دل آفاق۔ اور دونوں کی نزاکتوں کے میر بھی قائل ہیں اور فراق بھی۔ یہی وجہ ہے کہ فراق کے لب و لہجہ میں جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ہر عہد کے بڑے شاعر کے یہاں اس کے سامنے ایک مسئلہ رہا ہے۔

حسن نے مسئلہ کی اس کشمکش پر قابو پالیا وہ اپنے عہد کا نمائندہ
شاعر بن گیا۔ کیونکہ اس کے لب و لہجہ میں اس کی شخصیت جھلکتی
ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فنکار کی شخصیت کیا اس کے
لب و لہجہ کی آئینہ دار نہیں ہے؟ یقیناً ہے اور یہی آئینہ داری
اسے اپنے عہد میں امتیاز عطا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو
دبستانِ لکھنؤ کی بھیڑ میں آتش لکھنوی کی شناخت مشکل
ہو جاتی۔

فراق کے یہاں ہندی دیو مالا کا مطالعہ بہت وسیع ہے
جہاں نفسیات کو تقدس کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ فراق خود
کہتے ہیں۔

"میرے نزدیک جنسیت محض شہوت اور مباشرت
کبھی نہیں رہی۔ بلکہ ایک مکمل سازِ زندگی رہی۔ جنسیت
کی حدود سے گذر کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔"

فراق نے اپنی شاعری میں جنسیات کو جس انداز سے
پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے ؎

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

محبت کا تذکرہ بغیر حسن کے بے معنی ہو جاتا ہے۔
فراق جب حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو نشاط و کیف سے سرشار
نظر آتے ہیں ؎

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا
دیدۂ جلوۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خوں فشاں۔ کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رو

کیفیاتِ حسن کا بیان ہو یا جلوۂ حسن کی پیکر تراشی،
فراق کے لہجہ کا گداز نرمی، دھیماپن وہی ہے جو ان کا خاص
آہنگ غزل ہے۔ یہ انداز میر، مصحفی، میر حسن کے یہاں بھی ہے
اور آہنگ کی یہ نرم کیفیت انھیں ہندو دیو مالا کے اثرات سے
بھی نصیب ہوتی ہے۔ ان کے یہاں زلف و رخسار حسن و عشق
کے سلسلے میں جو استعارے اور تشبیہات ملتی ہیں وہ ان
شاعری میں ایک نئے آہنگ کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ادا
یہی آہنگ، لب و لہجہ کا دھیماپن انھیں اپنے عہد کے دوسرے
شعرا سے ممتاز کر کے ان کی شناخت بن جاتا ہے ؎

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

فراق کے لب و لہجہ میں جو گھلاوٹ اور نرمی پائی جاتی
ہے وہ ان کا اپنا انداز، لب و لہجہ طرزِ گفتگو، حسن بیان
ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے عظیم شعرا نے غزل
کے دھیمے پن کو اپنے لب و لہجہ میں سمو کر پیش کیا، شانِ امتیاز
پیدا کی۔ فراق خود بھی شاعری میں لب و لہجہ کے قائل ہیں۔ وہ
لکھتے ہیں

"کلام حالی میں کلام سعدی کی مکمل عکاسی
پائی جاتی ہے اس کی مثال اردو شاعری
میں ملنی محال ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو
انسانیت و ہمدردی حالی کی واعظانہ
اور قومی شاعری میں، باوجود اس کی سادگی
کے موجود ہے۔ اس رنگ میں وہ سعدی
کے یہاں نہیں ہے۔ سعدی ہمارے لیے
تھا۔ حالی ہم ہی سے تھے۔"

"نیا دور"، فراق نمبر ۱۲ صفحہ ۹

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فراق غزلو
میں آہنگ کے ہم نوا ہیں اور کلام کی سادگی ان کے اس نقطۂ نظر
کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سادگی، صفا

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

کرشن مدہوش

میرا نہیں مقام یہ میں تو سفر میں ہوں
اپنی نظر سے دور کسی کی نظر میں ہوں

کشتی کنارے پر سہی لیکن ہے چین کب
ہر لمحہ یہی سوچ کہ گہرے بھنور میں ہوں

ہاتھوں میں اپنے شام کا اخبار تھام کر
میں سوچتا ہوں بارہا کہ کس خبر میں ہوں

کہنے پہ ان کے چل تو پڑا اب خبر نہیں
رہزن کے ساتھ ہوں یا صفِ راہبر میں ہوں

سورج کو اپنی عمر کا حاصل سمجھ کے بھی
میں جانتا ہوں رات کے خونی اثر میں ہوں

اپنے بارے میں تو اب کچھ بھی نہ سوچا جائے
یاد اِک قید ہے اِس قید سے نکلا جائے

مشعلیں لے کے چلے تھے سو منزل کچھ لوگ
اُن کے ذہنوں میں اندھیرا تھا یہ مانا جائے

ہر کوئی موڑ پہ گر چھوڑ گیا تو کیا ہے
ہر کسی موڑ کو منزل نہ بنایا جائے

دولتِ درد کو سرمائے سے کم مت جانو
ایسے سرمائے کو دشمن سے بچایا جائے

خود کو بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے کبھی شام ڈھلے
آؤ سمجھانے چلیں خود کو تو پایا جائے

غزلیں



افسانہ

ایم مبین

محافظ

اس شام جب وہ واپس گھر آیا تو اسے بلڈنگ کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔

دو دو تین تین کا گروپ بنا کر بلڈنگ کے لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اُسے آتا دیکھ کر وہ سر اٹھا کر اسے دیکھ لیتے پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو جاتے۔

ان لوگوں کے رویّے سے اس نے اندازہ لگایا کہ ضرور کوئی انوکھی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ تبدیلی نظر آ رہی ہے اور لوگ اس بات پر چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔

"ارے ان صاحب کو بھی کیوں بھولتے ہو۔ ان کے بھی تو محترمہ سے تعلقات ہیں۔۔۔۔"

اپنے مکان کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ شرما جی جنھوں نے یہ بات کہی تھی اس سے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچے اور تیزی سے اندر آ گیا لیکن ذہن میں شرما جی کی بات اور آنکھوں کے سامنے بدلا بدلا سا ماحول اور سرگوشیاں کرتے لوگوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔

"آخر ایسی کیا بات ہوئی ہے؟" وہ ذہن پر زور دے کر بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ محترمہ سے شرما جی کا مطلب کس سے ہے؟ کہیں آبھا تو نہیں؟

آبھا کا نام ذہن میں آتے ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ارے ونود کچھ سنا آج کیا معاملہ ہو گیا" اچانک شیکھر دندناتا کمرے میں گھس آیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ کپڑے اتارتا ہوا بولا۔

"معاملہ کیا ہے میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ دونوں پارٹیاں الگ الگ بیان دے کر اپنے آپ کو بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اشوک کا کہنا ہے کہ اس کے آبھا سے عرصے سے تعلقات ہیں۔ آبھا اس پہ شادی کرنے کے لئے زور ڈال رہی تھی اس نے انکار کر دیا تو اسے بدنام کرنے کے لئے اس پر یہ الزام لگا رہی ہے کہ میں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور آبھا کا کہنا ہے کہ اشوک اسے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اشوک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج وہ بنا اجازت اس کے کمرے میں گھس آیا اور اس کے ساتھ زبردستی کرنے لگا تو اس نے اپنی حفاظت کے لئے شور مچایا اور مدد کے لئے لوگوں کو پکارا۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔" شیکھر کی بات سن کر اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

اشوک کا دعویٰ۔ اور پھر آبھا کا بیان۔! اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ نہیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اشوک بکتا

ہے۔ یہ آبھا کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔۔۔۔ آبھا کبھی ایسا نہیں کرسکتی۔۔۔۔۔"

اچانک وہ تیزی سے مڑا اور آبھا کے کمرے کی طرف چل دیا۔ آبھا کے کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر آیا تو اسے سامنے آبھا منہ کے بل پلنگ پر لیٹی سسکتی نظر آئی۔

"آبھا" پلنگ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

اس کی آواز سن کر آبھا نے سر اٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر سسک پڑی۔

"آبھا معاملہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

آبھا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکتی رہی۔

"آبھا تم بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا تو آبھا نے اپنے آنچل سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے اور سسکتی ہوئی بولی۔

"وہ ذلیل اشوک آج میرے کمرے میں گھس آیا۔ اور میرے ساتھ زبردستی کرنے لگا۔ میں نے شور مچا کر لوگوں کو بلایا۔ لوگ آئے تو کہنے لگا۔ میرے اس سے پرانے تعلقات ہیں۔ میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو یہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" کہتی ہوئی ایک بار پھر آبھا سسک اٹھی۔

"میں اس کمینے کا خون پی جاؤں گا" آبھا کی بات سن کر اسے طیش آگیا۔

"نہیں ونود نہیں۔" آبھا تڑپ کر بولی "تم اس کے منہ مت لگو۔۔۔۔"

"اس کمینے کی اتنی ہمت! میں اسے سبق سکھا کر ہی دم لوں گا۔"

"نہیں ونود۔ تم ایسا کوئی قدم مت اٹھاؤ جس سے میری اور ساتھ ہی ساتھ تمہاری بھی رسوائی ہو۔ لوگ اشوک کی باتوں کو سچ سمجھ کر باتیں تو بنا رہے ہیں۔ اگر تم نے جذبات کی رو میں ایسا کوئی قدم اٹھا دیا۔ تو تمہارے متعلق بھی باتیں بنانے لگیں گے۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور میرا ہے۔ کیونکہ میں ایک بیوہ ہوں۔ ایک نوجوان حسین بیوہ۔ نوجوان بیوہ چاہے وہ کتنی ہی پاک صاف کیوں نہ ہو۔ لیکن لوگوں کو اس کی پاکیزگی کا یقین نہیں آتا۔ کسی بھی مرد کا اس کے پاس سے گذرنا بھی اس کے لئے ایک دھبہ بن جاتا ہے۔ اور لوگ اس دھبے کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔"

آبھا کی بات سن کر اس کا سر جھک گیا۔

سچ مچ اگر اس نے اشوک کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کی تو لوگوں کو باتیں بنانے کا اور اسے اور آبھا کو بدنام کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اس نے آبھا کی آنکھوں میں جھانکا۔

آبھا کی آنکھوں میں ایک بے بسی بھری التجا تھی۔

"عورت کے لئے اس کا شوہر چاہے کیسا بھی ہو۔ جواری ہو۔ شرابی ہو۔ اس کا سب سے بڑا محافظ ہوتا ہے شوہر یہ لفظ ہی اس کا سب سے بڑا محافظ ہوتا ہے۔ اس کے شوہر کے ہوتے ہوئے نہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی طرف کوئی انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ اشوک جیسی ہمت کرے یا میری طرف انگلی اٹھائے لیکن ان کی موت کے بعد۔۔۔۔۔"

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور ایک بار پھر سسک اٹھی۔

اس کے ذہن میں شرما جی کی بات گونج رہی تھی۔

"ان کے بھی تو ان محترمہ سے تعلقات ہیں۔"

غصے سے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور پیر پٹختا ہوا واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اسے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

پلنگ پر گر کر اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے جلدی جلدی کش لینے لگا۔

ذہن میں آبھا کی باتیں گونج رہی تھیں تو آنکھوں کے سامنے بلڈنگ کا منظر اور لوگوں کے معنی خیز چہرے گھوم رہے تھے تو تصور ذہن کے پردے پر اس منظر کو اجاگر کر رہا تھا جب اشوک نے آبھا کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہو گی اور لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد اپنے دفاع کیلئے آبھا کو بدنام کیا ہوگا۔

"عورت کے لئے اس کا سب سے بڑا محافظ اس کا شوہر ہوتا ہے اس کے شوہر کے ہوتے ہوئے کوئی بھی اس کے ساتھ اشوک کی سی حرکت نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے"۔

"آبھا کی بات بالکل سچ ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ امر شرابی جواری تھا۔ لیکن اس کے ہوتے ہوئے سچ مچ نہ تو کسی نے اشوک کی سی حرکت کی تھی اور نہ ہی کسی نے آبھا کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ آج آبھا پر پڑنے والے کسی مرد کے سائے کو بھی لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور۔ وہ.... وہ تو آبھا سے کافی گھل مل کر رہ سکتا ہے تو کیوں نہ اس کے متعلق بھی باتیں بنانے کی کوشش کریں؟"

وہ جس بلڈنگ میں رہتا تھا آبھا بھی اسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر امر بھی اسی کی کمپنی میں کام کرتا تھا۔

ایک جگہ کام کرنے کی وجہ سے امر کی اور اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ لیکن یہ جان پہچان دوستی میں تبدیل نہیں ہو سکی۔ کیونکہ اسے امر کی عادتیں پسند نہیں تھیں۔

امر ایک عادی شرابی اور جواری تھا۔

آفس میں تو وہ ٹھیک رہتا تھا۔ لیکن آفس سے چھوٹتے ہی سیدھا شراب خانے پہنچ جاتا تھا۔ اور رات گئے عادی شرابیوں کی طرح شور مچاتا۔ بیہودی حرکتیں کرتا گھر آتا تھا۔

اسے جوا کھیلنے کی بھی عادت تھی۔ اکثر وہ جوئے میں ساری تنخواہ ہار جاتا تھا۔ تنخواہ ہار جانے کے بعد وہ دوستوں سے ادھار لے کر اپنے کام چلاتا تھا۔

آبھا اس کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کو مشکل سے دو سال ہوئے ہوں گے۔

امر کی حرکتوں سے بلڈنگ کے سبھی لوگ اس سے نالاں تھے۔ لیکن وہ صرف آبھا کی وجہ سے اسے کچھ نہیں کہتے تھے۔

کیونکہ ہر کسی کو آبھا سے ہمدردی تھی

آبھا اور امر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور سب یہی سوچتے تھے کہ ایک شیطان کے جال میں ایک معصوم پری کس طرح پھنس گئی۔

آبھا ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ اور لوگوں کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیتی تھی اس لئے سبھی اسے چاہتے تھے۔

اور اس پر امر کے مظالم دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے۔

امر جب بھی شراب پی کر آتا تھا کسی بھی بات پر جھگڑا کر دیتا تھا اور آبھا کو مارنے پیٹنے لگتا تھا۔

ایسی صورت میں اگر لوگ چھڑانے جاتے یا امر کو برا بھلا کہتے تو آبھا ان سے صاف کہہ دیتی۔

"ان سے کچھ نہ کہیئے۔ یہ ہمارا نجی معاملہ ہے۔ برائے کرم آپ لوگ چلے جائیے ہمارے معاملوں میں دخل نہ دیجئے۔"

آبھا کی برداشت کی حد دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ اور اس کی قوت برداشت پر عش عش کرتے تھے۔ آج کے دور میں آبھا جیسی بیوی ملنی مشکل ہے جو اتنے ظلم سہہ کر شوہر کی طرف داری کرے۔

اسے بھی آبھا سے دلی ہمدردی تھی۔

اکثر وہ جب بھی موقع ملتا امر کو سمجھاتا رہتا کہ وہ شراب پینا۔ جوا کھیلنا اور آبھا کو یوں مارنا پیٹنا چھوڑ دے۔

جب وہ شراب کے نشے میں نہیں ہوتا تھا تو وہ توبہ کرتا تھا۔ اور اپنے کئے پر شرمندگی ظاہر کر کے ہر کسی سے معافی مانگتا تھا کہ اب وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

لیکن شراب پیتے ہی توبہ اور معافی سب کچھ بھول جاتا تھا اور پرانی حرکتوں پر اتر آتا تھا۔

ایک دن رات کو وہ شراب کے نشے میں دھت واپس آ رہا تھا کہ سڑک پر کوئی ٹرک اسے کچل کر چلا گیا۔

اور آبھا بیوہ ہو گئی۔

اس کی موت پر کسی کو کوئی دکھ نہیں ہوا۔ سب خوش تھے کہ بلڈنگ کی ایک مصیبت گئی اور آبھا کو ایک شیطان سے نجات مل گئی لیکن آبھا کا روتے روتے برا حال تھا۔

ایک جواری شرابی ظالم شوہر کے لئے اس کی یہ تڑپ لوگوں کے لئے ایک سوالیہ نشان تھی۔

آبھا کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد وہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ ایک دن اس کے پاس آئی اور اس سے بولی۔

" اگر آفس میں مجھے میرے شوہر کی جگہ۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل جائے تو مجھے زندگی گزارنے کا ایک بہانہ مل جائے گا۔ آپ کوشش کیجئے نا۔"

آبھا کی بات اس کے دل میں اتر گئی اس نے اس سلسلے میں مالک اور منیجر سے بات چیت کی اور کافی دوڑ دھوپ کی۔

آخر اس کے دفتر میں آبھا کو ٹائپسٹ کی نوکری مل ہی گئی۔ اس طرح آبھا کو جینے کا ایک بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ شوہر کی موت کے غم کو بھلا کر وہ ایک نئی زندگی گزارنے کی جد و جہد میں لگ گئی۔

دونوں ساتھ ہی آفس جاتے آتے تھے۔ اور آفس میں بھی ان کا زیادہ تر وقت ساتھ ہی کٹتا تھا۔

کبھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے کبھی اپنے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے۔ کہ وہ اپنی بیوی کو کتنا پیار کرتا تھا۔ جس کی موت دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت ہو گئی اس کی ایک بچی ہے جو اپنی نانی کے گھر ہے۔

تو کبھی آبھا اپنے بارے میں بتانے لگتی کہ اس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے اس کے چچا چچی نے اس کی پرورش کی تھی۔ اس کی چچی اس پر کس طرح کے مظالم ڈھاتی تھی۔

دونوں کی دنیا یہیں تک محدود تھی۔

ابھی تک دونوں انہیں دائروں میں قید تھے انہوں نے کبھی ان دائروں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

لیکن صبح کے واقعے نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اشوک نے جو حرکت کی تھی اس سے اس کا خون کھول رہا تھا اس سے زیادہ غصہ اسے شرما جی کی باتوں پر آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر شرما کا گلا دبا دے۔

" یہ لوگ بھی کتنے ذلیل ہیں۔ اس کے اور آبھا کے بارے میں اتنا گندہ نظریہ رکھتے ہیں۔"

لیکن جب ذہن میں آبھا کے الفاظ گونجتے تو اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔

" ایک بیوہ پر اگر کسی مرد کا سایہ بھی پڑے تو لوگ اسے اس کا پاپ سمجھ لیتے ہیں۔"

وہ لوگوں کی زبانوں اور سوچوں پر پابندی کیسے لگا سکتا ہے؟ انہیں ایسا کچھ سوچنے سے کیسے روک سکتا ہے؟

آبھا۔ ایک جوان بیوہ ہے۔ اسے دیکھ کر لوگ اپنی ذلیل ذہنیت کا ثبوت دینے کے لئے ایسی باتیں سوچیں گے ہی ——— کریں گے ہی!

اس سلسلے میں وہ یا آبھا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

اچانک اس کے ذہن میں آبھا کے الفاظ گونجنے لگے۔

" ایک عورت کے لئے اس کا شوہر شوہر کا لفظ ہی اس کا سب سے بڑا محافظ ہوتا ہے۔ اس کے شوہر کے ہوتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی بھی مرد اشوک جیسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے۔"

اور ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

" آبھا " آفس جاتے ہوئے دوسرے دن اس نے آبھا سے کہا۔ تم نے کہا تھا نہ کہ ایک عورت کے لئے اس کا شوہر اس کا سب سے بڑا محافظ ہوتا ہے۔ میں تمہارا محافظ بننے کو تیار ہوں اگر تم اسے پسند کرو۔ اس کی بات سن کر پہلے تو آبھا چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر اچانک اس کی

آنکھوں میں ایک انجانی سی خوشی اور اقرار کی جھلک تھی۔

غزلیں

اِندرجیت سنگھ نکہت

جب ہوا کا لمس پا کر ریت چونکی نیند سے
میرے اندر پھر سے کوئی چوٹ جاگی نیند سے

اس طرح آئے ہو، دستک اور آہٹ تک نہیں
ایسا لگتا ہے یہ چوری تم نے سیکھی نیند سے

میں نے رشتوں پر پڑی تہہ دھول کی کیا چھیڑ دی
ہر شکایت جاگ اٹھی آنکھ ملتی نیند سے

میری آنکھوں نے تو دیکھی راہ اُس کی مدتوں
بیر کیا مجھ سے ہے، پوچھے کوئی اوچھی نیند سے

اس بہانے سے ہی شاید چھو لے آنکھوں کی زمیں
تم بھی کر دیکھو ذرا سی بے وفائی نیند سے

رکھ دیا پلکوں پہ انگارہ سکوں کے نام پر
کب شکن نے بھیگ مانگی تھی نگوڑی نیند سے

جب ہوا نکہتؔ کا چرچا جب ہوئی پھولوں کی بات
بھر گئی سب کوری آنکھیں میٹھی میٹھی نیند سے

شودیال سحاب

آدمی کی ہستی کیا خود فریبِ ہستی ہے
حسنِ محض ہو کر بھی حسن کو ترستی ہے

حُسن ہی نہیں سب کچھ عشق کی بھی ہستی ہے
ایک شانِ مستی ہے۔ ایک جانِ مستی ہے

رحمت ان کی ہے یکساں۔ کوہ و دشت و گلشن پر
یہ گھٹا ہے جو ہر دم رات دن برستی ہے

جان تک چھڑکتی ہے صرف شان پر دنیا
شان کتنی مہنگی ہے۔ جان کتنی سستی ہے

زندگی کے معنی جب اضطرابِ پیہم ہوں
کیوں سکونِ پیہم کو زندگی ترستی ہے

آدمی کا رتبہ ہے آدمی کی فطرت سے
کوئی ننگِ ہستی ہے کوئی فخرِ ہستی ہے

اُن کا حسنِ بے پروا تشنگیٔ بے پایاں
آنکھ سیر ہو کر بھی دید کو ترستی ہے

نوش و نیش کی لذّت ہجر و وصل کی راحت
رنگ و بو کی دنیا میں کس بلا کی مستی ہے

اور کوئی اب اس میں اے سحابؔ کیا آئے
دل کسی کا مسکن ہے دل کسی کی بستی ہے

نوجوانوں کی قوت

ترقی کے عمل کی الجھن

قریب ایک تہائی آبادی کی عمر ۱۹ سے ۳۵ برس تک ہونے کے سبب بھارت کو ایک نوجوان قوم کہا جا سکتا ہے — آبادی کا یہ حصہ قوم کا ایک نہایت متحرک اور پیداواری وسیلہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسی حصے کو نظر انداز کیا جائے یا مناسب ڈھنگ سے استعمال نہ کیا جائے تو سماج اور حکومت کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔

آج نوجوانوں کا یہ طبقہ ایک اضطراب کے دور سے گذر رہا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی کل ۲۲ کروڑ ۱۰ لاکھ کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ ان پر دن رات مختلف اقسام کے دباؤ پڑتے ہیں جن میں سماجی مجبوریاں، اقتصادی پسماندگی، ناخواندگی اور رجعت پسندی شامل ہیں ان اثرات کا ان کی خود کفیل اور باوقار زندگی بسر کرنے کی خواہشات اور امیدوں سے براہِ راست ٹکراؤ ہوتا ہے۔

بے روزگاروں کی روز افزوں باقی تعداد اور روزگار کے پیدا ہو رہے وسیلے ایک اور امر ہے جو صورت حال پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

ہمارے نوجوان لوگوں کو اپنی شخصیت کی تعمیر، اپنی ہنرمندی کا درجہ بلند کرنے اور انھیں سماجی طور پر مفید اور اقتصادی لحاظ سے پیداوار کے قابل بنانے کے لئے انھیں زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوان عورتوں سے متعلق یہ مشکل اور بھی شدید ہو جاتی ہے جن کیلئے سماجی پروگرام مرتب کرنا اور ان پر عمل کرنا اور بھی ضروری ہے۔

انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کا محکمہ ایک ترقی پسند اور با اعتماد پود کی تعمیر کے کام میں لگا ہوا ہے۔ پیشہ ورانہ تربیت کے ذریعہ تعلیمی مواقع اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے ان لوگوں کو مناسب کاموں پر لگانے سے لے کر ثقافتی ترقی تک اس اسکیم کے کئی ایک پہلو ہیں۔

مسئلے میں اضافہ

بھارت کے رجسٹرار جنرل اور مردم شماری کے کمشنر نے آبادی کے جو تخمینے لگائے ہیں ان کے مطابق نوجوانوں کی آبادی ۱۹۸۶ء میں ۲۵ کروڑ ۷۷ لاکھ ۱۰ ہزار سے ۱۹۹۱ء میں ۲۹ کروڑ ۶۵ لاکھ ۷۰ ہزار ہو جائے گی۔ موجودہ شرح سے ۲۰۰۰ء تک بھارت میں نوجوانوں کی آبادی ۳۱ کروڑ ۲۸ لاکھ ہو جائے گی جو دنیا کے نوجوانوں کی کل آبادی کے ۲۶ فی صد کے برابر ہے۔

نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو تعلیمی نظام کی زندگی کے امور سے لاتعلقی پر تشویش ہے جن کا انھیں سامنا ہے۔

بھارت میں نوجوانوں کو اپنی زندگی کے مقاصد کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیمی سہولیات بڑھ رہی ہیں۔ سماجی نقل و حرکت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سفر کے مواقع اور اطلاعات کے وسائل تک رسائی وسیع ہو گئی ہے نوجوان لوگ

ان کا تاثرہ اشارہ ہے ہیں اور اس عمل میں تبدیلی کے محرک اور ترقی کے آلہ کار بن گئے ہیں۔

ایک ایسا مقام آپہنچا ہے جبکہ بعض فرسودہ تصورات اور خیالات کو پھر سے مرتب کرنا ہوگا جن سے سماج میں طاقت، یک جہتی اور قوت محرکہ پیدا ہوگی نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم اور تکنیکی پیشہ ورانہ تربیت کو اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے۔

چھٹے منصوبے کی مدت میں ۳۲۴ کروڑ ۴۰ لاکھ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لئے کئی منصوبہ جاتی پروگراموں پر عمل شروع کیا گیا تھا۔ ۱۵ سے ۳۵ برس کی عمر کے نوجوانوں کو ان مواقع سے زیادہ تر فائدہ پہنچا ہے۔

نوجوانوں کے لئے پالیسی

حکومت کی نوجوانوں کے لئے قومی پالیسی کے مسودے میں تعلیم و تربیت تک رسائی اور خاص طور پر جدید ٹکنالوجی، صبر سے کام لینے، استدلال میں اعتقاد، نظم و ضبط، خود اعتمادی، جذبہ رحم، کھیل کے جذبے سائنسی انداز طبع اور ہمارے ثقافتی ورثے کے علم پر زور دیا گیا ہے۔

نوجوانوں کو سماجی برائیوں کا مقابلہ کرنے، استحصال کا شکار نہ ہونے، جسمانی کلچر، اولوالعزمی کی تعلیم دی جائے گی اور صحت مندانہ سرگرمیوں کا بھی اہم کردار ہوگا۔ نوجوانوں کی امن، سیکولرازم، عدم تشدد، قومی یک جہتی اور ماحولیات کے تحفظ کیلئے بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

اس کے لئے طریقہ کار محض پروگراموں کی منصوبہ بندی اور کچھ نشانے حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ پوری کوشش یہ رہے گی کہ نوجوانوں کے مسائل کا پتہ لگایا جائے اور جہاں تک ہو سکے انھیں حل کرنے میں مدد دی جائے جیسے کہ منشیات کی لت چھڑانے کیلئے کی جاتی ہے۔

کچھ دیر سے بعض نہایت خطرناک اشارات مل رہے ہیں جن میں لڑکیوں میں تمباکو اور شراب نوشی کا بڑھتا ہوا رجحان اور بہت چھوٹے بچوں کو منشیات کے کاروبار میں شامل کیا جانا۔

ملک کے کل جرائم کا ۶۰ فی صد حصہ نوجوان کرتے ہیں اور اس میں سے بھی ۸۰ فی صد حصہ جرائم ۱۶ سے ۲۱ برس کی عمر کے لڑکے کرتے ہیں۔ یہ جرم اور منشیات کا چکر شہری گندی بستیوں اور بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں زیادہ زور پر ہے۔

ان تمام مہلک برائیوں سے نپٹنے کے لئے ایک جامع طریقہ کار مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس میں تربیت، علاج اور بحالی کے طریقے شامل ہیں۔

نیشنل سروس اسکیم

اس اسکیم میں رسمی تعلیم حاصل کرنے کے دوران نوجوانوں کی طرف سے عوام کی خدمت کا خیال شامل ہے جس کے لئے طلباء کا سماجی شعور بیدار کرنا اور انھیں اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے گرد و نواح میں تعمیری کام کرنے کے مواقع مہیا کرنا ضروری ہے اس طرح طلباء کو سماج کے حالات کو سمجھنے اور انہیں محسوس کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔

چنانچہ اس اسکیم کے تحت جو پروگرام شروع کئے گئے ہیں ان میں مقامی ضروریات اور ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے ماحولیات کے تحفظ اور بہتری، سماجی خدمت، سیلابوں، زلزلوں اور طوفانوں جیسے ہنگامی حالات، خواتین کے مرتبے کو بلند کرنے کیڑوں کی روک تھام اور امداد باہمی انجمنوں کے فروغ وغیرہ کے کام شامل ہیں۔ تعلیمی اور تفریحی پروگرام جس میں تعلیم بالغان اور قبل از اسکول کی تعلیم بھی شامل ہیں، پروگرام کا ایک اور حصہ ہیں۔

نیشنل سروس پروگرام کا مقصد عام طور پر ان لوگوں کی جو پہلا ڈگری کورس مکمل کر چکے ہیں رضاکارانہ طور پر قومی مقصد کے کام میں اور پورے دن کے کام میں شامل ہونے کا موقع مہیا کرنا ہے۔ قومی خدمت کے ان رضاکاروں کو نہرو یووک کیندروں اور رضاکار تنظیموں میں اجتماعی خدمتوں کے کارکنوں کے طور پر لگایا جاتا

ہے۔ پروگرام انھیں ایسے تخلیقی و تعمیری کام کرنے کا موقع مہیا کرتا ہے جو شرکت کرنے والوں کے رجحانات اور تعلیمی پس منظر کے لئے موزوں ہوں۔

اولوالعزمی اور نوجوانوں کے کلب

نوجوانوں میں جان جوکھم میں ڈالنے، جماعت کے طور پر مل کر کام کرنے، ان میں ہمت افزا صورت حالات کے مقابلے میں فوری اور موثر ردعمل کی حوصلہ افزائی اور نظم و ضبط و قوت برداشت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے مالی امداد منظور کی جاتی ہے۔ یہ مالی امداد اداروں، گروپوں، کشتی رانی، پیدل سفر، اعداد و شمار جمع کرنے کی غرض سے چھان بین، پہاڑوں میں حیوانات و نباتات کے مطالعے اور تیراکی نیز نوجوانوں کی ایسے کام کرنے کے لئے تربیت کے لئے بھی دی جاتی ہے۔

رضاکار تنظیموں کو نوجوان افراد کو شہری گندی بستیوں کی بہتری کے کاموں میں شامل کرنے میں بھی مدد دی جاتی ہے۔ رضاکار ادارے حکومت کی مدد سے جو دوسرے کام کرتے ہیں ان میں دیہی نوجوانوں کی کاروباری صلاحیت بہتر بنانے کے لئے جو سماجی تبدیلی لانے کا آلہ کار بن سکتے ہوں نوجوانوں کی قیادت کی تربیت کے پروگرام شروع کرنے بھی شامل ہیں۔

یوتھ کلبوں کی سرگرمیاں قومی طور پر مسلمہ تندرستی، سماجی برائیوں کے خلاف آگاہی پیدا کرنے اور تندرستی کے کلچر کے فروغ کے لئے رضاکارانہ کوششوں کی تنظیم کے لئے بہت اہمیت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ اس وقت بہت سے یوتھ کلب نچلی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ یہ اسکیم یوتھ کلبوں کی سرگرمیوں کو ایک مثبت رخ دینے کے لئے شروع کی گئی ہے۔

سکاؤٹنگ اور گائڈنگ ایک بین الاقوامی تحریک ہے اور اس کا مقصد لڑکوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تعمیر ہے جس سے وہ اچھے شہری بن سکیں۔ اس کے لئے ان میں وفاداری ـــــ حب الوطنی اور بلاغرض خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ سکاؤٹنگ اور گائڈنگ کی سرگرمیوں سے لڑکے اور لڑکیوں میں متوازن جسمانی و ذہنی ترقی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے جو قومی تنظیم اس سرگرمی کو فروغ دے رہی ہے وہ ہے بھارت سکاؤٹنگ اینڈ گائڈز جسے نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کا محکمہ مالی مدد دیتا ہے۔

نوجوانوں کے قومی ایوارڈ

نوجوانوں اور نوجوانوں کی تنظیموں کی طرف سے کئے گئے نمایاں کاموں کی قدر شناسی کے لئے جو قومی ترقی یا سماجی خدمت کے طور پر کئے گئے ہوں اور نوجوانوں میں اپنے عوام کے تئیں ذمہ داری کی حوصلہ افزائی کے لئے اور اس طرح ایک اچھے شہری کے طور پر ان کی صلاحیت بہتر بنانے کی غرض سے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کے محکمے نے نوجوانوں کے قومی ایوارڈ کی اسکیم شروع کی ہے۔ وزیر اعظم نے حال ہی میں یہ ایوارڈ ۱۲ نوجوانوں اور ایک ادارے کو پیش کئے۔

نہرو یووک کیندر بنیادی سطح پر ایسے دیہی نوجوانوں کی سرگرمیوں کے فروغ اور تال میل کے لئے جو طالب علم نہیں ہیں ایک نئی قسم کے کثیر المقصد ادارے ہیں۔ یہ پروگرام ۱۹۷۲ء میں اس قسم کے نوجوانوں اور بالخصوص دیہات کے علاقوں کیلئے شروع کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک میں ۲۲۷ نہرو یووک کیندر کام کر رہے ہیں۔

نہرو یووک کیندر مقامی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق اپنی سرگرمیاں منظم کرتے ہیں جن میں دیہات کے نوجوانوں کے لئے غیر رسمی تعلیمی پروگرام، سماجی خدمت کی سرگرمیوں کا انعقاد مثلاً دیہی علاقوں میں تعمیری کاموں کیلئے کیمپ لگانا، ثقافتی و تفریحی سرگرمیاں، کھیل کود کا فروغ، نوجوان رہنماؤں کے لئے تربیتی پروگرام اور پیشہ ورانہ تربیت شامل ہیں۔

اگر مناسب ڈھنگ سے استعمال کی جائے تو نوجوانوں کی قوت سماجی اقتصادی اور ثقافتی تبدیلی کیلئے ایک زوردار

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

نورجہاں صدیقی

سیندور کی آنچ

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔
وقت کے انقلاب سے بے خبر کاروانِ زندگی اپنی منزل کی جانب بڑھا جا رہا تھا۔ وہی رہگذر آج بھی حیران حیران نظروں سے اپنے جسم پر رینگ رہی آہٹوں کو محسوس کر رہی تھی۔ آہٹیں..... حسن و عشق کی مدہوش کُن صداؤں کی۔ خواہشات و التفات میں گھری نقرئی جھنکاروں کی۔ پھر کیا بدل گیا تھا؟ سب کچھ وہی تو تھا۔ اسی طرح تو تھا آج بھی روزگارڈن کی مہکی مہکی روِش پر جوڑے سرگوشیوں میں مست تھے۔ ایک دوشیزہ..... آج بھی فوّارے کی پھوّاروں میں اپنا رنگین دوپٹہ اُڑاتے شرم سے اپنے میں سمٹی جا رہی تھی۔ فرق تھا تو صرف چہروں کا۔ نہیں چہروں پر پڑی نقابوں کا چہرے تو یکساں ہی ہوتے ہیں۔ دھوکا دینے والی قاتل نگاہیں، معصوم چہرے سب کے پاس ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔ مجھے آج بھی سب کچھ یاد تھا۔ اُس حسین دوشیزہ کی معصوم سی ہنسی..... جس کی جھنکار پر میں بے ساختہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اُس کے حُسن میں اس قدر کھو گیا کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ کلی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قدموں تلے کچل گئی ہے اور میں دیر سے فوّارے کی پھوّار میں کھڑا بھیگ رہا ہوں۔ قدرت کا وہ حسین پیکر مجھے روزگارڈن سے زیادہ پُرکشش لگ رہا تھا۔

صنفِ نازک مَرد کی ہمیشہ کمزوری رہی ہے۔

لیکن میں کچھ زیادہ ہی شدّت پسند واقع ہوا تھا۔ ہر کلی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے مسل ڈالنے کی خواہش میرے دل میں اُبھرتی اور جب تک وہ کلی میرے قدموں تلے آکر اپنی عفت ہی نہیں، ہستی تک نہ گنوا دیتی مجھے قرار نہ آتا۔ حسین سے حسین لڑکی چند ہی ملاقاتوں میں میرے قریب یوں آجاتی جیسے وہ نسلِ انسان کو پروان چڑھانے والی ذات نہ ہو بلکہ اسی کی دائیں پسلی سے اُپجی ہوئی ایک لطیف شئے ہو اور میں بھی دِل کھول کر سرچشمۂ حسن سے سیراب ہوتا تھا۔ میری نظر میں حُسن کی کچھ اور ہی قدر و قیمت تھی۔ میں ایک بار جس کی طرف قدم بڑھاتا دوسری بار خود بخود وہ جسم کھنچے چلے آتے۔ صرف ایک لمس کی خاطر۔

لمس، پیار، تڑپ۔ انہیں اجزاء سے مِل کر تو ایک وجود دنیا میں آیا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجھے ایسے ناجائز وجود کو مِٹانے کے لئے بڑی بڑی رقموں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ یوں میرے اوپر کوئی ذمّہ داری نہیں تھی مگر میں جو کچھ بھی کرتا تھا وہ میرے پیار کا احسان ہوتا۔ میری محبوباؤں کی تحریریں آج بھی میرے پاس محفوظ تھیں۔ جن میں سے کچھ بلیک میل ہوتے ہوتے وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی

تھیں۔ اور کچھ آج بھی گھر سے باہر اپنے عاشقوں سے ملکر اپنے شوہروں کو دھوکا دے رہی تھیں۔

گلاب کی ادھ کھلی کلی میرے قدموں تلے کچل گئی تھی۔ لیکن میں اس نظارۂ حسن کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک جیسے کسی نے مجھے آسمان کی بلندیوں سے گرا دیا۔ میں نے بچ بچا کر اپنی بھوری آنکھوں سے دیکھا۔ وہ دوشیزہ کسی بانکے کو دیکھ کر سمٹ سی گئی تھی۔ اس کی تیکھی تیکھی نگاہیں محبوب سے ٹکراتی زمین پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ یہ زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ میری پسند کا پھول کسی دوسرے کی آغوش میں جانے کو بیتاب تھا۔ وہ دونوں روز گارڈن کی گلاب سے لدی جھاڑیوں کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے ایسی باتیں جو زبان سے کم اور آنکھوں سے زیادہ ہو رہی تھیں اور جس کا مفہوم بھی وہ خود ہی سمجھ رہے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کنپٹیاں جلنے لگیں۔ پیار کی دھیمی آنچ میں سلگتے وہ دو بدن خراماں خراماں روز گارڈن سے ایک جانب چل پڑے تھے۔ نہ جانے کیوں میں بھی انھیں کے پیچھے چل پڑا۔ وہ دونوں دریا کے کنارے آگئے تھے اور اس سنسان جگہ میں میرا رقیب اس دوشیزہ کا ہاتھ بڑے پیار، بڑی نرمی سے تھامے ہوئے تھا۔ میں نے اس دوشیزہ کی آنکھوں میں آرتی کے ان گنت چراغوں کی چمک دیکھی۔ پاکیزہ اور محبت بھری شام ڈھلنے لگی اور رات کی تاریکی میں دونوں سائے دو مختلف راہوں سے چلے گئے۔ میں پھر بھی وہیں تذبذب کے عالم میں اپنے اندر چھپے ہوئے جانور کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش میں لگا رہا نہ جانے ایسی کونسی کشش تھی جو مجھے اس لڑکی کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح ملتے رہے اور پھر اسی مخصوص وقت اور انداز سے جدا ہوتے رہے۔ ایک شکست کا جذبہ تھا جو مجھے نہ جانے کس طرف لے جانے پر اکسا رہا تھا۔ شروع شروع میں، میں اس آواز سے غافل رہا لیکن اُس کے علم میں آتے ہی میں جیسے چونک گیا۔

"کیا میں ایسا کر سکوں گا؟"

اور میرے اندر چھپے حیوان نے مجھے یاد دلایا۔

"انسان کا وجود خاک اور روح کا ملاپ ہے۔ مت بھول کہ خاک میں کشش ہوتی ہے۔ زمین بھاری ہے — آسمان تو اس کے گناہوں کی پردہ پوشی چادر ہے۔ انسان خاکی اسی زمین پر چلنے پھرنے والی، پستی میں سما جانے والی ملک کی تڑپتی سسکتی فریاد ہے۔"

اس آواز نے کشمکش کا سارا طلسم توڑ دیا۔ اب میں اس کے محبوب کی لاش کو حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ شام کی لالی اپنے کلیجے پہ ایک بے گناہ کے خون کا داغ لئے موت کی تاریکی میں چھپ گئی تھی۔ میں ا کی لاش کو ٹھوکر مار کر خود جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ اپنی فتح کے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے وہ آتی تھی، سبز لباس میں بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی۔ اپنے محبوب سے ملنے کی آرزو میں۔ مگر خون آلود لاش دیکھ کر وہ سہم سی گئی۔ میرا خیال تھا اب وہ لاش پہ گر کر روئے گی۔ چیخے گی۔ چلائے گی۔ مگر وہ زوبت کی مانند کھڑی تھی: خاموش۔ ساکت۔ پھر وہ جھکی۔ آہستگی سے اس نے پہلی بار اپنے محبوب کے ہونٹوں کو چوما۔ اور خاموشی سے اس کی لاش کاندھوں پہ ڈال کر چلنے لگی۔ میں حیران تھا۔ اس کے رویّہ پر، اس کی دلیری پر۔ کسی امانت کی طرح اس نے وہ لاش دریا کو سونپ دی اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی، اسے دیکھتی رہی۔

اپنی فتح پر میں بہت مسرور تھا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد میں نے اس قاتل حسن کو بھی جیت لیا تھا۔ محبت کے سوانگ سے نہ سہی شادی کے بندھن سے سہی۔ میری پہنچ بہت اونچی تھی۔ اس لئے کسی بھی لڑکی کے خاندان سے رشتہ طے کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اب وہ میری اپنی کائنات تھی۔ گھنٹوں میں اس کے پاس بیٹھا محبت و پیار کی باتیں کرتا، وہ بھی زیرِ لب مسکرا کر مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی قربت میں نہ جانے کیوں میں گذشتہ تمام معشوقوں کو بھول گیا تھا۔ پھر بھی فرصت

کے اوقات خطوط کو گرماتی سے محفوظ ہو لیتا تھا۔ اور اپنی تحریروں میں پوشیدہ اپنی ڈائری کے اس راز کو بھی پڑھ لیتا، جس کے جال میں وہ بے بس ہوئی آج بھی اسیر تھی۔

ایک دن یونہی میں وہ تحریریں پڑھ رہا تھا کہ وہ کمرے میں آگئی۔ میں نے لاپرواہی سے وہ تمام تحریریں آتش دان کی نذر کر دیں۔

"یہ کیا تھا؟" وہ چونک کر بولی۔

"کیوں؟" میرے تیور دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اور چپ چاپ میری میز پر ناشتے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی۔

میں دھیرے دھیرے چائے کی چسکی لینے لگا۔

"چائے کیسی بنی ہے؟" تبھی وہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ میری نظر اس کی مانگ پر پڑ گئی۔

"یہ تمہارے سیندور کی لالی؟"

"ہاں! آج کچھ گہری ہے۔" وہ ہنس کر بولی لیکن دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔ مجھے یاد آیا آج ہی کے دن تو اس کا محبوب میرے ہاتھوں موت کی نیند سویا تھا۔ میں خاموشی سے اپنی بیوی کے چہرے سے اس کے جذبات پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بھی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اچانک وہ زور سے ہنسنے لگی۔ میں اس کی ہنسی کے راز کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ قہقہوں کے درمیان بولی۔

"تم وہی ہو نہ جس نے ان گنت لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ان کی زندگی کو بہار آشنا ہونے سے پہلے ہی خزاں سے متعارف کرا دیا۔ تم وہی ہو نہ جس نے میری معصوم بہار کو جارحانہ طریقے سے نظرانداز کیا تھا۔ تم وہی ہو نہ...!"

وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔

"جس نے صرف میرے جسم کی خاطر... مجھ سے شادی کی۔ تو سنو!

تم آج تک صرف میرا جسم حاصل کرتے رہے.... میں
.... میں......!"

"خاموش!" زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ گر پڑی اور فرش کی چوٹ سے خون کی پھوار اس کی پیشانی پر بہہ نکلی۔

"آج تم مجھے خاموش نہیں کر سکتے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں نہیں پتہ میں تمہارے تمام عزیزوں سے واقف تھی۔ آج میرے سیندور کی لالی گہری ہے کیونکہ یہ لالی سیماب کی افشاں..... میرے پیارے دل کو سکون دے گی۔ میرا سیندور..... ایک شکستہ دل کے رستے ہوئے زخم کا لہو بن کر تمہاری رگوں میں کوڑھ بن کر سما جائے گا۔ دنیا اس کوڑھی سے بچ کر نکلے گی جس نے بہت دل دکھائے ہیں۔"

وہ ہنسی اور تیزی سے دروازے سے نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن روز گارڈن کے گیٹ کے نزدیک آ کر مجھے ٹھوکر لگی۔ میں گر پڑا۔

شام کے سرمئی دامن میں وہ اپنا سبز آنچل لہراتی روز گارڈن سے گذرتی، دور دریا کی لہروں میں کھو گئی۔ اور....... میں ایک کوڑھی۔ آج بھی اپنی پیپ بھری آنکھوں سے مکھیوں کو اڑاتا روز گارڈن کے اس فوارے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں آج بھی کوئی دوشیزہ اپنے محبوب کے انتظار میں اپنا دوپٹہ ہوا میں لہراتی گنگنا رہی تھی۔

بقیہ نظیر اکبرآبادی ص ۳۴ سے آگے

ہے۔ انجام عیش کی "لیموں کی مصوری کی ہے۔ اخلاقی اوصاف کی تلقین کی ہے جس میں روحانی سرشاری کا سامان ہے۔ نظیر کی شاعرانہ حیثیت اور ادبی عظمت بہت بلند ہے۔ وہ شیخ سعدی کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

غزلیں

ہر گلی چوک میں دن رات تماشے ہوں گے
بدگمانوں کے بکھرتے ہوئے رشتے ہوں گے

آج ہی سوچیے کلیوں کے ارادے کیا ہیں؟
کل تو پھر آپ کے خود سامنے نقشے ہوں گے

جن کی تہذیب کا مٹی سے نہیں ہے رشتہ
ایسے بادل تو سمندر میں برستے ہوں گے

جس کے ہونٹوں کا قلم خشک رہا ہے خوشتر
اس کی آنکھوں میں کئی بولتے چہرے ہوں گے

جسے صدیوں کا وقفہ دیکھتا ہے
وہ اِک بکھرا ہوا سا سلسلہ ہے

کھنڈر کے جسم میں آ کر بسا ہے
کئی شکلوں سے ہم کو گھورتا ہے

وہ اِک کمرہ ہے بیوہ کا مقدر
نگر میں ہے مگر سونا پڑا ہے

ابھی اس شخص کے قصے نہ چھیڑو
سنا ہے وہ ابھی سویا ہوا ہے



خوشتر مکرانوی

محبت کا جہاں تکرار میں ہے
ہماری جیت خوشتر ہار میں ہے

تمازت کو غلاظت چاٹنے دو
ہر اک سایہ ابھی دیوار میں ہے

مصوّر واقعوں سے خوش ہیں لیکن
ہماری ان کہی اخبار میں ہے

بدن بونا ہے لیکن سر بڑا ہے
پڑوسی سے ہمارا ڈر بڑا ہے

مکینوں پر کہاں تک چھت گرے گی؟
ہمیں معلوم ہے یہ گھر بڑا ہے

کئی راتوں یہاں جگنا پڑے گا
اکیلے کے لیے بستر بڑا ہے

کسے چھوڑیں کسے اپنایا جائے
کہیں خوشتر کہیں پتھر بڑا ہے

شـام داس کھنہ

نظیر اکبر آبادی

نامور نامور نقّاد رشید حسن خاں رقمطراز ہیں۔

"نظیر اکبر آبادی شاعر کی حیثیت سے اپنے زمانے میں بھی مشہور تھے اور آج بھی مشہور ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ اُس زمانے میں ان کا کلام عام لوگوں کی زبان پر تھا مقبولیت بھی انہی لوگوں تک محدود تھی۔ خاص لوگوں کا طبقہ جو اس زمانے میں شعر و ادب کا پارکھ سمجھا جاتا تھا ان کے کلام کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ آج صورت یہ ہے کہ عام لوگوں کی زبان پر تو شاید نظیر کا کلام اس قدر نہ ہو لیکن خواص کا گروہ ان کی شاعرانہ ہمہ گیری کا پوری طرح معترف ہے۔ نظیر کی سماجی حیثیت بھی ان کے راستے کا پتھر بن گئی۔ وہ ایک معلّم تھے جن کی پشت پر نہ تو کسی معروف خاندان کی درویشی، سیادت یا سپہ گری کا پشتارہ تھا اور نہ کوئی ایسی وجاہت حاصل تھی جس کو اسی زمانے میں قابلِ لحاظ سمجھا جاتا ہو۔ تنوع اور رنگا رنگی کے لحاظ سے نظیر کا کلام آج بھی بے مثال ہے کوئی شاعر اس باب میں ان کا حریف نہیں۔ زندگی اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ان کے کلیات میں جلوہ گر ہے۔"

نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنی ایک علیحدہ دنیا رکھتی ہے۔ نظیر نے میر اور سودا کی بہارِ شعر و سخن بھی دیکھی اور دبستانِ لکھنؤ کی جوانی کا نکھار بھی۔ لیکن ان کی آزاد منشی، قلندرانہ روش، بے تعصبی اور منفرد رنگِ طبیعت نے انھیں کسی مسلک کا پیرو اور کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ بڑے مرکزوں سے دُور رہ کر اور رنگِ زمانہ سے بے نیاز ہو کر انھوں نے ایک آزاد فضا میں سازِ شعر چھیڑا۔ اپنی طرز پر اپنا رنگِ سخن نکھارا اور اپنی شاعری کی علیحدہ روایات بنائیں۔ نظیر نہ عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے نہ رموزِ فن کے بڑے ماہر۔ وہ تعصّب اور تنگ نظری سے یکسر پاک تھے من کی موج میں ڈوبے ہوئے تھے۔ زندگی کو انھوں نے خلوص اور جذبے کے ساتھ برتا۔ اس کی ہزار رنگ کیفیتوں اور ساغر کو دل و دماغ کی چشم بیدار سے دیکھا۔ انھیں کسی مذہب سے کوئی بیر اور کسی ملّت سے کوئی عناد نہیں تھا۔ وہ عوام کے آدمی تھے۔ عوامی رنگ رلیوں چہل پہل، تفریح اور طرب و مسرّت کی تقریبات میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں کا اُن کے دل میں یکساں احترام تھا اور سب کے تہواروں سے یکساں دلچسپی تھی۔ جوانی نے انھیں کوچۂ محبوب میں پھرایا۔ خواہشات کے ہنگاموں اور طلبِ مسرّت کی بدمستیوں سے آشنا کیا۔ مایا کی دھوپ چھاؤں دنیا کے نشیب و فراز اور پیری کی نگاہِ   نے ان کا رنگِ طبیعت بدل ڈالا۔

انھوں نے زندگی کے ان خاص مادی پہلوؤں کو اور ان کے اثرات کو بے حد سادگی اور صفائی کے ساتھ پیش کیا جن کے کرشمے ہر طرف نظر آتے تھے لیکن جن کو شاعر کی نظر اور مصوّر کی آنکھ نے اپنے مرقعوں میں جگہ نہیں دی تھی۔

وہ فن کے علمبردار نہیں ذوقِ طبیعت کے پرستار تھے نگاہوں سے جو دیکھا، دل پر جو بیتی، من میں جو لہرا ٹھی اسے انتہائی بے تکلف اور بے ساختہ انداز میں قالبِ شعر دے دیا۔ یہ تھا نظیر کا فنِ شعر گوئی۔ نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے جب غزل عالمگیر تھی، جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے، ایسے زمانے میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور آزادیٔ فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔ ان کی نظموں میں لازمی طور پر ربط و تسلسل کی کاریگری ہے۔ ان کی ہر نظم بوقلموں جذبات اور خیالات کا گلدستہ ہے۔ وہ جزئیات کی نقاشی میں ایک خاص لطف محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مطمعِ نظر بلند نہ تھا اور وہ مغربی ادب سے واقف نہ ہو سکے تو اس میں نظیر کا قصور نہیں۔ قصور ہے اس معاشرہ اور ماحول کا جس میں وہ پلے اور پروان چڑھے۔ نظیر دردؔ کی طرح آگاہ راز نہ تھے لیکن وہ شاعر تھے اور دنیائے تجربات پر ان کا تصرف تھا۔ ان کی عشقیہ شاعری میں دل دوزی، کسک اور لہجے کی گرمی نہیں ملتی۔ بالکل نہیں ملتی۔ ان کی نظموں میں بوالہوسی بھی ہے اور عشقِ عقیقی کی بلند و لطیف کیفیتیں بھی۔ قدماء کے مقابلے میں ان کا کلام زمانہ حال کے رنگ کا معلوم ہوتا ہے دورِ متوسط کے شاعروں کی نسبت ان کے کلام میں آزادہ روی بہت ہے مضامین اور اندازِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دورِ جدید کے شعراء مومنؔ اور ذوقؔ کی فارسی تراکیب کے مقابلے میں کلام شستہ اور رفتہ ہے۔ انھوں نے ایسے بہت سے الفاظ لغاتِ شعر میں داخل کئے جن کو شعراء صوفیانہ خیال کرتے تھے۔

صاحبِ تاریخ ادبِ اُردو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کہتے ہیں۔ یہی ان کی صفات اور خصوصیات ہیں۔ وہ اُن چیزوں پر طبع آزمائی کرتے تھے جو عوام کو پسند ہیں۔ اسی لئے انھیں کی زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ کسی کی ہجو کی اور نہ کسی کی تعریف۔ موجودہ نیچرل شاعری کے پیش رو حقیقت میں نظیر اکبرآبادی ہیں جس طرح دبیرؔ اور انیسؔ نے مناظرِ جنگ اور مناظرِ قدرت کے بے مثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں اسی طرح معمولی معمولی چیزوں کی عین مین تصویر نظیر نے اپنے کلام میں کھینچی ہے۔ ان کے اشعار میں مشکل الفاظ، پیچیدہ ترکیبیں اور دور از کار تشبیہیں بالکل نہیں۔ ان کی نظمیں اردو غزلوں کے برخلاف مسلسل ہیں۔ آگے چل کر یہی طرز ہمارے ادب کی ترقی کا باعث ہوئی اور نیچرل شاعری کی بنا پڑی جس کے موجد آزادؔ اور حالیؔ کہلاتے ہیں۔

نظیر کی ظرافت تکلیف دہ نہیں۔ انشاء کی ظرافت درباری ظرافت ہے ان کا مذاق درباری مسخروں کا سا ہے۔ وہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے دوسروں کی عزت کا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ بخلاف اس کے نظیر ایک آزاد روش ظریف ہیں۔ وہ اپنی پر مذاق باتوں سے کسی کا دل نہیں دکھاتے بلکہ ہنساتے اور خوش کرتے ہیں۔ واقعات کی صحیح تصویر ایک کامیاب مصوّر کی طرح کھینچتے ہیں۔ اردو شاعروں نے ڈرامہ نویسی کا فن اہلِ عجم سے لیا۔ سوداؔ نے ہجو کی بنیاد ڈالی۔ وہ مزاح نگار کہلاتے ہیں۔ چونکہ انسانی فطرت کا انھیں بہت کم مطالعہ تھا لہٰذا وہ حزن نگار نہیں کہلا سکتے۔ میرؔ کے یہاں سوز و گداز ہے۔ انشاء کے یہاں ظرافت ہے۔ وہ خود ایکٹر بننے کے قابل نہیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ فطرت کے شاعر ہیں۔ زبان پر پورا یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور کردار نگاری پر شاق ہیں ——— ان کی قوتِ عمل مرثیہ نگاری تک محدود رہی۔ نظیر کی جذباتِ انسانی کی معلومات اکثر شاعروں سے زیادہ تھی۔ انھوں نے مرد عورتوں اور بچوں کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا۔ وہ زنانہ فطرت کے سلسلے کے لئے شاہراہِ بازاری کی طرف بھی رجوع ہوئے۔ اکثر اشعار میں اس کے متعلق اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ نظیر کی نظم "لیلا مجنوں"، "مہادیو کا بیاہ" میں مزاحیہ رنگ پوری طرح موجود ہے۔

اگر نظیر کے کلام میں سے ان کے معمولی شعر نکال دیئے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شاعروں میں ہو سکتا ہے۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دلی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے۔

اور ہم کو ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے جو کہ رذائل و مصائب سے بالکل پاک ہے نظیرؔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں میں یکساں شریک ہوتے تھے اور ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے کیونکہ ان کے خیالات ان کی زبان، ان کے مضامین سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے مضامین کے تنوع، اپنی ناصحانہ روش اپنی وسیع النظری ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت اور خاص طور پر ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیرؔ بالکل اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں شعرائے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

ہے چاہ فقط اک دلبر کی پھر اور کسی کی چاہ نہیں
اک راہ اُسی سے رکھتے ہیں پر اور کسی سے راہ نہیں
یاں جنت رنج و تردد ہے ہم ایک سے بھی آگاہ نہیں
کچھ موت کا بھی سندیہ نہیں کچھ جینے کی پرواہ نہیں
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

نظیرؔ کی ایک نظم ہے "جوگی کا سچا روپ"، ان کے دل میں یکایک یہ تمنا ابھرتی ہے کہ جس کی ثناخوانی ہو رہی ہے اُسے کسی صورت سے دیکھئے۔ وہ جوگی کی شکل بناتے ہیں اور دکان، بازار اور گلی کوچوں میں اسے ڈھونڈتے ہیں جو سامنے آتا ہے اسے پوچھنے لگتے ہیں۔ کہو پیارے! میرے یار کو کہیں تم نے دیکھا؟ لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ دریائے حیرت کی طغیانی بڑھتی ہے مسجد، مدرسہ اور دیر کی سیر کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر کار جنگل کی راہ لی۔ وہاں بھی پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ نوبت یہ ہوتی ہے۔

بڑا تھا ریت میں اور دھوپ میں سورج سے جلتا تھا
لگی تھیں دل کی آنکھیں یار سے اور جی نکلتا تھا

ان کی نظموں سے دوئی کا پردہ اٹھ گیا تھا۔ تنگ نظری کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف خواجہ سلیم چشتی کے مدّاح ہیں تو دوسری طرف گورونانک شاہ کی عظمت کے قائل ؎

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گورو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گورو
مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گورو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گورو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گورو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گورو

کبھی کرشن کنہیا کی بانسری سُن کر بے ہری ہری کہہ اٹھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بلند و لطیف عشق بھی ہے اور ان کے مضامین حقیقت پر مبنی ہیں۔ نظیرؔ کا معشوق پردہ نشیں نہیں بازاری ہے۔ انھیں دید بازی کا چسکہ ہے وہ سوکروفن سے، سوانگ روپ بھر کر خوباں سے امید کرتے ہیں۔ اسی عاشقی کا دم بھرتے ہیں اور اسی عاشقی کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں ان کی آنکھیں ہر رنگ میں واتھیں۔ ان کا ہر شعر اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ہر لفظ مصوّر ہے۔

سر کانپا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں
قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیائی گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گئی دل مست ہوا آواز نہیں
جو ہونی تھی سو ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باجے چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ نظیرؔ کی جرأت ہے کہ انھوں نے ایک پامال مضمون کو اپنے مخصوص رنگ میں کمال فن کے ساتھ بیان کر دیا۔ بے ثباتیٔ دنیا کا یہ مضمون میرؔ نے اپنے مخصوص انداز میں باندھا ہے مگر نظیرؔ کی نظیر نہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

ان کی روح کی فلاسفی دیکھ کر اکثر لوگ انھیں اشتراکی نظیرؔ کہیں گے لیکن میری نظر میں وہ نہ اشتراکی تھے اور نہ انقلاب فرانس کے بانی۔ ان کا دامنِ حلقۂ خیال بہت وسیع تھا ان کی شاعری کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے ایک صوفی صافی درد باخدا کی حیثیت میں دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کا حیرت انگیز مرقع کھینچا۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

راشد جمال فاروقی

غزل

کبھی ہمیں بھی میسر تھیں ساعتیں کیا کیا
گزر رہی ہیں سروں پر قیامتیں کیا کیا

ورق ہی گم ہے ترا دیکھنا ضروری تھا
کہ تیرے نام لکھی تھیں عبارتیں کیا کیا

کرے گا کون یقیں، میں کہ وقفِ بستر ہوں
قدم سے لپٹی ہیں اب تک مسافتیں کیا کیا

ہمارے بچے تو سن کر یقین بھی نہ کریں
کہ میری نسل نے کی تھیں اطاعتیں کیا کیا

جبیں جبیں پہ اٹا ہے غبار و گردِ ملال
بدن بدن پہ سجی ہیں جراحتیں کیا کیا

قاضی انصار

غزل

کتنے پہلو بدل کے دیکھیں گے
آپ تیور غزل کے دیکھیں گے

یوں بھی آب و ہوا بدلنا ہے
آج گھر سے نکل کے دیکھیں گے

جانتا ہوں کہ ہے فریب نظر
پھر بھی نزدیک چل کے دیکھیں گے

ایک ہی رُخ پہ چل رہی ہے ہوا
اس کی سمتیں بدل کے دیکھیں گے

کچھ تو انصار لوگ ہیں ایسے
جو تمہارے عمل کو دیکھیں گے

اطہر خان

غیب کی آواز

کردار

۱ ـــــ ایک بیمار آدمی

۲ ـــــ ایک سایہ

۳ ـــــ ایک گرج دار آواز

منظر ـــــ ایک بڑا ہال ہے۔ اس کے نصف حصے میں تیز روشنی ہے۔ نصف حصہ بالکل تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے روشنی کے بیچ ایک بیمار شخص بستر مرگ پر زندگی کی جدوجہد میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا شخص ہے۔ اس کے جسم پر قیمتی ملبوسات ہیں داہنی کلائی میں طلائی رسٹ واچ ہے۔ نہایت ہی خوبصورت، گورا چٹا وہ آدمی بڑی ہی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ اسی لئے اس کے چہرے پر جھریاں پھیلی ہیں جس سے اس کے چہرے پر کرب ہی کرب کے نشان صاف جھلکتے ہیں۔ وہ کوڑھ کا بھی مریض ہے اس کے ہاتھ ٹیڑھے میڑھے ہیں اور انگلیاں ناخنوں سے آزاد ہیں اس کو کمرے میں کسی سائے کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ چیخ پڑتا ہے (پردہ اٹھتا ہے)

بیمار آدمی ـــــ "کون ہو تم۔؟"

سایہ ـــــ "میں ملک الموت ہوں"

(روشنی دھیرے دھیرے سائے کی طرف بڑھتی ہے اور وہ پوری طرح روشنی میں نہا جاتا ہے۔ سائے کی آنکھیں سرخ ہیں چہرہ بہت بھیانک ہے۔ اس کا پورا جسم خون کے لوتھڑوں سے بنا ہوا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھتا ہے اور پلنگ سے دو گز کی دوری پہ کھڑا ہو جاتا ہے۔)

بیمار آدمی ـــــ (پاگل پن کی حد تک چیختے ہوئے) "کیا بکتے ہو؟ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔۔۔۔"

سایہ ـــــ (قہقہہ لگاتے ہوئے) ہا۔۔۔ ہا ہا۔۔۔۔ میں ایک طوفان ہوں۔ ایک سناٹا بھی ـــــ ایک عذاب ہوں ـــــ زندگی کا قصاب ـــــ ایک منزل ـــــ میں ہواؤں کی پکار ہوں ـــــ اوپر سے آیا ہوا ایک ایجنٹ ہوں ـــــ ہاں! میں موت ہوں۔ موت ـــــ ایک اختتام ـــــ ایک خاموشی۔ مکمل سکوت ـــــ ایک درد ـــــ ایک سسک ـــــ میں ایک بہرا خادم ہوں۔ جو کچھ سنتا نہیں۔ بس اپنا کام کرتا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میں موت ہوں۔ آغاز کا دشمن انجام ہوں۔ اور ایک بے رحم ڈیوٹی کانسٹیبل" (وہ سایہ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔)

بیمار آدمی ـــــ (روتے ہوئے لہجے میں ہکلاتے ہوئے) "ل۔۔۔۔ ے۔۔۔۔ ک۔۔۔ کن۔ تم میرے پاس۔۔۔۔ ک۔۔۔۔ ک۔۔۔ کیوں آئے ہو۔؟"

سایہ ——— (غصے میں) "تم کہ جو ایک آوارہ کتے کی مانند جی رہے ہو۔ تم کہ جو بستر مرگ پہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی اور موت سے لڑ رہے ہو۔ یہ سب کچھ اب محض بیکار ہے۔ اس دنیا میں اب تمہارا کچھ کام نہیں ہے۔ تم ایک ناسور بن کر ایک ہنستے مسکراتے گھر کو جہنم بنانے پہ تلے ہو (ذرا ٹھہر کر) لیکن تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ میں تمہارے جسم کو چھوؤں گا بھی نہیں ——— بس تمہارے اندر کی تڑپتی ہوئی روح کو کہ جو آزادی کے لئے پھڑپھڑا رہی ہے، صرف تمہارے جسم سے آزاد کر دوں گا۔"

بیمار آدمی ——— (نہایت ہی عاجزی سے) "نہیں۔ نہیں۔ تم مجھ کو چھوڑ دو۔ میں ابھی اور بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم میرے جسم کو چھو سکتے ہو۔ لیکن روح کو۔! ...... ہرگز نہیں۔ یہی روح تو زندگی کی علامت ہے۔ دھڑکن ہے۔ اور میں کہ جو آج تک برسوں سے شکست نہ کھا سکا ہوں۔ آج بھی مجھ کو بخش دو۔ ادھر دیکھو (بیمار آدمی ایک طرف اشارہ کرتا ہے) بغل والے گھر میں سو برس کا ایک بوڑھا اب تک جی رہا ہے۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔ وہ مدتوں سے بھوکا ہے۔ اس کا اپنا پرایا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ وہ پانی کے چند قطروں کے لئے بھی ترستا ہے۔ دمے کا مریض ہے اور دن رات خون کی قے کرتا ہے اور بڑی بے چینی سے تم کو پکارتا ہے۔ اس کو موت کی تمنا ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہارا سواگت خوش دلی سے کرے گا۔ لیکن میں ... میں تو ابھی جوان ہوں۔ مجھ کو ابھی بہت دنوں تک زندہ رہنا ہے۔ میرے پاس خوشحالی کے سارے لوازمات ہیں۔ میں بھوکا نہیں ہوں۔ دیکھو (کونے کی طرف اشارہ کر کے) اس ٹیبل پہ طرح طرح کے پھل اور میوے سجے ہیں۔ (دوسری طرف اشارہ کر کے) جاپانی فریج ہے۔ اس میں ہر وقت ٹھنڈا پانی بھرا رہتا ہے۔ اس سامنے والی ٹیبل پہ رنگین ٹی۔ وی سیٹ ہے جس کو میری زندگی میں آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ہیں (سر دھنتے ہوئے) اب تک میں اس کا ایک پروگرام بھی تو پورا نہیں دیکھ سکا ہوں۔

(تیسرے کونے کی طرف اشارہ کر کے) اس تجوری میں کروڑوں کے زیورات اور روپے ہیں۔ تم سب کچھ لے سکتے ہو لیکن میری روح .... ہرگز نہیں۔!! (بیمار آدمی بولتے بولتے ہانپنے لگتا ہے۔ پھر کھانسنے لگتا، پھر رونے لگتا ہے۔ پھر چپ ہو جاتا ہے)

سایہ ——— (حیرت سے) "لیکن تم کس کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو۔؟"

بیمار آدمی ——— (پر امید نظروں سے دیکھ کر) "میرا گھر بھرا پرا ہے۔ میرے ماں۔ باپ ہیں۔ بھائی۔ بہن ہیں۔ بیوی۔ بیٹی بیٹے ہیں۔ سب کو ابھی ہماری ضرورت ہے۔ ان سب کو ہم سے کتنی ساری امیدیں ہیں۔"

سایہ ——— (کڑوی مسکراہٹ سے) "ہونہہ۔! ماں باپ، بھائی، بہن، بیوی بیٹی بیٹے۔ (ہاتھ نچاتے ہوئے) ارے اب تم کو کسی کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم تو ان سب پہ ایک بوجھ ہو جس کو کسی وقت بھی وہ اگر ممکن ہوا تو، اٹھا کر دور جا پھینکیں۔

بیمار آدمی ——— (بڑی بیزاری سے) "پھر بھی میں اکیلے زندہ رہوں گا۔ ابھی مجھ کو بخش دو۔!"

سایہ ——— "لیکن تمہاری موت، میری ڈیوٹی ہے"

بیمار آدمی ——— "موت نہیں زندگی ——— زندگی ایک خواہش ——— ایک خوشی ——— زندگی ایک خوشگوار سرور ——— ایک جوان عورت کی انگڑائی۔ ہاں زندگی ایک فتح ——— ایک سلطنت ——— فریج کا ٹھنڈا پانی۔ رنگین ٹی۔ وی کے دلفریب مناظر، اور بہت کچھ۔ اور یہ ساری چیزیں مجھ کو عزیز ہیں۔"

سایہ ——— (طنزیہ انداز میں) "لیکن یہ ساری چیزیں اب تمہارے لئے خواب ہیں۔ خواب ——— جو ٹوٹ جاتے ہیں ——— بکھر جاتے ہیں ——— جس کے بعد اس کا اور چھور ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری زندگی کے خواب اب

ٹوٹ رہے ہیں بکھر رہے ہیں۔ اب ان خوابوں کو میں اپنی پناہ میں رکھوں گا۔ کیونکہ میں فرشتۂ اجل ہوں۔ جو پرانے پرانے خوابوں کو یکجا کرتا ہے۔ پھر انھیں ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ایک دوسرا انسان۔ پہلا ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا جنم لیتا ہے۔ اور ابھی تمہاری جگہ ایک نیا انسان جنم لے گا۔ ضرور لے گا۔ (ایک قدم آگے بڑھ کر) اس لئے اب تم تیار ہو جاؤ تم کو کچھ نہ ہوگا۔ تمہیں، تمہاری روح کے نکلنے کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔ تم تم ہی رہو گے۔ بس سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاؤ گے۔ محسوس کرنے سے بچ جاؤ گے۔"

بیمار آدمی ——— (چیخ کر نا کام اٹھتے ہوئے) تم اس طرح نہیں مانو گے۔ میں تمہارا بدن نوچ لوں گا۔ تم کو لہولہان کر دوں گا۔ تم کو مکّے مار مار کر ادھ مرا کر دوں گا۔ تم کو بے بس کر دوں گا۔ تم پھر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جاؤ گے۔ میں بوکسنگ کا ورلڈ چیمپئن رہ چکا ہوں۔ تم میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو!"

سایہ ——— (تعجب سے) لیکن تم مجھ کو نوچو گے کیسے؟ تم مجھ کو مکّے سے کیسے مارو گے؟ تمہارے ہاتھ تو کوڑھ سے ٹیڑھے میڑھے ہیں۔ اور تمہاری انگلیاں کہاں ہیں۔ اور انگلیوں میں ناخن . . . . . ؟ تم تو گنجے بھی ہو۔" (قہقہہ لگاتا ہے)

بیمار آدمی ——— (مایوسی میں تکیے سے سر ٹکاتا ہے) "اُف! (پھر کچھ سوچ کر) اچھا ٹھہرو! ذرا یہ سیب تو کھا لینے دو۔ پتہ نہیں تم کتنی دیر بھوکے رکھو؟" (سیب کا ایک ٹکڑا کسی طرح دونوں پنجوں کے سہارے منہ میں رکھتا ہے) لو ایک ٹکڑا تم بھی کھاؤ۔ بہت میٹھا اور لذیذ ہے۔ کشمیر سے منگایا ہے۔ (ایک سیب اسی طرح سائے کی طرف بڑھاتا ہے جس کو سایہ لے لیتا ہے۔)

سایہ ——— (سیب کھاتے ہوئے)

"واقعی بہت عمدہ ہے۔ تم روز کھاتے ہو؟"

بیمار آدمی ——— "ہاں! کہو۔ پسند آیا نہ!! اگر تم بھی روز کھانا چاہتے ہو تو میرے پاس چلے آیا کرو۔ میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک خوشنما چیزیں ہیں۔ اس علاقہ میں سب لوگ ٹی۔وی دیکھنے کو ترستے ہیں۔ تم کو صوفہ پر بٹھا کر دکھاؤں گا۔ اور سیب اور میوے کے ساتھ ساتھ فرج کا پانی بھی پلاؤں گا ——— لیکن آج والی بات پھر دہرانا۔ نہیں تو . . . . . !!!"

(اچانک ایک گرجدار آواز سن کر سایہ اچھل پڑتا ہے۔ جس کو بیمار آدمی نہیں سن سکا۔)

سایہ ——— (خوف کھاتا ہوا سیب پھینک دیتا ہے) "نہیں۔ نہیں۔ اے میرے معبود۔ اے میرے مالک۔ میرے آقا۔ میں آ رہا ہوں۔ چونکہ وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا اس لئے اس کی دلجوئی کرنے لگا تھا۔ اب میں آ رہا ہوں۔ ابھی آ رہا ہوں۔ (بڑبڑاتے ہوئے) شاید کسی دوسری جگہ کا پیغام ہو۔"

(اور وہ سایہ دھیرے دھیرے دور ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو بیمار آدمی نہایت ہی خاموشی سے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور ہاتھ پلنگ سے لٹک کر فرش کو چھو لیتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

تخلیقات بھجواتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے

غزل

اوم پرکاش لاغر

جنوں کے دست سے دیوانگی لے جا
خرد والوں سے دورنہ گمرہی لے جا

اگر کم ہوں درندے دشت وصحرا میں
ہماری بستیوں سے آدمی لے جا

خرد لیتی ہے آکر درس ان سے
تو بھی اہلِ جنوں سے آگہی لے جا

عنادل قید میں ہیں اور صحرا میں
صبا! ان کے لئے کچھ پھول ہی لے جا

نہیں چلتے یہ سکّے آج کل لاغر
شرافت، بھولپن اور سادگی لے جا

غزل

نثار احمد نثار

میری آنکھوں کا اُجالا بھی وہی تھا
میرے اندر جلنے والا بھی وہی تھا

اس کی ہی توفیق سے مہتاب تھا میں
میرے گرد و پیش ہالہ بھی وہی تھا

خاک کی تہہ میں جب اُترا دہ تو جانا
میری شہرت کا حوالہ بھی وہی تھا

سب سے کھل ملنے کی عادت بھی تھی جیں
ساری دنیا سے نرالا بھی وہی تھا

مسئلوں سے تھا ذہن سینہ سپر بھی
وحشی لمحوں کا نوالہ بھی وہی تھا

نام کتاب : غزالاں
مصنف : حفیظ بنارسی
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۲۵ روپے
ناشر : درخشاں پبلیکیشنز۔ آرہ (بہار)

حفیظ بنارسی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں غنایت کا وہ عنصر موجود ہے جس سے غزل کا روپ سنورتا ہے۔ کامیاب غزل کہنے کے لئے صرف فنی ریاضت سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ اس کے لئے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حفیظ کے تازہ مجموعۂ کلام "غزالاں" کے اکثر اشعار میں اس فنی ریاضت کی جھلک بھی موجود ہے اور گہرے مطالعہ و مشاہدہ کی بھی۔

اگرچہ حفیظ کے اس دعویٰ کو کہ ؎

نام زندہ رہے گا ہمارا حفیظ
آبروئے غزل ہم بچا لے گئے

روایت پرستی سے معنون کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفیظ کا کلام نہ ترقی پسند تحریک کے اثر سے اچھوتا رہا ہے اور نہ جدیدیت کے اثر سے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کلاسیکی لب و لہجہ کے باوجود حفیظ کبھی ادب اور سماج کے اٹوٹ رشتے کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے شعر کہتے ہیں ؎

گرے جو چشمِ بشر سے غمِ بشر میں حفیظ
وہ اشکِ غیرتِ لعل و گہر لگے ہے مجھے

تو کبھی جدید غزل کی علامتوں کا دامن تھامتے ہوئے اس قسم کے شعر کہتے ہیں ؎

گر گیا شام کے سمندر میں
دور افق پر پھسل گیا سورج

حفیظ کی شاعری کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے کئی اشعار "نہ مانگے کا اجالا" "نہ ہو کر دھرتی کی اُپج" بن گئے ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں فارسی زبان و ادب کے دوش پر سوار ہو کر ایران و عرب کی جو تہذیبی فضا ہندوستان چلی آئی تھی، اردو غزل پر ایک زمانے تک وہی فضا غالب رہی ہے مگر حفیظ کے اس مجموعے میں کئی ایسے اشعار موجود ہیں، جو سرزمینِ ہند پر کھلے گل بوٹوں کی طرح یہاں کی مٹی کی سوندھی باس دے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

من میں جھانکا تو گنگا ملی
من میں ڈوبے تو شنکر ملے

لاج سیتا کی پھر آج خطرے میں ہے
رام کوئی نہیں اور راون کئی

یاد کے جگنوؤں سے وہ عالم رہا
دیپ بجھتے رہے دیپ جلتے رہے

نام کتاب : پت جھڑ کے مسافر
مصنف : مصور سبزواری
صفحات : ۲۳۵
قیمت : ۳۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

مصور سبزواری کا ناول "پت جھڑ کے مسافر" ایک ایسے خوبصورت نوجوان کی داستان ہے جس کی زندگی شہوت اور نفس پرستی کے مختلف ادوار میں سے گذرتی ہوئی ایک ایسے دردناک اختتام کو پہنچتی ہے جو المناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ ناول کا ہیرو منوہر ایک ایسا کردار ہے جس کے مردانہ حسن پر ہر اس کے قریب

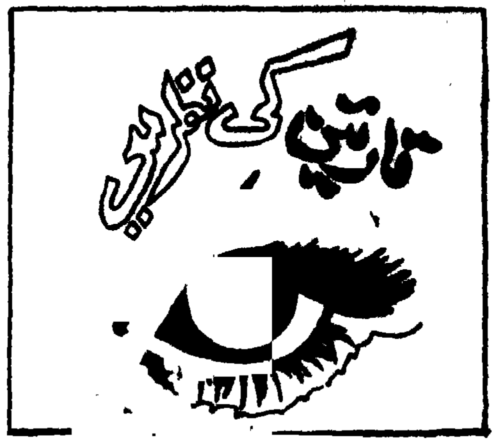
آنے والی ہر عورت اس طرح فریفتہ ہوتی ہے کہ بلا تکلف اپنا جسم اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد احساسِ تنہائی کا شکار ہوا منوہر رسوماتِ مرگ کی ادائیگی کو ملتوی کر کے سکونِ دل کی تلاش میں ایک ایسے دوست کے دروازے پر دستک دیتا ہے، کئی سال پہلے جس کا انتقال ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی بہن لِلّی اس کے گبرو جسم اور خوبصورت خدوخال پر اس قدر فریفتہ ہوتی ہے کہ اسے ازدواجی زندگی کے رشتے میں باندھنے کی غرض سے واپس نہیں جانے دیتی۔ اسی دوران اداس پہاڑیوں پر آوارگی کرتے ہوئے اس کی ملاقات بھیڑیں چراتی ہوئی ایک دیہاتی لڑکی سیما سے ہوتی ہے، جس کے ساتھ وہ ایک رات پہاڑ کے کسی غار میں گزارتا ہے۔ چند دنوں میں ہی سیما ایک ناجائز بچے کی ماں بننے کے خوف سے اور اپنی بدنامی کے ڈر سے پاگل ہو جاتی ہے اور منوہر اس سے کنارا کشی کر کے لِلّی سے شادی کر لیتا ہے۔ سہاگ رات لِلّی کی آخری رات ثابت ہوتی ہے اور وہ سہاگ کے پھولوں کی سیج پر ہی دم توڑ دیتی ہے۔ لِلّی کی موت کے بعد اس کا بے سمت سفر اسے روشن باغ لے جاتا ہے۔ جہاں ملکہ نام کی ایک طوائف اس پر فدا ہو کر اسے اپنے کوٹھے پر لے جاتی ہے۔ ملکہ کی نتھ اترائی کیلئے رقابت کی آگ میں جلتے ہوئے دو امیر زادے نواب اچھن میاں اور مرزا اسکندر بخت خون کی ہولی کھیلتے ہیں تو اس معاملے میں سکندر بخت کا ایک دوست منوہر کے چہرے کو تیزاب سے جھلس دیتا ہے اور اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں ملکہ بالکنی سے کود کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ چند ماہ قید و بند کی سزا کاٹنے کے بعد وہ رہا ہوتا ہے تو لکھنؤ پہنچتا ہے جہاں اس کی اتفاقیہ ملاقات ایک نابینا طوائف رشتو سے ہوتی ہے جو اس کے بچپن کی آشنا اور اس کی پھوپھی نکلتی ہے۔ بالآخر جسم و ذہن کی پراگندگی کا شدید احساس اسے اپنے گھر میں واپس لے آتا ہے جہاں وہ گذری ہوئی زندگی کے خوفناک سایوں میں دم توڑ دیتا ہے۔

لِلّی، سیما اور ملکہ۔ تینوں کے ساتھ گذارے ہوئے منوہر کے شب و روز کے بیان میں ناول نگار نے شہوت آمیز رومانی فضا قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کئی واقعات کو جذباتی ہو کر تفصیل سے رقم کیا ہے، لیکن ناول کے آخری حصے میں تفصیل کا یہ توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ پورے ناول میں "اتفاقات" کی اہمیت اس قدر غالب ہے کہ ان کی نفی سے ناول کا پلاٹ مجروح ہو جاتا ہے۔ دوست کی موت کے باوجود لِلّی کا منوہر کو مہمان بنانا۔ پہاڑوں پر بھیڑیں چراتی ہوئی سیما کا بلا تکلف اپنا جسم اس کے حوالے کر دینا، ایک ریستوران سے ملکہ کا اسے اپنے کوٹھے پر لے جانا اور عین اس موقع پر اپنا جسم اس کے سپرد کر دینا جب اس کی ماں دوگنا بھاؤ سے اس کی نتھ اترائی کا سودا کر رہی ہوتی ہے، ملکہ کی موت کے بعد بے سروسامان منوہر کے لکھنؤ پہنچنے پر ایک آدمی کا اس پر رحم کھا کر اسے شراب کا ٹھیکہ لے دینا اور پھر ایک اجنبی دوست کا اسے رشتو کے کوٹھے پر لے جانا، یہ سب ایسے واقعات ہیں جو غیر فطری ہوتے ہوئے بھی، معجزات کی صورت میں ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔

رومانی فضا تیار کرنے کی جلد بازی میں بعض مقامات پر ناول نگار کے قلم کو لغزش بھی ہوئی ہے۔ مثلاً ناول کے ابتدائی صفحات میں منوہر جب اپنے گھر سے روانہ ہوتا ہے تو پت جھڑ کا آغاز ہوتا ہے مگر اگلے روز جب وہ سنگرام پور پہنچتا ہے تو چند دنوں کے بعد ہی موسم برسات شروع ہو جاتا ہے (صفحہ ۱۵) اور پھر اگلے مہینے موسم خنک بھی ہونے لگتا ہے (صفحہ ۳۰) اور اسی دوران ساون بھی آ جاتا ہے (صفحہ ۳۲)۔ اسی طرح ناول کے آخری حصے میں کارتک کی اماوس کو ملکہ کی ماں دیوالی کے چاند سے معنون کر دیتی ہے (صفحہ ۱۹۸)

معتوّر سبزواری جانے پہچانے شاعر ہیں اور ان کے پاس نثر میں شاعری کرنے کا فن بھی ہے۔ پنجابیت کے اثر سے قطع نظر اس ناول کی رواں دواں زبان اور پُر اثر اندازِ بیان قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر ظفر بخش)



ماہ فروری، مارچ ۱۹۸۷ء کا شمارہ سامنے ہے کشمیری لال ذاکر کا "دوسرا مرد" ڈاکٹر گیان چند کی "میٹھی یادیں" تاثیر کا "پس نوشت" خوب ہیں۔ غزلیات میں کرشن کمار طور۔ آزاد گلاٹی۔ شرر فتحپوری کے علاوہ کچھ اور بھی غزلیں اچھی لگی ہیں۔ برق صاحب کا "پیغام" ہریانوی عوام کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اور چودھری بنسی لال کا ہریانہ کا تابناک مستقبل" دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر بیتاب علی پوری (سونی پت)

"تعمیر" کا خصوصی شمارہ (۲-۳) بیاد مولانا ابوالکلام آزاد" پر صالحہ عابد حسین کا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ "ہولی اور اردو شاعری" پر ڈاکٹر مظفر حنفی نے قلم اٹھا کر یہ دکھانے کی اچھی سعی کی ہے کہ اردو نے ہر قوم کی خدمت کی ہے اور اردو ہر قوم کے لئے ہے — غزلیں، افسانے اور نظمیں بھی معیار کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔

اختر آزاد (جمشید پور)

فروری۔ مارچ ۱۹۸۷ء کا مشترکہ شمارہ بدست ہوا — کرشن کمار طور، آزاد گلاٹی، حامدی کاشمیری، پرکاش تیواری کی غزلیں آپ کے منفرد ادبی مزاج کی آئینہ دار ہیں۔۔۔۔۔۔ نثری حصہ میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر مظفر حنفی اور صالحہ عابد حسین کی تخلیقات آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا عکس ہیں۔۔۔۔ تاہم افسانے سطحی ہیں۔

جنوری کے شمارے میں انور پانی پتی کی غزل کا مطلع ہے

لہو لہان پروں میں اڑان مت رکھیو
شکستگی کا نیا امتحان مت رکھیو

اتفاق سے میری ایک غزل کے مطلع سے ٹکرا گیا ہے۔ میرا مطلع یہ ہے۔

لہو لہان پروں پر اڑان رکھ دینا
شکستگی میں نیا امتحان رکھ دینا

بہر حال میں نے غزل ۱۹۸۳ء میں کہی تھی اور پہلی بار فروری ۱۹۸۶ء کے "آجکل" (دہلی) کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں انور پانی پتی سے کوئی وضاحت مقصود نہیں ہے۔ تاہم دوستوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے یہ چند الفاظ لکھے ہیں۔

سلیم انصاری (دہرہ دون)

فروری۔ مارچ ۱۹۸۷ء کا شمارہ اپنی آن بان کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ صالحہ عابد حسین کا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد" اچھا لگا۔

افسانہ نگاروں میں راج شرما، آر۔ ڈی شرما تاثیر — مشتاق احمد نوری بہت کامیاب رہے ہیں۔ جاوید اختر کی "خودکشی" ایاز نظر کا "نیا گھر" بھی قابلِ ستائش ہے۔ غزلوں میں مدھو کا داس، تاصر، شرر فتحپوری، قمر سنبھلی، پرکاش تیواری کی غزلیں بہت عمدہ ہیں۔ صغیر ابراہیم کا مقالہ "پریم چند اور ہریجن" بھی بہتر ہے۔

عبدالصمد (بریلی)

فروری۔ مارچ ۱۹۸۷ء کا تازہ شمارہ "تعمیر" موصول ہوا۔ سرورق دلکش ہے۔ "افق کے اس پار" "مولانا ابوالکلام آزاد — تجربہ کی پہلی رُت" آزاد گلاٹی اور کرشن کمار طور کی غزلیں "ہولی اور اردو شاعری" وغیرہ بہت پسند آئے۔

قاسم محمود انصاری

(مئو ناتھ بھنجن)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے
ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ
ہریانہ ایس۔سی۔ او نمبر ۱۸۹۔۱۹۱ سیکٹر
۱۷ سی، چنڈی گڑھ سے مئی ۱۹۸۷ء
کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ٹی چنڈی گڑھ



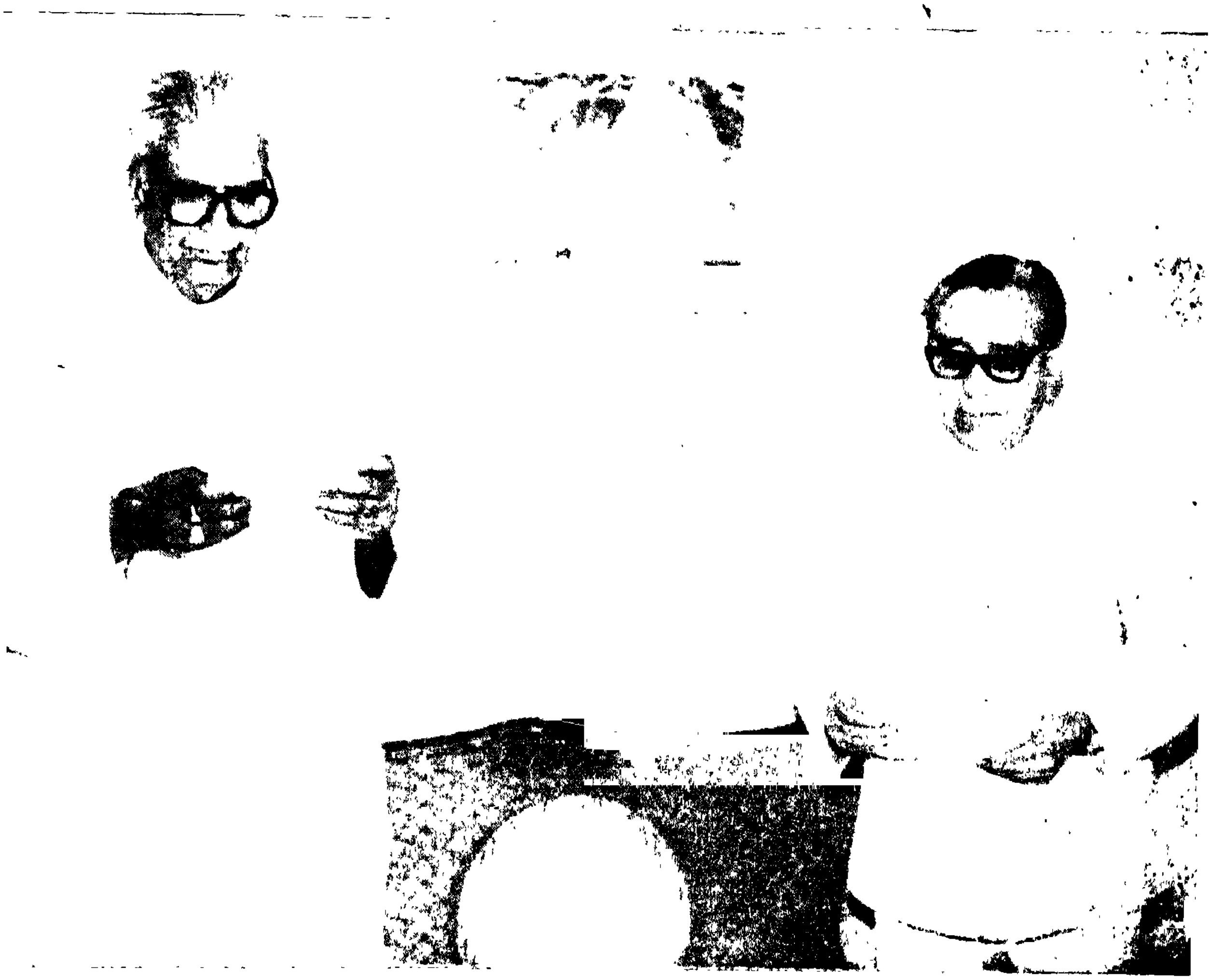


تعمیر ہریانہ

جون ۱۹۸۷

17 AUG 1987
Dr. Zakir Husain Library, J.M.I. New Delhi





عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ ۲۰ر جون ۱۹۸۷ء کو ہریانہ بھون، نئی دہلی میں
عالیجناب دیوی لال کو وزیر اعلیٰ ہریانہ کے عہدے اور رازداری کا حلف دلاتے ہوئے۔

آپ کا محبوب معتبر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

| جون ۱۹۸۷ء | شمارہ نمبر ۶ | جلد نمبر ۱۵ |

مدیر اعلیٰ:
رنجیت الیسر

مدیر:
سلطان انجم

سرورق: منجیت

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ
مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹۰۱-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب

Dr. Zakir Husain Library J. M. I. New Delhi

ھریانہ کی نئی وزارت

جناب دیوی لال دوبارہ وزیر اعلیٰ بنے

عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے ۲۰ جون ۱۹۸۷ء کو ہریانہ بھون، نئی دہلی میں منعقدہ ایک سادہ اور پُر اثر تقریب میں عالیجناب دیوی لال کو وزیر اعلیٰ کے عہدے اور رازداری کا حلف دلایا۔ اس موقع پر جناب بنارسی داس گپتا، جناب ویریندر سنگھ، جناب سورج بھان، جناب سمپت سنگھ اور جناب آر۔ کے۔ پونیا کو بھی گورنر موصوف نے وزیر کے عہدے اور رازداری کا حلف دلایا۔ جناب بنارسی داس گپتا کو خزانہ، جناب ویریندر سنگھ کو بجلی اور آبپاشی، جناب سورج بھان کو مال، جناب سمپت سنگھ کو صنعتیں اور جناب آر۔ کے۔ پونیا کو ترقی اور پنچایت کے محکمے دیئے گئے ہیں۔

رسم حلف برداری کے بعد وزیر اعلیٰ نے ہریانہ کے باشندوں کی سیاسی دانش مندی کی تعریف کی — اور ہریانہ اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں ہریانہ سنگھرش سمتی کو بھاری اکثریت سے فتح دلانے پر اُن کے تئیں دلی ممنونیت کا اظہار کیا۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ لوگوں نے اُن پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے، وہ حتی المقدور اس کے اہل ثابت ہونے کی کوشش کریں گے۔

وزیر اعلیٰ نے اپنے اہم پروگرام "بجلی۔ پانی کا پربندھ اور بھرشٹاچار بند" کی یاد دلائی۔ ریاست میں پانی۔ بجلی کی وافر سپلائی اور عام زندگی سے بھرشٹاچار کا خاتمہ اس پروگرام کا بنیادی مقصد ہے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب دیوی لال نے ہریانہ واسیوں کو یقین دلایا کہ ستلج - یمنا لنک نہر کا تعمیری کام تیزی سے پورا کرنے کے لئے ضروری کارروائی کی جائے گی تاکہ ہریانہ کے حصّے کا پانی جلد از ریاست میں پہنچ سکے - حکومتِ ہریانہ بجلی پراجیکٹوں سے اپنے حصّہ کی تمام بجلی حاصل کرنے کے لئے بھی مرکز سے اصرار کرے گی -

وزیرِ اعلیٰ نے چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں اور دوکان داروں سے جنہیں بھاری نقصان ہوا ہے، بقایا قرضوں کی وصولی روکنے کا اعلان کیا -

وزیرِ اعلیٰ نے اس بات پر زور دیا کہ دیہی علاقوں میں ترقیاتی اسکیمیں لاگو کرتے ہوئے دیہی عوام کے اشتراک کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی - موصوف نے مزید فرمایا کہ دیہاتیوں کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کی غرض سے بے توجہی کے شکار اسکولوں، ہیلتھ سینٹروں اور لنک سڑکوں کی طرف بھی پورا دھیان دیا جائے گا -

عالیجناب دیوی لال نے فرمایا کہ حکومت تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو روزگار دلانے کے لئے روزگار اسکیمیں مرتب کرے گی - جب تک وہ باروزگار نہ ہو جائیں، حکومت انہیں بے روزگاری بھتہ دیتی رہے گی - مزید براں سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں کے لئے انٹرویو پر آنے جانے والے بے روزگار افراد کو ہریانہ روڈ ویز کی بسوں میں مفت سفر کرنے کی سہولت دی جائے گی -

وزیرِ اعلیٰ نے یہ بھی اعلان کیا کہ جنگلی درختوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی پچاس فیصد رقم ان زمینداروں کو دی جائے گی، جن کی فصلوں کو جنگلی پانی کے باعث نقصان پہنچتا ہے -

وزیرِ اعلیٰ نے فلاح و بہبود کی اہم سکیم کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں سبھی ضعیفوں اور بے سہارا بیواؤں کو، جن کی گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، پنشن دی جائے گی -

وزیرِ اعلیٰ نے فرمایا کہ انتظامیہ افسران کے وسیع پیمانے پر تبادلوں جیسی کارروائی نہیں کی جائے گی کیونکہ اس سے ان کی خود اعتمادی اور حیثیت پر برا اثر پڑے گا -

آخر میں وزیرِ اعلیٰ نے ہریانہ واسیوں کو یقین دلایا کہ ریاست میں نظم و نسق، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن برقرار رکھنے کو اوّلیت دی جائے گی -

ترقیاتی کاموں کے لئے برابر کی امداد

حکومتِ ہریانہ نے چالو مالی سال کے دوران ترقیاتی کاموں کو مہمیز کرنے کی غرض سے برابر کی امداد کے طور پر پنچائتوں کو ۲۰ر۴۲ کروڑ روپے دیئے - یہ امداد ساتویں پنجسالہ منصوبہ میں اس کام کے لئے طے شدہ رقم ۱۰۶ر۱۵ کروڑ روپے میں سے دی گئی - یہ رقم ۹۰ر۴ ترقیاتی کاموں پر صرف کی جائے گی -

میچنگ گرانٹس سکیم کے تحت، پچاس فیصد رقم پنچائتوں نے رضاکارانہ طور پر خود جمع کی اور اسی کے برابر رقم حکومت نے مختلف ترقیاتی کاموں مثلاً سکول کی عمارتوں، مویشیوں کے ہسپتالوں، پنچایت گھروں، مہلا منڈلوں، ڈسپنسریوں

وغیرہ کے لئے مہیا کی۔

گذشتہ برس برابر کی امداد کے طور پر ۵۳۳ ترقیاتی کاموں کے لئے ۲۲ء۲۷ کروڑ روپے تقسیم کئے گئے۔ اس رقم سے ۳۹۲-اسکولوں کی عمارتیں، ۲۰ دھرم شالہ، چوپال، پنچایت گھر، ۱۰ مویشیوں کے اسپتال، ڈسپنسریاں اور ۳۶ کمیونٹی سنٹر تعمیر کئے گئے۔

اسی طرح سنہ ۱۹۸۵-۸۶ء میں ایسے ہی ۴۶۵ کاموں کے لئے ۲۲ء۱۷ کروڑ روپے دئے گئے تھے۔

دیہی لڑکیوں کو الیکٹرانکس میں تربیت

ہریانہ الیکٹرانکس ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ (ہرٹرون) کی تحریک پر الیکٹرانکس کے شعبہ میں تربیت دینے کا پروگرام کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت دیہی لڑکیوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ چالو مالی سال کے دوران مختلف پیشوں سے متعلق ۴۰ تربیتی کورس شروع کرنے کا منصوبہ ہے جبکہ گذشتہ برس ایسے ۲۰ کورسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اس پروگرام کا مقصد الیکٹرانکس اور سائنسی کلچر کو دیہی علاقوں تک لے جا کر ضرورت مند لڑکیوں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔ دیہی لڑکیوں کے لئے یہ پروگرام سماجی فلاح و بہبود کی یونین منسٹری کے توسط سے عالمی ترقی کی خواہاں ناروے جین ایجنسی کی مالی امداد سے چل رہا ہے۔ چار ماہ کی اس سکیم کے تحت ہر تربیت حاصل کرنے والے کو دو سو روپے ماہانہ وظیفہ کے ساتھ مستقل ملازمت کا بھی یقین دلایا جاتا ہے۔ تربیت کے شعبہ کا تعین صنعتوں سے صلاح مشورہ کے بعد کیا جاتا ہے۔

یہ سکیم گوڑگاؤں، انبالہ اور پنچکولہ میں شروع ہے جہاں الیکٹرانکس انڈسٹری مستحکم بنیادوں پر پہلے ہی قائم ہے۔ ۲۵ لڑکیوں کے ۱۰ گروپ تربیت حاصل کرنے کے بعد مقامی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں۔

مزید براں ہرٹرون نے الیکٹرانکس کے مرکزی محکمہ کے مالی تعاون سے الیکٹرانکس ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شعبوں میں آئی۔ ٹی۔ آئی انسٹرکٹروں کے لئے چار چار ہفتے کے ریفریشر کورس بھی شروع کئے ہیں۔ ان اداروں میں الیکٹرانکس کی تعلیم کا معیار بلند کرنے اور جدت لانے کے لحاظ سے یہ کورس نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ایسے دو کورس سالِ رواں میں بھی شروع ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس سال ہرٹرون صنعتوں اور مختلف تعلیمی اداروں کے تین سو سے زائد تکنیکی افراد کو اس ٹریننگ پروگرام کے تحت تربیت دے گی۔

(ص۔و)

زاہدہ زیدی

تخلیق کا سفر

خواجہ احمد عباس کو نذرِ عقیدت

وہ ایک بیباک شوخ چنچل کرن تھی
جس نے کہ ایک جسمِ لاغر میں آنکھ کھولی
اسی کے خونِ جگر کی گرمی سے پھر وہ شعلہ بنی
شفق بنی، ماہِ نو بنی اور مہرِ تاباں
کہ جس کی آتش بیان کرنوں سے رفتہ رفتہ اک جہاں
منوّر
کبھی وہ آتش فشاں ندی تھی
کبھی وہ سیلابِ نور تھا
کبھی دھوپ کا سمندر

مگر وہ لاغر بدن جزیرہ نہ تھا
منارہ تھا روشنی کا
کہ جس کی حدِ نظر میں بحرِ بیکراں کی موجوں کا زیر و بم تھا۔
ہوا کی مانند تھا وہ آزاد
بادِ صبا کی مانند نکہتوں کا پیامبر تھا
کبھی وہ آواز بن کے گونجا
کبھی وہ الفاظ بن کے تڑپا
کبھی وہ احساس کے سفینے میں شعلہ زن پانیوں سے
گذرا
کبھی وہ صورت گری کی دنیا میں ایک تلوار بن کے لپکا۔
کبھی وہ ایوانِ فکرِ نو میں قلم کا اعجاز بن کے چمکا
نہ اس نے ظلمت سے ہار مانی
نہ اس نے کڑوی حقیقتوں سے نظر چرائی۔

نہ اس نے شہرت کی آرزو کی
نہ اس نے ثروت کی جستجو کی
کہ اس کی رنگیں مزاجیوں میں بھی ایک رنگِ قلندری تھا

مگر وہ آواز اب کہاں ہے
قلم کا اعجاز اب کہاں ہے
جنوں کا وہ ساز اب کہاں ہے
کہاں ہے اب وہ کرن
جو تھی ظلمتوں پہ یلغار روشنی کی
نہیں وہ معدوم ابھی نہیں ہے
نہیں وہ شاید یہیں کہیں ہے
زمیں کے گوشے میں گو نہاں ہے
ہر ایک شے میں رواں دواں ہے
چلو اسے زندگی کے سچے کھرے مناظر میں
فکرِ بیباک کے مظاہر میں
تخلیق کے شراروں میں
الفاظ کے خزینوں میں
احساس کے قرینوں میں
قلبِ گداز کی خلوتوں میں ڈھونڈیں

افسانہ

نور الحسنین

گرفتارِ بلا

دفتر سے اپنی پروموشن کا لیٹر لے کر جب میں باہر نکلا تو سورج اپنا کام مکمل کر کے رُخصت ہو رہا تھا اور جاتے جاتے دُنیا کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وقتِ نزع کوئی دیکھتا ہو۔ سورج کی اس بے بسی کو میں نے بھی محسوس کیا، لیکن معاً میری نظریں جب اپنے سائے پر پڑیں تو وہ میرے قد سے کئی گُنا بڑا ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے اس بڑے سائے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہُوئی اور اپنی اس خوشی میں میں سورج کی اس بے بسی کو بھول گیا، لیکن اس مسرت سے ابھی پُوری طرح لُطف اندوز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ وہ اچانک میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، جانے کیوں جب بھی وہ میرے سامنے آتا ہے غصّے کے مارے میری آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ خُون جوش کھانے لگتا ہے اور زبان اُول جُلول بکنے پر مجبُور ہونے لگتی ہے، کتنی دفعہ چاہا بھی کہ وہ میرے سامنے نہ آیا کرے، لیکن وہ بڑا بے غیرت ہے، جب بھی مجھے تھوڑی سی تنہائی میسّر ہوتی ہے وہ آ دھمکتا ہے۔ میں نے اُسکی آنکھوں میں گھورتے ہُوئے کہا۔ "اب میں یہاں سے جا رہا ہوں، ایک نئے شہر۔ اُمید کہ اب تمہاری منحوس صُورت مجھے دیکھنے کو نہیں ملے گی!"

میری باتیں سُن کر اُس نے قہقہہ لگایا، "تم مجھے ہر جگہ پاؤ گے۔ شاید تم نہیں جانتے میرے کتنے رُوپ ہیں؟ میں ہوا کی طرح ہر طرف بکھر سکتا ہوں، آگ کی طرح پھیل سکتا ہوں، اور پانی کی طرح برس سکتا ہوں، تم مجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکتے — میں ہر جگہ تمہارا پیچھا کرتا رہُوں گا۔"

اُس کو جواب دینا میں نے ضروری نہیں سمجھا البتہ میرے ہونٹوں پر طنزیہ مُسکراہٹ اُبھری اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

جب میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چُکا ہے۔ اور میری بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور ڈرائینگ رُوم سے ہوتا ہُوا اندر چلا گیا۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد میری بیوی آئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ "آج کل آپ بڑے بداخلاق ہوتے جا رہے ہیں — میسرز رانا کنسٹرکشن (M/S Rana Construction) کے مالک آئے تھے۔ اور آپ اُن سے ملے تک نہیں؟"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا، اور سوچنے لگا کم بخت واقعی رُوپ بدلنے میں ماہر ہے۔ پھر یکایک مجھے خیال آیا اور میں نے اپنی بیوی سے پُوچھا، "تم نے اُسے یہ تو نہیں بتایا کہ ہمارا تبادلہ کہاں ہُوا ہے؟"

"نہیں تو —؟" اُس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، اور پھر خود ہی کہنے لگی، "اُس نے تو یہ بات مجھ سے پُوچھی تک نہیں!" اور میں سوچنے لگا کم بخت صرف بہت بڑا اداکار ہی نہیں

بلکہ ماہرِ نفسیات بھی ہے۔

اُسے بنا بتائے میں نئے شہر آ گیا، اور آفس جوائن کر لیا، لیکن ایک روز جیسے ہی میں آفس سے باہر نکلا وہ اُبلام میرے قدموں میں آکر گر گیا اور مجھے سلام کرنے لگا۔ میں نے اُسے بڑی آسانی سے پھلانگ لیا، اور اپنے راستے پہ چلنے لگا۔ لیکن وہ تیزی سے اُٹھ کر پھر ایک بار میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور مجھے ایک نئے راستے پر چلنے کی ہدایت دینے لگا۔ میں نے اُسے فوراً اُسی وقت ڈانٹ دیا اور دانت پیس کر میرے سامنے سے پرے ہٹ گیا۔

میری اُس کی پہلی مُلاقات اُس وقت ہُوئی تھی جب میں نیا نیا جونیئر انجینئر کے عہدے پر فائز ہُوا تھا۔ اُس وقت میری عمر بھی کوئی زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ میری شادی بھی نہیں ہُوئی تھی۔ ہُوا یُوں تھا کہ مجھے میسرز سدا مابلڈرز نے ایک روز فون کیا کہ وہ میری مُلاقات ایک ایسی ہستی سے کروانا چاہتے ہیں جو بہترین رقاص ہے۔ میں شام اُن کے گھر ہونے والی پارٹی میں حاضر رہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی رقاص کا رقص نہیں دیکھا تھا بلکہ ہر دم قسمت کے فیصلوں پر خود ہی رقص کرتا آیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری زندگی سب سے پہلے اُس وقت ٹوسٹ (TWIST) ہُوئی تھی جب میرا باپ مرا تھا۔ اور میری ماں نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"سنجو! تم کوئی فکر نہ کرنا، میں تمہارے لئے زندہ ہُوں۔ تم اپنا پُورا دھیان پڑھائی میں لگاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا!"

اور پھر یہ سب کچھ جو میں آج ہوں۔ اُسی کے بلند حوصلے کی دین ہے۔

ہاں تو میں اپنی اور اُس کی پہلی ملاقات کا واقعہ سُنا رہا تھا۔ میں جب سدا ما بلڈرز کی پارٹی میں شریک ہُوا تو واقعی ایک رقاص اپنے فن کے داؤ پیچ دکھا رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی نیا پینترا بدلتا کسی کونے سے آہ کی صدا زور سے بلند ہوتی اور وہ اپنی نظریں بدل کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا۔ پھر اُس کا اور میرا بھی سامنا ہو گیا۔ لیکن وہ مجھ سے آنکھیں نہ مِلا سکا اور نہ اُسے دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہُوئیں۔ کچھ دیر بعد جب میں ڈائننگ ہال میں داخل ہُوا تو وہیں یہ شخص میرے گلے کا ہار ہو گیا۔ اور خواہ مخواہ اپنی چکنی چپڑی باتوں میں مجھے اُلجھانے لگا۔ وہاں میرا دل بالکل نہ لگا۔ اور میں اُس کے پاس سے اُٹھ گیا۔ جاتے جاتے جُونہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ سارے لوگ جو کچھ دیر پہلے بجے خاصے قد آور نظر آ رہے تھے اُس کے سامنے چوہوں کی طرح کھڑے تھے۔ اُس کی آنکھیں مجھے بڑی تیز محسوس ہوئیں۔ جیسے وہ ہپناٹزم کے علم سے واقف ہو۔ دُور سے اُس نے بھی میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو میرے متعلق کچھ کہنے لگا۔ پیٹھ پیچھے بُرائی ــــ؟ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہُوا اور میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی گھگھی بندھ گئی اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر میں نے دیکھا جیسے اس کا وہ بلند قد گھٹ رہا ہے۔ پگھل رہا ہے۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ ایک چُوہے کی شکل اختیار کر گیا۔ اور پلک جھپکتے ہی ایک سُوراخ میں جا کر چُھپ گیا۔ لوگ کبھی حیرت سے مجھے اور کبھی اُسے دیکھتے تھے لیکن میرے چہرے پر کہیں بھی خوف کی کوئی لکیر نہیں اُبھری تھی۔ میں نے بس اتنا پُوچھا،

"کیا یہ جادُوگر ہے؟"

ساتھ والے سبھی لوگوں نے ایک ساتھ جواب دیا ــــ

"ہاں جادُوگر ــــ بہت بڑا ساحر ہے یہ ــــ اُس میں عجیب و غریب صلاحیتیں ہیں۔ یہ بڑی آسانی سے اپنا رُوپ بدل سکتا ہے اپنی جِنس بدل سکتا ہے اور جب چاہے آسانی سے دُھواں بن کر غائب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دھرتی پر سمندر کی طرح پھیل سکتا ہے۔ طُوفان بن کر چھا سکتا ہے اور جب چاہے وارد بھی ہو سکتا ہے اور غائب بھی!

اب مجھ پر اُس کا ہلکا ہلکا خوف طاری ہونے لگا تھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنی ساحری کا اثر مجھ پر کرتا میں وہاں سے چُپ چاپ نکل گیا۔

جانے کیوں اب مجھے بھی اس سے متعلق سوچنے کی عادت ہو گئی تھی جہاں بھی موقع ملتا میں لوگوں سے اُس کے بارے میں معلومات

حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اُس سے متعلق میرا ایک سینئر ماتحت کہہ رہا تھا۔ صاحب وہ بڑا عجیب شخص ہے۔ آپ اُسے نہیں جانتے، چور راستوں سے داخل ہوتا ہے اور پھر چند لمحوں میں آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ اور جہاں اُس کی رسائی نہیں ہوتی وہاں پر بہروپ لے کر آتا ہے اور آخر کامیاب ہو کر ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک خوبصورت ہرنی کا بھی روپ بھر لیتا ہے جس کے شکار میں الجھ کر کتنے ہی بابو اُس کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ بس جیسے بھی ممکن ہو اُس ہرنی کو سالم دبوچ لیا جائے. لیکن صاحب ایسا کبھی ممکن ہُوا ہے؟ وہ اُنہیں اُس وقت تک اپنے پیچھے دوڑاتا ہے جب تک کہ یہ شہر بدر نہ ہو جائیں۔ اور صاحب کبھی کبھی تو وہ پارس کے مانند بھی ہو جاتا ہے لیکن صاحب آپ سے کیا کہوں جب بھی اُس کا سحر ٹوٹتا ہے تو دُور دُور تک کچھ نہیں ہوتا، بس قسمت کا صحرا رہ جاتا ہے جہاں آدمی اپنی زندگی کے آخری ماہ و سال پورے کرنے لگتا ہے۔"

"ایسے پاگل آدمی کو آخر ختم کیوں نہیں کر دیتے؟" میرے اِس سوال پر میرا سینئر ماتحت صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اوروں کی طرح اُس نے مجھے بھی شکار کرنے کی کوشش کی اور جب میں اس کی اکڑفوں کے آگے زیر نہ ہُوا تو اُس نے چاپلوسی کا حربہ استعمال کرنا شروع کیا۔ میں جہاں بھی جاتا وہ میرے پیچھے دوڑتا رہتا، اور جب میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو میرے قدموں میں لوٹنے لگتا، اور بڑی لجاجت سے کہتا، "بابو جی! میری دوستی قبول کر لو میں تمہاری زندگی بدل دوں گا۔ آرام و آسائش کی وہ ساری گھڑیاں جن کا لوگ صرف تصور ہی کرتے ہیں آپ کے قدموں میں ہوں گی!" اُس کی یہ باتیں سُن کر کبھی کبھی میرا ایمان بھی ڈگمگانے لگتا، لیکن میں ہمیشہ ہی سے اپنے منتخب کردہ راستوں کا راہی رہا ہوں، اس لئے میں نے کبھی اُس کی دوستی قبول نہیں کی بلکہ جب بھی اُس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا میں نے جھٹک دیا۔ جانے کیوں مجھے اُس سے شدید نفرت تھی۔

پھر آخر ایک روز وہ بھی آ گیا جب اس کی اور میری دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ میری اچھی کارکردگی کے باوجود میں کسی شہر میں چھ ماہ سے زیادہ نہ ٹِک سکا۔ ہر بار میرا تبادلہ ہوتا رہا، میری ترقی کے سارے راستے ختم کر دیئے گئے۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور جب بھی اُس کا سامنا ہُوا میں نے اُس سے دوستی کی بھیک نہیں مانگی۔ اب وہ بھی اتنا کٹھور ہو چکا تھا کہ اب اُسے بھی میری دوستی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ اُس نے مجھ پر بے حد ظلم کئے۔ میری لڑکی کا بیاہ محض اسی وجہ سے نہ ہو سکا کہ میں جہیز میں کوئی بڑی رقم دینے کے قابل نہ تھا۔ اس کی خاطر میں اُدھار مانگنے جن لوگوں کے بھی پاس گیا وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور میرا پتہ کٹوا دیا۔ میری لڑکی بن بیاہی بیٹھی رہی، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری، پھر جب میرے لڑکے کے انجینئرنگ کالج میں داخلے کا مسئلہ آیا تو اس وقت بھی میں خاصا پریشان تھا — بطور (Donation) کالج کو مجھے بیس ہزار روپے دینے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی رقم آخر لاؤں کہاں سے؟ اچانک وہ بنا دروازہ کھٹکھٹائے میرے گھر میں داخل ہُوا اور میرے چہرے کی افسردگی کو دیکھ کر بے حد خوش ہُوا اور کہنے لگا۔ "بابو جی۔ اب بھی وقت ہے آپ کا نہ سہی آپ کے بچے کا مستقبل بنا دوں گا۔ بس آپ کو دو قدم میرے ساتھ چلنا ہوگا!" میں نے نفرت سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر پوری شدت سے چلا کر کہا۔ "نکل مردود — شیطان — تو ...... تو میرا ایمان خریدنا چاہتا ہے، میں ایک سچا انسان ہوں اور تیرے ساتھ چلنے کے لئے میرا ضمیر کبھی راضی نہ ہوگا!"

میرے یہ الفاظ سُن کر وہ بڑے اطمینان سے ہنسا اور پھر کہنے لگا۔ "جانتے ہو اس دنیا میں سچائی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ مسیح بھی سچا تھا، لیکن اُسے پھانسی دے دی گئی۔ میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن یاد رکھنا اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے جب سچائی کی جیت ہوتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں — بولو کیا چاہتے ہو — ؟"

اُس کے اس سوال نے لمحہ بھر کے لئے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ لیکن آخر فتح پھر میری ہوئی اور وہ مجھ سے ہار گیا اور اس کامیابی کے نتیجے میں میرے لڑکے کا انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہ ہو سکا۔

زندگی کے اس طویل سفر میں ساتھ چلتے چلتے اب میری

بیوی بھی کچھ تھک سی گئی تھی۔ اب اُس کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی میرا ساتھ دیئے جا رہی تھی۔ مسلسل علالت اور کمزوری کے باعث وہ بالکل لاغر ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے حالات اتنے اچھے نہ رہے تھے کہ میں اُس کا علاج کسی اچھے دواخانے میں کروا سکتا۔ اُس کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ اور آخر ایک دن مقامی ڈاکٹر والیا نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں اپنی بیوی کی صحت چاہتا ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ میں اُسے کسی بڑے دواخانہ بھیج دوں ـــــ

بڑا دواخانہ ـــــ ؟؟ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ـــ جو شخص تمام عمر محدود تنخواہ پر گذر بسر کرتا رہا ہو وہ بھلا بڑے دواخانے کیسے جا سکتا ہے؟ میں ذہنی طور پر شدید دیوالیہ ہو چکا تھا۔

آخر ایک روز بیوی کی حالت بہت زیادہ تشویشناک ہو گئی۔ اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ میں بہت گھبرا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اُسکے ساتھ گذارا ایک ایک پل گھوم گیا۔ جب وہ دلہن بن کر میرے گھر آئی تھی تب ہی میں نے اُس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا اطمینان دیکھا تھا۔ جیسے وہ اپنے حالات اور ماحول سے بالکل مطمئن ہے۔ اُس کا یہ اطمینان میں نے ہمیشہ اُس کے چہرے پر دیکھا۔ کبھی اُس نے کسی چیز کی خواہش نہیں کی، بس جو بھی کرتا وہ اُسے تسلیم کر لیتی۔ جیسے یہی اُس کا مقدر ہے۔ لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا تھا جیسے موت اور زیست کی اس کشمکش میں اُس کے چہرے کا اطمینان غائب ہو گیا ہے۔ اور وہ بے چین ہے۔ اور شاید ابھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اُس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا اور اُسے دیکھنے لگا۔ جونہی اُسے یہ احساس ہوا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں تو اُس کے چہرے کا وہی اطمینان پھر ایک بار لوٹ آیا ہے۔ اور وہ خاصی مطمئن نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں ایکدم پھٹ پڑا ـــ جھوٹ ...... ایکدم جھوٹ ـــــ تم نے زندگی بھر اپنے چہرے پر اطمینان کی ایک جھوٹی نقاب لٹکا رکھی تھی۔ تم نے اپنے آپکو نہیں مجھے دھوکہ دیا ہے۔ نوچ ڈالو اپنے چہرے کی یہ نقاب..... تم ـــ تم اگر صرف ایک بار مجھکو اپنی بے یقینی کا احساس دلا دیتی تو میں اُن سارے ممنوعہ سمندروں سے موتی سمیٹ لاتا اور اُن سے تمہارا دامن بھر دیتا ـــ لیکن تم دھوکے باز ہو ـــ تم نے اپنی ہی نہیں بلکہ میری زندگی بھی تباہ کر دی ہے ـــ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لیکن اُس کے چہرے پہ وہی اطمینان کی دبیز نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بلکہ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی پھیل گئی تھی۔ جیسے اُس کی یہ مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہو "اگر تم میں ہمت ہو تو اس نقاب کو اُلٹ دو ـــ ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ دفعتاً میرے کندھوں پر کسی کے مضبوط وزنی ہاتھ محسوس ہوئے۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہی شخص کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔ اُس نے میری پیٹھ تھپتھپائی، اور پھر میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور دوسرے ہی لمحے میں اُسکے بتلائے ہوئے راستوں پر بے تحاشہ دوڑ رہا تھا کہ ساری زندگی کے اندھکار کی ابھی اور اسی وقت تلافی کر دوں۔

میری بیوی کا علاج ہو چکا ہے۔ آج میری کوٹھی میں اُس کی صحتیابی کا شاندار جشن منایا جا رہا ہے۔ اور وہ ایک بار پھر اُتنی ہی حسین نظر آ رہی ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ میں بیحد خوش ہوں۔ اس جشن میں شہر بھر کے رئیس، ٹھیکیدار، تاجر، سیاست دان موجود ہیں۔ اور ان سب کے بیچ وہ شخص بھی بیٹھا ہوا ہے، جو کبھی میری طرف دیکھ کر غرور سے کِلکِلایا کرتا تھا۔ آج جب میری نظریں اُس کی طرف اُٹھیں تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے خوف کے مارے میری گِھگھی بندھ گئی ہے۔ اور میں تھر تھر کانپ رہا ہوں اور میرا قد تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے اور اُس کا قد تیزی سے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ وہ آسمان کی طرف بڑھ رہا ہے اور میں زمین میں سمٹتا جا رہا ہوں پگھل رہا ہوں۔ اور آہستہ آہستہ میں ایک چوہے کی شکل اختیار کرتا رہا ہوں۔ وہ اپنے بڑے بڑے قدم اُٹھاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں گھبرا کر ایک چھوٹے سے سوراخ میں چھپ جاتا ہوں۔ میری بیوی کے چہرے پر کسی نے اطمینان کی اس نقاب کو اُلٹ دیا ہے۔ اور وہ تذبذب کا شکار ہو گئی ہے...... میں اپنے سوراخ سے پوری شدت سے چیختا ہوں ـــ نکل مردود۔ شیطان ـــــ

لیکن میری آواز حلق سے نیچے ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور وہ گہرے اطمینان سے مجھے ایسے دیکھنے لگتا ہے، جیسے اپنے شکار کو قابو میں کرنے کے بعد بلی دیکھا کرتی ہے۔ ....

شریندر پنڈت سوز

غزل

اِک صندلی سا ہاتھ جب میرے گلے میں تھا
میں رنگ و بُو کی قید کے اِک سلسلے میں تھا

صحرا کی موت میرے مقدر میں لکھ گیا
جو شخص بادلوں کی طرح دیکھنے میں تھا

جب زلزلوں کی زد میں گھرا تھا مرا مکاں
اُس وقت میرے دوستو میں مے کدے میں تھا

اَب قربتوں کے حبس میں گھٹنے لگا ہے دم
کتنا سکون دِل کو کبھی بُت کدے میں تھا

مَیں نے کہا تھا جس سے نہ روؤں گا عمر بھر
وہ تیز گام شخص ابھی راستے میں تھا



انجم عرفانی

غزل

برپا کبھی تو ہوگی عدالت ضمیر کی
پَیہم ہُوا کریگی چُبھن دِل میں تیر کی

قیدِ غمِ حیات سے ہو جائے کب فرار
لیتا نہیں ہے کوئی ضمانت اسیر کی

گھر بار ہی نہیں تو جلا کر چلینگے کیا؟
ویسے صدا تو ہم نے بھی سُن لی کبیر کی

مُہرِ اَنا لبوں پہ، جبیں پر کُلاہِ فقر
شہرِ ہُنر میں کرتے ہیں تقلیدِ میر کی

کاسہ بھرا ہُوا ہے دُعاؤں کے پھُول سے
انجم تو گوشِ دِل سے صدا سُن فقیر کی

ابراہیم یوسف

اُردو ڈرامے میں لیلیٰ مجنوں کی روایت

انسان ابتدا ہی سے قصے کہانیوں اور داستانوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے ان میں خصوصیت سے عشق و محبت کی داستانیں اسے مرغوب رہی ہیں جو قیدِ مکان اور قیدِ عمر سے آزاد ہوتی ہیں۔ نانی اماں کی کہانیوں میں بھی ایک خوبصورت شہزادہ کوئی پری یا کوئی خوبصورت شہزادی ضرور ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے شہزادہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے۔ مذہبی کتابیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ قرآن پاک میں یوسف زلیخا کے قصے کو احسن القصص کہا گیا ہے۔ دُنیا کی ہر زبان کا ادب عشق و محبت کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ لوک کہانیوں میں بھی عشق و محبت کی داستانیں نوجوانوں سے خوں آلود عاشق رہتی ہیں اور بے جانے بوجھے کر ان داستانوں میں سچائی بہت کم ہوتی ہے لیکن عوام متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا اور اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا المیہ انجام ہے جو ذہنِ انسانی پر لافانی نقش چھوڑ جاتا ہے۔

اُردو کے ابتدائی ڈراموں کی بنیاد عشق و محبت کے قصوں پر ہی رکھی جاتی تھی جن میں عشق کا مارا ہمیشہ سوز گری پہ نظر آتا ہے۔ اُردو ڈرامانگاروں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی کہانیوں اور داستانوں پر ڈرامے لکھے جو عام طور پر معروف اور مقبول تھیں ان میں سب سے زیادہ مقبولیت بکاؤلی کے قصے اور لیلیٰ مجنوں کو حاصل ہوئی مقابلتاً لیلیٰ مجنوں کو کچھ زیادہ۔ جس طرح اندر سبھا امانت نے متعدد ضروری اور غیر ضروری گانوں کی روایت ہمیں ورثہ میں دی اسی طرح لیلیٰ مجنوں نے ایسے المیہ ڈراموں کی بنیاد ڈالی جو بہت جذباتی انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اُردو میں لیلیٰ مجنوں پر لکھے گئے چند ڈراموں کا جائزہ لینے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے لیلیٰ مجنوں کے قصے کی تاریخی حیثیت کا تعین کریں۔

فرہنگِ آصفیہ اور جناب محمود نیازی کی "تلمیحات" میں لیلیٰ مجنوں پر تفصیل سے لکھا گیا ہے، صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کا انداز افسانوی ضرور ہے لیکن پھر بھی لیلیٰ مجنوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جبکہ محمود نیازی صاحب تحقیقی نقطۂ نظر سے واقعے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ لیلیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "لیلیٰ ۔ قیس یعنی مجنوں کی معشوقہ کا نام جو عامر کی بیٹی محمد مہدی عرب کی رہنے والی خلفائے بنو امیہ کے عہد سلطنت میں موجود تھی۔" لیکن محمود نیازی صاحب لیلیٰ کے باپ کا نام سعد لکھتے ہیں۔ قیس کے باپ کے نام پر مورخ متفق ہیں کہ اس کا نام ملوح بن مزاحم عامری تھا جو قبیلۂ بنی عامر کا سردار تھا اگرچہ

بعض حضرات قیس کے باپ کا نام عبداللہ بتلاتے ہیں اور ہمارے ڈرامانگار بھی اسی نام کو ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ملوح بن فراحم کے مقابلے میں عبداللہ زیادہ عام فہم اور آسان ہے۔ ہمارے ڈرامانگار نوفل کو بحیثیت بادشاہ کے پیش کرتے ہیں لیکن وہ بنی امیہ کا ایک سردار تھا اور بقول صاحب فرہنگ آصفیہ قبیلہ بنی عامر سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر تھا۔ مجنوں کے عشق صادق کو دیکھ کر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ قیس کی شادی لیلیٰ سے کرا دیگا لیکن بنی عامر کے معاندانہ رویہ کے باعث وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ قیس کی جنونی کیفیت دیکھ کر اس کا باپ اسے حج بیت اللہ کے لیے لے گیا کہ اس کی برکت سے اس کی دیوانگی رفع ہو جائے مگر قیس کی بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا خانۂ کعبہ کے پاس ایک عورت نے دوسری عورت کو لیلیٰ نام لیکر پکارا یہ نام سنتے ہی قیس بے ہوش ہو گیا ہوش میں آنے پر جنونی کیفیت پھر پیدا ہو گئی اور وہ کپڑے پھاڑ کر نجد کے جنگلوں میں چلا گیا۔ قیس کے باپ نے لیلیٰ کے باپ کو شادی کا پیغام دیا مگر قیس کے جنون کے باعث لیلیٰ کے باپ نے شادی سے انکار کر دیا اور لیلیٰ کی شادی جبراً ورد بن محمد العقیلی سے کر دی لیلیٰ اس کی تاب نہ لا سکی اور اس کی موت واقع ہو گئی جب اس کی خبر قیس کو ملی تو وہ قبرستان پہنچ گیا اور لوگوں سے لیلیٰ کی قبر معلوم کرنا چاہی مگر لوگوں نے بتلانے سے انکار کر دیا قیس نے قبروں کی مٹی سونگھ کر لیلیٰ کی قبر معلوم کر لی اور ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا کہ "لوگ چاہتے ہیں کہ اس کے عاشق سے اس کی قبر چھپائیں مگر خود قبر کی مٹی بتا رہی ہے کہ یہ کس کی قبر ہے۔" اس کے بعد وہ لیلیٰ کی قبر پر گرا اور مر گیا اس کی قبر بھی لیلیٰ کی قبر کے پاس بنا دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ قیس کی موت پر قبیلہ بنی عامر میں جیسا ماتم کیا گیا ایسا ماتم کبھی کسی کی موت پر نہیں کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔
بقول محمود نیازی صاحب "مجنوں کی وفات کا سال ۸۰ھ بتایا جاتا ہے لیکن مورخین نے اس پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ ۸۰ھ میں مرنے والا وہی مجنوں ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے یا کوئی دوسرا۔[1]

[1] تلمیحات : محمود نیازی۔ صفحہ [illegible]

اس قسم کے شبہات کا اظہار ابن خلکان اور ابن خلدون جیسے مستند مورخین نے کیا ہے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مجنوں عرب کے ان تین شخصوں میں سے ایک ہے جن کا کوئی وجود ہی نہیں اور یہ محض افسانوی ادب کی تخلیق ہیں۔ ابن الکلبی کے نزدیک مجنوں کا سارا قصہ فرضی ہے اور اسے بنی امیہ کے کسی مصنف نے تصنیف کیا ہے۔ ان مستند مورخین کی تحقیق اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا مجنوں ہے جس کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا جب تک اس مجنوں کی شخصیت ظاہر نہیں ہوتی قیس کے وجود پر کوئی آخری فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال قیس عربی زبان کا شاعر ضرور تھا۔ (امراء القیس نہیں) اس کا دیوان موجود ہے اور جس سے مرزا رسوا نے اپنا ڈراما لکھتے وقت استفادہ کیا ہے۔

مجنوں کا قصہ فارسی، ترکی اور اردو میں یکساں طور پر معروف ہے فارسی میں اسے سب سے پہلے نظامی گنجوی نے متعارف کرایا پھر امیر خسرو اور جامی نے اس پر لکھا۔ ترکی میں حمدی اور فضیلی نے اردو میں میاں نظیر نے۔ بعد میں اردو ڈرامے کا یہ ایک مستقل موضوع بن گیا۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کچھ حضرات کا خیال ہے کہ قیس حضرت امام حسن کا دودھ شریک بھائی تھا مگر یہ قیس، قیس عامری نہیں بلکہ اس کا نام قیس بن ذریح تھا وہ قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھتا تھا اور بنی کعب کی ایک لڑکی لبنیٰ بنت حباب پر عاشق تھا۔ حضرت امام حسن کی سفارش سے دونوں کی شادی ہو گئی تھی لیکن اولاد نہ ہونے کے باعث قیس کے باپ نے جبراً دوسری کرا دی۔ قیس اور لبنیٰ دونوں اسی غم میں مر گئے۔

یوں تو لیلیٰ مجنوں پر لاتعداد ڈرامے لکھے گئے ہیں ـــ لیکن مندرجہ ذیل ڈراموں کا اردو ڈرامے کی تاریخ میں کسی نہ کسی طرح ذکر مل جاتا ہے۔

(۱) لیلیٰ مجنوں۔ از خانصاحب نسروانجی مہروانجی آرام۔
(۲) لیلیٰ مجنوں (اوپرا) از خانصاحب نسروانجی مہروانجی آرام۔
(۳) لیلیٰ مجنوں ۱۸۷۹ء (منظوم) از رونق بنارسی (۴) سوانح قیس مفتوں معروف بہ لیلیٰ مجنوں ۱۸۸۹ء از حافظ عبداللہ

(۵) مرقع لیلیٰ مجنوں ۱۸۸۶ء از ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا۔
(۶) لیلیٰ مجنوں ۱۹۲۹ء از دل لکھنوی (۷) لیلیٰ مجنوں ۱۹۳۱ء از نشتر لکھنوی (۸) لیلیٰ مجنوں از ایم۔ بی۔ اختر (۹) لیلیٰ مجنوں از دھنا سنگھ شاد (۱۰) لیلیٰ مجنوں از ریاض دہلوی (۱۱) لیلیٰ مجنوں از صادق سردھنوی۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے "لیلیٰ" مصنفہ ڈاکٹر دھن جی بھائی نوروز جی پٹیل۔ "لیلیٰ مجنوں عرف شاد مقتولیا"۔ از افسوں مراد آبادی اور "کفن پوش لیلیٰ مجنوں"۔ از وحشت دہلوی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق لیلیٰ مجنوں کے قصے سے معلوم ہوتا ہے لیکن نہ تو انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور نہ ہی نامی صاحب نے کسی قسم کی معلومات عنایت کیں اس لیے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ریاض دہلوی اور صادق سردھنوی کے لیلیٰ مجنوں کے بارے میں نامی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ صرف مطالعہ کے لئے ہیں اور ریاض دہلوی کا ڈراما دلؔ لکھنوی کے لیلیٰ مجنوں کا مکمل چربہ ہے۔ رونق کا ڈراما "لیلیٰ مجنوں" منظوم ہے ڈاکٹر نامی کا خیال ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈراما بھی آرام کے منظوم ڈرامے لیلیٰ مجنوں سے ماخوذ ہے کیوں کہ تاریخ مذکورہ بالا (۱۸۸۶ء) سے کئی سال قبل یہ ڈراما اسٹیج ہوا تھا۔"[1] اپنے اسی قیاس کو اپنے ایک اور مضمون "رونق بنارسی" مطبوعہ ادب لطیف لاہور فروری ۱۹۵۸ء ص ۱۳ پر انہیں الفاظ میں دہراتے ہیں۔ ڈاکٹر نامی کی رائے قیاس پر مبنی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "حافظ عبداللہ کے ڈرامے کو (رونق بنارسی کے ڈرامے کو) عشق لیلیٰ مجنوں عرف سوانح قیس مقتول کے نام سے از سر نو لکھا"[2] حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا نام "ناٹک سوانح قیس مفتوں معروف بہ عشق لیلیٰ مجنوں" ہے ڈاکٹر نامی نے نام میں الٹ پھیر کر دی ہے۔ ہمیں آرام کے اصل ڈرامے تو دستیاب نہ ہوئے لیکن دونوں ڈراموں کے پلاٹ ضرور پڑھے ہیں اور حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا پلاٹ آرام کے نثری ڈرامے سے ماخوذ ہے منظوم سے نہیں اس لیے اگر حافظ عبداللہ نے رونق کے ڈرامے سے استفادہ کیا ہے تو رونق نے آرام کے نثری ڈرامے پر اپنے ڈرامے کی بنیاد رکھی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ آرام کے منظوم ڈرامے کا پلاٹ اس قدر کمزور اور غیر معروف کہ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی جبکہ نثری ڈرامے کا پلاٹ اس قدر مقبول ہوا کہ ہر ڈراما نگار اپنا لیلیٰ مجنوں لکھتے وقت اسی میں معمولی تبدیلیاں کر کے اپناتا رہا۔ ایم۔ بی اختر کے ڈرامے کے سرورق پر تحریر ہے۔ "میڈن تھیٹر کلکتہ کا تیار کردہ لاثانی شاہکار لیلیٰ مجنوں"۔ اندرونی صفحہ پر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس ڈرامے کو مس کجن، ماسٹر نثار، ماسٹر رحیم بخش، نواب اے۔ آر کابلی اور عبداللہ کاشمیری کھیلتے تھے یہ ڈراما اس قدر کمزور ہے کہ یہ یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ میڈن جیسی کمپنی اپنے زمانے کے اس قدر مقبول اور بہترین اداکاروں کے ساتھ اس ڈرامے کو کھیلتی ہوگی اگرچہ کجن اور ماسٹر نثار لیلیٰ مجنوں کا پارٹ کرنے میں کافی شہرت رکھتے تھے لیکن شاید ہی وہ اس ڈرامے کو کھیلتے ہوں۔ نشتر لکھنوی بھی میڈن تھیٹر سے وابستہ تھے ان کے ڈرامے لیلیٰ مجنوں پر ۱۹۳۲ء میں فلم تیار کی گئی تھی۔ دھنا سنگھ شاد کا لیلیٰ مجنوں بہت ہی معمولی ڈراما ہے

اردو ڈرامے کی تاریخ میں لیلیٰ مجنوں کی روایت آرام کے ان دو ڈراموں سے پڑتی ہے جو انہوں نے نظم اور نثر میں الگ الگ لکھے تھے، ان کے پلاٹ بھی الگ الگ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آرام کو دو ڈرامے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ ابتدا میں پارسی اردو تھیٹر میں ڈرامے نثر ہی میں لکھے گئے لیکن امانت کی اندر سبھا کی غیر معمولی مقبولیت اور عوام میں گانوں کی بے پناہ مانگ نے پارسی اردو تھیٹر کا رجحان بدل دیا۔ آرام کا یہ گیت ناٹک لکھنے کا سبب یہی بدلا ہوا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ آرام کو تیسرے درجے کا شاعر تسلیم کرنے میں بھی تامل ہوتا ہے صرف کھینچ تانی کر کے شعر بناتے تھے جس میں فنی اغلاط سے قطع نظر کسی بھی قسم کی شاعرانہ خوبی مفقود ہوتی تھی۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے لیلیٰ مجنوں لکھنے سے جو روایت قائم ہوئی اس سے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ ان کے نثری ڈرامے کے پلاٹ کو بعد کے ڈراما نگار تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اپناتے رہے۔ ایک بات آرام کے متعلق یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اپنے ڈراموں کے پلاٹ کو ایکٹ اور سینوں میں تقسیم کرنے میں غیر معمولی محنت کرتے تھے اور پھر اس میں مشکل ہی سے کوئی تبدیلی کی جا سکتی تھی اس لیے بعد میں جو لیلیٰ مجنوں لکھے گئے یا جو قصے میں تبدیلیوں کے ایکٹ اور سینوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک سا رہا اس لیے فنی نقطۂ نظر کے مقابلے میں ہمیں ڈراما نگاروں کے اس

۱؎ اردو تھیٹر (جلد دوم) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ص ۵۹۔ ۲؎ ایضاً: ص ۶۰

یکھنا ہوگا جو ڈراما لکھتے وقت اس کے پیشِ نظر رہا ہے۔
ہم نے تقابلی مقابلہ کے لئے حافظ عبداللہ، مرزا رسوا اور
لکھنوی کے ڈراموں کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے
پیچھے ایک تاریخ ہے یعنی اصل ڈراما آرام نے لکھا اور اس میں تھوڑی
ست تبدیلی کرکے رونق نے اپنایا اور اس کو حافظ عبداللہ نے۔ مرزا رسوا کا
اما خالص ادبی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور دل لکھنوی کا لیلیٰ مجنوں
پنے زمانے میں سب سے زیادہ مقبول ڈراما رہا ہے۔
اوپر عرض کیا گیا ہے کہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے یا سوانح
س مفتوں معروف بہ عشقِ لیلیٰ مجنوں" کا پلاٹ آرام کے نثری
رامے لیلیٰ مجنوں سے مستعار ہے حافظ صاحب اپنے دیباچہ میں لکھتے
یں کہ "ماہ اپریل ۱۸۸۵ء میں بمقام شہر فرخ آباد ترتیب دیا ہے۔
راس کو بنام سوانح قیس مفتوں معروف بہ عشقِ لیلیٰ مجنوں"
وسوم کیا زاں بعد ماہ جنوری ۱۸۸۲ء میں بمقام فتحپور لسوہ بہ ناٹک
میم کیا گیا اور نامی پریس قیصر کانپور میں چھپوا دیا گیا اب ۱۸۸۹ء
یں پھر اس کو بمقام شہر میرٹھ ترمیم کیا گیا"۔ اس سے اندازہ
گانا مشکل نہیں ہے کہ یہ لیلیٰ مجنوں اپنے زمانہ میں بیحد مقبول
تھا کہ حافظ صاحب اسے بار بار ترمیم کرکے خوب تر بنانے کی کوشش
رتے رہتے تھے۔ حافظ صاحب اس ڈرامے کو لکھنے کے مقصد کے بارے
یں فرماتے ہیں کہ "میں نے اس کھیل میں لڑکوں اور لڑکیوں کے ہم مکتب ہونے
ی مضرت دکھائی ہے اور مردوں کو عورتوں کی بے پردگی پر نہایت
یرت دلائی ہے"۔ ڈراما چار ایکٹ اور ستائیس سین پر مشتمل ہے۔
مرزا رسوا کا "مرقع لیلیٰ مجنوں" صرف مطالعہ کے لئے ہے
س کا اسٹیج کیا جانا بہت مشکل ہے۔ سرورق پر درج ہے "لیلیٰ مجنوں
معدا منظوم بطور ڈراما جس میں پانچ ایکٹ اور ترپن سین شامل
یں ہر سین کی بحر مناسب حال واقعات کے ہے ہر موقع کے مناسب
بحر کا بھی خیال رکھا گیا ہے، زبان ہر موقع اور ہر شخص کی حالت اور وضع
ص کے ہے"۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا رسوا کے پیشِ نظر
یورپین انداز کا اوپیرا لکھنا تھا ہندوستانی انداز کا سنگیت ناٹک
لکھنا نہیں کیونکہ اوپیرا میں ہر سین کی موسیقی اور اور بحروں کا انتخاب
سین میں واقع ہونے والے واقعہ کی مناسبت سے کیا جاتا ہے اور مرزا

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرزا رسوا اپنے زمانہ کے ڈراموں کی زبان
اور شاعری سے مطمئن نہیں تھے وہ ان ڈراموں کی زبان کو پھلی بازار
کی زبان کہتے تھے۔ اپنے ڈرامے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ چند نمائشیں
کہ حضرت استاذی و مکرمی جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج
(مدظلہ العالی) کی خدمت میں لے جا کر سنائیں بعد حک و اصلاح ارشاد
فرمایا مناسب ہے کہ تمام بحور متقع میں آجائیں تاکہ مبتدی موزوں طبیعتوں
کو مفید تر ہو تعمیل حکم استاد کو عین سعادت سمجھ کر اس پر بھی کاربند
ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال رہا کہ ہر ایک بحر کا نظم موسیقی موافق
اس حالت کے ہو جس حالت کا اظہار شعر سے مطلوب ہے اور یہ امر
اہلِ ذوق واستشعار سے پوشیدہ نہ رہے گا۔ حقیقتاً مرزا رسوا پہلے سے
ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ اس دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ۔
"جی چاہتا تھا کہ اب ایک ایسی کتاب نظم و نثر میں تحریر کروں جس میں
اکثر اصناف شعر شامل ہوں تاکہ متعدد کیفیات ذہنیہ کا مختلف طور
سے بیان ہو جائے"۔ ان [illegible] سے پھر مرزا اوج کی رائے نے مہمیز کا
کام کیا اور انہوں نے [illegible] خواہش کی تکمیل "مرقع لیلیٰ مجنوں" کے
ذریعہ کی۔ اسلئے جہاں مرزا رسوا کا مقصد قصہ لیلیٰ مجنوں کو ڈرامے
کی شکل میں بیان کرنا ہے وہیں مختلف بحور اور ان کے استعمال سے بھی
روشناس کرانا ہے۔ قصۂ لیلیٰ مجنوں کے بارے میں مرزا رسوا فرماتے ہیں۔
کہ قیس کے دیوان (جس کا مدون والبی ہے) کے مدون نے یہ تکلیف
کی ہے کہ ہر ایک غزل کے پیشتر اس موقعہ اور روداد کو بھی بیان
کر دیا ہے جہاں پر اس غزل کا انشاء واقع ہوا ہے یہ دیوان بجائے
خود ایک تاریخ قیس کی سوانح عمری معلوم ہوتی ہے گو کہ اس میں
شاعرانہ مذاق کو بہت دخل دیا گیا ہو۔ میں ان واقعات کو کلیتاً
اختیار نہ کرنے پر مجبور ہوا اس لئے کہ اکثر مضامین اس دیوان
میں ایسے ہیں جو ہمارے ملک نیز فارسی کے شاعرانہ مذاق کے بالکل
مخالف ہیں پھر بھی تاحدِ امکان اکثر واقعات اسی دیوان سے لئے ہیں"۔
اس بیان سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے اول یہ کہ قیس اور لیلیٰ کی
داستانِ عشق بالکل فرضی نہیں ہے جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے
دوسرے یہ کہ قیس شاعر بھی تھا جس کا دیوان موجود ہے تیسرے یہ کہ مرزا
رسوا نے اپنے ڈرامے میں جو واقعات بیان کئے ہیں وہ قیس کی زندگی

سے قریب تر ہیں۔

منشی دل لکھنوی کے ڈرامے میں تین ایکٹ اور بائیس سین ہیں انہوں نے اپنے ڈرامے پر کوئی دیباچہ نہیں لکھا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ ڈراما لکھنے کا ان کا مقصد کیا ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قصۂ لیلیٰ مجنوں کو انتہائی جذباتی انداز میں کر تبی اسٹیج کے ذریعہ پیش کیا جائے کہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کر سکے۔ ایک جگہ انہوں نے ضرور تنقیدی لہجہ اختیار کیا ہے کہ لڑکیوں کی شادی والدین اپنی مرضی سے کر دیتے ہیں حالانکہ لڑکی کی رضا لینا اسلام نے لازمی قرار دیا ہے اور بے زبان لڑکیاں اطاعتِ والدین کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیتی ہیں لیکن پورا ڈراما نہ تو اس مقصد سے لکھا گیا ہے اور نہ کوئی دوسرا مقصد ہی ظاہر ہوتا ہے۔ سوائے لیلیٰ مجنوں کے قصہ کو غیر معمولی جذباتی انداز میں پیش کرنے کے۔ —————— (باقی آئندہ)

بقیہ خانے نہ خانے ص ۳۹ سے آگے

کی بارش میں بھیگنے کے باوجود آپ مجھے ایک سرد تہ خانہ سمجھ سکتے ہیں۔

بظاہر یہ ایک فطری عمل تھا' تاہم جب میں نے اپنی دھندلی فضاؤں کی اسیر دُنیاؤں کا بالیک بین نگاہوں سے جائزہ لیا تو' دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے تاریکیے انت اندھے کنویں میں پھینکا گیا کوئی وجود سسک سسک کر مجھے آواز دے رہا ہے۔ —— لیکن میں کیا کر سکتی تھی —— مجبوراً مجھے اپنے کان بند کرنے ہی پڑتے' اور ایسا ہُوا بھی ——

پھر تو سسکیاں اُبھرتی ہی رہیں۔ اور میں بارشوں کا یہ ذائقہ مزا اپنی شریانوں میں اُتارتی رہی —— شور —— اور —— اندھیرا —— یہ سب کیا ہے مجھے کیا پتہ۔ سرد تہ خانے کا اندھیرا اور کسی اُمید کی کوئی کرن کچھ بھی تو اس کی گرفت میں نہیں ہے۔ سب کچھ احساس سے دُور ہے' بہت دُور ......!

✱

قمر جلال آبادی

غزل

یارب ترے کرم سے یہ سودا کریں گے ہم
دُنیا میں پی کے خُلد میں توبہ کریں گے ہم

یُوں رسمِ حسن و عشق کو بدلا کریں گے ہم
تم منتظر رہو گے نہ آیا کریں گے ہم

آئینے میں خود اپنا تماشا کریں گے ہم
یُوں بھی تو شبِ فراق گذارا کریں گے ہم

تُو باوفا ہے بس یہی سوچا کریں گے ہم
تجھ کو تری نگاہ سے دیکھا کریں گے ہم

فریاد ہم سے ہو گی نہ شکوہ کریں گے ہم
رُسوا ہُوئے ہیں آپ کو رُسوا کریں گے ہم

تُجھ کو بِٹھا کے دُور سے دیکھا کریں گے ہم
یُوں بھی ترے غرُور سے کھیلا کریں گے ہم

جا تُجھ سے بے نیاز ہوئے چھوڑا تیرا ذکر
تُو چاہے گا تو تیری تمنا کریں گے ہم

رُباعیات

ہر حادثہ اِک فکر کی دعوت لایا
ہر تجربہ اِک درسِ بصیرت لایا
ہر منظرِ نیرنگ حیاتِ گرداں
میرے لیے اشعار کی دولت لایا!

البیلا ہُوں، بانک پن کی دھج رکھتا ہُوں
ماتھے پہ سجی کلاہِ کج رکھتا ہُوں
شاعر ہُوں، نہیں فرض سے اپنے غافل
آوازِ حقیقت کی گونج رکھتا ہُوں

ہر دُکھ کو دوا سمجھ کے پی لے ساتھی!
مت چیخ، لبوں کو اپنے سی لے، ساتھی!
ہر موڑ پہ زندگی کے مرنا کیسا ؟
جینے کی طرح دہر میں جی لے، ساتھی!

شام آتے ہی کیا دِل پہ گزر جاتی ہے
اشکوں میں مرے آگ سی بھر جاتی ہے
کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا کچھ دیر
یہ کس کے تعاقب میں نظر جاتی ہے؟

افسانہ

ستیہ پال آنند

زِندگی موت اور بُڑھیا

زرد، جھُرّیوں بھرا چہرہ، پوپلا مُنہ، بغیر پلکوں کے بہتی ہوئی گندی آنکھیں، سفید، ہلکا پیلا رنگ لئے کھُلے بال۔ پھٹی پُرانی قمیض۔ ٹوٹی ہوئی جوتی۔ ٹیڑھی میڑھی ہاتھ کی لاٹھی۔

لیکن اس کے باوجود بڑھیا قیامت سے کم نہ تھی۔ میرے اپنے گھر کے پاس، دُلاری دائی کے دروازے کے باہر دیوار پر اُلٹا ہاتھ اور ہاتھ کی پُشت سے پیشانی ٹکائے دُلاری کی ساس دن بھر بیٹھی رہتی۔ صبح دفتر جاتے، شام دفتر سے لوٹتے، ایک بار نگاہ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنا میرا معمول سا بن گیا تھا۔ نوے برس کی عمر ـــ لوگ کہا کرتے ـــ خاوند کو مرے ہوئے ساٹھ برس ہو گئے۔ دو بیٹوں کو دوسری دُنیا میں گئے ہوئے تیس برس ہونے کو آئے۔ آخری بیٹا۔ دُلاری دائی کا خاوند، دس برس پہلے اپنی بیوی کی بدچلنی کی وجہ سے اُسے اور ماں کو چھوڑ کر کسی اور شہر چلا گیا۔

بُڑھیا پھر بھی جیتی ہے" ایک بار رام دیال کریانہ فروش نے کہا۔ "بابو جی نہ جانے کیوں جی رہی ہے۔ یہ بڑھیا! اسے تو مر جانا چاہیئے تھا۔ کچھوے کی عمر بھوگ رہی ہے۔ کون ہے اب اس کا؟ خاوند مر گیا۔ بیٹے گئے ـــ دُلاری دُور سے دُتکارتی ہے۔ روٹی تک تو محلے والوں سے مانگ کر کھاتی ہے۔ دو قدم چل نہیں سکتی، چار چار گھنٹے نالی پر بیٹھی گندگی پھیلاتی رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں جی رہی ہے یہ بڑھیا!"

رام دیال نے کہا۔ دینا ناتھ نے کہا۔ پھر ایک بار کرشن لال بزاز نے بھی یہی بات کہی۔ "کتنی گندی ہے صاحب۔ آپ نے تو سکوٹر چلایا اور دفتر چلے گئے۔ میں کبھی کبھی دن بھر گھر میں ہوتا ہوں۔ سر اُٹھانے کی تو جسم میں سکت نہیں۔ لیکن زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ اللہ ننگی سی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی رہتی ہے۔ میری بہو نے کپڑے پہن کر بیٹھنے کو کہا تو بیچاری کی شامت آ گئی۔ میری تو سات پشتوں کو گالی بکتی رہی۔ کیا کیا جائے؟ دُلاری سے کوئی گلہ کرے بھی تو کیا؟ اسے تو خود یہ چین نہیں لینے دیتی۔"

صبح دفتر جاتے، شام کو دفتر سے واپس آتے۔ بڑھیا پر نگاہ پڑتی۔ دھرتی کا بوجھ ہے، دِل کہتا۔ اب سچ مچ اسے مر جانا چاہیئے۔ ایسے اگر کوئی کہے کہ یہ کسی اور کی آئی موت مر جائے تو یہ کتنی خوش ہو۔ موت اس کے لئے نجات ہے۔ زندگی تو ایک بھاری بوجھ ہے جو اسے اُٹھانا پڑ رہا ہے ـــ ایک ایک سانس کے لئے کتنی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے اسے! ایک ایک دن کیسے گذرتا ہے اس کا؟ صبح کٹورہ لئے چلتی مانگنے۔ چیونٹی کی چال سے

چلتے ہوئے میرے گھر آ رہا ہے تو شام کو روٹی اور دال کی کٹوری کے لئے رام دیال کی چوکھٹ پر ہے۔ بیٹا ماں کی قینچی سی زبان اور بیوی کی بد سلوکی سے تنگ آ کر بھاگ گیا ہے۔ نہ معلوم زندہ بھی ہے یا نہیں۔ یہ کس کے لئے زندہ ہے؟ آخر میں اس سوچ میں مگن رہتا۔ رات کو پڑھنے میں مصروف ہوتا تو دُور سے بڑھیا کی کانپتی ہوئی لیکن آرے کی طرح تیز آواز سنائی دیتی۔ بڑھیا دُلاری اور اس کے کسی گاہک کو گالیوں پر گالیاں سُنا رہی ہوتی ـــ پھٹکار بھی دیتی تو سات پُشتوں تک کو......

"ارے کنجری تیری یہ کرتوتیں؟ میرا بیٹا کھا گئی! تیرے یہ لچھن!" پڑھنے سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی۔ بڑھیا ہے یا قیامت! نوّے برس کی ہونے کو آئی۔ اسے کسی کی آئی کیوں نہیں آ جاتی! یہ مر کیوں نہیں جاتی!

اچارج گھرانا۔ ایک نہیں۔ محلے میں دس اچارج گھرانے ہیں۔

اچارج، جن میں مُردے کا کفن تک دان میں لینا روا ہوتا ہے۔ جن کا کسی کے گھر آنا تو درکنار، گھر کے سامنے سے گزرنا بھی منحوس سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنے گھروں میں اپنی چارپائیاں اکثر اُلٹے رُخ کھڑی کئے رکھتے ہیں تاکہ شہر میں موتیں زیادہ ہوں۔ بیماری پھیلے، آگ لگے۔ کریا کرم زیادہ ہوں اور دان زیادہ سے زیادہ ملے۔ تقسیم وطن کے بعد جب ہم اس شہر میں نئے نئے آئے تو کسی کو بھی اپنے نئے پڑوسیوں کے بارے میں علم نہیں تھا کہ کون کہاں سے آیا ہے۔ کیا کام کرتا ہے۔ کس قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے جب کچھ مہینوں کے بعد شریمتی جی نے بتایا کہ ہمارا گھر چاروں طرف سے اچارج لوگوں کے گھروں سے گھرا ہوا ہے اور یہ ہر نئی صبح مرنے والوں کے گھروں سے کریا کرم کی نئی چارپائیاں، رضائیاں اور دیگر سامان لئے آتے دیکھے جاتے ہیں تو بڑا افسوس ہوا۔ مکان الاٹ ہوا بھی تو کہاں! لیکن پھر سوچا کیا فرق پڑتا ہے! دوستی، تعلق اور ملت تو بنانے سے ہی بنتے ہیں۔ ہم اپنے کام سے کام رکھیں گے۔ انہیں بُلائیں گے نہیں۔ دس برس گزر گئے۔ اچارج لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ خوش یا ناراض رہتے۔ ہمیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس مدت میں اُن کی لڑکیاں، لڑکے جوان ہو کر بیاہے گئے۔ جو بچے تھے وہ بڑے ہو گئے لیکن سماجی طور پر ہم اُن سے دُور ہی رہے......

اچارج گھرانا ـــــــ دُلاری کا خاوند شہر چھوڑ کر چلا گیا تو اس کا دھندہ چمک اُٹھا۔ اس کی برادری میں سب لوگ اُس کے لچھن جانتے تھے۔ اس لئے وہ خاموشی سے برادری سے خارج کر دی گئی۔ اب شمشان پر اُس کی باری نہ رکھی جاتی لیکن اُس کی ساس بدستور برادری والوں شمشان سے ملنے والے دان میں برابر کی حصہ دار تھی۔ ہر پندرہ دنوں کے بعد اُس کی باری کا آیا ہوا کریا کرم کا سب سامان اُسے ملتا تو دکاندار لوگ خود آ کر نقد قیمت ادا کر کے اونے پونے داموں میں خرید کر لے جاتے اور بڑھیا نوٹ اپنی پوٹلی میں باندھتی دیکھی جاتی۔ رشتے کا ایک بھتیجا ہی یہ کام بخوبی نپٹا دیتا۔ اُس کے پاس ازار بند سے بندھے ہوئے سو ڈیڑھ سو روپے بھی رہتے اور کانوں کی بالیاں بھی تھیں۔ اپنی بہو دلاری سے وہ برابر کی ٹکر لیتی۔ ایک ایک کی چار چار سُناتی۔ لیکن اپنے سب سے چھوٹے پوتے سے وہ بہت پیار کرتی۔ دس بارہ برس کا لڑکا، جس میں دُنیا کے سب عیب تھے۔ دادی سے ہمیشہ بے رُخی سے پیش آتا۔ پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن بڑھیا پھر بھی اُسے چار آٹھ آنے خرچ کے لئے دے دیتی۔

ایک دن دفتر سے لوٹتے ہوئے بڑھیا کو چوکھٹ پر نہ پایا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بڑھیا سامنے دالان میں پیڑھی پر بیٹھی اپنی تیز قینچی سی [illegible] شریمتی جی سے باتیں کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے میلے کپڑے میں کچھ باندھ رہی تھی۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ اس سے پہلے روٹی سالن یا چائے کے لئے آتی بھی تو دروازے پر ہی بیٹھ کر آواز دے دیتی۔ میں اندر گیا۔ کپڑے بدلے۔ شریمتی جی آئیں تو انہوں نے اپنے آپ ہی کہا:۔

"بے چاری کو میرٹھ سے اپنے بیٹے کی چٹھی آئی ہے۔ وہ وہاں بیمار ہے۔ مجھ سے خط لکھوانے آئی تھی۔ میں نے کچھ آٹا وغیرہ بھی دے دیا ہے۔"

دن گزرتے گئے۔ اب میں اکثر اُسے اپنے گھر پر بیٹھے دیکھتا۔ شریمتی جی بھی اب اُس کے ساتھ فراخدلی سے پیش آتیں۔ آٹا دیتیں، کبھی کبھی کٹوری بھر دے دیتیں۔ اپنے پُرانے کپڑے دے کر اُسے تن ڈھانپنا سکھا دیا۔ چائے بنا کر لوٹے میں اُس کے سامنے رکھتیں۔ کبھی کبھی نقد پیسے بھی دے دیتیں۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی۔ اپنی ہتھ لٹھیا پر ہاتھ کی پشت سے سر ٹکائے، کتر کتر باتیں کئے جاتی۔ اُس کے اِدھر آنے کی وجہ سے ایک دو بار دُلاری بھی اُس کی غیر حاضری میں اِدھر آئی تاکہ شریمتی جی اُس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کر لیں۔ گھر پہنچتا تو کبھی کبھی یہ دلچسپ باتیں سُننے کو ملتیں۔

ایک دن معلوم ہوا کہ دلاری کا چھوٹا لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے اور دادی کی صندوقچی سے پچاس روپئے بھی نکال کر لے گیا ہے۔ اگرچہ وہ خود بڑھیا کا چہیتا تھا اور وہ اُس کی زیادتیوں کو بھی برداشت کر لیتی تھی، تو بھی آج

صبح سے گالیاں بک رہی ہے۔ نہ کچھ کھایا ہے، نہ پیا ہے۔ لیکن دن ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ آخر شریمتی جی اور دیگر کچھ عورتوں نے چندہ اکٹھا کر کے روپے پورے کر دئے تو گلی میں امن ہوا۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ دُلاری کے کان سے گرا ہوا ایک کانٹا گم ہو گیا ہے اور وہ اپنی ساس پر چوری کا الزام لگا رہی ہے لیکن بڑھیا کسی کو بھی اپنا بکس کھول کر نہیں دیکھنے دیتی اور دُلاری کی ایک گالی کا جواب دس گالیوں سے دیتی ہے۔

کئی دنوں تک ہنگامہ رہا۔ اور جب تک کہ دُلاری کو اپنے کانٹے کا ٹوٹا ہوا حصہ چارپائی کی پائینتی میں اٹکا ہوا نہ ملا، خاموشی نہ ہوئی۔ ہر دوسرے دن ایک نہ ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ کبھی دُلاری بڑھیا پر ہاتھ اٹھا بیٹھتی تو وہ چیخ چیخ کر آدھا شہر اکٹھا کر لیتی۔ محلے والوں کا چین حرام ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر ہاتھا پائی اور چھینا جھپٹی میں بڑھیا کی بائیں کلائی ٹوٹ گئی۔ پھر جو ہنگامہ ہوا تو پورے پندرہ دنوں کے بعد چین ملا۔ بڑھیا کا ایک ہاتھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا۔ وہ اس پر میلی کچیلی پٹی باندھے رکھتی۔ سینک کرتی رہتی۔ ہلدی اور گھی کی مالش کرتی رہتی۔

بڑھیا میں ... شریمتی جی کی یہ دلچسپی آخر رنگ لائی اور گھر سے چھوٹی موٹی چیزیں گم ہونے لگیں۔ پہلے چمچے اور کٹوریاں گم ہو گئیں۔ پھر ایک دن چاندی کا گلاس چوری ہو گیا۔ ہزار بار کہا کہ بڑھیا کی ہی کارستانی ہے۔ دُلاری نے تو ایک چمچہ بھی بڑھیا کے کپڑوں سے نکال کر لا کر دکھا دیا۔ لیکن شریمتی جی نہ مانتیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نوکر بدلا گیا۔ بڑھیا اپنے بارے میں چونکہ میری رائے اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس لئے میرے سامنے کم ہی آتی۔ لیکن میری غیر حاضری میں وہ گھنٹوں بیٹھی شریمتی جی کی کرسی یا پلنگ کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھی رہتی۔ چپ رہنا اُس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس لئے میں حیران تھا کہ شریمتی جی اُس کی باتیں کیسے سُن لیتی ہیں۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام کو آیا تو دیکھا بڑھیا گھر کے سامنے مٹی میں بیٹھی تھی۔ دُلاری کے گھر رونا دھونا ہو رہا تھا۔ بدری بھی ہوئی تھی۔ اچانک برادری کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑھیا کھو کھلی آنکھوں سے دور دیکھ رہی تھی اور بار بار سر پٹک رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کا بیٹا، دُلاری کا خاوند مر گیا ہے۔ پُرانا افیونی تھا۔ ایک دن زیادہ کھا لی اور صبح مُردہ پایا گیا۔ میرٹھ سے تار آنے پر معلوم ہوا ہے۔

بیٹے کی موت کے بعد بڑھیا کی حالت زیادہ دگرگوں ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ایک آخری مقصد بھی ختم ہو گیا ہو جیسے اُس کے جینے کا اب کوئی جواز نہ ہو۔ اُس کا بھتیجا اب شمشان سے حاصل ہونے والا سامان خود ہی ہڑپ جاتا۔ وہ اُسے ہزار ہزار گالیاں سناتی۔ لیکن اب بے بس تھی۔ اُس کا چہرہ اور سکڑ گیا۔ جھریاں زیادہ گہری ہو گئیں۔ کمر کمان کی طرح جھک گئی۔ طاقت بالکل جواب دے گئی۔ مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچہ سا رہ گئی۔ البتہ کبھی ہمارے گھر آتی تو پہلے کی طرح لاٹھی ٹیکتی، چیونٹی کی چال سے چلتی ہوئی آتی۔ آدھ گھنٹہ، گھنٹہ بیٹھتی۔ مطلب کی بات کرتی۔ چیز لیتی اور چلی جاتی۔ دُلاری اب بے خوف و خطر کھلے عام اپنا دھندہ کرنے لگی تھی! اس لئے بڑھیا اپنی سبھی مجبوریوں اور کمزوریوں کے باوجود انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اپنے طعن و ملامت کے فقرے اور زیادہ تیز کر دیتی۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں اتنی آگ کیسے بھری پڑی ہے۔ اتنا شر کہاں سے آیا ہے؟

گھر میں بات ہوتی تو کہتا۔ "دھرتی کا بوجھ ہے۔ یہ مر کیوں نہیں جاتی؟ اس زندگی سے کیا موت بہتر نہیں؟"

اور شریمتی جی گہرے فلسفیانہ انداز سے سر ہلاتیں ـــــ "ہاں بڑھیا کا اب کون ہے؟ بیٹا بھی مر گیا۔ دو پوتے ہیں ..... بڑا تو پاگلوں کی طرح سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ البتہ ایک چھوٹا ہے۔ چار بار گھر سے بھاگ چکا ہے ـــــ دلدی کو کبھی کبھی پیٹتا بھی ہے لیکن مرنے کو کس کا جی چاہتا ہے؟"

انفلوئنزا پھیلا تو سارا شہر ہی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑھیا گندگی سے لت پت رہتی تھی۔ ایک دن صبح معلوم ہوا کہ بخار میں بے ہوش پڑی ہے۔ ساتھ ہی نہ معلوم کیا کھا لیا ہے۔ ہیضے کی سی حالت ہے۔ اُس دن تو میں نے بھی ذرا سخت الفاظ میں اپنی بیوی کو اُس کے قریب جانے سے روکا۔ "اب بڑھیا مر جائے گی!" سبھی کی رائے تھی۔ ایک دن اور گزرا تو بیہوش بڑھیا کو کیمپ ہسپتال میں لے جانے کے لئے میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ ناک پر کپڑا چڑھائے میونسپلٹی کے دو خاکروبوں نے اُسے اٹھا کر گاڑی میں لٹایا۔ گندگی سے لت پت نیم برہنگی کی حالت میں بیہوش بڑھیا کو لئے ہوئے میونسپلٹی کی گاڑی جب گلی سے نکل گئی تو جیسے سب میں جان پڑ گئی ـــــ جیسے

بڑھیا کا جنازہ اُٹھ گیا ہو۔ دُلاری نے سبھی چین کا سانس لیا اور وہ اُس رات کافی دیر تک بڑھیا کی کوٹھڑی میں کچھ تلاش کرتی دکھی گئی۔ اُس کا چھوٹا بیٹا۔ بڑھیا کا بیہودہ پوتا اُس کے ساتھ لالٹین لئے ہوئے تھا۔

دو دن کے بعد دُلاری کا چھوٹا بیٹا بھی بیمار پڑ گیا۔ لیکن اُسی شام ہیوسپیلٹی والے بڑھیا کو واپس چھوڑ گئے۔ مَیں نے دیکھا۔ وہ اُسی طرح سے دیوار کے ساتھ پیشانی ٹکائے آنکھیں بند کئے دُلاری کے دروازے پر بیٹھی ہے۔ اس کے کپڑے زیادہ پھٹے ہوئے ہیں۔ اب اس میں زندگی کی ایک معمولی سی رمق ہے۔ ایک کمزور سا دھاگا ہے۔ جو نہ معلوم کب ٹوٹ جائے۔ دُلاری کی گالیوں کا جواب بھی اب اس کے پاس نہیں رہ گیا ہے۔ گردن کی کمزور رگیں پھول جاتی ہیں آنکھیں باہر نکل آئی ہیں۔ لیکن جئے جا رہی ہے۔ "امریکہ میں تو ڈاکٹر لوگ ایسے مریضوں کے خود اصرار کرنے پر انہیں زہر کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔" امریکہ سے لوٹ کر آئے نیتر صاحب نے اُس کے بارے میں کہا۔ وہ اُنہی دِنوں گلی کے دوسرے موڑ پر نئے بنے ہوئے مکان میں آئے تھے۔

دُلاری کا چھوٹا لڑکا اتنا سخت بیمار ہُوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑھیا کو اس لڑکے سے بہت محبت تھی سبھی جانتے تھے۔ مَیں نے بھی جاتے ہوئے از راہِ ہمدردی پُوچھ لیا۔ "مائی، لڑکے کا کیا حال ہے؟" بڑھیا نے بے نُور آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس میں شاید پہچاننے کی حِس بھی نہیں رہی تھی۔ بولی "بڑا بے آرام ہے۔ ساری رات تڑپتا رہا ہے۔ میرے رام، تو بچے کو سُکھ دے!"

مَیں چلا گیا۔ کام سے لوٹا تو معلوم ہُوا کہ لڑکے کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ بارہ تیرہ برس کا کھیلتا کُودتا بچہ۔ انفلوئنزا ہُوا اور ایسا ہُوا کہ رات دس بجے کے قریب اُس کی موت ہو گئی۔

دُلاری کے گھر میں کُہرام مچا تو میں بھی گیا۔ بڑھیا اُسی طرح دروازے سے سر ٹکائے، خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ اونچا رونے، چھاتی پیٹنے اور ماتم کرنے کی طاقت اس میں نہیں تھی۔ بیماری نے رہی سہی طاقت بھی نچوڑ لی تھی۔

مجھے جاتے دیکھ کر رام دیال اور کرشن لال وغیرہ لوگ بھی آ گئے۔

"بڑھیا بیچاری..." کرشن لال نے کہا۔ "یہ دن بھی اسے دیکھنا تھا۔ کاش اس معصوم بچے کی جگہ یہی مر جاتی۔"

بڑھیا نے شاید بات سُن لی۔ اُس نے دیوار سے سر اُٹھایا۔ لاٹھی کا سہارا لے کر ہزار دِقتوں سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ہمارے سامنے آئی۔ بے نُور آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ مَیں نے سمجھا اب وہ لاٹھی چھوڑ کر گر پڑے گی۔ سر پٹک پٹک کر رو دے گی۔ موت کے لئے گڑگڑائے گی۔ لیکن اُس نے اپنا پوپلا مُنہ کھولا اور پھر ہم پر گالیوں کی بوچھار شروع کر دی۔ "مریں تمہارے ہوتے سوتے! مریں تمہارے گھر والے۔ مجھے کہتے ہیں۔ مَیں مر جاتی!"

مجھے اندر موت کے کُہرام اور باہر زندگی کے کُہرام میں فرق سمجھنا مشکل ہو گیا۔

✻

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین، پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد سے "تعمیر ہریانہ" کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنے ادب نواز دوستوں سے ایک بار پھر درخواست کرنا ہے کہ وہ خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ پرچے کی خریداری کے لئے ایجنسیاں قائم کرنے کے لئے بھی ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

— ادارہ

طلعت عرفانی

غزلیں



سمندر کا پانی تو نمکین ہے
ندی کن خیالوں میں غمگین ہے

یہاں ریت پر لوگ لکھتے ہیں نام
یہ ماحول کس درجہ رنگین ہے

خدا جس کو رکھے وہ مرتا نہیں
مگر یہ تو دشمن کی توہین ہے

گزرتا ہوں جاں سے کہ کچھ تو کہے
تری لب کشائی میرا دین ہے

خدا کا تو خائف ہے طلعت مگر
سنا ہے کہ مذہب کا بے دین ہے

گر آسماں کو ضد ہے کہ مٹی میں دم نہیں
جوشِ نمو کو نالۂ شبنم بھی کم نہیں

سب کارواں کے لوگ بگولوں میں جا ملے
صحرا میں اب تو ایک بھی نقشِ قدم نہیں

تم جانو سر پھرا بھی ہوں ضدی بھی ہوں مگر
توڑی تمہارے پیار کی میں نے قسم نہیں

لو مہرِ تاب دار کا چہرہ تو بجھ گیا
ہوتے ہمارے ہاتھ بھی کیونکر قلم نہیں

طلعت! بدن بدن میں ہیں زخموں کے خلفشار
اس پر بھی ہم کو آگہیِ امکاں بہم نہیں

افسانہ

ہیرانند سوز

روشنی

شہر کے اس پسماندہ علاقے میں گندے نالے کے پاس والی نیم آباد گلی کے پرے پر سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے اس زنگ آلود کھمبے کی طرف نہ جانے کیوں وہاں کے لوگوں کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ ایک مدت سے اس کی ٹیوب لائٹ خراب تھی جس کی وجہ سے اس تنگ گلی میں ہمیشہ اندھیرا رہتا تھا۔ یوں تو اس کھمبے کے آس پاس کے دوسرے پولوں کی بتیاں روشن رہتیں مگر گلی کا زاویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ان بتیوں کی روشنی گلی کے اندر تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

میں رات کو دکان سے لوٹتے وقت جب بھی چھوٹا راستہ اختیار کرنے کی نیت سے اس گلی میں سے گزرتا تو مجھے وہاں عجیب قسم کے اندھیرے کا احساس ہوتا۔ قبرستان جیسا اداس اداس پُرسکون اندھیرا۔ گلی کے دونوں طرف آدھے سے زیادہ گھر آباد تھے مگر آج تک کسی نے کارپوریشن یا محکمۂ بجلی کو شکایت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ وہ یا تو اپنے اندر کی روشنی پر قناعت کیے بیٹھے تھے۔ یا پھر ان کے گھروں کا اندھیرا ہی اتنا مستقل تھا کہ وہ روشنی کی برکتوں کا تصور ہی کھو چکے تھے لیکن پھر ایک دن یوں ہوا کہ اس کھمبے پر اچانک ایک نئی ٹیوب جگمگاتی دکھائی دی۔ میں اس رات دکان سے لوٹا تو گلی میں خاصی روشنی تھی۔ گلی کے بچے گھروں سے باہر نکل کر اس روشنی میں اچھل کود کر رہے تھے۔ خوشیاں منا رہے تھے۔ میں اس گلی میں سے گزرتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ ممکن ہے گلی والوں نے ہی وہاں روشنی کی عدم موجودگی کے بارے میں شکایت کی ہو۔ یا کسی لیڈر نے اپنی مقبولیت کے تحفظ کی خاطر کارپوریشن سے خراب ٹیوبیں بدلنے کے لئے کہہ دیا ہو۔ بجلی والوں کو اس کا خیال اپنے آپ بھی آسکتا تھا اور یہ بات بھی بعید از قیاس نہ تھی کہ یہ نیک کام کسی دیالو مہاپرش نے اپنی طرف سے ہی سرانجام دے دیا ہو۔ بہرحال یہ ایک اچھا قدم تھا۔ گلی اور سڑک دونوں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ یہ روشنی میرے علاوہ اب اور بھی بہت سوں کو راستہ دکھانے لگی تھی۔ اور لوگ گلی کے اوبڑ کھابڑ فرش پر ٹھوکر کھانے اور گندی نالیوں میں گرنے سے بچ جاتے تھے۔ اس روشنی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ گلی کے وہ لوگ جن کے گھروں میں بجلی نہیں تھی۔ گاہے گاہے اس روشنی سے استفادہ کرنے لگے تھے۔ کبھی کوئی غریب طالب علم بجلی کے اس پول کے نیچے پڑھتا دکھائی دیتا اور کبھی اپنے نیم روشن گھر کی گھٹن سے گھبرایا ہوا کوئی بزرگ اپنے کسی پوتے یا پوتی کو اس پول کے نیچے لا کر اپنی انگلی سے ٹیوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا "بچو! وہ دیکھو! روشنی۔!" غرضیکہ گلی والوں کے چہروں پر اب اس روشنی سے اطمینان کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہاں ایک نیا

تماشہ شروع ہو گیا۔

ایک شام جب میں دکان سے لوٹ رہا تھا تو مجھے وہاں ایک پاگل اس کھمبے کے بالکل پاس کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے کھمبے کے آس پاس کچھ پتھر جمع کر رکھے تھے۔ ٹیوب لائٹ جہاں وہ کھڑا تھا اس کی دوسری طرف فٹ تھی۔ اس کے چہرے کی وحشت اور ہونٹوں کے کناروں پر پھیلی جھاگ سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس وقت سخت ہذیانی کیفیت میں ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک پتھر کو زور سے کھمبے پر مارتا اور جونہی کھمبے سے ٹن کی آواز پیدا ہوتی وہ وحشی نگاہوں سے ٹیوب کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔ "روشنی اِدھر۔۔۔!"

اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر اس کی ہتھیلی کی جسامت سے بڑا تھا۔ ایک بار ہاتھ بیدھا نہ پڑنے کی وجہ سے وہ پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اسی کے پاؤں پر گر پڑا مگر اس نے چوٹ کی پرواہ کئے بغیر وہی پتھر پھر اُٹھا لیا اور اب دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے پھر زور زور سے کھمبے پر مارنے لگا اور چلاّ چلاّ کر کہتا رہا۔

"روشنی اِدھر۔۔۔۔ روشنی اِدھر۔۔۔۔"

مسلسل چوٹیں مارتے رہنے سے اس کے ہاتھ زخمی ہو رہے تھے اُس کی جنونی کیفیت شاید اُسے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس کی حرکات سے کبھی کبھی یہ بھی اندازہ ہوتا کہ وہ ٹیوب کا رُخ بدلنے کے لیے پول پر چڑھنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی عقل کا کوئی گوشہ اُسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اس کے جنونی دماغ میں یہ احساس شاید کہیں موجود تھا کہ روشنی تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس نہ تو طاقت ہے اور نہ ہی شعور۔ پول کے درمیان چار پانچ چکروں میں لپٹا ہُوا خاردار تار ہی شاید اُسے راستے کی مشکلات کا احساس دِلاتا تھا۔ اس کے پاس کچھ چھوٹے پتھر بھی پڑے تھے مگر وہ انہیں ٹیوب لائٹ کی طرف نہیں پھینکتا تھا۔ بس صرف کھمبے پر ہی پتھر مار مار کر اپنی بات دُہرائے جا رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا بھی لگا کہ وہ اپنی بات کھمبے کو نہیں بلکہ راہ چلتے لوگوں کو سُنا رہا ہے۔ پتھر کی ہر چوٹ پر جونہی کھمبے سے ٹن کی آواز نکلتی۔ وہ پہلے ایک نظر سڑک کی طرف دیکھتا پھر ٹیوب کی طرف منہ اُٹھا کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگتا۔

"روشنی اِدھر۔۔۔ روشنی اِدھر۔۔۔!"

شام کو گھر لوٹتے ہوئے جب مجھے روزانہ یہ تماشہ نظر آنے لگا تو میرے نزدیک اس کی اہمیت کم ہو گئی اور میں اُسے نظر انداز کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھیک حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ اِدھر مبذول ہو۔

لیکن پھر ایک دِن میری حیرانی کی حد نہ رہی جب میں نے ایسے ہی ایک اور پاگل کو اس کے پاس کھڑے پایا۔ وہ بھی اُسی طرح ایک بڑا سا پتھر ہاتھ میں لئے بار بار اسی کھمبے پر مار رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔

"روشنی اِدھر۔۔۔۔ روشنی اِدھر۔۔۔!"

کھمبے پر اب جگہ جگہ چوٹوں کے نشان تھے مگر ٹیوب بدستور جل رہی تھی۔ وہ نیا پاگل بھی نہ تو پول پر چڑھنے کی جرأت کر رہا تھا، اور نہ ہی ٹیوب پر پتھر پھینکتا تھا۔ ہاتھ اس کے بھی چھِل رہے تھے۔ مگر پہلے پاگل کے ہاتھ کچھ زیادہ زخمی تھے۔ اب انہیں دیکھنے کے لئے کچھ لوگ بھی رُکنے لگے تھے۔ کچھ باتیں بھی ہوتیں اور کچھ قیاس آرائیاں بھی۔ پھر ہر شخص زندگی کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھ جاتا مگر وہ دونوں پاگل مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔

مَیں اپنے ذہن میں اُن پاگلوں کی حالتِ زار کا بوجھ لئے اپنے گھر کی طرف چل پڑا مگر دِل میں کہیں یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ جلد ہی تھک کر بیٹھ جائیں گے۔ یا کوئی پولیس والا انہیں پاگل خانے پہنچا دے گا۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اگلے دِن میں نے کل شام والے منظر سے بھی زیادہ خطرناک سین دکھائی دیا۔ کھمبے کے پاس اب تین پاگل موجود تھے اور اُن تینوں کے ہاتھوں میں پتھر تھے جن سے اب وہ کھمبے پر تین اطراف سے ضربیں لگا رہے تھے۔ ٹیوب لائٹ حالانکہ اس وقت بُجھی ہوئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اس سے مخاطب ہو کر تینوں سمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاّئے جا رہے تھے۔

"روشنی اِدھر۔۔۔ روشنی اِدھر۔۔۔ روشنی اِدھر۔۔۔!"

لوگ اب وہاں زیادہ دیر رُکنے لگے تھے۔ گفتگو اور قیاس آرائیوں نے اب بحث کا رنگ اختیار کر لیا تھا، کہیں کہیں سرگوشیاں بھی ہو رہی تھیں جو بہت جلد بلند آواز دلائل میں بدل جاتیں۔ پھر اچانک ایک اور پاگل بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے اُس کھمبے کی طرف لپکا اور پاس پڑے ہوئے پتھر کو اُٹھا کر پوری طاقت کے ساتھ کھمبے پر چوٹیں مارتے ہوا زور زور سے چلّانے لگا۔

"روشنی گُل..... لائٹ کی چُھٹی..... روشنی گُل۔ لائٹ کی چُھٹی.....!"

مجمع آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اپنے کام پر جاتے ہوئے کچھ لوگ بھی اب وہاں رُکنے لگے تھے اور کچھ راستہ بدل کر نکل رہے تھے۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ اور سراسیمہ سا اپنی دُکان کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن شام کو گھر لوٹتے ہوئے جب میں پھر اس گلی کے پاس سے گزرا تو صورتِ حال اس وقت نیا اور بھیانک رُوپ اختیار کر چکی تھی۔ اب وہاں چاروں طرف پاگلوں کی بھیڑ تھی۔ سب کے ہاتھوں میں پتھر تھے جنہیں وہ بے تحاشہ کھمبے کی طرف پھینک رہے تھے۔ اُن کے کف آلود مُنہ سے نکلے ہوئے جُملوں نے ایک بے ہنگم شور کی شکل اختیار کر رکھی تھی جس کا مفہوم کسی طرح بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ان کے تمام پتھر اب کھمبے پر لگنے کی بجائے خود انہیں کے سروں پر پڑ رہے تھے۔ کئیوں کے سر لہولہان تھے۔ کچھ لوگ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ گلی میں سے بچوں اور عورتوں کی چیخیں سُنائی دے رہی تھیں۔ ٹیوب اُس وقت آن تھی اور سب کے سروں پر جگمگا رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کون سی روشنی کو ادھر اُدھر کرنا چاہتے ہیں۔ روشنی کا منبع تو یہاں سے دُور کسی پاور ہاؤس میں ہے جس کا شاید ان لوگوں کو علم ہی نہیں۔ نُور کا ایک ہی تو بھنڈار ہے جو اس کھمبے کے علاوہ باقی ٹیوبوں میں بھی روشنی پہنچا رہا ہے۔ یہ لوگ روشنی کے اس ماخذ کو نظر انداز کر کے نہ جانے کیوں اس ٹیوب کی روشنی اپنی طرف سمیٹنے کے درپے ہیں۔

میں نے اس سوال کا جواب پانے کے لئے اُس شخص کو تلاش کرنا چاہا جس نے پہلے پہل روشنی کے اس رُخ کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ وہ مجھے دُور ایک بہت اُونچی عمارت کی اوٹ میں کھڑا دکھائی دیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں نہ تو وحشت تھی اور نہ ہی چہرے پر خشونت۔ اس کے ہاتھوں پر اب زخموں کے نشان بھی نہیں تھے۔

قاری محمد اسحاق حافظؔ سہارنپوری

غزل

انوارِ حُسنِ دوست نے جادُو جگا دیا
میری نظر پہ جلوؤں کا پردہ گرا دیا

دُنیا کو اُس نے دولتِ کونین بخش دی
دل پر ہمارے نقشِ تمنّا بنا دیا

وُہ خوش ہُوئے تو نکہتیں ہر سُو بکھیر دیں
برہم ہُوئے تو ہر طرف محشر اُٹھا دیا

رخصت ہمارے گھر سے ہُوئی ظُلمتِ فراق
داغِ اَلَم نے خانۂ دِل جگمگا دیا

حافظؔ عمل سے بڑھ کے نہیں راہبر کوئی
ہم کو ہمارے دِل نے یہی مشورا دیا

کمزوریاں

جس طرح ہم کچھ چیزوں سے الرجک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کچھ چیزوں سے مانوس اور قریب ہو جاتے ہیں۔ گویا دوریاں الرجک اور انسیت کمزوریاں بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس جہان میں کمزوریاں رنگینیاں لانے کا سبب بن گئی ہیں۔ قوموں اور ملتوں کی کمزوریاں تو سب پر عیاں ہیں اور ان کا ذکر بے کار ہے۔ ہاں فرد اور بالخصوص اپنے گرد و پیش کے افراد کی کمزوریاں ملاحظہ ہوں۔

یوں تو حضرت آدم سے لے کر اب تک انسان کسی نہ کسی کمزوری میں مبتلا ہے۔ بلکہ اُسے یہ خوش فہمی بھی ہے کہ اگر اس میں کوئی کمزوری نہ ہوتی تو پھر فرشتہ ہوتا۔

آیئے ہم اپنے چند منتخب دوستوں کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں۔

شوکت عالم خاندانی رئیس ہونے کے باوجود دوسروں کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ جہاں کہیں بیٹھے ہوں ان کے شریر ہاتھ خاموش نہیں رہتے۔ یوں کہیے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھتے بلکہ بہت ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ دوستوں، شناساؤں اور عزیزوں کی چیزوں سے لدے پھندے گھر واپس آتے ہیں۔ مکانات قریب ہوں یا دور ان کو فاصلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ یاروں نے کتنی دُور دراز ہیں بستیاں۔ کہہ کر ٹال بھی جاتے ہیں۔ چونکہ ہم سب ان کی کمزوری سے واقف ہیں اس لئے ان کے دستک دیتے ہی ایک ہاتھی کا بہانہ کر کے ہم خود گھر کی صفائی شروع کر دیتے ہیں۔ اور منٹوں میں ہمارا دیوان خانہ ویران خانہ ہو جاتا ہے اور ہم اسماعیل وردی صحرا میں اونٹ کی طرح کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اس خاندانی رئیس سوسائٹی کے باوجود ہماری چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری کے سبب شوکت عالم کا گھر نادرات عالم سے بھر گیا ہے۔ اس لئے ہم ان کے گھر کو عجائب گھر کہتے ہیں۔ تب دیکھئے یہاں کونشان سے مال مسروقہ کی برآمد شدہ تاریخ۔ ساعت اور مقام بتاتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں عشائیہ کے بعد یہ چیز ہاتھ لگی۔ فلاں صاحب کے یہاں چائے کے بعد یہ چیز ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی مجبوراً لینا پڑا۔ فلاں کے یہاں اس چیز پر نظر جمی تو اٹھا لائے۔ چوری اور سینہ زوری۔ شاید اسی کو کہتے ہیں۔

دوسروں کی چیزوں کو چھپا لینا باعث زحمت ہو تو ہو لیکن شوکت عالم کے لئے یہ کمزوری باعث نعمت ثابت ہوئی۔ یعنی کہ پیرس سے واپسی پر وہ حسب کمزوری بے شمار مال مسروقہ و متروکہ کے علاوہ ایک عدد میم بھی ساتھ لائے۔ واپسی پر بڑی دھوم دھام سے شادی کر لی کہ اب دھوم دھام سے شادی کر کے ہمارے معاشرے کی کمزوری بن

گئی ہے۔ خواتین کا اپنی انہی کمزوریوں سے مجبور ہو کر شادی کی رسومات ادا کرنا۔ بیچاری فرانسیسی گڑیا کو بھی نئی رسومات سے گزرنا پڑا۔ بادلِ ناخواستہ ساڑھی زیورات پہننے پڑے۔ زبردستی مہندی لگوائی گئی۔ بعد میں وہ اِس حِنایا لجبیر پر خوش خوش تھیں۔

شادی کے چند دنوں کے بعد بدیسی بیوی بھی اُن ہی کمزوریوں کا شکار ہو گئی جن سے ہماری خواتین دوچار ہیں یعنی شوہر کے آتے ہی ساس اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف شکایات کرنا شروع کر دیں۔ نُدرت اپنی فطرت کی وجہ سے خاموش تھے۔ اِس لیے کہ امپورٹڈ بیوی ان کی کمزوری تھی۔ ماں باپ اس لیے چُپ تھے کہ نُدرت اُن کی کمزوری تھے۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی بیٹے سے دُور ہو گئے۔ ؎

ہائے رے انسان کی کمزوریاں
پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں ؎

بُوم الدولہ کی کمزوری ریڈیو پر خبریں سُننا تھی۔ بس ہر وقت ریڈیو کسی کار و کے بچے کی طرح ان کی گود میں دبکا رہتا تھا۔ اور بُوم الدولہ سُوئی گھما گھما کر دُنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں سُنتے رہتے تھے۔ جیسے وہ اگر خبریں نہ سُنیں تو بس قیامت آجائے گی۔

اِن کا ریڈیو اتنا خبر زدہ ہو گیا تھا کہ ایک دن ہم جب بُوم الدولہ کی غیر موجودگی میں سِبا کا گیت مالا سُننے کے لیے سوئی کو سمجھا بجھا کر بمشکل سری لنکا تک لائے تھے کہ ریڈیو نے یہ نغمہ اُگلا۔ ؎

آج کی تازہ خبر آج کی تازہ خبر

بُوم الدولہ کے خیال میں گھر، محلہ بلکہ شہر کی خبر، خبر نہیں کہلاتی۔ وہ اس قدر بین الاقوامی خیالات کے ہو گئے تھے کہ غیر ملکی خبر کو ہی خبر سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اِن کا جسم تو گھر میں ہوتا لیکن ذہن مختلف مُلکوں کی سیر کرتا رہتا۔ ان کو تمام عالمی دہشت گردوں کے نام ازبر ہیں۔ اور ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے بُوم الدولہ کو از حد دلچسپی ہے۔ لیکن اپنے ہی فرزند کے کارناموں سے بے خبر۔ جب ہم نے جدید ادب کا سہارا لے کر استعاراتی اور علامتی انداز میں ان کے بیٹے کے کارناموں کا ذکر کیا تو وہ ہمیں بھلا بُرا کہتے ہوئے کہنے لگے۔ ؎

بچوں کو بُرا ثابت کرنا دُنیا کی پُرانی عادت ہے

جس دن وہ ریڈیو پر مافیا کے سربراہ کی گرفتاری کی خبر سُن کر خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت اُن کا فرزند افیم بیچنے کے جُرم میں پکڑا گیا۔ بڑی مُشکل سے ہماری کوششیں اور بُوم الدولہ کے آنسوؤں سے فرزندِ نظربند کو رہائی ملی۔

یہ تو اولاد سے بے خبر اور لاپرواہ دوست کی کمزوری کا ذکر تھا۔ ہمارے ایک اور دوست ان کی ضد ہیں۔ یعنی وہ صرف اولاد ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ کثیر العیال مگر منتشر الخیال ہیں۔ مختلف شعبوں کے ماہروں کی شہرت اور کامیابی دیکھ کر اپنے بچوں کو جبراً ان شعبوں میں جھونکنا ان کی کمزوری ہے۔ بڑے فرزند کو مقبول فلمی اداکار بنانا چاہا۔ برخوردار اداکار تو نہیں بن سکے۔ سینما ہال کے گیٹ کیپر بن گئے۔ اپنی دخترِ نیک اختر کو بھی ہیروئن بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے کہا کہ وہاں حیا پردہ نہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اپنے دُوسرے فرزند کو محمد علی کلے کی شہرت سُن کر باکسر بنانے کی ٹھانی اور اُس سے روز مُکّے کھا کھا کر اپنے دانت شہید کرا ڈالے۔ آخر میں صاحبزادے باکسر نہ بن سکے، پولیس کانسٹیبل بن گئے اور مجرموں کے دانت پہلے کھٹّے اور پھر توڑ کر اکھٹے کرتے رہتے ہیں۔

پرسوں ان صاحب کو گھر سے ٹِفن (پہلے مرد کفن لے کر نکلتے ہیں) لیے سفید کپڑوں میں ملبوس اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے کے ہمراہ اسٹیڈیم جاتے دیکھا تو وجہ سفید پوشی پُوچھی کہنے لگے۔ میاں میں چھوٹے فرزند کو کرکٹ کھیلنے کی مشق کرا رہا ہوں۔ آخر معروف کھلاڑیوں کو ایک نہ ایک دن ریٹائر ہونا ہے۔ دیکھنا اسے شہرت اور عزت مجھے دولت اور راحت ملے گی۔

محلّہ کے ایک اور صاحب امیرِ عالم اپنی کمزوری کی وجہ سے اسیرِ عالم کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ اِن کا رُخ ہمیشہ سُوئے مجلس رہتا ہے، جی ہاں! جہاں اس دَور میں لوگ باہر جانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ وہاں یہ صاحب اندر جانے کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔

آج کل جیلوں کی زندگی اتنی آرام دہ ہو گئی ہے ۔ اسیرِ عالم باہر آتے ہی پھر اندر جانے کی دُھن میں لگ جاتے ہیں۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اندر ہو جاتے ہیں اور صحنِ زنداں میں اپنے ہم اسیروں اور ہم جلیسوں سے خطاب کرتے فرماتے ہیں کہ دُنیا خود ایک بڑا جیل خانہ ہے۔ آرام تو جیلوں میں ملتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

عینی شاہدوں یعنی آہنی قیدیوں کے بیان کے مطابق جیل میں اسیرِ عالم کے لئے کمرہ، بستر اور برقی پنکھا مختص ہیں ، اور کیا مجال کہ ان کی غیر حاضری کی مدّت (جو نہایت قلیل ہوتی ہے) میں کوئی دوسرا ان کے کمرے میں قدم رکھے۔ بلکہ یہ صاحب تو جیل کے حکام کو تسلّی یقین دلاتے ہیں کہ "میں ابھی گیا اور ابھی آیا" پھر وہ اپنے قول و فعل پر عمل کرتے ہوئے واردِ زنداں ہو جاتے ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ بستی سے جیل کے مستقل نمائندے ہیں۔

لوگ اور رشتہ داران کے اِس حُبِّ اسیری کے سبب شادی بیاہ اور دیگر تقاریب کے دعوت نامے جیل کے پتے پر ہی بھیجتے ہیں۔ عید اور دوسری تقاریب کے موقعوں پر ان کے فرزندان حکامِ زنداں کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر بڑی مشکل سے ضمانت پر کچھ دیر کے لئے اپنے والد صاحب کو چھڑا لاتے ہیں اور بجا طور پر کہتے ہیں۔ ع

کیا کیا نہ سہے ہم نے ستم باپ کی خاطر

اسیرِ عالم کی اِس کمزوری کی وجہ سے ان کے مکان کے مکالمے ہی بدل گئے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی روپیوں کا تقاضہ کرتا ہے تو مکان سے یہ جواب ملتا ہے کہ "آپ کا سارا قرضہ ادا کر دیا جائے گا۔ ذرا ان کو اندر سے تو آنے دیجئے"۔ جب کہ دُوسرے مکانوں سے یہ صدا نکلتی ہے کہ آپ کی پائی پائی ادا کی جائے گی ذرا ان کو باہر سے آنے دیجئے۔

جب کبھی یہ قیدپرست، زنداں نواز شوہرِ گرفتار جیل جاتے ہیں تو ان کی بیگم زلفیں کھولے راگ الاپتی ہیں۔ ؎

اکیلے اکیلے کہاں جا رہے ہو
مجھے ساتھ لے لو جہاں جا رہے ہو

انجام کار اُن کی بیگم بہوؤں کے طعنوں اور لوگوں کی گالیوں سے تنگ آ کر اپنے شوہر کی کورانہ تقلید میں کچھ ایسا کر بیٹھی کہ شریکِ حیات کے ساتھ شریکِ حوالات ہو گئی۔ سُنا ہے کہ اب وہ شوہر کے ساتھ جیل میں فلم لاہور کا گیت گنگناتی ہے۔ ؎

دُنیا ہمارے پیار کی یُوں ہی جواں رہے
مَیں بھی وہیں رہوں میرا ساجن جہاں رہے

تو صاحبو اِس دُنیا میں فرد ہو یا ملّت ہر کوئی عجیب عجیب کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ آدم اور ابنِ آدم کے قصّے کو رنگین و سنگین بنانے میں ان بشری کمزوریوں کا زبردست ہاتھ ہے۔

یہ دُنیا قیامت تک یُوں ہی رنگین و سنگین رہے گی کیونکہ ع

ختم نہ ہوں گی کبھی کمزوریاں

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔سی۔او نمبر ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷-سی ، چنڈی گڑھ سے جون ۸۷ء کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ

رونق شہری

غزلیں

(میر کی زمین میں)



عجب ہے ذہن کا موسم ہمارا
نکل جائے گا جیسے دم ہمارا

اسے ہم بانٹ کر بھی خوش نہیں ہیں
کوئی تحفہ نہیں ہے غم ہمارا

تخاطب سہل ہے اب گفتگو میں
تعلق ہو گیا ریشم ہمارا

بھلا دیتے ہیں خود کو قہقہوں میں
نہیں تو دکھ نہیں ہے کم ہمارا

بہت عریاں ہے تیرے غم کا پیپل
بہت ہے مضمحل گوتم ہمارا

●

ہے چپ وہ گردِ تعلق کو صاف کرتی ہوئی
ندی ہوا کی شرارت معاف کرتی ہوئی

ہزار آنکھیں بچھی ہیں ہمارے قدموں میں
ہے ایک راہ مگر انحراف کرتی ہوئی

نزولِ قہر و غضب سے بجھی ہوئی بستی
ہنسی بلند فلک تک شگاف کرتی ہوئی

عجب مزاحمتِ جسم و روح ہے اب کے
سپردِ جاں ہے کوئی اختلاف کرتی ہوئی

مکین دست بریدہ ہے جانے کس گھر میں
کھڑی ہے در پہ مصیبت طواف کرتی ہوئی

آپ ہیں شیریں کلام اور میرا لہجہ زہر ہے
بھید کھل جائے گا اک دن کس میں کتنا زہر ہے

تازگیٔ روز و شب کا عکس بھی باقی نہیں
ذائقہ ہونٹوں پہ خود میرے لہو کا زہر ہے

مختلف اقسام کے کھانے چنے ہیں میز پر
اور یہ اپنی طبیعت ایک لقمہ زہر ہے

غم کو بھی پیتے رہو آدابِ مے نوشی کے ساتھ
نصف ہے آبِ حیات اور اس میں آدھا زہر ہے

ابتدا کوئی نہیں رونق ہوئی انجام خیز
سلسلہ خوش فہمیوں کا جیسے میٹھا زہر ہے

افسانہ

نسیم بن آسی

اجنبی چہرے

یہ 'شبنم' ہے۔ نام سے آپ یہی سمجھیں گے، یہ کوئی ہوٹل یا ریستوراں ہے۔ بنارس میں سِگرا کی کشادہ سڑک سے جب بھی گزرنے کا اتفاق ہو، سڑک کے کنارے اس نام کا بورڈ آپ کو دکھائی دے گا۔ 'شبنم' کے نیچے ہی ڈاکٹر سُدھا سنگھ بھی لکھا ہوگا۔ سِگرا ہے اور کچھ مشہور ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر سُدھا سنگھ کا یہ 'نرسنگ ہوم' بہت مشہور ہے۔ مجھے خوبصورتی سے والہانہ محبت ہے۔ دست آپ میری دیوانگی سمجھیں یا کچھ اور — لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ ستار، ہارمونیم اور پیانو کے ساتھ ڈھولک بھی ہے۔ ذرا سوچیے، بغیر ڈھولک کے ساز کیا؟ نام میں کیا رکھا ہے! اصل خوبصورتی تو کام میں ہے۔ کوئل کی کوک سُن کر کبھی ہُوک نہیں اٹھتی؟ آپ شکل پر مت جائیے۔ اچھی شکل تو کسی کسی کو ملتی ہے اور جسے ملتی ہے، اُس کا ملنا مشکل ہے، یہ ظاہر اور مسلّم حقیقت ہے۔ خوبصورت لڑکیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ نظر بھی آتی ہیں تو مشکل سے —!

ڈاکٹر سُدھا سنگھ کا جب پہلی بار نام سُنا تو یہ نام بھی مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ آج بھی یہ نام میرے ذہن میں ایک سنگیت سا گھولتا ہے — یہ نام نہیں کوئی آبشار کوئی گیت ہے، کوئی تان ہے — ! رنگ کھلتا ہے، نشہ آتا ہے۔ بس مجھ سا ہے جسے دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں! بالکل ایسے ہی جیسے کوئی رات آخر سمٹ گئی ہو، جسے دیکھ کر آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں —!

رات نیند نہ آنے کی وجہ صرف یہ آبنوسی نرس ہی نہیں ہے۔ جس کی شکل کچھ ایسی ہے جسے آپ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ بُرا — بس شکل ہے جسے دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ کسی دُبلے پتلے آدمی پر گر جائے تو اُس کا اُٹھنا بھی مشکل ہو جائے۔ رات اُسے مجھ سے ضد ہو گئی —

"بستر یہاں نہیں لگے گا، راستہ ہے۔"

"میں نے راستہ چھوڑ کر لگایا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے!" میں نے کہا۔

"نہیں، یہ راستہ ہے!"

میں اُس کی ضد سمجھ جاتا ہوں — جب عورت ضد پکڑ لیتی ہے تو بڑے بڑوں کو جُھکنا پڑتا ہے۔ میں ذرا سا اپنا بستر کھسکا لیتا ہوں۔ اور وہ مان جاتی ہے —!

نیند نہ آنے کی دوسری وجہ وہ عورت ہے جو پہلی بار ماں بننے یہاں آئی ہے۔ جب اُسے تیز درد ہوتا ہے، وہ بے حال کراہنے شوہر کو پکارتے ہوئے میرے پاس آتی ہے، بہت تیز درد ہو رہا ہے اور وہ آبنوسی نرس زور سے دروازہ بند کر لیتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھول کر پھر کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اور ٹہل ٹہل کر کراہتی رہتی ہے۔ مجھے مجبوراً نیند آتی ہو — لیکن میری نیند کے وقت یہ عورت دنیا کی کہانیاں افسانے کرنے میں مصروف

ہو جاتی ہے۔ جب عورت چلّانا بند کرتی ہے تو بچّہ رونے لگتا ہے۔
بچّہ کہاں آ گیا ——— میں کہاں آ گیا ——— یہ تو دُنیا ہے ——!
چائے والا صبح ہی صبح چلّا رہا ہے۔ اُس کی ایک کرسی کسی نے ہوٹل
میں ڈال دی ہے! ہوٹل والوں نے ہی بھی کہیں نہیں ڈال دی؟ سب ٹی بنیں ——!
اس کا پڑوسی بیٹھا آہ کہہ رہا ہے۔ اُس کی بھینس کی کمر نشیں بھی
غائب ہیں۔ کسی نے وہ بھی ہوٹل میں ڈال دی ہیں۔ ہو لی ہے بھائی
ہو لی!۔

میں نرسنگ ہوم کے برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوں اور ہوٹل
کی صبح دیکھ رہا ہوں۔ کل چائے والے ہی نے میری بیوی کو پینے کے لئے دودھ
دیا تھا۔ ہاں دودھ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ وہ دودھ میں پانی ملاتا تو کوئی
بات نہ تھی، اُس نے پانی میں دودھ ملایا تھا ——! اور پیسہ اصل کا
لیا تھا۔ یہ گوالا بھی ہوٹل کی صبح کا فائدہ اٹھا رہا ہے اور پانی دودھ کے بھاؤ
بیچ رہا ہے! ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب میں اس گوالے سے دودھ
نہیں لوں گا۔ پانی ہی پینا ہے تو میری بیوی نلکے کا پانی پیئے گی۔

میری بیوی بیڈ پر ہے۔ اُس کے پیٹ میں جو بچّہ ہے وہ مر چکا
ہے۔ اُسے کس طرح نکالنا ہے۔ میری بیوی کو گلوکوز چڑھ رہا ہے۔ آشا
بھی بیڈ پر ہے۔ اس کا اور میری بیوی کا بیڈ پاس ہی پاس ہے۔ اُس کے
پیٹ کا آپریشن ہوا ہے، وہ جب کراہتی ہے تو اُس کی بڑی بہن ارملا
حاضر ہو جاتی ہے۔ عورت کا دل کائنات کی طرح بڑا ہے۔ کبھی وہ ماں بن جاتی
ہے، کبھی بہن، کبھی بیٹی اور کبھی بیوی ——! ان کی ماں کو مرے کچھ ہی
سال ہوئے ہیں۔ ماں زندہ ہوتی تو وہ کیا ہی سب کچھ کرتی جو ارملا کر رہی ہے۔
وہ آشا کو ناشتہ دینے کے لئے بریڈ میں مکھن لگا رہی ہے۔ کل بھی وہ
دوپہر کو اسے سہارا دے کر کھانا کھلا رہی تھی۔ پھر اس کے سر میں تیل
لگا رہا تھا۔ رات اسے کم ہی نیند آتی ہے۔ جب کسی کی کراہ سنائی دیتی ہے
تو نیند کہاں آتی ہے!
ڈاکٹر شرما ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کی طرح کمرے میں آتی
ہیں اور آشا کو دیکھ رہی ہیں۔ اُسے پہلے سے آرام ہے۔ میں اپنی بیوی کے
پاس بیٹھا ہوں اور گلوکوز کی بوتل دیکھ رہا ہوں ——— گلوکوز زندگی ہے
بوتل جیون ہے! گلوکوز بہت مدھم رفتار سے نسوں میں اُتر رہا ہے۔
میری بیوی اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے لیٹی ہے اور ڈاکٹر شرما کو دیکھ

رہی ہے۔ ڈاکٹر نے میری بیوی کا بلڈ پریشر دیکھنے کے بعد کہا ہے ——— یہ
تیسرا آپریشن ہے۔ اب بچّہ پیدا ہونے میں تمہاری زندگی کے لئے خطرہ ہے۔
سوچ لو۔ میری بیوی نے مسکرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہے۔ میری بیوی
کے اس خوبصورت انکار پر ڈاکٹر شرما بھی مسکرانے لگی ہیں۔ میں سوچ
رہا ہوں ——— عورت دھرتی ہے۔ اور دھرتی ہمیشہ پھل پھول ہی دینا چاہتی ہے!
ڈاکٹر شرما دونوں مریضوں کو دیکھنے کے بعد دوسرے کمرے میں چلی
گئی ہیں۔ رات کو بھی وہ بارہ بجے، ایک بجے اُوپر کی منزل سے سیڑھیاں اُتر کر
مریضوں کو دیکھنے چلی آتی ہیں۔ اکثر چار بجے سویرے بھی ——! امرت پینے کے
بعد انسان مرتا نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرما کے پاس وہ امرت نہیں ہے، لیکن ایسا
امرت ضرور ہے، جس سے مریض زندگی پا جاتے ہیں ——!
میں اکیلا ہوں ——— یہاں صرف میری بیوی ہے۔ وہ بھی اب میری
کہاں ہے ——؟ وہ تو ہسپتال کی ہو رہی ——! میں جلدی میں گھر سے کھانے
پینے کا برتن بھی لانا بھول گیا ہوں ——— میرے پاس پانی پینے کے لئے ایک گلاس
بھی نہیں ہے۔ میں کوزے میں اپنی بیوی کو پانی پلاتا ہوں۔ پھر اُسے بہت
سنبھال کر رکھتا ہوں۔ کبھی کبھی چھوٹی چیز کی بھی کتنی اہمیت ہو جاتی
ہے۔ ارملا مجھے اپنا اسٹیل کا گلاس دیتی ہے اور گڈی کو میری بیوی
کو کھانے کے لئے گھر سے ایک پلیٹ بھی لانے کے لئے کہہ رہی ہے۔!
ڈاکٹر شرما کا خیال ہے، ہم ایک دن اور ٹھہر جائیں گے ——— لیکن
میں آج شام ہی کو گھر جانا چاہتا ہوں۔ میں ایک رات اور گزارنے کے تصوّر
ہی سے کانپ جاتا ہوں ——— میری بیوی پہلے سے کافی ٹھیک ہے۔ اُس کی ساری
تکلیف ختم ہو چکی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، شام تک وقت کیسے گزرے گا؟
دوپہر تک کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بھی نہیں سکتا۔ میں برآمدے
کی طرف ہی چل دیتا ہوں ——— سڑک پہ عجیب منظر ہے۔ بہادر جو کبھی
پہ بھی منہ کالے نظر آ رہے ہیں۔ کپڑے پھٹ گئے۔ لیکن کوئی بات نہیں ———
ہولی ہے۔ کوئی اور دن ہوتا تو ذرا سی بات پہ جانے کیا ہو جاتا ——!
چمیلی گنگنانے لگتی ہے ———
"برج میں کھیلے کنہائی ہولی رے برج میں......"
"تمہارے کنہائی تو برج میں ہیں۔ آج تم کس کے ساتھ ہولی
کھیلو گی؟"
"تیرے ساتھ ——!"

پھر کرنے ہی میں چہرے گلابی ہونے لگتے ہیں۔ ساڑھیاں رنگوں سے بھیگ رہی ہیں۔ رات کو چوکیداری کرنے والا بیس سالہ بہادر بھی موقع کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ وہ رنگوں سے کم ہاتھوں سے زیادہ کام لے رہا ہے۔

کوئی مرے۔ کوئی جیئے۔ ان نرسوں اور دائیوں کو کیا ۔۔۔! یہ تو روز کا کام ہے۔ چھٹی نہیں رہے گی تو کیا کوئی ہولی بھی نہیں منائے گا۔ انسان جہاں مرتا ہے وہیں جیتا ہے ۔۔۔!

میں برآمدے سے پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں ۔۔۔ آشا میری بیوی سے باتیں کر رہی ہے۔ ارملا پاس بیٹھی ہے۔ وہ کبھی آشا کی طرف، کبھی میری بیوی کی طرف دیکھ رہی ہے اور اس انتظار میں ہے کب آشا چپ ہو اور وہ بات شروع کرے۔ میری بیوی باتونی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں، وہ ایکدم چپ ہی رہتی ہو۔ بات اور عورت کا وہی تعلق ہے، جو کھانے اور پینے کا ۔۔۔! میں کہتا ہوں "گڈی! تم بھی بولو۔ چپ کیوں ہو۔ کچھ تم بھی تو کہو ۔۔۔! وہ مسکرا کر نگاہیں جھکا لیتی ہے۔ جب سے آشا کے پیٹ کا آپریشن ہوا ہے، وہ گھر کا کام کاج کرنے کے بعد اپنی امی کو دیکھنے شام کو ضرور آتی ہے۔ یکایک کام کا بوجھ بڑھنے سے اس کی بھی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ بچے ہولی کا پکوان لے کر آگئے ہیں۔ ارملا نے پکوان میں سے میری بیوی کو بھی کھانے کے لئے دیا ہے۔ میں باہر جانے لگتا ہوں۔ ارملا مجھے روک لیتی ہے۔ آپ بھی کھا لیجئے وہ پکوان مجھے بھی دیتی ہے۔ ارملا اکثر میری غیر موجودگی میں میری بیوی کی ہر ضرورت پوری کرتی رہی ہے۔ "دیپ بینے کے لئے پانی دینا۔ باہر سے اُس کے لئے کچھ منگا دینا۔۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں ۔۔۔ عورتیں کس طرح اپنے تعلقات ہموار اور مضبوط کر لیتی ہیں اور ہم مرد لوگ ۔۔۔۔۔۔

میں ایک نرس سے ڈاکٹر کے بل کے بارے میں پوچھتا ہوں ۔۔۔ وہ آشو سسی نرس کی طرح تو نہیں ہے پھر بھی نرس ہے۔ اُس نے مجھے کافی بور کیا ہے۔ وہ بات سُنی اَن سُنی کر رہی ہے۔

بہت کہنے پر ڈاکٹر کا بل بن کر آگیا ہے۔ میں جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ ڈیڑھ سو روپے کم پڑ رہے ہیں۔ میں باقی روپے کل بھی ڈاکٹر کو دے سکتا ہوں۔ میں اس کے بارے میں نرس سے کہتا ہوں۔ وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے۔ میں کمرے میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں ۔۔۔ نرس ڈاکٹر سے مل کر نیچے آتی ہے۔

"آپ کو پورے روپے دینے ہوں گے!"

"شاید میں باقی روپے نہ دوں۔ یہی بات ہے نا؟" میں جھنجھلا کر بولا۔ مجھے ڈاکٹر کی بات پر شک ہوتا ہے۔ انسان سب کچھ چھوڑ سکتا ہے، روپیہ نہیں، وہ روپے کے لئے ہی جیتا ہے، اسی کے لئے مرتا ہے!

میں اپنی بیوی کے کمرے میں جاتا ہوں۔ اور کہتا ہوں ۔۔۔۔۔۔

"آج ہم لوگ گھر نہیں جاسکتے۔ ڈاکٹر کے بل کے روپے کم ہو رہے ہیں۔"

وہ اپنا کالا نقاب اتار کر رکھ دیتی ہے۔ آشا اپنے شوہر رائے صاحب کی طرف دیکھ رہی ہے ۔۔۔۔۔۔ ارملا بھی اُن کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دونوں رائے صاحب سے روپے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ رائے صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ہے ۔۔۔

"میرے پاس روپے ہیں آپ یہ لیجئے۔"

میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور کہتا ہوں ۔۔۔

"میں کل دوپہر تک روپے آپ کو واپس کر دوں گا۔"

وہ کہتے ہیں ۔۔۔ "کوئی بات نہیں۔"

میں الماری سے اپنا سامان سمیٹنے لگا ہوں۔ میری بیوی بھی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں کو اپنے جھولے میں رکھ رہی ہے۔ جس نرس نے مجھے بل دیا ہے، وہ میرے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی ہے۔ کسی کا روپیہ باقی ہو تو کیسا معلوم پڑتا ہے۔ اپنی نگاہیں نیچی تو رہتی ہی ہیں، جس کا باقی ہوتا ہے وہ سوچتا ہے، کہیں بغیر دئے ہی بھاگ نہ جائے ۔۔۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں جلدی سے اُسے بل کے روپے دے دیتا ہوں۔ اب میں اُس نرس کی طرف آنکھیں ملا کر دیکھ سکتا ہوں۔ اب مجھے اپنے انسان ہونے کا گمان ہونے لگا ہے ۔۔۔

میری بیوی ارملا سے مل رہی ہے۔ آشا اپنے بیڈ سے اٹھ نہیں سکتی ہے۔ وہ لیٹے ہی لیٹے اپنا ہاتھ میری بیوی کی طرف بڑھا دیتی ہے ۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی۔ آنسو اُس کی پلکوں پر آکر اٹک

جاتے ہیں۔!

چلتے چلتے ارملا پھر یاد دلا رہی ہے ــــ

"گھر پر ضرور آنا، بھولنا نہیں!"

اور میری بیوی وعدہ کر لیتی ہے۔ ایک نگاہ ارملا، آشا، گڈی اور رائے صاحب پر ڈالتے ہوئے ہم دونوں کمرے سے باہر آجاتے ہیں۔ باہر رکشا کھڑا ہے۔ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے رکشا پر بیٹھتے ہیں۔ اور رکشا آگے بڑھ جاتا ہے۔

دوسرے دن نرسنگ ہوم میں اپنے وعدہ کے مطابق میں رائے صاحب کو روپے دینے جاتا ہوں ـــ میری بیوی کا بیڈ اُسی طرح خالی پڑا ہے۔ آشا اپنے بیڈ پر لیٹی ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی ہوئی کہتی ہے ــــ

"آج رات نیند نہیں آئی ــ!"

ارملا اُسے بگڑنے لگتی ہے ــــ

"چُپ بھی رہو ــ"

پھر میری طرف مڑ کر کہتی ہے ــــ

"گھر آرام سے پہنچ گئے نا۔؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔؟"

"پریشانی........" آواز میرے حلق میں آ کر رُک جاتی ہے۔ اور میں ارملا کی نظریں بچا کر اپنی آنکھ کے کونوں کو صاف کرنے لگتا ہوں۔!!

تخلیقات بھیجتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجیں

رزاق افسر

نذرِ خواجہ احمد عباس مرحوم

سب سے جیسی اُنگلیاں اُس کی نہیں تھیں
اُنگلیوں میں اُس کی ایسی تھی لچک
جیسے دریا کا تموّج
پیرہن کاغذ کا پہنے
یوں ہُوا تھا سر بُلند
جیسے سر پر سات رنگوں کی دھنک
اُس کے ہاتھوں کا اثاثہ
اِک اکیلی سا قلم
جو برائے زندگی تھا
زندگی اُس کے لئے تھی
اُنگلیوں میں تھام کر اِک کائنات
روز و شب کے فاصلوں کو پاٹنے
عمر بھر چلتا رہا
جانے کیا سوجھی اُسے
اپنا سب کچھ چھوڑ کر سب کے لئے
روشنی کی کھوج میں
چاند کی بستی میں شاید جا بسا ہے

روشن لال روشن بنارسی

جدید اردو غزل اور باقیؔ

راجیندر منچندہ باقیؔ جدید غزل کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی تازگیٔ فکر اور طرحداری نے جدید غزل کے خدوخال نکھارنے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔

باقیؔ کے لہجے کی تازگی اور انکا تحکمانہ اندازِ بیان اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ باقیؔ کو اپنے ذہن و شعور، زبان و ذات پر پورا اعتماد تھا ؎

راہ آسان دیکھ کر سب خوش تھے، پھر میں نے کہا
سوچ لیجے! ایک اندازِ نظر میرا بھی ہے

باقیؔ کا اندازِ نظر اور ان کے یہاں لفظوں کے تخلیقی استعمال کا عمل اور ان کے پیرایۂ اظہار کی ندرت نے بہت جلد جدید غزل کے قارئین کی توجہ اپنی طرف کر لی تھی۔ شاعری میں فکر و نظر اور احساس کی تازگی زبان و اظہار کی ندرت کے بغیر اپنی پہچان اور اپنی انفرادیت قائم کرنا ایک ناممکن بات ہے۔ اپنی انفرادیت کے لئے الفاظ کے تخلیقی استعمال سے شاعر کا واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔ زبان و بیان پر پوری گرفت اور ہزاروں بار کے برتے ہوئے الفاظ کو نئے سیاق و سباق میں نئے انسلاکات کے ساتھ شعر میں ڈھالنے کا فن باقیؔ خوب جانتے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں باقیؔ کی شاعری سے پیش کی جاسکتی ہے ؎

ہوائیں زور سے چلتی تھیں ہنگامہ بلا کا تھا
میں سناٹے کا پیکر منتظر تیری صدا کا تھا

کسی کے لوٹنے کی جب صدا سُنی تو کھُلا
کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا

کون تھا میرے پر تولنے پر نظر جس کی تھی
جس نے سر پہ مرے آسمان رکھ دیا کون تھا

مندرجہ بالا اشعار میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے اردو شاعری کے قارئین اچھی طرح واقف نہ ہوں۔ لیکن ان میں لفظوں کے تخلیقی استعمال نے جو معنی آفرینی پیدا کر دی ہے وہ جدید غزل کے قارئین کو ایک عجیب سی حیرت کے ساتھ لطف اندوز کرتی ہے۔ اور دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔

باقیؔ کے اشعار میں جگہ جگہ نئی ترکیبوں اچھوتے استعاروں اور پیکر تراشی و فعل سازی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ نئی و نادر تشبیہات بھی باقیؔ کو تمام جدید شاعروں سے منفرد کرتی ہیں۔ یہاں ان کی دو متشابہ غزلوں کے چند اشعار درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ؎

لباس اُس کا علامت کی طرح تھا
بدن روشن عبارت کی طرح تھا
ادا موجِ تجسّس کی طرح تھی
نفس خوشبو کی شہرت کی طرح تھا

بساطِ رنگ تھی مٹھی میں اُس کی
قدم اُس کا بشارت کی طرح تھا

صدائے دل عبارت کی طرح تھی
نظر شمعِ شکایت کی طرح تھی
بہت کچھ کہنے والا چپ کھڑا تھا
فضا اُجلی سی حیرت کی طرح تھی

لباس کو علامت بدن کو عبارت، ادا کو موجِ تجسس نفس کو خوشبو کی شہرت اور قدم کو بشارت کی تشبیہہ دینے سے قارئین کا ذہن اسی ربط و تضاد سے لطف اندوز ہوتا ہے جو زمین و آسمان میں یا نفی اور اقرار میں مضمر ہے۔ دوسری غزل میں صدائے دل کو عبارت کہنا نظر کو شمعِ شکایت کہنا فضا کے اُجلے پن کو حیرت سے تعبیر کرنا باقی کے خلاقانہ ذہن کی پہچان ہے۔

ایسے شعروں میں ذات کو آفاق سے اور آفاق کو ذات سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے وسیلے سے پرکھنے اور پہچاننے کی کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔ یہی وہ نئی شعری جہت ہے جسے ہم بجا طور پر جدید شاعری کہہ سکتے ہیں۔

باقی کے یہاں بہت سے اشعار منفیت سے مملو ہیں بلکہ یوں کہیں کہ ان کے شعروں کی حاوی کیفیت منفیت کی ہے۔ مگر ان کو باقی کی پوری تخلیقی فضا کے ساتھ دیکھنے پر ہی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں حاوی منفیت کی اول کیفیت کیا ہے۔ ان کی منفیت اور اس منفیت کی اصل نوعیت کو سمجھنے کے لئے ان کے چند اشعار کا معنوی تقابل ضروری معلوم ہوتا ہے۔

منفی پہلو
اک زیاں فردا بہ فردا ہے یہاں کیا جاگئے
بس کہ ہیں منظر کا حصہ لاکھ تنہا جاگئے

تقابلی پہلو
اک کرن کھڑکی سے بستر تک شفق خوردہ ہوئی
اور ترا صحن میں روشن پرندا! جاگئے

منفی پہلو
کب سے ہے گرتے ہوئے پتوں کا منظر آنکھ میں
جانے کیا موسم ہے، خوابوں کا زیاں ایسا نہ تھا

تقابلی پہلو
کوئی شئے لہرا ہو جاتی ہے فصیلِ شب کے پار
دُور اُفق میں دیکھنا، کچھ رائیگاں ایسا نہ تھا

منفی پہلو
محراب نہ قندیل نہ اسرار نہ تمثیل
کہہ اے ورقِ تیرہ! کہاں ہے تری تفصیل

تقابلی پہلو
آساں ہوئے سب مرحلے اک موجۂ پا سے
برسوں کی فضا ایک صدا سے ہوئی تبدیل

نفی اور اثبات کی یہ کشمکش باقی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اس کشمکش کو اگر مربوط کرکے دیکھا جائے تو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں کہ باقی کے یہاں حاوی منفیت کی اصل کیفیت و نوعیت کیا ہے۔

باقی کے یہاں بحروں کا تنوع بھی اُن کی شاعری کا قابلِ غور پہلو ہے۔ نامانوس بحروں سے باقی کا یہ شغف ان کی تخلیقی قوت اور خلاقانہ ذہن کی روشن علامت ہے۔ غزل کی لفظیات میں اضافہ اور اُس کے فکری حصار میں وسعت پیدا کرنے میں بحروں کے تنوع کی ضرورت کو باقی اچھی طرح محسوس کرتے تھے اور وہ بحروں کا تجربہ کرنے میں پوری طرح کامیاب بھی رہے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے

میں ایک بے برگ و بار منظر کمر برہنہ
میں سنسناہٹ تمام یخ پوش اپنی آواز کا کفن ہوں
محاذ سے لوٹتا ہوا لفظ تو سپاہی
میں اپنا ٹوٹا ہوا عقیدہ اب آپ اپنے لئے وطن ہوں

شفق تحریر اُس کی
ہوا اظہار اُس کا!

اڑ چلا وہ اک جُدا خاکہ لئے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

میں خلاؤں میں اڑتا ورق تیرے اقرار کا ہوں
نقش جس پر ترے بوسۂ اولیں کا نشاں ہے

ان چار اشعار کی مثالوں سے واضح ہے کہ بحروں کے
تنوع سے غزل کی لفظیات میں اضافہ اور اُس کی فکری فضا میں
وسعت پیدا ہونا یقینی امر ہے۔

باقیؔ کی غزلوں میں تجسس و استعجاب دونوں جذبوں
کی کارفرمائی بھی اپنے عروج پر ہے۔ جو اپنے قارئین کو
وسیع لیکن نامانوس فضاؤں کی سیر کراتی ہے۔ ان کی غزلوں
میں گنتی کے ہی ایسے اشعار ملیں گے جن کو قاری لفظی ترجمہ کرکے
سمجھ سکیں اور یہی ایک بڑی اور اچھی شاعری کی پہچان ہے۔
مثلاً ؎

پھیلتی جائے گی چاروں سمت اک خوشبو رونق
ایک موسم میرے اندر سے نکلتا جائے گا

سر بہ سر ایک چمکتی ہوئی تلوار تھا میں
موجِ دریا سے مگر برسرِ پیکار تھا میں

میں کسی لمحۂ بے وقت کا اک سایہ تھا
یا کسی حرفِ تہی اسم کا اظہار تھا میں

میں ترے بعد پھر اے گم شدگی!
خیمۂ گردِ سفر سے نکلا!

ان اشعار کی تفسیر اشعار کے ساتھ زیادتی ہوگی۔
ان کی تخلیقی فضا سے لطف اندوز ہونا ہی ان اشعار
کی کامیابی ہے ـــــ باقیؔ نے اپنی غزلوں میں ایسے شگفتہ بھی
شعر کہے ہیں وہ ان کی پہچان اور جدید اردو
غزل میں ان کی اہمیت کو منوانے میں پوری طرح
حق بہ جانب ہیں۔

شادؔ قادری لکریلوی

غزل

فلک کا عکس زمیں پر کبھی پڑا ہی نہیں
وہ اِس خیال سے آئینہ دیکھتا ہی نہیں

سفینہ حق و صداقت کا ڈوبتا ہی نہیں
خُدا بھی اِس کا نگہبان ہے ناخُدا ہی نہیں

جو حوصلہ ہی نہ ہوتا تو کیا قدم اٹھتے
رگوں میں خون نہ ہوتا تو دوڑتا ہی نہیں

مرا وجُود کچھ ایسا مٹا زمانے سے
وہ خواب ہوں مَیں جسے کوئی دیکھتا ہی نہیں

کہاں سے شادؔ کو آئے شعور پینے کا
وُہ میکدے کے تو آداب جانتا ہی نہیں

افسانہ

مہتاب عالم پرویز

خانے تہ خانے

آج سورج میرے وجود سے طلوع ہو رہا تھا۔

اور ـــــــ

یہ ایک عجیب بات تھی۔

اس کا احساس مجھے اُس وقت ہُوا جب میں نے اپنے آپ کو پہلی بار دیکھا، اور نتیجے کے طور پر ایک کھِلا ہُوا گلاب میری آنکھوں میں سمٹ آیا جس پہ شفق کے آنسو بکھرے ہوئے تھے۔

باغ میں ایک گلاب کا پودا، جس کی شاخوں سے جھولتی ہوئی ادھ کھِلی کلیاں شبنم کا رس پی رہی تھیں، مجھے یوں محسوس ہُوا کوئی مجھے تھوڑی تھوڑی شراب پلا رہا ہے۔

لیکن یہ شفق کے آنسو؟

ایک لمحے کے لئے میں سوچ میں پڑ گئی اور مسلسل سوچتی رہی۔

لمس کی حیثیت بدل گئی تھی۔

مگر آج جو لمس میں نے محسوس کیا تھا وہ نشہ سب سے جداگانہ تھا۔ عجیب کیفیت تھی! درد بھی اور خوف بھی، کیف میں ڈوبی ہوئی لذت بھی۔

میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بھابی میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

میں پھر سوچنے لگی .....

ایک خواب جو کبھی دیکھا تھا۔

ان ہی جوان آنکھوں سے۔

یہ وہی آنکھیں ہیں جن میں خواب اترا کرتے تھے۔

ستاروں بھرا آسمان .... مسکراتی چاندنی .... اٹھلاتی اتراتی الہڑ ہوائیں .... ٹیڑھی میڑھی پُراسرار پگڈنڈیاں .... دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیت اور کھلیان .... کہیں فضا میں پرواز کرتے ہوئے پرندوں کا ایک خوبصورت جوڑا .... گیسوؤں میں اُلجھی ہُوئی شام .... بارش کی پھوہار .... رات کا پھیلا ہُوا اندھیرا .... شبنم میں نہایا ہُوا کوئی پھُول .... اور ان معصوم مناظر کو سمیٹے میری جوان آنکھیں۔

رات گئے تک میری آنکھیں آکاش کی بے شکن چادر پہ نہ جانے کیا تلاش کیا کرتیں۔ اور کبھی میں نے اپنی ان آنکھوں کو شبنم سے بھیگی ہوئی مخملی گھاس پہ رینگتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

رات! ـــ ہر جہت کی خاموشی اور تاریکی ـــ گرد و پیش کا ماحول بڑا پُراسرار تھا۔

کیا واقعی یہ سب کچھ اتنا پُراسرار ہے۔ جسے صرف میری آنکھیں دیکھا کرتی ہیں یا جوان آنکھوں میں ایسے خوابوں کا اُترنا معمول ہے۔

آخر یہ سب کچھ مجھے اتنا کیوں بھا گیا ہے۔

رات کے اندھیرے میں ایک سوالیہ نشان اُبھرتا اور خلاؤں میں بکھر جاتا۔

جواب میں مَیں کر بھی کیا سکتی تھی سوائے اس کے کہ پھر اُسی سوال کے سِرے کو پکڑنے کی کوشش کروں۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ سوال اگر بار بار اُبھرے تو خود ہی ایک جواب بھی بن جاتا ہے۔

بہر حال اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

لیکن جب بھی سوچتی ہوں تو نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے آپ سے جُدا ہو گئی ہوں۔ لیکن جُدائی کی یہ لکیر آخر کب تک قائم رہ سکتی ہے؟

ایسے میں، مَیں خود ہی سے اُلجھتی چلی جاتی۔

اور پھر اُلجھن ہی ایک مستقل سوال بن گئی۔

میں اپنے اندر سمائی ہوئی عورت سے اُلجھتی رہی۔

پھر یُوں ہُوا کہ میں چونک پڑی میری نظر گلاب کے اُسی پودے پہ ثبت ہو گئی جس کی شاخ سے جھُولتی ہُوئی ادھ کھلی کلی پہ شبنم کا ایک قطرہ اب بھی چمک رہا تھا۔ پھر اس قطرے میں سُورج سمٹ گیا۔ مَیں نے ایک نظر سُورج پہ ڈالی جب کہ سُورج بہت دُور جا چکا تھا مگر اتنا پاس بھی تھا جیسے ننھے سے قطرے میں آگ کی صورت قید ہو۔ مَیں نے سوچا یہ آگ بُجھ تو سکتی ہے۔

ایک لمحے کے لئے میرا سارا وجُود برف ہو گیا۔

کہیں مَیں منجمد نہ ہو جاؤں کہ آگ کا ہونا بھی ضروری ہے۔

شبنم کا نازک قطرہ اور دہکتا ہُوا سُورج۔

اور پھر؟

مجھے یُوں لگا جیسے سُورج میرا تعاقب کر رہا ہے۔

اور یہ سوال ـــــ یہ احساس میری رگ و پے میں حلول کر گیا۔

موسم بدل گیا ـــــ

اور جیسے کوئی سرپٹ دوڑتا ہُوا صحرا کی بیابان دھند میں کھو گیا تھا۔

اور شاید اب موسم کے بدلنے اور وقت کے چلن میں کوئی خاص بات نہ رہ گئی تھی۔

یہ سب یکایک ہُوا۔ سب خاموش تھے۔ اور مَیں صحرا میں موسم کے قدموں کے نشان ڈھونڈ رہی تھی۔

دفعتاً کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک کر مُڑی۔

لیکن وہاں تو کوئی نہ تھا۔ انتہائی اندھیرا۔ شبنم بُوندیں۔

اور دہکتا ہُوا سُورج ـــــ کیا کچھ تھا، کیا کچھ نہیں۔

صرف میں تھی اور میری پرچھائیاں۔

پرچھائیاں اس لئے کہ سر پر کئی سُورج چمک رہے تھے۔ اور آنکھیں تاریکی میں دفن تھیں۔ وجود برف کے اندر دھنس چکا تھا۔

خلاء میں گھورتے ہوئے مَیں یکبارگی چیخ پڑی۔

دہکتا ہُوا سُورج میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اور سُورج کی ننگی حقیقت کا انکشاف میری آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

اور میں ـــــ؟

مَیں نے تو آنکھیں مُوند لی تھیں۔ ایسا کرنے سے یہ تو احساس تھا کہ سُورج اب بھی میرا تعاقب کر رہا ہے مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مَیں اپنے آپ کو سُورج کی آنکھوں سے پوشیدہ سمجھ رہی تھی، جیسے خرگوش جھاڑیوں میں سر دے کر خود کو بھیڑیئے سے محفوظ سمجھ لیتا ہے لیکن یہ دھوکہ بھی بعض وقت کتنا اہم اور پیارا لگتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مَیں وقت سے خُوب آشنا ہو چکی تھی اور وقت کی آشنائی نے ہی تو مجھے رات کے سرد سینے پہ سر رکھ کر سو جانے کا پیغام دیا تھا۔

شاید سورج کے مزاج کا علم کسی اور کو بھی تھا۔

لیکن ـــــ

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ رات اور دن کا امتیاز ختم ہو گیا۔

اور دہکتے ہوئے سُورج سے آگ کی بارش ہونے لگی۔

شبنم اس بارش میں بُری طرح بھیگ چکی تھی ـــــ

(ریحانہ شیخ)

کتاب کا نام : شہرِ وفا
مصنف : نعیم راہی
ناشر : سہیل پبلیکیشنز۔ تانڈور۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔
قیمت : بیس روپے

دکن کے ہونہار اور جوان فکر شاعر نعیم راہی کا ۱۳۲ صفحات پر محیط شعری مجموعہ "شہرِ وفا" ۸۴ غزلوں اور ۲۴ نظموں پر مشتمل ہے۔ بیچ بیچ میں چند ایک رباعیات۔ قطعات اور متفرق اشعار کا ترشح بھی ہے۔ ابتدائی ۱۷ صفحات — حرفِ آغاز۔ مقدمہ۔ تعارف وغیرہ کی نذر ہیں۔

بنیادی طور پر جناب راہی غزل کے ہی شاعر معلوم ہوتے ہیں اور اُن کے اپنے الفاظ میں انہیں صنفِ شاعری میں غزل سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ "تاہم موجودہ دور میں غزل کی موضوعاتی ہمہ گیری ان کی غزل میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ اُنکی غزل گل و بلبل۔ لب و رخسار" وغیرہ کی فصیل سے نکل کر زندگی کی تلخ واقعیت کی بھی عکاسی کرتی ہے ——— جو مقتضائے وقت ہے جہاں راہی نے غزل کو نیا موڑ دے کر اس کی جدیدیت اور ارتقا میں واجب حصہ لیا ہے۔ وہاں وہ غزل کی کہنہ روایت سے قطعی بے نیاز بھی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا کلام عشق و محبت کی داستان اور حیات کے متنوع تجربات کے امتزاج کا ایک دلکش اظہار ہے۔ جس میں یاسیت اور قنوطیت کا عنصر غالب ہے۔ اور جس میں ان کی ذہانت۔ جدت اور ایک محتسس ذہنی شعور کی پہچان ملتی ہے۔ ان کی نظمیں بھی نہ صرف شعریت اور تفکر کی غماز ہیں بلکہ شاعر کے گہرے جذبات اور ایک انفرادی انداز کی حامل ہیں۔

راہی کے کلام میں فنی پختگی کے ساتھ زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ جدید۔ موزوں استعاروں کے استعمال نے اسے برجستگی عطا کی ہے۔ بیشتر غزلیں چھوٹی اور درمیانی بحر میں کہی گئی ہیں جس سے ان کی جاذبیت اور دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس مختصر مگر نمائندہ مجموعہ سے راہی کا مستقبل بطور شاعر درخشاں دکھائی دے رہا ہے۔ جہدِ مسلسل سے وہ اپنی شاعرانہ صلاحیت کو بطریقِ احسن بروئے کار لا سکتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں۔ ؎

ہر چہرے پہ زندگی کے روایت کی گرد ہے ✽ ابھرا ہے پھر سے وقت کے ماتھے پہ اک شکن

—✽—

کپڑے بھی کبھی قید کی دیوارے ہیں ✽ اُس جسم کے ننگے تو شراروں کی طرح ہیں

—✽—

اِک آرزو تھی زیست کی راہوں میں کھو گئی ✽ اک خواب تھا جو غم کی وادی میں مر گیا

—✽—

احباب خوش ہیں دیکھ کے چہرے کی تازگی ✽ ہیں کتنے زخم کچھ مرے اندر تو دیکھئے

—✽—

انسان آج پیتا ہے انسان کا لہو ✽ کیا زندگی سے چھن گئے آدابِ زندگی

—✽—

نظموں میں "تخلیق" "بازگشت" "میرا وطن" "بھوک" خوب ہیں۔

(ھردیال شوق)

موہن ایلچپوری

رُباعیات

آفات سے دِل اُن کا نہ ٹوٹا دیکھا
اُترا نہ غم و رنج سے چہرا دیکھا
یارب تری رحمت پہ بھروسہ تھا جنہیں
دِل، حوصلہ دیکھا تو انہیں کا دیکھا

•

جینے سے ہیں لاچار قناعت سے قریں
اللہ رے اللہ کے بندوں کا یقیں
دامن ہے تہی اور زبانوں پر یہی
اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں

•

کم عمر جواں سال پُرانے دیکھے
یاروں سے ملے نہ پیر و یگانے دیکھے
ناداں نہ کوئی ایک بھی دیکھا موہن
مطلب کو سبھی لوگ سیانے دیکھے

•

دُنیا میں پھر آئے ہیں جہاں گھوم لیا
کوشش سے جو مقصود تھا حاصل نہ ہُوا
پہلی سی عقیدت وہ عنایت کا شعار
بچوں ہی میں پائی نہ بزرگوں میں ملا

•

قارئین کی نظر میں

"تعمیر ہریانہ" فروری۔ مارچ اور اس کے بعد اپریل ۸۷ء کے شمارے موصول ہوئے۔ رسالوں کے خوبصورت سرورق اور اندر "گھر بیٹھے ہریانہ کے درشن" دیدہ زیب کتابت، طباعت اور بیجا اشتہارات سے پاک۔ پرچوں میں ایک مخصوص خوبی کا مجھے احساس ہوا۔

ہریانہ کی صنعتی اور زراعتی ترقی کی معلومات فراہم کر کے دلی مسرت ہوئی۔ خدا کرے آئندہ سالوں میں اور تیزی آئے۔

مضامین سبھی اچھے لگے خاص کر صالحہ عابد حسین کے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مظفر حنفی کے "ہولی اور اردو شاعری" نے متاثر کیا۔

راج ثریا کا "افق کے اُس پار" جاوید اختر کا "خودکشی" اور آر۔ ڈی شرما کا "پس نوشت" قابلِ تحسین ہیں۔ کرشن کمار طور، انجم عرفانی، ڈاکٹر رانا گنوری، ظہیر رحمتی، شباب للت اور نصیر پرواز کی غزلیں خوب ہیں۔ شان بھارتی کی غزل میں مرحوم باقی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

چلی ڈگر پر کبھی نہ چلنے والا ہیں
نئے ازکے موڑ بدلنے والا ہیں

● بھگوان داس اعجاز

چند روز قبل مجھے سینٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، نئی دہلی سے زیرِ اہتمام شائع شدہ نہایت ضخیم سالنامہ "وارشکی" (ہندوستانی ادب کا سروے) ۱۹۸۲-۸۳ء موصول ہوا۔ اس میں شامل ایک مضمون میں "تعمیر ہریانہ" کا ذکر ہندوستان میں شائع ہونے والے موقر ادبی جرائد کا نام گنواتے وقت کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے زیرِ ادارت نکلنے والا جریدہ ملک میں شائع ہونے والے تمام رسائل میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ آپ کی اس کامیابی کے لئے میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

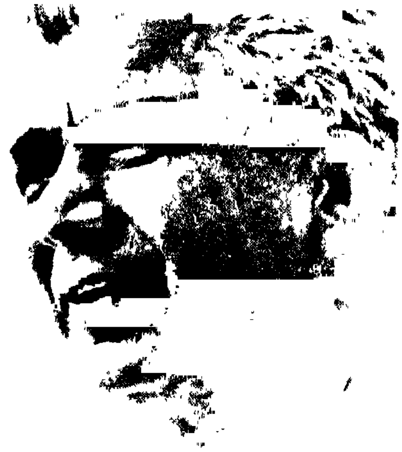
چند باتیں شمارہ زیرِ نظر اپریل ۸۷ء کی بابت بھی جو اپنی سابقہ روایتوں کا آئینہ دار ہے۔ تزئین و ترتیب کا معیار بدستور قائم ہے۔ یوسف ناظم طنز و مزاح کے میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ "وجود زن سے ہے....." مضمون ان کے قلم کے اعتبار کو قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔

ڈاکٹر حیات افتخار کا مضمون ان کی تنقیدی نگاہ پر بھروسہ کرنے کو اکساتا ہے۔ ان سے آئندہ اور اچھے مضامین کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ منظومات غنیمت ہیں۔ شباب للت کی غزل بطورِ خاص اپنی طرف ذہن کو کھینچتی ہے۔ ان کی غزل موجودہ دور میں کھوتی ہوئی قدروں کی طرف قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

● احترام اسلام

"تعمیر" کا مطالعہ عرصہ دراز سے کر رہا ہوں۔ آج کل ہر شمارہ نکھر اور سنور کر آ رہا ہے۔ تخلیقات معیاری طباعت اور کتابت صاف ستھری ہوتی ہے۔ جنوری۔ فروری۔ مارچ۔ اپریل کے شمارے زیرِ نظر ہیں۔ جن میں آزاد گلاٹی۔ حامدی کاشمیری۔ ڈاکٹر رانا گنوری، ساحل احمد۔ قمر سنبھلی۔ انجم عرفانی۔ شان بھارتی۔ شباب للت۔ ظہیر رحمتی کی غزلیں نوک پلک سے درست اور لائقِ تحسین و ستائش ہیں۔ صالحہ عابد حسین اور ڈاکٹر طلعت نقوی کے مقالات معیاری ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے بہت ہی عمدہ پیرائے میں "ہولی اور اردو شاعری" پر مضمون تحریر کیا ہے۔

● شہزاد انور رومانی



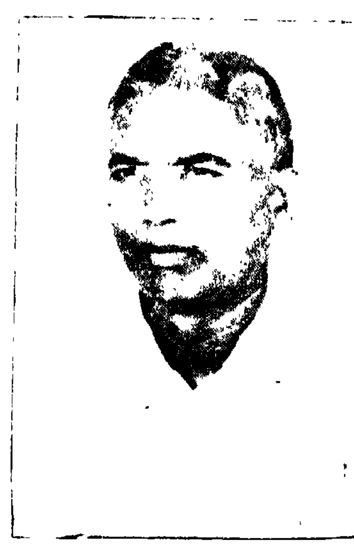
عالیجناب دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ، ہریانہ



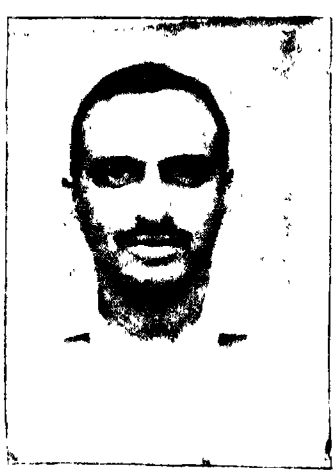
جناب بنارسی داس گپتا
وزیرِ خزانہ



جناب ویریندر سنگھ
وزیرِ آبپاشی و بجلی



جناب سورج بھان
وزیرِ مال



جناب سمپت سنگھ
وزیرِ صنعت



جناب آر۔ کے۔ پونیا
وزیرِ ترقی و پنچایت



وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال (دائیں جانب سے دُوسرے) نے ۲۳ جُون ۱۹۸۷ء کو دہلی سے
چنڈی گڑھ پہنچنے پر ہوائی اڈے پہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا۔ اس موقعہ پہ وزیرِ صنعت
جناب سمپت سنگھ، وزیرِ آبپاشی و بجلی جناب ویریندر سنگھ (دائیں جانب) اور وزیرِ ترقی و پنچایت
جناب آر۔ کے۔ پُونیا (بائیں جانب) بھی موجود تھے۔

تعمیر ہریانہ

جولائی ۱۹۸۷ء

21 SEP 1987

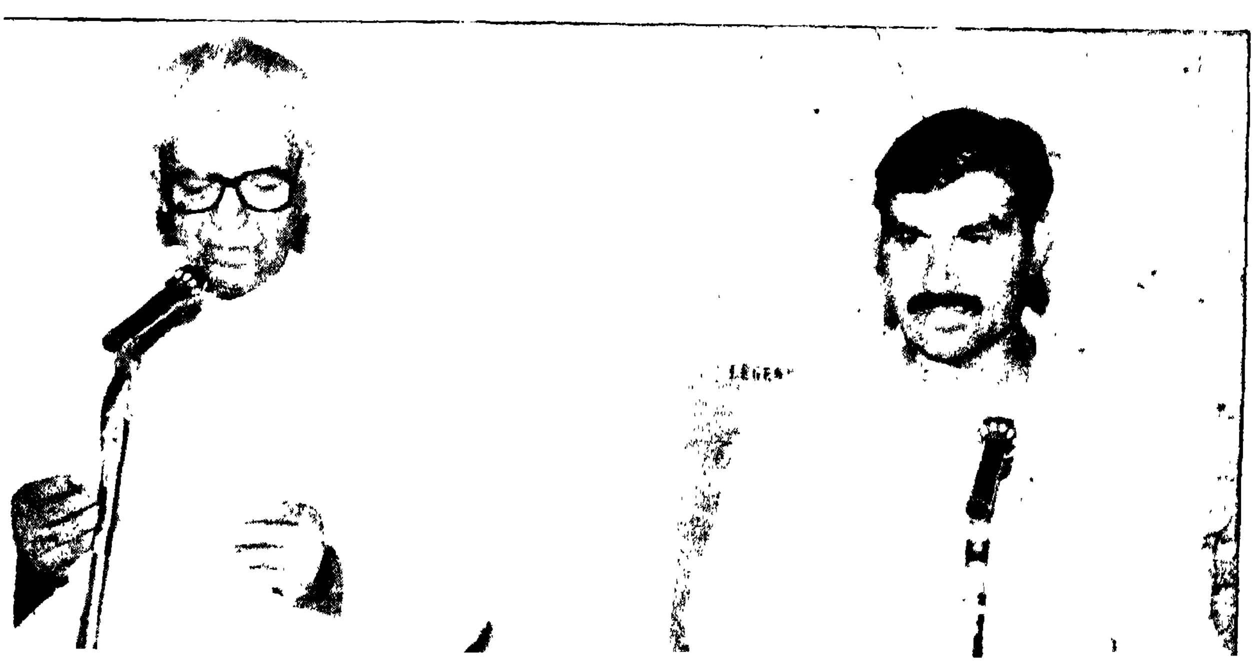




گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی اور وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال
۱۸ جولائی ۱۹۸۷ء کو ہریانہ وزارت میں شامل ہوئے نئے وزراء جناب پرمانند (بائیں جانب)
جناب من پھول سنگھ اور جناب دھرم ویر کے ساتھ۔

○

عالیجناب دیوی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ ۱۸ جولائی ۱۹۸۷ء کو جناب آر۔ ایس۔ مان کو
چیف پارلیمانی سیکریٹری کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔



Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

آپ کا محبوب معیاری ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

جولائی ۱۹۸۷ء | شمارہ نمبر ۷ | جلد نمبر ۱۵

ترتیب

مدیرِ اعلیٰ:

رنجیت الیسر

مدیر:

سلطان انجم

سرورق: منجیت

فی شمارہ ۵۰ پیسے
سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

حرفِ آغاز



حکومتِ ہریانہ فرقہ وارانہ خیر سگالی برقرار رکھے گی

سیّد مظفر حسین برنی
گورنر ہریانہ

گورنر ہریانہ عزت مآب سیّد مظفر حسین برنی نے ۱۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو ہریانہ اسمبلی کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کے دوران فرمایا کہ ہریانہ کے عوام نے ہریانہ سنگھرش سمتی اور اسکے فعال قائد چودھری دیوی لال کے چناؤ پروگرام اور پالیسیوں کی تائید کرتے ہوئے انہیں بے مثال فتح دلائی ہے۔ موجودہ سرکار اپنے وعدے عقیدت اور لگن سے پورے کرنے کا عہد کرتی ہے۔

عالیجناب برنی صاحب نے اپنے خطاب میں پنجاب سمجھوتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہریانہ سے متعلق کسی معاملے پر فیصلہ لینے سے قبل مرکزی حکومت کو حکومتِ ہریانہ سے صلاح مشورہ کرنا چاہیئے۔ چنڈیگڑھ اگر پنجاب کو دیدیا جاتا ہے تو ہریانہ کو ابوہر اور فاضلکا کے علاقے ملنے چاہیئں اور ہریانہ کے نئے دارالسلطنت کی تعمیر کا مکمل خرچ مرکز برداشت کرے۔

گورنر موصوف نے فرمایا کہ راوی بیاس واٹر ٹریبونل نے راوی بیاس کے وافر پانی میں سے ہریانہ کو 38.30 لاکھ ایکڑ فٹ پانی دیا ہے۔ یہ ہریانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ حکومتِ ہریانہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ ہریانہ کو پنجاب سے زیادہ پانی ملنا چاہیئے۔ ستلج یمنا لنک نہر کا تعمیری کام کسی مرکزی ادارے کے سپرد کیا جائے تاکہ اسے بلا تاخیر مکمل کیا جاسکے۔

نئی سرکار سماجی واقتصادی عدم مساوات اور عدم توازن کو دور کرے گی اور ریاست کے سبھی علاقوں کی ترقی کی طرف

توجہ دے گی۔ کوآپریٹو سیکٹر کے ذریعہ دیئے گئے قرضوں، انٹیگریٹڈ رورل ڈیولپمنٹ سکیم کے تحت دیئے گئے قرضوں اور ریاست کی مختلف ویلفیئر کارپوریشنوں کے ذریعہ جاری سکیموں کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کو دیئے گئے قرضے معاف کرنے کے لئے اصولی طور پر فیصلہ کیا جا چکا ہے۔

گورنر ہریانہ نے مزید فرمایا کہ نئی حکومت ہریانہ کے کسانوں کے حالات بہتر بنانے کے لئے پُرعزم ہے۔ حکومت کسانوں کو ان کی پیداوار کے لئے فائدہ مند قیمتیں دلانے کے لئے خاص طور پر کوشاں ہے۔ کھیتوں کے ساتھ لگے درختوں کی پہلی قطار سے ہونے والی آمدنی میں سے کسانوں کو حصّہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

چھوٹے پیمانے کی، دیہی، زراعت پر منحصر صنعتوں اور پسماندہ علاقوں میں صنعتی اکائیوں کے قیام پر زور دیا جائے گا۔ ان سے گاؤں میں بے روزگاری اور غریبی کے مسائل کو حل کرنے اور دیہی معاشرہ کو خود کفیل بنانے میں مدد ملے گی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار دینے کی سکیمیں مرتب کی جائیں۔

گورنر موصوف نے 17 جون 1987ء کو یا اس سے پہلے 65 برس کے ہو جانے والے ضعیفوں کو 100 روپے ماہانہ پنشن دینے کا بھی اعلان کیا۔ اس سکیم سے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ افراد مستفید ہوں گے اور اس پر 60 کروڑ روپے سالانہ خرچ ہوں گے۔

نئی سرکار عام زندگی اور انتظامیہ سے بھرشٹاچار کو ختم کر کے دم لے گی۔

آخر میں گورنر ہریانہ نے کہا کہ نئی حکومت ریاست میں فرقہ وارانہ خیرسگالی کو استوار رکھنے اور بلا امتیاز ذات و فرقہ سبھی شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے پُرعزم اور کمربستہ ہے۔

افسران عوام سے نرمی کا سلوک کریں۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال نے ریاست کے ایڈمنسٹریٹو سیکرٹریوں اور محکموں کے سربراہوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ رشوت ستانی کے ہر سطح سے خاتمہ کے لئے حکومتی پالیسیوں اور پروگراموں کے نفاذ میں افسران تہِ دل سے تعاون کریں۔ انتخابات میں کئے گئے وعدوں کی تکمیل اور عوام کی شکائتوں کے کارگر ڈھنگ سے ازالہ کی غرض سے افسران حکومت کے سرگرم ممبران کے طور پر کام کریں۔ وزیرِ اعلیٰ موصوف نے فرمایا کہ اسی سلسلے میں سبھی اضلاع کے ڈپٹی کمشنران، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سب ڈویژنل افسران (سول) کے نام پہلے ہی احکامات صادر کئے جا چکے ہیں کہ وہ عام دنوں کے علاوہ رخصت کے دنوں میں بھی غیر رسمی طور پر عوام کی شکایات سنیں۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ نے افسران سے کہا کہ وہ اُن کا نعرہ "بجلی۔ پانی کا پربندھ۔ بھرشٹاچار بند" یاد رکھیں اور اسے اس کے بنیادی جذبہ کے ساتھ لاگو کریں۔ موصوف نے افسران کو تاکید کی کہ وہ عوام کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور اپنے دورے کے دوران دیہات کی چوپالوں میں جا کر جنتا کی شکائتیں سنیں۔

سورج تنویر



غزلیں

آلامِ روزگار و غمِ عشقِ مہ وشاں
اِک جانِ ناتواں ہے، کئی دشمنانِ جاں

وہ میرا عہدِ رفتہ، مری عمرِ رائیگاں
مِل جائے پھر تو وہ بھی کر دل نذرِ گل رُخاں

ہم نے سمیٹ لی ہیں وہ سب اپنے واسطے
جتنی بھی تھیں شرابِ محبت میں تلخیاں

یادش بخیر! ذہن معطر سا ہو گیا
اے زلفِ مشکبار تری عطر بیزیاں

کرکے ترے خیالِ دِل آرا کو راہبر
چلتا رہے گا میری امیدوں کا کارواں

جو بن گیا ہے زینتِ گیسوئے تابدار
ہے گوہرِ گراں وہ مرا اشکِ خوں چکاں

ہم سے ہے آبروئے گُل و لالۂ چمن
ہم ہی تری نظر میں کھٹکتے ہیں باغباں

ضبط کا فُرقت میں یارا بھی نہیں
ماسوائے ضبط چارا بھی نہیں

تُم نہ دُنیا میں کسی کے بن سکے
دہر میں کوئی ہمارا بھی نہیں

انجمستاں تھیں یہی پلکیں کبھی
اب میسّر اِک ستارا بھی نہیں

حُسنِ خود بیں کی گراں گوشی بجا
عِشق نے کھُل کر پُکارا بھی نہیں

غرق کر دیتی ہے ساحل کی طلب
بحرِ اُلفت بے کنارا بھی نہیں

جی رہے ہیں جو سہاروں کے طفیل
کوئی اُن سا بے سہارا بھی نہیں

سہہ گیا ہر چند ضربِ کوہ پاش
شیشۂ دِل سنگِ خارا بھی نہیں

نئے لوگ

جوگندر پال

کوئی چار پانچ دہے پہلے میرے لڑکپن کا ذکر ہے کہ بعض لوگوں کو ہماری روزمرہ کی قیام اور خوابناکی کی کیفیات بے حد کھلتی تھیں۔ اپنی گرجدار تقریروں میں وہ موقع بے موقع ہمیں تیز تیز چلنے کی تلقین کرنا نہ بھولتے اور ہر دوسرے تیسرے فقرے پر اس بات پر زور دیتے کہ خدا کیلئے اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھو، جاگتے رہو، ورنہ جہاں پڑے ہو وہیں پڑے رہ جاؤگے اور انہیں سنتے ہوئے ہم اپنے گرمجوش انہماک میں بار بار ہڑبڑا کر نعرہ بلند کرتے، انقلاب زندہ باد!

سُن سُن کر آخر ایک مقام آ ہی جاتا ہے کہ آدمی انجانے میں سُنے ہوئے پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے، سو اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہمارے پاؤں رُکنے میں نہیں آتے اور اس دوران چلتے چلتے۔ چلتے ہم اپنے ٹھکانوں سے اتنا آگے نکل آئے ہیں کہ سمتوں کا تعین کھو بیٹھے ہیں اور تھک ہار کر جب سونے کیلئے گر جاتے ہیں تو آنکھیں چوپٹ کھول کر سوتے ہیں۔ چند ہی روز ہوئے میری بیوی اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور اپنی دانست میں اُسے اِس قدر منہمک پاکر مست مولا سا بنا باتیں کئے جارہا تھا۔ مجھے نامعلوم کیا سوجھی کہ یکلخت میں بڑی ملائمت سے اُس پر جھک آیا اور میں اُسی وقت وہ چیخ مار کر بیٹھ گئی "نہیں! نہیں!" "کیا ہوا ہے بھلی لوگ؟" میں شرمندہ ہوکر پرے ہٹ گیا۔ وہ ابھی تک بوکھلائی ہوئی تھی۔ "میں خواب دیکھ رہی تھی کہ کوئی پرایا مرد مجھ پر جھکا چلا آرہا ہے۔"

یہی تو ہوا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کو کھول کھول کر اتنا چپٹا کر لیا ہے کہ اپنے بھی صاف پرائے دکھتے ہیں اور اُن سے بچاؤ کی کوشش میں ہم سوتے میں دوڑ رہے ہوتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر جہاں پہنچتے ہیں وہاں پھر انہی کو پا کر چیخ مار کر آنکھیں کھول لیتے ہیں اور آنکھیں کھلنے پر بھی وہی بے یقینی، بیگانگی، بےقعایت وہی بھاگا بھاگ، کہیں بھی نہ جانے کیلئے بھاگا بھاگ!

چھٹی کے دن ہمارے گھر کے افراد اکثر آؤٹنگ پر جانے کی طے کرتے ہیں، مگر مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ جایا کہاں جائے۔

"چلو، کسی باغ میں دن گذارتے ہیں۔" میری بیوی تجویز کرتی ہے۔ "مگر نہیں، مجھے تو ہرے گھاس سے الرجی ہے۔" وہ سوچنے کیلئے ذرا رُکتی ہے۔ "چلو تمہارے ماموں کے یہاں چلتے ہیں۔" اگر اپنی بھابی سے اُس کی بنتی ہو تو وہ چوبیس گھنٹے وہیں بتا لے۔ "بھیا بہت اچھے ہیں۔" وہ شاید مجھے چڑانے کی خاطر کہتی ہے۔ مجھے اچھے لوگوں سے الرجی ہے۔ میرا سائنس دان بیٹا اُسے ٹوک کر سب کو بتاتا ہے کہ اُسے فیملی کے ساتھ کہیں نہیں جانا

ہے، کیونکہ اِسی وقت اُسے اپنی لیبارٹری پہنچ کر مائیکروسکوپ کے نیچے کسی بیماری کے کلبلاتے جراثیم کا مطالعہ کر کے اپنی رپورٹ تیار کرنا ہے۔ اِس کیلئے مائیکروسکوپ کی کیا ضرورت ہے؟۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے میری اَلّم غلّم سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں، پھر بھی میں بولنے سے باز نہیں آتا۔ سیدھے دو آنکھوں سے ہی دیکھ لو۔

میرا بیٹا مجھے کچھ جواب دینے کی بجائے اپنی بہن سے کسی بات پر جھگڑنے لگتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم سبھی اُن کے بے سبب جھگڑے میں اُلجھ جاتے ہیں اور اپنا آگے پیچھے کا حساب چکانے لگتے ہیں اور پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمروں کی طرف ہو لیتے ہیں اور بستروں پر دراز سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک سرپٹ بھاگتے ہوئے کیا پتہ کہاں پہنچنے کے لئے آوٹنگ پر چڑھ نکلتے ہیں۔

کسی اور کا تو مجھے پتہ نہیں، مَیں اپنے لڑکپن کے شہر میں گویا پرانے گھر کے "کچے" کوٹھے پر نیلی چھت کے نیچے پڑا ہوتا ہوں جہاں رنگ برنگے پرندوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ منڈلا رہے ہوتے ہیں اور بعض مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر ہمارے کوٹھے کی منڈیر پر اُتر آتے ہیں اور مدھر بولیوں میں اپنی پوری رام کہانی شروع کر دیتے ہیں جس پر کان دھرے میرے پر نکل آتے ہیں اور مَیں بھی اُن کی رفاقت میں اپنے "کچے" کوٹھے کے عین اوپر چمکیلی نیلاہٹوں میں اُڑ رہا ہوتا ہوں مگر اُسی دم مجھے "جاگتے رہو"، کا نعرہ سنائی دیتا ہے اور میری بیوی مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی ہوتی ہے۔ "یہ وقت کوئی سونے کا ہے؟ اُٹھو!"

"سونے کے وقت مجھے نیند نہیں آتی۔"

"تو گولیاں کھا کے سو جایا کرو۔ ہر کام اپنے وقت پر کرنا چاہیئے۔"

ہمہ وقت کام کے عادی ہو کر اب ہمیں یہ صورتِ حال درپیش ہے کہ سونے کیلئے سونے اور کھانے کیلئے کھانے کی بجائے ہم سوتے یا کھاتے ہوئے گویا کوئی کام انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ اور تو اور، ہمارے ہنسنے یا رونے میں بھی واقعی ہنسنے یا رونے کا کوئی جواز نہیں ہوتا، سوائے اِس کے کہ "یوگا فار سلیتھ"، کے کئی بار مطالعہ کے بعد ہم پر روشن ہو چکا ہے کہ ہنسنا یا رونا بدن کیلئے ایک نہایت مفید کسرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع سے پہلے پبلک پارکوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ بیسیوں بوڑھے نیکریں اور بنیانیں پہنے قطار در قطار ورزش کے طور پر زلعدہ قطار ہنس رہے ہوتے ہیں۔

کھانے کے سلسلے میں میرا سائنس دان بیٹا بڑا محتاط ہے، مگر مجھے شبہ ہے کہ اِسی احتیاط کے باعث وہ سدا بیمار رہتا ہے۔ جن کھانوں سے لذت کا بھرپور احساس ہو وہ اُسے قطعاً ناپسند ہیں۔ اُس کی تھیوری ہے کہ کھانا مزیدار سا لگے تو کھانے والا اِسے چبائے بغیر نگل جاتا ہے، اِس لئے کھاؤ تو ہمیشہ بے لذت کھاؤ اور لذت محسوس ہوتے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لو۔ وہ قاعدوں کلیوں کی بہت سخت پابندی کرتا ہے۔ اُس سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود مَیں کبھی کبھی اُس کے سامنے مقاماتِ دل کے اسرار کھولنا شروع کر دیتا ہوں جس کے جواب میں وہ دل کا رقبہ عین بین بیان کر کے پوچھتا ہے، اتنی سی جگہ میں یہ سارے مقامات کیونکر سما سکتے ہیں؟ میں جب جھوم جھوم کر اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ دل کتنا بڑا ہوتا ہے تو وہ مجھے اپنے جواب سے لاجواب کر دیتا ہے! "بحث مت کرو ڈیڈ، دل اگر اپنے چند انچوں کے رقبے سے ذرا بھی بڑا ہو جائے تو اُس کا فوری اپریشن لازمی ہو جاتا ہے۔"

اپنے بے معنی رفتار کی سہولتوں کے لئے آج ہم نے آکاش کو پرندوں سے خالی کر دیا ہے اور اپنی خود کار مشینوں میں بیٹھے نشے میں چنگھاڑتے ہوئے اپنے سروں پہ بے سمت اُڑتے رہتے ہیں۔ ہمارے گھنے جنگل کبھی ہمارا سارا زہر چوس لیا کرتے تھے اور ہمیں اپنا آپ اتنا ٹھیک معلوم ہوتا تھا مانو ہمارے [illegible] روشنیاں پھوٹ رہی ہوں مگر اِس دور میں ہمارے [illegible] میں ہرن اور ہاتھیوں کی چاپ کی بجائے ہمیں [illegible] کا شور سنائی دیتا رہتا ہے جو خاموش آور خوف زدہ اور معصوم بیڑوں کی جڑیں دن رات کاٹتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے سمندروں میں مچھلیوں کی بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ جو مچھلیاں نیوکلیائی دھماکوں سے بچ جاتی ہیں وہ بھی جان بچانے کیلئے خشکی کی طرف

سکتی ہیں۔ یہاں خشکی پر انسانوں نے زمین کے کلیجے میں تارکول بھر بھر کر اپنی کدورتوں کی راہیں خوب ہموار کر رکھی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہمیں اس لئے بے جا نہیں لگتا کہ انسانی دل کی کائناتی بیکرانی اِن کے رقبے میں سمٹ آئی ہے جہاں وہ اپنے بے ذات جراثیم میں منتقل ہوکر ایک اپنی ہی رفاقت میں کلبلا کلبلا کر سوچتا رہتا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے ساری دنیا نیست و نابود ہو جائے بس ایک وہی محفوظ رہے۔

ہم اپنے معاشرے میں مستقبل میں تال میل پیدا کرنے کی خاطر ابھی سے پریشان ہیں کیا اِس تال میل کا ماحصل یہ ہے کہ سب ایک دوسرے سے خوفزدہ ہوکر اپنے اپنے وجود کو اپنا زنداں بنالیں؟ آنے والے دنوں میں کیا ہمیں زندگی کی اکائی سے اُکھڑ کر دھجیوں میں منتشر ہو جانا ہوگا، کیا ہمارے دُکھ سُکھ کا کوئی ساجھی نہ ہوگا، سبھی رشتے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے؟ ہمیں کوئی اچھی خبر ملے گی تو اسے اپنے آپ کو ہی سُنا سُنا کر، خوش ہو ہوکر بالآخر ہم رو دیں گے؟ کیا۔ ؟ کیا۔ ؟۔

میرے سائنسداں بیٹے کا کہنا ہے "تمہیں اور کیا چاہیئے ڈیڈ؟ تم لوگ سمجھتے رہے کہ موت کے بغیر، ساتویں آسمان پر کیسے پہنچا جاسکتا ہے، ہم نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ یوں۔ اب جاؤ جیتے جی ساتویں یا آٹھویں آسمان سے ہو آؤ۔"

میں اپنے بیٹے کو کیوں کر سمجھاؤں کہ ہمارے نئے لوگ سائنسی کمال کو اِس حد تک چھو لئے ہیں کہ مر کھپ چکنے کے بعد بھی چل پھر رہے ہیں۔ اُن کے بنائے ہوئے روبوٹ بھی تو اُنہی کے مانند بے واسطہ جی جی کر اپنے معرکے انجام دے رہے ہیں۔

میں آپ کو ایک سچی واردات سناؤں؟

ایک دن مجھے اپنے ایک کردار کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو میری کہانی "دُکھ ہرن" کی سوہ مائی ہے۔ میں نے گھبرا کر جھٹ یہ کہانی کھول لی۔

"کیا بات ہے، مائی؟"

اُس نے بتایا، "آج میں بے دھڑک تمہاری بیٹی کے ذہن میں داخل ہوگئی۔ سوچا تھا، جب سے اُس نے اپنے شوہر سے طلاق لی ہے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے، اُس کا دکھ بانٹ لوں گی۔ مگر ظالم نے مجھے دو چار سطریں پڑھ کے ہی کتاب کو فرش پر پھینک دیا۔ میں دیوار سے ماتھا پھوڑ کر اوندھی پڑی رہی مگر وہ ہونٹوں کو گول کرکے سیٹیاں بجاتی رہی۔"

"پر سوہ مائی، تم کس کا دُکھ بانٹنا چاہتی تھی۔ میری بیٹی نے تو اپنی خوشی سے طلاق لی۔ جب کمپیوٹر نے اُسے بتایا کہ تمہاری اور تمہارے شوہر کی طبیعتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، وہ اپنی مرضی سے اُس سے الگ ہونا چاہتی تھی۔ اُس کا شوہر بے چارا تو ہاتھ جوڑ جوڑ کر اُس سے کہتا رہا، آؤ ایک بار پھر کمپیوٹر سے پوچھ لیتے ہیں، شاید کوئی راستہ نکل آئے۔"

اب راستہ تو ایک ہی باقی ہے: جو انسان ابھی روبوٹ نہیں ہو پائے وہ بھی جلدی سے اپنی تکمیل پر آپہنچیں اور روبوٹ ہو جائیں تاکہ آنے والی صدی کے منجدھار میں صرف خودکار مشینیں ہی مشینیں جی رہی ہوں، بے محبت اور بے واسطہ، اور وہ اپنے بچے پیدا کرنے کی بجائے حسب ضرورت اُنہیں بنالیا کریں، اور پھر مشینوں کے بوڑھا اور ناکارہ ہونے پر اُنہیں ڈمپ کرکے بہ عجبر ضائع کر دیا جائے، تاکہ زندگی کی ٹریفک میں کوئی خلل واقع ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ مشینیں روئیں گی نہ ہنسیں گی، بس ہوں گی اور اُن کے ہونے سے ناقابلِ یقین معرکے سر ہوتے رہیں گے۔ خدا کو کیونکر معلوم ہوگا کہ نسلِ آدم کی جگہ اب پُرزوں کے پیکر چکے ہیں؟ سزا؟ روبوٹوں کے لئے سزا کیا اور انعام کیا! انہیں نا درد محسوس ہوتا ہے، نہ کرب۔ کچھ بھی ہو جائے انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ مشینوں کی آپس میں ٹھن جائے۔ پھر؟ پھر سب کچھ اپنے انجام پر آپہنچے گا۔ زمین اور آسمان اور آسمان میں چمکتے ہوئے چاند تارے۔ ایک ایک سیارہ خلاء میں ڈوب کر خلاء ہو جائیگا۔ خلاء کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔ ہر سو خلاء ہی خلاء۔

جب کوئی بچہ بھوک سے بلکتے ہوئے دم توڑتا ہے، یا

کوئی معذور بیمار دوا دارو کے وسائل نہ ہونے کے باعث پرلوک سدھار جاتا ہے، یا اپنے آدرشوں پر اڑ جانے والے کو پھانسی پر جھلا دیا جاتا ہے تو میرے دل میں ویسا ہی کائناتی خلاء اُٹھنے لگتا ہے اور میں ڈر محسوس کرنے لگتا ہوں کہ زندوشوں کیلئے دوسری دُنیا بھی محفوظ نہ رہی تو کس امید سے مریں گے؟ زندگی کے نہیں تو کم سے کم ہمیں موت کے امکانات کو تو بنائے رکھنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ نظام کائنات میں بے حساب دیکھے اور ان دیکھے رابطے کارفرما ہوتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ ترا فزائش دراصل انہی رابطوں کے عرفان سے عبارت ہے۔

رچے بسے رشتوں کی توانائی سے خالی ہوکر ہم آپ ہی اپنے اقتدار کے بوجھ تلے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں گے۔ ہم اپنی ترقی کے جتنے بڑے وسیلے فراہم کرنے کے خواہش مند ہیں، ہماری محبتوں کی صلاحیت کا بھی اتنا ہی بڑا ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو پائے تو عدم توازن سے بھونچال کے اسباب ہونے لگتے ہیں۔

کرامت ادیب

غزل

فکر و فن میں جب تلک شامل لہو دل کا نہیں
ایک پتھر ہے کہ جس میں کوئی بھی چہرا نہیں

غم زدہ لوگوں کے دُکھ میں عمر بھر شامل رہے
بے سر و ساماں ہیں خود بھی یہ کبھی سوچا نہیں

یہ تو دشت سامری ہے، آ گئے ہیں ہم کہاں
لوٹ جانے کا کہیں اب کوئی بھی رستا نہیں

سلسلے آبادیوں کے، دیکھ تا حدِ نظر
اب تو دیوانوں کی قسمت میں کہیں صحرا نہیں

آشنا نا آشنا چہرے ہیں میرے چار سُو
اس دیارِ غم میں لیکن کوئی بھی اپنا نہیں

ہر قدم پر یاد تیری چل رہی ہے ساتھ ساتھ
میں وفا کی راہ گزر پر آج بھی تنہا نہیں

سُونے سُونے بام و در ہیں ایک مدت سے ادیب
اس مکاں میں آتے جاتے کوئی بھی دیکھا نہیں



دوسری اور آخری قسط

ابراھیم یوسف

اُردو ڈرامے میں لیلیٰ مجنوں کی روایت

تینوں ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ باوجود الگ الگ مقاصد سے لکھے گئے ان ڈراموں میں کچھ ایسے مواقع ضرور آئے ہیں جن کا تقابلی مقابلہ کیا جا سکتا ہے تینوں ڈراموں میں مکتب کا سین مشترک ہے جہاں بچے حروف تہجی یاد کرتے ہیں جس کے لئے حافظ عبداللہ اور دل لکھنوی نے ایک ایک نظم لکھی ہے جو سب بچوں کے لئے مشترک ہے جبکہ مرزا رسوا نے یہ جدت کی ہے کہ لیلیٰ اور قیس کے لئے علیحدہ علیحدہ نظمیں اور دو دیگر کرداروں کے لئے ایک ایک شعر لکھا ہے۔ ان تینوں ڈراموں کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

حافظ صاحب:

الہام الف سے ہوا اللہ ہے بس ایک
اور بے سے کرو بندگی اے بندو بنو نیک
تحقیق ہوا تے سے بری خو ہے تکبر
اور ثے سے روزہ کرو ثروت کو تصدق

منشی دل، مطلع عالم الف ایک نام ہے اللہ کا
ب سے خالق نے بنایا تاج بسم اللہ کا
ت سے تیری بے نیازی ث سے ثابت ہوگئی
ج سے جلوہ تراح سے حکم اللہ کا

مرزا رسوا: (بزبان لیلیٰ)

الف ہے ایک انوکھا حرف اسے اپنی ادا سمجھے
ہمارے بانکپن میں بے ہے کیوں اس کو کیا سمجھے
تغافل تے سے اور ثے سے ثابت ہے ثواب اس کا
جو سمجھے جیم سے جلوہ تو حے سے ہم حیا سمجھے

(بزبان مجنوں):

الف سے ابتدائے اُلفت اہل ادا سمجھے
اسی کو ابتدا سمجھے اسی کو انتہا سمجھے
نہ سمجھے بے سے کچھ ہم بے لوا لیکن
بُری ہے بے وفائی عشق میں اس کو بُرا سمجھے

(بزبان طرار جو ایک آوارہ لڑکا ہے):

بتا دیں ہم الف بے سے جو کچھ اچھا بُرا سمجھے
بھلائی کو بُرا سمجھے بُرائی کو بھلا سمجھے

(بزبان خیلا جو ایک طوائف کی لڑکی ہے):

الف سے اپنی آنکھوں کی قسم آشنا سمجھے
اور اس بے سے جو بے زر تو بالکل بلا سمجھے

جب ان تینوں ڈرامہ نگاروں کی ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو حافظ عبداللہ کا نقطۂ نظر اصلاحی نظر آتا ہے۔ مرزا رسوا اپنی نظموں کے ذریعے کرداروں کی ذہنی کیفیت ان کی سماجی حیثیت اور ان کے کردار پیش کرتے ہیں۔ دِل لکھنوی کا زاویۂ نگاہ مذہبی ہے۔ اس طرح مرزا رسوا کا انداز زیادہ ڈرامائی اور منطقی ہے۔ اور انہوں نے ان نظموں سے زیادہ بہتر کام لیا ہے۔

حافظ صاحب اور مرزا رسوا کے مکتب والے سین میں ہماری ملاقات چند کرداروں سے ہوتی ہے جو آگے چل کر ڈرامے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ کردار ہیں حافظ عبداللہ کے ڈرامے میں عیار اور مرزا رسوا کے ڈرامے میں طرار، خیلا اور خیلا کی ماں زہرہ۔ عیار کے بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں۔ "کہانی میں جتنے بھی ڈرامائی محل آتے ہیں ان سب میں بانکے میاں کے صاحبزادے کے وجود کو دخل ہے ان صاحبزادے کا نام حافظ عبداللہ کے ڈرامے میں عیار ہے۔ عیار صحیح اسم با مسمیٰ ہے اور قصے میں ہر جگہ اپنی عیاری کے کرشمے دکھاتا ہے۔"[1] وقار عظیم کا اس کردار کے بارے میں تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ عیار پورے ڈرامے میں لگائی بجھائی کا کام کرتا ہے اور جب وہ محسوس کر لیتا ہے کہ لیلیٰ قیس کی طرف مائل ہے تو کہتا ہے۔

مجھ میں دو چند قیس سے ہے خوبی و جمال
پھر ہائے مجھ پہ مرتی نہیں کیوں کوئی چھنال
ماں باپ سے یہ لیلیٰ کے کہتا ہوں حال جا
تا خوب وہ چکھائیں اسے عشق کا مزا

اور پھر وہ برابر ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی ادھر لگاتا رہتا ہے۔ مرزا رسوا کے ڈرامے میں ایک نہیں تین ایسے کردار ہیں۔ پہلا طرار اور دوسرا خیلا اور تیسرا خیلا کی ماں زہرہ۔ جب خیلا لیلیٰ مجنوں کو راز و نیاز کی باتیں کرتے دیکھتی ہے تو اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر جاتا ہے کیونکہ زہرہ نے قیس کو پھانسنے کے لئے مکتب میں داخل کرایا تھا۔ خیلا کی جھنجھلاہٹ اور طنز ملاحظہ ہو۔

امیر زادیاں جب مُفت میں کریں یاری
تو ہم غریبوں کی ہو کس طرح بسر دیکھو

اور آخر کار خیلا کی ماں زہرہ لیلیٰ کی ماں سے افشائے راز کر دیتی ہے۔ لیکن اس کا افشائے راز کرنا اس قدر مہذب نفسیاتی اور چالاکی سے بھرپور ہے کہ کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خاص طور سے لیلیٰ کے خلاف کسی قسم کا الزام لگا رہی ہے۔ ڈرامے کا یہ حصہ جس میں لیلیٰ کی ماں اور زہرہ کی گفتگو ہوتی ہے، زہرہ کے طبقہ کی بڑی اچھی طرح نمائندگی کرتا ہے۔ زہرہ کے کردار کی ایک جھلک ہمیں اس وقت نظر آجاتی ہے جب وہ خیلا کو مکتب میں داخل کرانے آتی ہے کہ اس میں حالات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اسکے مزاج میں شوخی اور مزاح بھی موجود ہے۔ جب مولوی صاحب خیلا کو مکتب میں داخل کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں

پڑھاؤں گا خوب اس کو علم و ادب
کہ خدمت کو حاضر ہوں میں روز و شب

اس پر زہرہ کا جواب ملاحظہ ہو۔

یہ کہتی ہے بندی ابھی صاف صاف
اسے شب کی خدمت سے رکھیے معاف

زہرہ صرف تین سینوں میں آتی ہے لیکن ہر وقت اپنا بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔

زہرہ سے گفتگو کے بعد لیلیٰ کی ماں لیلیٰ کے مکتب جانے پر پابندی لگا دیتی ہے بات یہیں ختم نہیں ہوتی خیلا اور طرار مولوی صاحب کو بتلا دیتے ہیں کہ لیلیٰ کو مکتب سے اٹھا لیا گیا ہے کیونکہ قیس ـــــ اس سے محبت کرنے لگا اور لیلیٰ کی بدنامی کا خوف تھا اس پر مولوی صاحب قیس سے کہتے ہیں۔

لو آج کھلا واہ بڑا کام کرو گے
کیا قصد ہے صاحب مجھے بدنام کرو گے

---

[1] حافظ عبداللہ کے ڈرامے؛ مرتبہ، سید امتیاز علی تاج: ص ۹۴

آوارہ مزاجوں کا پڑھانا نہیں اچھا
بس جائیے یاں آپ کا آنا نہیں اچھا

اِس طرح مکتب سے نکالے جانے کے بعد قیس گھر واپس نہیں جاتا اس کے گھر نہ پہنچنے پر اس کے باپ عبداللہ کے دریافت کرنے پر طرار کہتا ہے کہ ان کو لیلیٰ سے عشق ہوگیا تھا لیلیٰ کی ماں کو اس کی خبر ہوگئی اور انہوں نے لیلیٰ کو گھر بٹھا لیا اس لئے قیس کا دل اب مکتب میں کیا لگتا۔ اس کے بعد خیلا اور طرار لیلیٰ مجنوں کے تعلق سے قصہ سے غائب ہو جاتے ہیں لیکن حافظ عبداللہ کا عیار پورے قصہ میں موجود رہتا ہے اور اپنی عیاری سے ڈرامائی محل پیدا کرتا رہتا ہے مقابلتاً خیلا اور زہرہ کے کرداروں میں ایک ارتقائی سفر نظر آتا ہے جبکہ عیار ایک محدود دائرے میں گھومتا رہتا ہے — دلؔ لکھنوی کے ڈرامے میں ایسا کوئی کردار نہیں ہے۔

ایک موقع اور ایسا ہے جس کو حافظ عبداللہ، مرزا رسوا اور دلؔ لکھنوی نے اپنے اپنے ڈراموں میں جگہ دی ہے اور وہ موقع ہے مجنوں کے باپ کا لیلیٰ کے باپ کے پاس شادی کا پیغام لے کر جانا۔ لیلیٰ کے باپ کے انکار کو تینوں نے اپنے اپنے طور پر بیان کیا ہے۔

حافظ عبداللہ:

حضرت پسر تو آپ کا وہ ننگ کار ہے
جس کی تمام شہر میں گھر گھر پکار ہے
پوشیدہ ہوں گے آپ سے وہ اس کے فعل کیا
بدنامی جس سے میری ہوئی بے شمار ہے
انکار کا سبب ہے یہی ورنہ اے جناب
کیا تم کو بیٹی دینے میں کچھ ننگ و عار ہے

مرزا رسوا:

کیا میری بیٹی کو رسوا یہ کیا تھا
مجھے تو کہیں کا نہ رکھا یہ کیا تھا
چچا کی یہ حرمت ہے یہ بھی نہ سمجھا
گھرانے کی عزت ہے یہ بھی نہ سمجھا

یہ آوارگی ہو طبیعت میں جن کی
بھلا ان کو کس طرح دے کوئی بیٹی

دلؔ لکھنوی:

کون کہتا ہے قیس پاگل نہیں وحشی نہیں سودائی نہیں۔ سرزمینِ نجد کے ذرہ ذرہ سے پوچھئے، ہمارے شہر کے بچے بچے سے پوچھئے دشت نجد کے پتے پتے سے پوچھئے سب یک زبان ہو کر کہہ دیں گے کہ قیس پاگل ہے ابھی کل ہمارے کوچے میں لیلیٰ لیلیٰ پکار رہا تھا سر پر پتھر پڑتے تھے اور یہ خاک اڑاتا تھا۔ میں تو بس کہتا کر آپ کے در دولت پر بھجوا دیا تھا۔

بظاہر حافظ عبداللہ اور مرزا رسوا کے ڈراموں میں لیلیٰ کے باپ کے انکار کی وجہ ایک ہی نظر آتی ہے کہ مجنوں کی شوریدہ سری کے باعث ان کی بدنامی ہوئی ہے اور وہ مزید بدنامی کے لئے تیار نہیں۔ لیکن حافظ عبداللہ کے اشعار میں طنز کی جھلک نمایاں ہے اور وہ جلدی میں ہیں صرف تین شعر کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں جبکہ مرزا رسوا دس شعر کہتے ہیں اور اپنے اشعار میں ایک تہذیب کو پیش کرتے ہیں جس میں بزرگوں کا احترام اور خاندان کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے دلؔ لکھنوی صرف خطابت سے کام لیتے ہیں نہ تو کسی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ کوئی طنز بلکہ احسان جتلانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔

ایک موقع ایسا ہے جس کو مرزا رسوا اور دلؔ لکھنوی دونوں اپنے ڈراموں میں جگہ دیتے ہیں اور وہ ہے قیس کی کی فنافی العشق کی حالت جہاں قیس خود میں اور لیلیٰ میں کوئی فرق نہیں کرتا

قیس:

نہیں میرے سوا کوئی انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہیں ہے دوسری لیلیٰ انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہ اب ہے شمع و پروانہ نہ جلانا نہ جل جانا
فقط شعلہ ہے اب باقی انا لیلیٰ انا لیلیٰ

مرزا رسوا کی لیلیٰ عشق کی اس منزل میں نہیں ہے جہاں وہ انا القیس کہہ سکے چنانچہ وہ کہتی ہے

یہ کیا کہتا ہے تو مجنوں انا لیلیٰ انا لیلیٰ
ارے تو ہے مرا مفتوں انا لیلیٰ انا لیلیٰ
جنوں کے طور ہیں اے شک نہیں ہوتی خبر تا تک
پکاروں میں تجھے کب تک انا لیلیٰ انا لیلیٰ

دل لکھنوی دونوں کو فنافی العشق کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔

ملاحظہ ہو:

لیلیٰ: تو کون ہے؟

قیس: مجنوں؟

لیلیٰ: کون مجنوں؟ جو لیلیٰ کی محبت میں بدنام ہے ارے دیوانے تو کیا بکتا ہے مجنوں تو میرا نام ہے۔

قیس: تیرا نام ہے! ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ شاید تو سچ کہتی ہے۔ ؎

اگر انگشتری تو ہے تو پھر اس کا نگیں میں ہوں
اگر مجنوں ہے تو لیلیٰ تو بس محمل نشیں میں ہوں

لیلیٰ: فنا فی القیس ہوں میں تو فنا فی اللیلیٰ مضطر
محبت میں تری قدرت کے ہم نے راز پہچانے

عشق: دیکھ یہ جذبۂ دل ہے کہ جوشِ جنوں میں ایک دوسرے کو پہچاننا بھی مشکل ہے۔

حسن: اے ہادیٔ محبت ؎

بدل دو ان کی حالت کو ذرا ہوش میں آئیں
کہانی سوزِ غم کی سامنے دلبر کے دہرائیں

جب ہم مرزا رسوا اور دل لکھنوی کے ان سینوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا رسوا کے پیشِ نظر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فرق کو پیش کرنا ہے جو قیس اور لیلیٰ کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے جبکہ دل لکھنوی کے پیشِ نظر کرتبی اسٹیج کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو حیرت زدہ کرنا ہے کیونکہ اس میں آگے چل کر کبھی لیلیٰ غائب ہو کر قیس میں سما جاتی ہے اور کبھی قیس گم ہو کر لیلیٰ میں سما جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عشق و حسن کو اس سین میں اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ شروع میں ان کا جو مکالمہ ہوا تھا اس کا یہاں نتیجہ ظاہر کر دیں کہ اصل چیز عشق ہے حسن کی حیثیت محض اضافی ہے اگر دل لکھنوی کرتبی اسٹیج کا سہارا نہ لیتے تو سین زیادہ منطقی اور حقیقت سے قریب ہو جاتا۔

تینوں ڈراموں میں متعدد ایسے مواقع آئے ہیں جن کا تقابلی مقابلہ کیا جا سکتا ہے مثلاً حافظ عبداللہ اور دل لکھنوی نے قیس کو اپنے باپ کے ساتھ خانۂ کعبہ کی زیارت کرتے ہوئے بتلایا ہے اور دونوں اسے جنونی کیفیت ختم ہونے کے بجائے عشق اور شدت کی تمنا کرتے بتلاتے ہیں۔ حافظ عبداللہ نے یہ جدت کی ہے کہ ایک شاہ صاحب سے عربی میں ایک حمد پڑھوا دی ہے جبکہ دل لکھنوی پھر کرتبی اسٹیج کا سہارا لیا ہے لیلیٰ کی اس کے گھر پر فصد کھولی جاتی ہے اور یہاں قیس کی رگ سے خون جاری ہو جاتا ہے قیس کا باپ گھبرا جاتا ہے مگر ایک فرشتہ آسمان سے اترتا ہے اور کہتا ہے "یہ خون نہیں مرہم جان بیتاب ہے۔" طوالت کے خوف سے ہم اب ایسے مقابلوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

بہر حال مرزا رسوا کے بارے میں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مغربی ڈرامے پڑھے تھے۔ جب ہندوستان میں ڈرامے اسٹیج ہونے ہوئے تو انہوں نے دیکھے ہی تھے اور بہت ممکن ہے کہ انہوں نے ارسطو کی بوطیقا کا بھی مطالعہ کیا ہو لیکن مرقع لیلیٰ مجنوں لکھتے وقت وہ اسٹیج کو بالکل نظر انداز کر گئے۔ خود کلامی طویل طویل منظوم مکالمے اور ڈرامے کی طوالت اکتا دینے والی ہے اگرچہ ادبی حیثیت سے ڈراما قابلِ توجہ ہے چونکہ مرزا رسوا اپنے زمانے کے ڈراموں کی ادبی حیثیت سے مطمئن نہیں تھے ان میں اصلاح اور ڈراما نگاروں کے سامنے ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کی پوری توجہ ڈرامے کے ادبی پہلو پر رہی فنی پہلو قطعی نظر انداز ہو گیا جہاں انہوں نے مکالموں میں چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے وہ بہت شگفتہ اور رواں ہیں جن سے محظوظ ہوئے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ مثلاً:

خیلا: اجی تم تو جھوٹوں کے سردار نکلے
دغا باز، عیار، مکار نکلے

طرار : تیرے واسطے گھر سے دلدار نکلے
غضب ہے اگر تُو دِل آزار نکلے

خیلا : سمجھتی تھی زردار میں تم کو پہلے
مگر تم تو بالکل ہی نادار نکلے

طرار : نکل چل مرے ساتھ تو لے کے زیور
تو کچھ آرزوئے دلِ زار نکلے

خیلا : سُنیں گی جو بیوی تو ماریں گی جُوتے
نہ یہ بات مُنہ سے خبردار نکلے

زہرہ : یہ رنڈی سوہاگانے کی کیا گفتگو تھی
بڑے آپ طرار فرار نکلے۔

جہاں مرزا رسوا کے ڈرامے کی ایک ادبی اہمیت ہے وہیں کردار نگاری کی بھی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں خاص طور پر زہرہ اور طرار کے کرداروں میں اس کے علاوہ اس زمانے کے اخلاق اور تہذیب کے نمونے بھی مِل جاتے ہیں ایک دو شعر ایسے بھی ہیں جو آج بھی کبھی کبھی سُننے میں آجاتے ہیں۔ مثلاً

کتاب دیکھ چکیں اب ذرا اِدھر دیکھو
حجاب دے جو اجازت تو اک نظر دیکھو

حافظ عبداللہ اور دل لکھنوی کے اسٹیج سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ڈرامے اسٹیج کے آداب کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ حافظ عبداللہ کا پُورا ڈراما نظم میں ہے ایک دو مکالمے نثر مقفیٰ میں بھی آگئے ہیں جبکہ دِل لکھنوی آغا حشر کے انداز میں نظم اور نثر دونوں کا استعمال کرتے ہیں اور ہر مکالمے میں زورِ خطابت دکھلانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اُوپر عرض کیا گیا تھا کہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا پلاٹ آرام کے ڈرامے سے ماخوذ ہے مگر بقول وقار عظیم "آرام کے لکھے ہوئے لیلیٰ مجنوں کا پلاٹ سیدھا سادھا ہے حافظ عبداللہ نے اس سیدھے سادے پلاٹ میں کئی چیزوں کا اضافہ کرکے اسے تماشائیوں کے لئے زیادہ دلچسپ اور دلکش بنادیا ہے۔[1] حافظ عبداللہ نے عیار کا کردار شامل کر کے ڈرامے کو دِل چسپ بنانے کی ضرور کوشش کی ہے مگر وہ کہیں بھی ڈرامائی تصادم کی حالت پیدا نہ کرسکا اس کی لگائی بُجھائی سے تشویش کی صورت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ دل لکھنوی جگہ جگہ تشویش کی صورت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کے لئے بے حد فرسودہ طریقہ استعمال کرتے ہیں یعنی کرتبی اسٹیج کے ذریعہ مافوق الفطرت واقعات پیش کرنا انیسویں صدی میں یہ طریقہ ضرور لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا تھا اور لوگ اس میں دلچسپی بھی لیتے تھے مگر بیسویں صدی کے آتے آتے یہ طریقہ بالکل متروک ہوچکا تھا۔ آغا حشر، احسن لکھنوی اور دُوسرے ذمہ دار ڈراما نگاروں نے کبھی اس کا استعمال نہیں کیا۔ دل لکھنوی نے لیلیٰ کی شادی شہزادہ بخت سے کراکے تصادم کا موقع ضرور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اس سے خاطر خواہ کام نہ لے سکے نہ تو لیلیٰ اپنے ماں باپ کے فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور نہ شہزادہ بخت لیلیٰ کے مجنوں سے عشق کا مقابلہ کرتا ہے بلکہ لیلیٰ کو طلاق دے کر بہن بنا لیتا ہے۔

دل لکھنوی نے اپنے ڈرامے میں ایک مزاحیہ پلاٹ بھی شامل کیا ہے جو بہت ادنیٰ درجہ کا واہیات مزاح پر مشتمل ہے، اس میں اور آغا حشر کے ضمنی پلاٹوں میں رتی بھر بھی فرق نہیں ہے۔ حافظ عبداللہ علیحدہ سے کوئی ضمنی پلاٹ تو شامل نہیں کیا ہے مگر ڈرامے کے ابتدا میں جب قیس پیدا ہوتا ہے اور قیس کا باپ اعلان کرتا ہے کہ آج جس جس گھر میں بچہ پیدا ہوگا اسے انعام دیا جائے گا تو عیار کا باپ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ وہ ساتویں مہینے ہی میں بچہ جن دے کہ وہ انعام حاصل کرسکے اور اپنی بیوی کو مار کوٹ کر اسی دن میاں عیار کو پیدا کرا لیتا ہے بس پورے ڈرامے میں یہی ایک شگفتہ صُورتِ حال پیدا ہوتی ہے مرزا رسوا کے ڈرامے میں علیحدہ سے کوئی ضمنی پلاٹ تو نہیں ہے مگر انہوں نے تفننِ طبع کے لئے ایک دو سین ضرور شامل کئے ہیں ان سینوں میں باپ بیٹے کی گفتگو تہذیب سے گری ہوئی ہے ملاحظہ ہو۔

---

[1] حافظ عبداللہ کے ڈرامے : مرتبہ سید امتیاز علی تاج : ص ۹۴

طرار: مجھے خیلا سے ملوادے ابے باوا ابے باوا
نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا
مردوں میں عشق میں آتنک نہیں لیتا خبر اب تک
ابے بوبک ابے بڈھے ابے باوا ابے باوا

خونخوار خاں: ابے باوا ابے باوا یہ کیا بکتا ہے تو مرغے
ابے یہ گفتگو ہم سے؟ ابے مردک ابے گرگے
ملاؤں تجھ کو خیلا سے یہ تو کہتا ہے باوا سے
تو ہم تیرے بنیں بھڑوے؟ ابے مردک ابے گرگے

حافظ عبداللہ کا مقصد تماش بینوں کو زیادہ سے زیادہ گانے سُنانا ہے المیہ زیادہ طربیہ کم اور ان میں اندر سبھا' چہل مذاق' شیریں فرہاد اور گل بکاؤلی کی ... دھنوں کا استعمال کیا گیا ہے جو اپنے زمانہ میں بیحد مقبول تھیں۔ دِل لکھنوی کے ڈرامے میں بھی کافی گانے ہیں جن میں کچھ بے حد مقبول تھے جو ابھی کچھ عرصے پہلے تک سُننے میں آجاتے تھے مثلاً۔

اے عشق عطا کردے اس کیف کا پیمانہ
ہر شخص پکار اُٹھے دیوانہ ہے دیوانہ
میری جاں زُلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھا ہے
نگاہِ ناز سے بجلی گرانا کس سے سیکھا ہے

یہ شعر تو اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔

مکتبِ عشق ہے تعلیم محبت کے لئے
میں یہاں آتا ہوں اس بُت کی زیارت کے لئے
لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

دل لکھنوی کے ڈرامے پر آغا حشر کی اس قدر زبردست چھاپ ہے کہ اگر مصنّف کا نام نہ بتلا کر ڈرامہ پڑھوایا جائے تو اکثر حضرات دھوکہ کھا کر اسے آغا حشر کا ڈرامہ سمجھ سکتے ہیں۔ دل لکھنوی نے یہ ڈراما آغا حشر کی نذر کیا ہے۔ بہر حال حافظ عبداللہ اور دِل لکھنوی کے ڈرامے اپنے زمانے کے بہت مقبول ڈرامے تھے۔

سوال یہ ہے کہ آخر لیلیٰ مجنوں اس قدر مقبول کیوں ہوا کہ اُردو ڈرامے کے آغاز سے بیسویں صدی کی دُوسری تیسری دہائی تک اس پر برابر ڈرامے لکھے جاتے رہے اور دُوسرے یہ کہ اس نے اُردو ڈرامے کی روایت پر کیا اثرات ڈالے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اردو ڈرامے کا آغاز ہُوا اُس وقت ایک طرف تو غیر ملکی تسلط کے باعث عام طور پر بد دِلی اور شکست خوردگی کا احساس پیدا ہُوا دوسری طرف اقدارِ حیات اور معاشرت میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ معاشرت کی شکست و ریخت سے سماج حواس باختہ ہوگیا۔ رقص و موسیقی کی محفلیں جو دلچسپی کا ذریعہ اور معاشرت کا حصّہ تھیں اب مہنگا سودا بن گئیں اور صرف تقاریب کے موقع پر ہی منعقد ہوتی تھیں اس طرح معاشرہ میں ایک خلا پیدا ہُوا جسے کسی سستے ذریعہ سے پُر کئے جانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی اس خلا کو ڈرامے نے پُر کیا اور ابتدائی ڈرامے رقص و موسیقی کی محفلوں کی بدلی ہوئی شکل میں پیش کئے گئے۔ ان میں ایک لنگڑی لولی کہانی بھی ہوتی تھی۔ جس کا انجام ہمیشہ طربیہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں میں جو بد دِلی اور شکست خوردگی پیدا ہوئی تھی وہ اس خوشگوار انجام سے وقتی طور پر سکون حاصل کر سکیں اور تھیٹر ہال سے نکلنے کے بعد آسودگی کا احساس ہو سکے علاوہ اس کے پیچھے سنسکرت ڈرامے کی روایت بھی تھی جو المیہ ڈرامے کی پیشکش کو ممنوع قرار دیتی ہے اسی پس منظر میں جب آرام کا لیلیٰ مجنوں پہلی بار اسٹیج کیا گیا تو لوگوں کے سامنے ڈرامے کا ایک بدلا ہُوا رُوپ سامنے آیا اور وہ لوگ جو ڈرامے کو صرف ایک تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے ڈرامے کی اس قوت سے بھی واقف ہوئے کہ وہ انسان کے لطیف جذبات میں ہل چل بھی پیدا کرسکتا ہے، دُوسرے یہ کہ عوام نے اپنی تمام ناآسودگیوں اور شکست خوردگیوں کی جھلک لیلیٰ اور مجنوں کی زندگیوں میں دیکھی جس نے ان کو بہت متاثر کیا۔

جس طرح امانت کی اندر سبھا نے اُردو ڈرامے پر اثرات ڈالے ہیں اسی طرح لیلیٰ مجنوں نے بھی اُردو ڈرامے کو متاثر کیا ہے۔ آرام جو اُردو کے ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں سے

ایک ہیں سب سے پہلے لیلیٰ مجنوں پر ڈرامے لکھے اور پھر بعد میں ڈرامہ نگار اس روایت کو آگے بڑھاتے رہے اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ وہ مقبول قصے اور لوک کتھائیں بھی اسٹیج پر مقبول ہو سکتی ہیں جو عام طور پر مشہور ہیں چنانچہ ہیرا رانجھا، سسّی پنوں' مرزا صاحباں' شیریں فرہاد' وامق عذرا' نل دمن' اور بعد میں رومیو جیولیٹ پر متعدد ڈرامے لکھے گئے اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اُردو ڈرامے کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا دوسرے یہ کہ ان قصّوں اور کتھاؤں کا انجام بالعموم المیہ ہے جس سے اردو ڈرامے میں المیہ ڈراموں کی روایت پڑی اور اُردو ڈرامے کا وقار بڑھا۔ یہ ضرور ہوا کہ ان المیہ ڈراموں میں عشق و محبّت کے جذبات کو اپنے انتہائی عروج پر پیش کیا گیا اور پھر اُردو ڈرامے میں نہ صرف عشق و محبّت بلکہ ہر قسم کے جذبات کو غیر متوازن انداز میں پیش کیا جانے لگا اور پھر یہ روایت اُردو اسٹیج سے فلموں میں منتقل ہو گئی بہر حال اگر ہم لیلیٰ مجنوں پر لکھے گئے اُردو ڈراموں کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو اُردو ڈرامے کے بہت سے نئے نئے گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ ●............

ہیرا نند سوز

غزل

وہ شخص جس کی نگاہوں میں پیار ہوتا ہے
گھنے شجر کی طرح سایہ دار ہوتا ہے

پہن رکھا ہو اگر سب نے مصلحت کا لباس
تو غمگسار بھی کب غمگسار ہوتا ہے

چھپائیں لاکھ نہیں چھپتی کیفیت دل کی
اگر ہنسیں بھی تو غم آشکار ہوتا ہے

عطا کیا ہے ترے انتظار نے مجھ کو
وہ ایک لمحہ جو صدیوں پہ بار ہوتا ہے

چلے جو خانۂ دل میں اداسیوں کی ہوا
تو دُور حدِ نظر تک غبار ہوتا ہے

وہ اہلِ حق تھے صلیبیں جنہیں نصیب ہوئیں
تمہارا سوز! کب اُن میں شمار ہوتا ہے

تخلیقات بھجواتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔

تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے

ڈاکٹر نریش

افسانہ

کھُلا دروازہ

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو چارپائی پر لیٹے ہوئے خالد نے ہاتھ کی کتاب سرہانے پر اوندھی رکھ دی اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ حیران رہ گیا۔

"شفیقہ تم؟"

"کیوں، کیا میں تمہارے یہاں نہیں آ سکتی؟"

"نہیں، ایسا تو نہیں ۔۔۔"

"لیکن کیا؟" کہتے کہتے وہ اندر آ گئی۔ خالد نے دروازے کے پٹ بند کئے اور آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شفیقہ کُرسی کا سہارا لئے کھڑی ہوئی تھی۔

"آج تمہیں یہاں آتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟"

"کس سے؟"

"مجھ سے۔"

"تم سے تو کبھی بھی ڈر نہیں لگا خالد۔" کہتے کہتے وہ آرام کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اپنی پیٹھ کو ڈھیلا چھوڑ کر کُرسی پر اطمینان سے جم گئی۔

"تو اس روز تمہیں یہاں آنے میں کیا پریشانی تھی؟"

"پریشانی تو کچھ نہیں تھی۔"

"انکار کرتے ہوئے تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ تمہارے انکار سے دُوسرے کے دِل پر کیا گُزرے گی۔ تم ۔۔۔۔" بات خالد کے ہونٹوں میں ہی ادھوری رہ گئی۔

دوپٹے کا کنارا انگلی پر لپیٹتے ہوئے شفیقہ نے سوچا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس روز اسے خالد کی بات مان لینا چاہیئے تھی اس بات کو لے کر خالد ایسا جذباتی ہو جائے گا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر، کہیں بھی، کبھی بھی، رات کو نہیں ٹھہری تھی۔ فلم کا آخری شو دیکھنا بھی اس نے صرف اِس لئے قبول کر لیا تھا کہ وہ خالد کو اتنی بار منع کر چکی تھی کہ اب اسے انکار کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔ خالد کی کئی مہینے سے ایک ہی ضِد تھی کہ وہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلے۔ اور فلم بھی آخری شو۔ رات کے ایک بجے فلم ختم ہوئی تو خالد نے دُوسری ضِد پکڑ لی تھی کہ اتنی رات گئے اتنی دُور اپنے کمرے میں جا کر کیا کرو گی۔ آس پڑوس کے لوگ خواہ مخواہ سوالیہ نظروں سے تمہاری طرف دیکھیں گے۔ لیکن یہاں وہ سمجھوتا کرنے سے معذور تھی۔ اُس نے ایک بار دبی زبان سے یہ تو کہا کہ وہ چاہے تو اسے کمرے تک پہنچا آئے لیکن اُس نے اس پر زور نہیں دیا۔ آس پڑوس سے اسے کسی قسم کا کوئی خوف

نہیں تھا۔ دیر رات گئے، اکیلی، رکشا میں جاتے ہوئے بھی اسے کسی خطرے کا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ سینما گھر سے خالد اور اس کے گھر کا آدھا راستہ ایک ہی تھا۔ رکشا والے سے شفیقہ کے محلے تک کے پیسے طے کر کے خالد اس اُمید سے رکشا میں سوار ہو گیا تھا کہ آدھا راستہ چل کر شفیقہ اس کی بات مان لے گی۔ ایک مسلسل اصرار نے بات چیت میں ذرا سی تُرشی بھی لا دی تھی لیکن جب شفیقہ نے فیصلہ کُن انداز میں انکار کر دیا تھا تو وہ دُکھی دل کے ساتھ اس چوراہے پر رکشا ہی سے اُتر گیا تھا، جہاں سے ان کے راستے الگ ہوتے تھے۔

اِس واقعے کو بارہ روز ہو چکے تھے۔ اِس دَوران اُن کی مُلاقات نہیں ہوئی تھی۔ خالد اس سے ناراض تھا۔ اُس کی انا کو گہری چوٹ لگی۔ شفیقہ کو معلوم تھا کہ خالد اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ پچھلے بارہ دن میں ہر روز وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ آج خالد آئے گا یا کم از کم آفس میں اس کا فون ضرور آئے گا، لیکن جب یہ خاموشی برداشت سے باہر ہو گئی تھی تو سوائے اس کے اور چارہ ہی کیا تھا کہ وہ خود خالد کے کمرے پر آئے اور اس سے بات کرے۔

ایک طویل خاموشی ان دونوں کے درمیان گھِر آئی تھی۔

"اُنگلی پر لپٹا کھُلتا دوپٹہ کندھے پہ درست کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"تم کچھ کہتے کہتے رُک گئے تھے خالد۔ اپنی بات پُوری کرو نا۔"

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خالد نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔

"میری ہر بات ہی ادھُوری ہے شفیقہ۔ بات کیا، زندگی ہی ادھُوری ہے۔ کس کس کو پُورا کروں گا۔"

"تم ناراض ہو؟"

"کس سے؟"

"مجھ سے۔"

"مَیں کون ہوتا ہُوں جو تم سے ناراض ہو سکوں۔"

"تمہارا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ تم ناراض ہو۔"

"ناراض بھی ہوؤں تو تمہیں میری کیا پرواہ ہے۔"

"پرواہ تو ہے۔ اور تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ مجھے تمہاری پرواہ ہے۔"

"وہ یقین پُرانا پڑ گیا تھا اور پھر اس رات اپنے ہی بار سے دب کر ٹوٹ بھی گیا۔"

شفیقہ کے چہرے پر اُداسی کی گہری لکیریں اُبھر آئیں۔ باتوں باتوں میں دل کی بات اس طرح کہہ دینے کا فیصلہ کہ کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا جائے کمزور پڑتا دکھائی دینے لگا۔ قصداً خود کو نارمل رکھتے ہُوئے وہ سیدھی گفتگو پر اُتر آئی۔

"تم اس لیے ناراض ہو نا کہ مَیں اس رات تمہارے ساتھ یہاں کیوں نہیں آئی؟"

خالد خاموش رہا۔

"مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ جو لڑکی تمہارے ساتھ فلم کا آخری شو دیکھنے جا سکتی ہے، اُسے تمہارے گھر آنے میں کیا قباحت ہو گی۔ تمہاری ناراضگی کسی حد تک دُرست ہے چونکہ تم نے جو سوچا تھا، جو چاہا تھا، جو کہا تھا، وہ نہیں ہُوا۔ تمہاری ضد کا مقصد صرف مجھے یہاں لانا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد مجھے اکیلے پن کے خوف سے، آس پڑوس کے لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا بھی تھا۔ مَیں اس کی قدر کرتی ہوں خالد، لیکن اکیلے پن سے ڈرنا اب میری فطرت میں شامل نہیں رہا۔ اس لیے کہ حالات نے زندگی کی جس سنسان پگڈنڈی پر مجھے لا کر چھوڑا ہے، وہ تمام سفر شاید اکیلے ہی طے کرنا ہے۔ اور آس پڑوس کی پرواہ نہ مَیں نے کبھی کی ہے، نہ اب کرتی ہوں۔ آس پڑوس سے تو مَیں اپنے محلے میں کبھی نہیں ڈری — نہ میکے میں، نہ سسرال میں۔ یہاں تو کرائے کے مکان میں رہتی ہوں۔ یہ شہر، اس شہر کے تمام محلے، محلّوں میں رہنے والے تمام لوگ میرے لیے اجنبی ہیں۔ ان سے کیا ڈروں گی۔ اس لیے چلی گئی تھی۔ تم گھر تک پہنچا آتے تو باقی کا آدھا راستہ بھی تم سے باتیں کرتے ہوئے کٹ جاتا۔ تم نہیں تھے تو باقی کا سارا راستہ اللہ اللہ کر کے کاٹ لیا۔"

"تم یہاں چلی آتیں میرے ساتھ تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا؟"

"خالد! تم یہ سوچ کر اس بات کو درگزر نہیں کر سکتے کہ میری کوئی مجبوری رہی ہوگی۔"

"مجبوری......" وہ حقارت سے مُسکرا دیا۔ اسکی مسکراہٹ انتہائی مصنوعی تھی۔ اس مصنوعی مسکراہٹ میں سے اس کی زخم خوردہ انانیت کی بُو آرہی تھی جسے شفیقہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

شفیقہ چپ ہو رہی۔ بات کرتے کرتے وہ اشتعال میں آرام کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اب پھر اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور آرام کرسی کی ڈھلواں پُشت سے جا لگی۔ اس کے اندر کا بحران پھر اُبھر آیا تھا۔ کیسے بتادے وہ خالد کو کہ اس کی کس مجبوری نے اس کے قدموں کو باندھ لیا تھا، اس طرح کہ ادھر کو قدم بڑھانے کے تصور سے ہی اس کی رُوح لرز گئی تھی۔ لیکن بغیر بتائے گزارا بھی تو نہ تھا۔ کرسی پر سیدھی ہو کر اس نے ایک بار پھر پور نگاہوں سے خالد کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ خالد کسی گہرے خلا میں جھانک رہا ہے۔

"خالد! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھے ہیں، ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرے دل میں تمہاری کتنی عزت ہے۔ مجھ پر تمہارے احسان بھی ہیں۔ اصغر کے طلاق دینے کے بعد اگر تم نے مجھے یہاں نوکری نہ دلوائی ہوتی تو معلوم نہیں آج میں کہاں ہوتی۔ ابّا تو بچپن میں ہی چھوڑ گئے تھے۔ اماں بھی اکلوتی بیٹی کو بیاہ کر یوں چل دیں جیسے بس اسی ایک کام کے لئے زندہ رہ رہی تھیں۔ میکے کے سُونے گھر میں جتنے دن بھی رہی، اماں کو یاد کر کے روتی رہی، اور رشتہ داروں کے بول سہتی رہی۔ اس اندھے کنوئیں سے باہر نکال لایا مجھے تمہارا خط اور میں تمہاری آواز کا دامن تھامے یہاں چلی آئی۔ اس اتنے بڑے بیگانے شہر میں ایک لمحے کے لئے بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں یہاں تنہا ہوں۔ تمہاری نگاہوں کا سایہ ہر وقت میرے ساتھ رہا ہے۔ مگر...... تم مجھے اس قدر غلط سمجھو گے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس طرح مجھ سے روٹھ جاؤ گے، اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔"

خالد خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا ــــ بہت کچھ کہہ دینے کے بعد جب شفیقہ اپنی مجبوری بتانے پر آئی تو الفاظ دغا دے گئے۔ اور وہ خاموش ہو گئی۔ کمرے کا ماحول ذرا سی خاموشی کا بار برداشت کرنے کے نا قابل ہو گیا تھا ــــ خالد کی زخم خوردہ انا برابر رِستی چلی جا رہی تھی، پکے ہوئے پھوڑے کی طرح مواد بہا رہی تھی۔ شفیقہ کی زبان بند ہوئی تو اسکی نگاہیں بولنے لگیں۔ نگاہوں کی زبان کا ایک ایک لفظ اتنا تیز، اتنا تیکھا تھا کہ خالد اسے برداشت کرنے میں خود کو معذور محسوس کر رہا تھا۔ نگاہوں کی زبان کے وار سے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش میں وہ بغیر کچھ کہے اُٹھا اور کمرے کے ایک کونے میں رکھا اسٹوو جلانے لگا۔

شفیقہ اسے دیکھتی رہی۔ اسٹوو کے جلتے ہی پورا کمرہ اسٹوو کی آواز کے شور سے بھر گیا۔ لیکن اس شور میں بھی وہ دونوں اپنے اپنے اندر چل رہے طوفان کی آواز صاف سُن رہے تھے۔ اسٹوو جلا کر اُس نے پاس پڑی بالٹی میں سے پانی لے کر چائے چڑھا دی۔ جب تک چائے بنتی رہی وہ چائے کا پکنا، اُبلنا دیکھتا رہا۔ پھر اسٹوو بند کر کے اُس نے چائے دو گلاسوں میں ڈال دی۔ پُورے کمرے میں ایک خوفناک خاموشی پھیل گئی تھی۔ اب آوازوں کا شور نہیں تھا۔ صرف کیروسین کے جلنے کی بدبو تھی جو ان دونوں کی ناک میں سے ہوتی ہوئی ان کے اندر تک اُتر رہی تھی۔

چائے کے دونوں گلاس کرسی اور چارپائی کے درمیان پڑی تپائی پر رکھ کر وہ پہلے کی طرح چارپائی پر آ بیٹھا۔ شفیقہ اس دوران خود پر قابو پا کر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اپنے دل کی بات کہہ ڈالے گی ابھی، اسی وقت۔

"شاید میرا جواب تمہاری تسلی نہیں کر سکا ہے خالد ــ میں لفظوں کے جنگل میں بھٹک گئی تھی ورنہ تمہیں سیدھے صاف لفظوں میں اپنی مجبوری بتا دوں تاکہ تمہاری ناراضگی باقی نہ رہے۔ میں اس ناراضگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے بُری طرح تھک گئی ہوں۔ اب مجھ میں مزید بوجھ ڈھونے کی طاقت نہیں ہے۔"

خالد نے سوالیہ مگر سُونی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور تپائی پر سے چائے کا گلاس اُٹھا لیا۔

"اس رات میں تمہارے یہاں چلی آتی تو ظاہر ہے کہ ہم اسی ایک

چارپائی پر سوتے۔ مجھے تمہارے ساتھ سونے میں کوئی پریشانی نہیں، کوئی خوف نہیں، کوئی عار نہیں، مگر ایک بار پڑوسن کا بیٹا میرے بستر پر سو گیا تھا۔ میں نے لحاظ میں پڑوسن سے کہہ دیا کہ اسے یہیں سویا رہنے دو اور وہ اسے وہیں میرے کمرے میں سوتے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس رات میں لمحہ بھر بھی نہیں سو سکی تھی۔ پوری رات مجھ پر قتل کی رات کی طرح گذری تھی۔ ہر لمحہ یہ خیال گذرتا رہا کہ اصغر میرے ساتھ لیٹا ہوا ہے۔ تمام رات اس کا تین بار چیخ کر دہرایا ہوا ایک لفظ میرے کانوں پر پتھراؤ کرتا رہا۔ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ میں نے دسوں بار روشنی جلا کر اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ پڑوسن کا یہ سات سال کا بچہ اصغر نہیں ہے، پشیتو ہے لیکن ہر بار اس کے چہرے پر اصغر کے خد و خال حاوی ہوتے رہے اور میں خوف سے سہم سہم جاتی رہی۔ وہ تو بچہ تھا، پڑوسن کا بیٹا، مگر تم.... تم تو بھرے پُرے مرد ہو خالد۔ تمہارے پاس سوئی ہوتی تو مجھ پہ کیا گزرتی، اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتے۔ میں پاگل ہو گئی ہوتی خالد، پاگل۔"

اشتعال میں اپنے اندر کا سب کچھ اُگل کر شفیقہ متحمل ہو گئی۔

اس نے وہ سب کہہ دیا تھا جس کا ایک ایک لفظ گذشتہ بارہ روز سے اس کے حلق میں اٹک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چائے کا گلاس اُٹھایا تو ہونٹوں تک آتے گلاس میں اس کے آنسوؤں کی دو بُوندیں مدغم ہو گئیں۔ خالد نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر گلاس تپائی پر رکھ دیا اور کہا۔

"اِس وہم سے جتنا ڈرو گی، تمہارے اندر کا خوف اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ اصغر تمہاری توجہ کا حقدار قطعاً نہیں ہے۔ اس کی پرچھائیں تک بھی تمہارے خواب و خیال میں نہیں آنی چاہیئے —— وہ انسان نہیں، وحشی درندہ ہے۔"

"درندہ ہے، اسی سے تو خوف کھاتی ہوں۔"

"خوف کے اس دائرے سے باہر نکلو شفیقہ۔ اس رات تمہیں یہاں لانے میں شاید میری ہوس شامل رہی ہو گی مگر آج میں تمہیں کھُلی دعوت دیتا ہوں کہ جتنی راتیں، ممکن ہو میرے ساتھ گذارو۔ کسی اَن دیکھے خطرے کو بڑا کرتی جاؤ گی تو وہ ایک ایسا پہاڑ بن جائے گا جسے سر کرنا تم سے کبھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے یہاں سونے میں تمہاری عصمت محفوظ رہے گی۔"

"میں اندھے کنوئیں میں گری پڑی ہوں خالد۔ مجھے اس میں سے باہر نکلنے دو۔ روشنی کی جو کرن آج تم مجھے دے رہے ہو۔ شاید اسے تھام کر میں باہر نکل آؤں گی۔ مگر اس میں وقت لگے گا۔"

"میرا دروازہ ہر رات تمہارے انتظار میں کھُلا رہا کرے گا شفیقہ۔ جس رات کو تمہارے قدم اس کمرے میں داخل ہوں گے، اسی رات تمہارے ماضی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ماضی کا وہ وحشت ناک دروازہ تم اپنے ہاتھوں بند کرو، اسلئے خود اسے کھُلا ہی چھوڑ رہا ہوں۔ بند کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔"

چائے کا گلاس خالی کر کے شفیقہ نے تپائی پر رکھ دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو میں چلوں؟"

دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے شفیقہ کو رُخصت کیا اور دروازے کے پٹ کھُلے چھوڑ کر ہی اپنی چارپائی پر آ بیٹھا۔

> ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ قارئین، پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد سے "تعمیر ہریانہ" کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنے ادب نواز دوستوں سے ایک بار پھر درخواست کرنا ہے کہ وہ خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ پرچے کی خریداری کے لئے ایجنسیاں قائم کرنے کے لئے بھی ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔
>
> —— ادارہ

امر چند قیس جالندھری



غزل

لب پہ نہیں کوئی گلہ دل میں غم ستم نہیں
اپنے طریقِ عشق میں نالۂ دم بہ دم نہیں

یاس کا بھی اَلم نہیں۔ درد کا بھی الم نہیں
غم کے پہاڑ ہوں تو ہوں اب مجھے کوئی غم نہیں

تیری جفا بھی ہے ادا۔ تیرا ستم بھی ہے کرم
تیری جفا، جفا نہیں۔ تیرا ستم، ستم نہیں

رنج کا بھی نہیں ملال۔ فکر کا بھی نہیں خیال
لب پہ نہیں کوئی سوال۔ آرزوئے کرم نہیں

شرم و حیا بھی دل نشیں۔ قہر و بلا بھی دل نشیں
مکر و ریا بھی دل نشیں، کوئی ستم، ستم نہیں

لطف کا پوچھنا ہی کیا؟ لطف تو پھر بھی لطف ہے
تیرے عتاب و ظلم بھی لطف و کرم سے کم نہیں

لذتِ غم نے کر دیا قلب و جگر کو بد مزہ
زہر بھی انگبیں ہے اب۔ زہر بھی مجھ کو سم نہیں

تیری ادائے حسن نے دہر کو کر لیا مرید
کون سا سر ہے۔ جانِ جاں! جو ترے در پہ خم نہیں

دعوئ ضبطِ عشق سے مہر بہ لب ہوں آج تک
مانا کہ دم پہ بن گئی! مانا کہ دم میں دم نہیں!

تیغ کو جن پہ فخر تھا۔ جن پہ قلم کو ناز تھا
آج کل اُن کے ہاتھ میں تیغ نہیں۔ قلم نہیں

لالہ وشوں کے عشق میں عمر ہی قیس! کٹ گئی
میری کتابِ زیست میں کوئی بھی باب اہم نہیں

ڈاکٹر محمد حنیف

غالب کا نظریۂ فن

فنی نظریات غالب کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں جن سے غالب کے شعری کلام کا بہت حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ ہر ذی ہوش قاری میں غالب جیسے عظیم شاعر کے شعری نظریے کو جاننے کا تجسس ہونا فطری امر ہے۔ غالب کی شاعری میں بے پناہ حسن، نکتہ رسی، بلندیٔ تخیل، احساس کی شدت، فکر کی ندرت اور محدود اسپیس میں دنیائے معنی پیش کرنے کی جو صفت ہے ان ساری خصوصیات کی ترجمانی ان اشعار سے مکمل طور پر نہیں ہوتی ہے جو غالب کے فنی نظریات پیش کرتے ہیں پھر بھی غالب کے شاعرانہ مزاج اور رویّوں کی نشاندہی بہت حد تک ہو ہی جاتی ہے۔

غالب کی شاعری کی تعریف جتنی بھی کی جائے بجا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاعری پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اور تنقید کی زبان ششدر رہ جاتی ہے۔ اگر کسی نے غالب کے دیوان کو الہامی کہا ہے تو غلط نہیں ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر عظیم تخلیق وہبی ہوتی ہے کسبی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مزید وضاحت اور نکھار کے لیے شاعر یا فنکار اپنے تراکیب و الفاظ میں تغیر و تبدل لا کر یا اپنے ابتدائی مسودہ میں قطع برید کر کے ہی اسے آخری ترتیب دیتا ہے۔ غالب اپنی شعری تخلیق کے سلسلہ میں تاثیر غیبی یا امداد غیبی کا اعتراف کرتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

افلاطون جیسا شاعر کا مخالف بھی کسی نہ کسی ڈھب میں شاعر کی الہامی صفت کا اقرار کرتا ہے۔
سڈنی اور شیلی بھی شاعری کے سلسلہ میں اسی حقیقت سے ہمنوا ہیں۔

حالی نے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس ضمن میں لکھا ہے۔
"سب سے پہلے ہم اسباب کی صلاح دیتے ہیں کہ شاعری کے کوچہ میں اسی شخص کو قدم رکھنا چاہیے جس کی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا گیا ہے ورنہ تمام کاوشیں اور تمام کوششیں رائیگاں کی جائیں گی یوں تو ہر فن اور ہر پیشے میں کمال حاصل کرنے کے لیے مناسبت فطری کی ضرورت ہے لیکن شاعری میں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔"

غالب کے یہاں ایک آئیڈیل فن کار یا شاعر کا نظریہ ملتا ہے۔ یعنی وہ اس خیال کا حامی ہے کہ کوئی شاعر اپنی شاعری کو دانستہ طور پر مقصدی اور واعظانہ بنا دے، کسی خاص ازم، مقصد یا آئیڈیالوجی سے دانستہ وابستگی شاعر یا فن کار کی نظر کو محدود بنا دیتی ہے۔ بحیثیت شاعر غالب وابستگی سے پرے زندگی اور زندگی کے بوقلموں تجربات اور اسکی حقیقتوں پر مکمل گرفت میں یقین رکھتا ہے۔ وہ جارج برنارڈ شا کی طرح آرٹ کو کسی خاص سماجی مقصد یا افادی نقطۂ نظر کا ترجمان نہیں بنانا چاہتا ہے۔ بلند اور عظیم آرٹ کی تخلیق کسی مخصوص افادی مقصد سے بلند ہو کر ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور ایسے ہی تاثرات غالب کے شعر سے بھی اخذ ہوتے ہیں۔ ؎

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

شاعر، فن کار ہزار انکار کرے اسے صلہ کی پرواہ نہ سہی، ستائش یا مقبولیت کی پرواہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے اور انسان ہی سے خطاب در پردہ اُسکی مدعا ہوتی ہے۔ وہ خلا میں سانس نہیں لیتا بلکہ سماجی ہوتا ہے۔ غالب کے دور میں میر، سودا کی عام فہم زبان قارئین کو محبوب تھی لیکن غالب نے دانستہ طور پر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے بیدل کے مشکل طرزِ شاعری شروع کر دی لیکن اس کی سخت مخالفت کی گئی تب غالب نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بعد میں عام پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب نے اپنا طرزِ کلام بدل دیا، اسے حد درجہ سادہ اور سلیس کر دیا۔ غالب میں ایک اوّل درجہ کے شاعر کی تمام خوبیاں موجود تھیں ان خوبیوں میں سادہ، سلیس زبان سے ناقابلِ بیان پُرکاری اور تاثیر پیدا ہو گئی اور صحیح معنوں میں غالب کی شاعری جادو ہو گئی۔ مثال کے لئے کہیں سے بھی شعر لیا جا سکتا ہے جیسے ؎

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اور آگے چل کر غالب نے طرزِ بیدل سے عدم اطمینانی کا کھُلا اعلان کر دیا۔ ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللّٰہ خاں قیامت ہے

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ طرزِ بیدل میں مشق کرنے کے نتیجہ میں غالب کے اندازِ بیان میں انوکھا پن پیدا ہو گیا اس لئے اُس کی وہ کوشش بیکار نہیں گئی۔

غالب کو بھی صنفِ غزل سے شکایت ہے کہ اس کا ظرف اتنا کشادہ نہیں کہ اس میں وہ اپنے خیال یا بیان کو وسعت دے سکے۔ ؎

بقدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لیے

اُس کی غیر معمولی شاعری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غالب کی یہ شکایت بجا تھی، ہمارا خیال ہے کہ غالب غزل کے لئے تھے یا صنفِ غزل غالب کی وجہ سے ناقابلِ تردید، یہ خارج از بحث ہے۔ غالب کے شاعرانہ کمال میں صنفِ غزل کی تنگی کی نمایاں کارکردگی ہے۔ دوسری صنف میں وہ شاید ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرتے ہیں اُن کی رُباعیات، اُن کے قصیدے ثبوت ہیں۔ غالب کا رجحان اجتماع، ارتکاز (Concentration) اور اختصار کی طرف یا تو فطری طور پر تھا یا صنفِ غزل میں شعر کہتے کہتے ان سب کے لئے ذوق پیدا کر لیا تھا۔ جو بات غالب کے ذریعہ کم اسپیس میں اشارے، کنائے، اختصار اور ابہام سے کہی جاتی ہے زیادہ کشش، گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے جسے وُسعت بیان دینے پر ان باتوں کے زائل ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ:-

'Too much of Explanation Spoils the lion's Leap'

ظاہر ہے کہ صنفِ غزل Too much of Explanation کی اجازت نہیں دیتی اور یہی بات غالب کے لیے عطیہ نعمت ثابت ہوئی۔ غالب نے لفظ 'ریختہ' کا استعمال کئی جگہوں پر کیا ہے۔ پہلے اُردو کو عام طور سے ریختہ کہا جاتا تھا اور دہلی میں 'ریختہ' سے مُراد شاعری کی زبان لی جاتی تھی۔ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا، غالب جیسے قیامت کے لئے

ہے کہ ریختۂ بیدلؔ بیجا پیچیدگی، طوالت اور تصنع کا شکار ہے جس سے غالبؔ کو آگے چل کر بجا طور پر تنفر پیدا ہو گیا۔ غالبؔ کی نظر میں آئیڈیل ریختہ یا مثالی زبانِ شاعری صاف، سادہ، سلیس اور پُر معنی ہے جو میرؔ اور غالبؔ کے یہاں مشترک ہے۔ آئیڈیل ریختہ میرؔ کے یہاں دستیاب ہے جس کی نشاندہی غالبؔ نے اپنے شعر میں کی ہے:

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اپنے دُوسرے اشعار میں بھی غالبؔ نے میرؔ کی تعریف کی ہے:

میرؔ کے شعر کا احوال کروں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

٭

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

٭

غالبؔ، میرؔ کو بحیثیت شاعر ایک آئیڈیل شاعر تصور کرتا ہے کیوں کہ میرؔ کے یہاں ایک اعلیٰ درجہ کے خالص شاعر کی تمام صفتیں موجود ہیں۔ میرؔ کے کلام میں تجربہ کی سچائی، مشاہدہ کی صداقت، احساس کی شدت اور گیرائی، حد درجہ اختصار اور زبان و الفاظ کی سادگی اور تعبیر بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ علاوہ ازیں یاس بداماں انسانی زندگی کی حسرت آگیں تصویر کشی بھی جا بجا ملتی ہے جو قارئین کے دلوں کو بغیر متاثر کئے نہیں رہتی۔ یُوں تو بہت ساری خوبیاں غالبؔ اور میرؔ کے یہاں مشترک ہیں لیکن غالبؔ کا کلام اور بھی خوبیوں کی بنا پر کلامِ میرؔ سے فزوں تر ہے۔ 'خُونِ جگر سل کو بناتا ہے دل' کا اطلاق کلامِ میرؔ اور کلامِ غالبؔ دونوں پر ہوتا ہے۔ غالبؔ جیسا عظیم شاعر معتقدِ میرؔ بلا سبب نہیں ہے۔ مثال کے لئے میرؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تُجھے
نظر میں سبھوں کی خُدا کر چلے

٭

دِکھائی دیئے یُوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

٭

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اِس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

٭

اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے
ناتواں اِک غُبار اُٹھتا ہے

٭

اُس کی طرزِ نگاہ مت پُوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پُوچھو

٭

جس کو تم آسمان کہتے ہو
سو دِلوں کا غُبار ہے اپنا

٭

میرؔ کے مندرجہ بالا اشعار میں سادگی، سچائی، سوز و گداز، بھرا خلوص اور فطری پن کی خُوبیاں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہیں۔ جن کی شرطیں ایک شاعر کے لئے غالب نے پیش کی ہیں۔ غالبؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

٭

آتا ہے ایک پارۂ دِل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

٭

بھرا ہے غالبؔ دِل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اِس کو

٭

دیکھیے آہ ہماری بھی اثر رکھتی ہے
سخنِ درد شنا ہے کہ اثر کرتا ہے

٭

سوز و تپش اور درد کا عنصر میر اور غالب دونوں کے یہاں ہے بلکہ میر کے یہاں زیادہ ہی ہے۔ غالب کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ زبان و اظہار یا شعری کلام میں اسی وقت جان آتی ہے جب اسکے پردہ میں دردِ دل نہاں ہوتا ہے یا جب اس سے یہ بیساختہ نکلتا ہے۔ جب سادہ دِل کہیں پھنستا ہے، جب اس پر کچھ بیتتی ہے یا جب یہ زخم خوردہ ہوتا ہے تو کلام میں اثر آفرینی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اور ایسی حالت میں شعر کا خوبصورت ہونا کوئی عجیب چیز نہیں۔ جس روز ذوق مر گیا تو غالب خوش ہو کر کہتا تھا کہ آج ہوشیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ وہ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا، صہبائی شعر کہنا کیا جانے، نہ اُس نے شراب پی، نہ معشوق کے ہاتھ کی جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانہ میں پڑا۔ یعنی اچھے شعر کی تخلیق کے لئے تعددِ حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے کچھ حقیقی تجربات اور مشاہدات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ غالب کا کہنا ہے۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

کچھ شعراء کے بارے میں کلیم الدین احمد کا کہنا ہے کہ انہیں عشق کے بارے میں کوئی حقیقی علم نہیں ہوتا صرف وہ لیلیٰ، مجنوں، شیریں، فرہاد کا لفظی ذکر کرتے چلے جاتے ہیں،

یہ لیلیٰ بھی اُن کی، یہ شیریں بھی اُن کی
اُنہیں کیا خبر، عشق کیا بد بلا ہے

نہ وہ ہجر جانیں، نہ وہ وصل جانیں
خیالِ محبت، خیالی سراپا

اُن کی کہی بات کسی اور کے لئے صحیح ہو سکتی ہے، غالب کے لئے قطعی صحیح نہیں ہے۔ غالب نے عشق کو جھیلا تھا، اسے بہت ہی قریب سے دیکھا تھا اور اسے اپنی ہر سانس میں کھینچا تھا اسلئے غالب کی شاعری کے لئے خوبصورت و شعلہ فشاں ہونا ایک فطری امر ہے۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں اپنے اندازِ بیان کے سلسلے میں ایک خیال کا اظہار کیا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اس شعر سے یہ بات قطعی طور پر ظاہر نہیں ہوتی کہ غالب کو بھی اُن سے مکمل اتفاق ہے جو غالب کی شاعری کی عظمت کا راز اُسکے اندازِ بیان کو گردانتے ہیں۔ غالب کے اندازِ بیان کو اوّلیت دینا غلط فہمی کا شکار ہونا ہے۔ غالب یا دوسرے کامیاب فن کار یا شعراء کے یہاں اندازِ بیان کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں اس میں دم خم کشش یا انفرادیت پیدا نہیں ہوتی جب تک تصورات، تخیلِ کاملہ، شدتِ احساس، حقیقی جذبات، مشاہدات و تجربات سے اس کی پشت پناہی نہیں ہوتی۔ جہاں تجربات کی صداقت اور احساس کی تپش اور معنی آفرینی ہوگی تو زبان و الفاظ و اظہار میں زور، تاثیر اور مقناطیسیت پیدا ہو ہی جائے گی۔ ایسا تصور کرنا خیال باطل ہے کہ اور شعراء میں بھی کلامِ غالب کی ساری خوبیاں دستیاب ہیں لیکن ان سب پر غالب کی برتری صرف اندازِ بیان کے سبب ہے اس نکتہ کی وضاحت غالب کے اشعار سے کی جا سکتی ہے؛

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

نفرت کا گمان گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ادھر وہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے کہ
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

٭

مندرجہ بالا کسی بھی شعر میں اندازِ بیان کوئی الگ حقیقت نہیں رکھتا یا کسی بھی شعر کی اہمیت و قدر و قیمت یا کشش طرزِ ادا میں نہاں نہیں ہے بلکہ معنی آفرینی، پروازِ تخیل، تصور زائی، استعارات، کنائے اور اشارات میں مضمر ہے۔ شاعر ایک سچے عاشق کی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے وہ بحیثیت عاشق متنفر ہوتا ہے اور رشک و حسد سے بھی دوچار ہوتا ہے جب اُس کے سامنے کوئی دوسرا اُس کے معشوق کا نام لیتا ہے اپنی محبت میں دوسرے کی شرکت کو قرینِ قیاس جان کر اُس کے دل پہ ایک چوٹ لگتی ہے پھر بھی ساری باتوں اور سارے غموں پر معشوق سے عاشق کا عشقِ حقیقی غالب آجاتا ہے اور اپنے محبوب کے نام لینے کو نام لینے سے منع نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کے نام سے بہرحال اُس میں ایک عجیب ناقابلِ بیان سحر آگیں کیفیت، سرور و نشاط اور بیخودی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہر شعر میں فکر و جذبہ کا امتزاج تخیل کی پرواز اور امرِ واقعہ کی آواز یا اس کا پرتو اور خیال کی نکتہ رسی وافر طور پر دستیاب ہے جس سے غالب کے کلام میں انفرادی شان اور جادوئی صفت پیدا ہوتی ہے یا جس سے غالب کے اندازِ بیان میں جان آتی ہے۔ اُوپر دیئے گئے شعر نمبر ۵ میں 'بن جائے کچھ ایسی' اور 'بن آئے نہ بنے'، جیسے اظہار میں بظاہر لفظی بازیگری معلوم پڑتی ہے لیکن اس کی اصل روح معنی داری میں پوشیدہ ہے۔ شاعر متمنی ہے یا دُعاگو ہے کہ اپنے جذبۂ دل کی تاثیر سے اُس کے معشوق پر بن جائے "کچھ ایسی" یا بندھ جائے کچھ ایسا طلسم کہ اُسے عاشق کے پاس بن آئے، کسی لمحہ کسی پہلو کل نہ ملے۔ اسی طرح تقریباً ہر جگہ غالب کے شعر میں محدود الفاظ میں دنیائے معنی کی تہہ داری کی کارکردگی نمایاں ہے۔

غالب کے سادہ اشعار میں بھی پُرکاری یا لالہ کاری خونِ جگر کی رنگ آمیزی سے ہے یا یہ صفت اس لئے ہے کہ غالب اپنے خوانِ گفتگو پر دل و جان کی مہمانی کرتا ہے:

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے غالب
کروں خوانِ گفتگو پہ دل و جان کی میہمانی

٭

غالب کبھی کبھی احساس کرتے ہیں یا تنگ دلی کی وجہ سے یہ شعری کلام کو منفی ڈھنگ میں دیکھتا ہے یا اسے غیر تشفی بخش گردانتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

شعر کی فکر کو اسد چاہیئے ہے دل و دماغ
عذر کہ یہ فسردہ دل بے دل و دماغ ہے

٭

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

٭

اپنی شاعری کے سلسلہ میں غالب کا مایوسانہ انداز بجا نہیں ہے کیونکہ دلِ آرامیدہ کی عدم موجودگی اور فسردہ دلی کی کثرت کے باوجود غالب کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہوا۔ مشکل حالات میں بھی شکستِ خوردگی سے مغلوب نہیں ہوا اور ہر حال میں زندگی اور مسکراہٹ کا چراغ جلائے رکھا۔ غالب کی شاعری کا فائدہ عرضِ ہنر میں نہ ہو، افادی نقطۂ نظر سے یا روزمرہ کی دُنیاوی ضروریات کی تکمیل کے حصول کے زاویہ سے یہ MIS FIT ہو لیکن کسی بھی اعلیٰ و عظیم شاعری کی طرح کلامِ غالب انسانی قدر و قیمت اور بے پناہ انسانی امکانات کا سرچشمہ ہے اور یہ کسی نہ کسی رُوپ میں پوری زندگی اور کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ غالب کے اشعار اچھے معنی میں دل لگی، دل بستگی اور تفریح کے اشعار ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی کتاب The use of poetry and the use of Criticism میں لکھا ہے کہ شاعری کی تعریف بطور تفریح ہی پیش کرنا اولیٰ ہے۔ لیکن یہ تفریح اعلیٰ درجہ کی تفریح ہے۔ اس تعریف کے ماسوا شاعری کی کوئی بھی دوسری تعریف پیش کرنا مزید مغالطہ کا شکار ہونا ہے۔ غالب کے اشعار دل لگی کے اشعار کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ دل لگی اعلیٰ اور برتر قسم کی ہے جو صرف اعلیٰ اور برتر لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ہر خاص و عام کے لئے ہے۔

جس میں جس طرح کا بھی کمال ہو قابلِ تحسین ہے۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

٭

غالبؔ آرٹ یا شاعری کو مقصدی زاویہ سے دیکھنے کا عادی نہیں ہے۔ مجھ شاعری جزو سازِ درویشی نہیں حاصل نہ پوچھ

شاعر درویشی کا ساز ہے یعنی جس طرح ایک صحیح درویش بے ثباتیٔ عالم اور سطحی، عارضی، دُنیاوی حقیقتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور دوامی مابعد الطبیعاتی سرچشموں کا متلاشی ہوتا ہے اور ثروت، امارت، اقتدار و حکومت کے حصول کا طالب نہیں ہوتا۔

اپنے ایک فارسی شعر میں غالبؔ نے کہا ہے کہ قدرتِ معنی سے شاعر کا صحنِ نغمہ کی داڑھی ہوتا ہے اور غم گیتی سے اُس کا سمند عمرو کا زنبیل ہوتا ہے۔ غالبؔ عباراتِ قلیل میں اشاراتِ کثیر پیش کرنے کا حامی ہے: ؎

فکر میری گہر اندوز اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل

غالبؔ آئیڈیل ابہام اور اجمال کی بھی وضاحت کرتا ہے:۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

یہ خوبیاں غالبؔ کے کلام میں ہیں اور دُوسروں کے اشعار میں بھی ہونی چاہیئں۔ غالبؔ اپنی اور بھی دُوسری خوبیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُس کے کلام میں مزہ ہے۔ اُس کی تقریر اور شاعری سے لذّت ایسی ملتی ہے کہ سُننے اور پڑھنے پر کسی کو کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اُس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

❖

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

❖

سچا عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی، شعری کلام کو اثر انگیز اور شعلہ نوا بناتا ہے۔ زبان و اظہار میں فطری پن اور خلوص و جذبہ کی رنگ آمیزی پیدا کرتا ہے۔ غالبؔ نے بھی مجازی عشق کیا تھا اور اُسے اپنے معشوق کے حُسن و ادا اور زلفِ پیچاں سے والہانہ فریفتگی تھی۔ ڈومنی کے علاوہ بھی ایک اور اعلیٰ خاندان کی حسین جوان بیوہ شاعرہ تھی جس کا نام تُرکی تھا جو اکثر اپنا کلام اصلاح کے لئے غالبؔ کے پاس بھجوایا کرتی تھی۔ وہ بے پناہ حسن کی بھی مالک تھی اور ناز و ادا اور آداب و انداز اور نفاست لیے زُود حِس کی بھی ملکہ تھی۔ غالبؔ کے یہاں عُریانیت، شہوت پسندی اور بوالہوسی کے بھی اشعار ہیں اور ان سے اُوپر اُٹھ کر حسنِ معشوق با خیالِ عشق کی تصوّر زائی اور بیخودی بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہی تُرکی ہوش رُبا شاعرہ غالبؔ کی شاعری میں تصوّر زائی، سرشاری، بیخودی اور جمالیاتی پہلوؤں کی بہت حد تک محرّک رہی ہو۔ ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دِن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

❖

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے

❖

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

❖

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

❖

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

❖

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں ہے

❖

شاعری میں تصوّر کی کار فرمائی بہت اہم ہوتی ہے اور تصوّر خیالِ معشوق سے قوی اور تیز تر ہوتا ہے یوں تو شعری کلام میں رعنائیٔ خیال کے اور بھی ذرائع ہو سکتے ہیں لیکن تصوّرِ جاناں (خصوصاً جہاں معشوق نہیں بلکہ حقیقی ہو) اس سلسلہ میں ایک نمایاں رول ادا کرتا

غالب فرشتہ نہیں بلکہ انسان تھا پھر بھی اُسے صرف اپنے حرص و ہوس کی تسکین نہیں چاہیئے بلکہ غمِ دل و اُلجھنوں، دُنیاوی کلفتوں اور مشکلوں پر قابو پانے کے لئے اور اپنے شعری فن کو جاری رکھنے کے لئے اِک گونہ بیخودی، سرشاری، اِک ذہنی جمالیاتی خمار بھی چاہیئے اور ان سب کا منبع غالب کے یہاں تصورِ جاناں رہا ہے۔ اسی لئے جب دامانِ خیالِ یار چھوٹنے لگتا ہے تو غالب کو وحشت ہونے لگتی ہے کیونکہ تصورِ جاناں ہی ہر رنج والم، کلفت وغم کا تریاق ہے۔

غالب شاعری میں روایتی فرسودہ خیال وفکر پیش کرنے کی مخالفت کرتا ہے۔ غالب شاعروں کو نئی تازہ بات پیش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ دنیاوی طمع میں کسی کی بیجا قصیدہ خوانی اصلِ شاعری کی ضد ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ورزشِ قصہ کہن کب تک
داستانِ شہرِ دکن کب تک
تا کجا درسِ نشہ ہائے کہن
تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن

غالب نے اشارت یا علامت پر بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ شاعر جس شے یا خیال کو پیش کرنا چاہتا ہے وہ اُسے رمزیہ بنانے کے لئے یا حسین معنی دار ابہام پیدا کرنے کے لئے دُوسری شے یا دُوسرے خیال کے ذریعہ پیش کرتا ہے جو اشارت یا علامت ہے۔ یہ اشارت بہ یک وقت خوبصورت ابہام بھی ہے اور وضاحت بھی۔ اگر شاعر کو مشاہدۂ حق یا عشقِ حقیقی کی ترجمانی بھی مقصود ہے تو وہ اسے ساقی، شراب، جام، نغمہ اور بیخودی جیسے الفاظ سے بھی ادا کر سکتا ہے جس نے عشقِ حقیقی کا مزہ چکھ لیا ہو وہ اپنے سرور و مستی کا اظہار ارضی جام و شراب، خمار و بیخودی کے وسیلہ سے بخوبی کر سکتا ہے۔ مناسب اشارت، علامت یا وسیلہ کا استعمال کرنا شاعری کی جودت کو جلا تا ہے۔ اسی لئے اسی سلسلہ میں غالب نے بجا کہا ہے:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

بقیہ تنہا تنہا ص۳۵ سے آگے

نے پلٹ کر دیکھا ممی اور پیا گہری نیند سو چکے تھے۔ وہ اُن کے درمیان سے چپکے سے اُٹھ کر میز تک آیا اور دراز سے چابیاں نکال کر الماری کھول لینے لگا جس میں اُس کی ممی نے گولی کھانے کے بعد وہ بوتل بند کر دی تھی۔ الماری کھول کر وہ نیم تاریکی میں اُس بوتل کو تلاش کرنے لگا۔ بوتل الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھی ہوئی تھی جہاں تک اُس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے ایک اسٹول اُٹھا کر لایا اور اُس پر چڑھ کر بوتل نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر بوتل اب بھی اُس کی پہنچ سے باہر تھی۔ اُس نے ایڑیوں کے بل پر کھڑے ہو کر بوتل اُٹھانا چاہی لیکن اُس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے بوتل سمیت زمین پر آ رہا۔ بوتل ٹوٹ کر اُس کے ایک ہاتھ میں دھنس گئی تھی جہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ دھڑام کی آواز سُن کر ممی پیا جاگ گئے اور دوڑ کر اُس کے پاس آئے۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔ ممی نے اُس کو ہاتھ لگانا چاہا تو اُس نے اُن کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پیا اُس کے لہولہان ہاتھ پر پٹی باندھنے لگے تو اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور روتا ہوا وہاں سے اُٹھ کر باہر کی طرف بھاگ گیا۔ اُس کے پیچھے اُس کے ممی اور پیا بھی لپکے۔ پھر نہ جانے کس طرح بنگلہ کی سیڑھیوں پر سے بھی اُس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا اور بے ہوش ہو گیا۔ ممی اور پیا دوڑتے ہوئے نیچے آئے وہ بے ہوش پڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے جھپٹ کر بٹو کو اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا اور اُسی سے لپٹ کر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

غریب خانہ

صغرا مہدی

"اے لو پھر گئی بجلی۔ یہ قیامت کی گرمی اور بار بار بجلی کا جانا۔" اماں نے اظہارِ پریشانی کیا۔

"مجھے تو ابھی امتحان کے پرچے دیکھنا ہیں۔" آپا کمرے سے نکل کر بولیں۔

"اور مجھے ضروری رپورٹ لکھ کر پریس پہنچانی ہے۔"

"گھر پر گھر بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک منزلہ دو منزلہ اور بجلی کا فیڈر وہی ہے۔"

"بدلے کیسے ہر چیز کیلئے تو بھاگ دوڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔" بھیا نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بھاگ دوڑ یہ لوگ کیوں نہیں کرتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک بڑا آدمی ہے جن کے تو بڑے بڑے کولر ایرکنڈیشنر اور نہ جانے کیا کیا ہے۔"

"اماں ان کے پاس ہیں تو چلاتے ہیں۔" چھوٹی بیٹی نے حسبِ عادت پڑوسیوں کی حمایت کی۔

"ہم نے تو سوچا تھا کہ ہمارے جیسے لوگ یہاں بسیں گے"

"ہمارے جیسے لوگ" اماں اب آپ جیسے لوگ نہیں ہوتے۔" چھوٹی بیٹی نے طنز کیا۔

"چُپ رہو، اماں سے زبان چلاتی ہو۔" بھائی جان نے چھوٹی بٹیا کو ڈانٹا۔

"میں پرلی کوٹھی فون کرنے جا رہی ہوں۔ معلوم کروں گی کہ بجلی کب آئے گی۔" یہ کہہ کر چھوٹی بٹیا یہ جا وہ جا۔

مہانگر سے دور اس یونیورسٹی ٹاؤن کے اس غیر آباد حصے میں بسے غریب خانے کے ارد گرد جب سے نئی وضع کی کوٹھیاں بننی شروع ہوئی تھیں اور ان میں پیسے والے لوگ آ کر بسے تھے جن کے پاس امپورٹیڈ کاریں، وی سی آر، رنگین ٹی وی اور بعض کے یہاں تو جنریٹرز بھی تھے۔ "غریب خانے" میں یہی بحث چھڑی رہتی۔ اماں بی نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب ان کے شوہر نے اپنے چند دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ اس بستی کو بسایا تھا۔ یہاں نئی تعلیم کا اسکول کھولا تھا۔ اس زمانے میں یہاں نہ بجلی تھی نہ پانی۔ کنویں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کی لالٹین سے گھر روشن کئے جاتے تھے۔ ہیڈ فون سے خبریں سنی جاتی تھیں۔ بہت کم تنخواہیں ملتی تھیں۔ زندگی بہت کٹھن تھی۔ اماں بی جب ان کٹھنائیوں کا شکوہ کرتیں تو ان کے شوہر بتاتے تھے کہ وہ ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ اسکول میں نئی تعلیم کے تجربے کر رہے ہیں۔ اور ان کی رفاقت اور مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے تو اماں جی کو بھی اپنی اہمیت کا احساس ہوتا

اور وہ ان سب کٹھنائیوں کو ہنسی خوشی اُٹھانے کو تیار ہو جاتیں۔ پھر عالم فاضل ماہر تعلیم شوہر کے ساتھ رہ کر ان کو یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ چاہے ان کے شوہر کے پاس مال و دولت نہ ہو شان و شوکت نہ ہو مگر پھر بھی لوگ ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی جفاکشی اور قربانی و ایثار کا ذکر بہت عقیدت سے کرتے ہیں۔ اماں جی جب میکے جاتیں تو وہ اپنی کم مائیگی اور کم حیثیت ہونے پر شرمندہ نہیں ہوتیں بلکہ فخر سے اپنے میاں اور ان کے دوستوں اور اس مارسے کا ذکر کرتیں۔ انہوں نے اپنا زیور بیچ کر ایک چھوٹا سا گھر بنوا لیا۔ اور اس کا نام "غریب خانہ" رکھا۔ غریب خانہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کا دروازہ سب کیلئے کھلا رہتا۔ صبح سے رات تک جو چاہتا اس پر دستک دیتا اور اس کو جواب ملتا۔ کوئی پتہ پوچھنے آتا کوئی بارش سے بچنے کیلئے یہاں آ جاتا۔ کوئی کڑی دھوپ سے پریشان ہو کر یہاں آ کر ٹھنڈے پانی کا سوال کرتا۔ مسافر یہاں تھک کر آرام کرتے۔ طلب علم میں بہت سے لوگ غریب خانے کے دروازے کو کھٹکھٹاتے۔ کچھ لوگ از راہ عقیدت آ کر حاضری دیتے۔ غریب خانہ سب کی پذیرائی کرتا۔ اماں بی کبھی کبھی کھسیا جاتیں مگر بس وقتی طور پر۔ ورنہ وہ خندہ پیشانی سے سب کی خاطر تواضع کرتیں۔ اپنی محدود آمدنی اور وسائل کے ساتھ۔

دیکھتے دیکھتے گردشِ ایام نے سب کچھ بدل ڈالا وہ چھوٹا سا اسکول بڑھ کر یونیورسٹی بن گیا۔ یہاں کام کرنے والوں کو بڑی بڑی تنخواہیں ملنے لگیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں زندگی کی سب سہولتیں لوگوں کو حاصل ہو گئیں۔ اماں بی کے جیون ساتھی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوستوں اور ساتھیوں میں سے کچھ نے بستی کو چھوڑ دیا کچھ نے دُنیا کو اب غریب خانے کے گرد بہت سے شاندار اونچے گھر بن گئے جن میں صاحبِ حیثیت اور صاحبِ ثروت لوگ آ آ کر رہنے لگے۔ بعض کے گھر نوکر کچھ کے گھر دربان اور زیادہ تر لوگوں کے گھر بڑے بڑے کتے تھے۔ مگر غریب خانہ اب بھی لوگوں کیلئے کھلا رہتا کیونکہ نہ ہوتا تو خود اماں جی کراہتی ہوئی اُٹھتیں اور ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتیں۔ لوگ اس بات پر اعتراض بھی کرتے کہ غریب خانہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ویسے بھی اب تو بستی بس گئی ہے ایک کتا ہی پال لیجئے۔

"اے ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے جو کوئی لے جائیگا غریب خانے کا دروازہ تو یوں ہی کھلا رہے گا۔"

بستی کے سب لوگ اماں جی اور ان کے خاندان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور پردیس میں آ کر بسنے والے لوگ ان سے میل جول بڑھانا چاہتے تھے۔ وہ اکثر تحفے تحائف بھیجتے۔ بار بار اپنا فون استعمال کرنے کی دعوت دیتے۔ اپنی کاروں میں غریب خانے کے لوگوں کو لفٹ دینے کی کوشش کرتے۔ جیسے یہ لوگ بظاہر انکسار مگر دراصل نہایت حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ اماں بی موقع بہ موقع ان لوگوں کے نو دولتے پن پر طعن کرتیں۔ کہ وہ ان پر اپنی دولت کا رعب جمانا چاہتے ہیں جبکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ لوگ کل تک کیا تھے۔

اماں بی کی ایک بڑی بیٹی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی اور بیٹا جرنلسٹ تھا۔ یہ دونوں باپ کی طرح ہی آئیڈیلسٹ تھے۔ یہ دونوں اماں جی کی ان باتوں کو پسند کرتے تھے اور ان کے اس اہانت آمیز رویے پر شفقت بھی کرتے تھے۔ مگر خود بھی غلط سے کمائے ہوئے روپیہ اور ان دولت مندوں کی بد مذاقی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر گھر کی چھوٹی بٹیا ان لوگوں کا ساتھ نہ دیتی۔ وہ ان لوگوں کو پسند کرتی۔ اماں بی کے منع کرنے کے باوجود پڑوسیوں سے اخلاق اور برابری سے ملتیں۔ اماں کہتیں "ارے ان کے گھر پڑھائی لکھائی کا رواج ہی نہیں تھا۔"

"مگر ان کے ہاں اب سب لوگ پڑھ لکھ رہے ہیں" چھوٹی بٹیا جلدی سے جواب دیتیں۔

"یہ لوگ تمہارے ابا کے پاس آتے تھے ذرا ذرا سی سفارشوں کو۔"

"آپ بھول گئے۔ اب تو ہماری سفارش کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"ہمیں ان کی سفارش کی ضرورت نہیں ہے؟" آپا تنک کر کہتیں۔
"ہے تو آپا! پرلی کوٹھی والے تمہارے اسکول کی مینجنگ کمیٹی میں ہیں وہ لوگ تمہاری سفارش کردیں تو۔"

"اے خدا نہ کرے اب یہ نوبت آگئی۔ کیا تمہارے ابا کا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔"

اماں خدا کیلئے آپ لوگ یہ سنوبری چھوڑیئے۔ مان لینے میں کیا حرج ہے کہ یہ لوگ ہم سے ہر طرح بہتر ہیں۔ ہم سے زیادہ حیثیت کے ہیں۔ ان کے پاس پیسہ ہے۔"

"پیسہ پیسہ سب کچھ پیسہ ہی نہیں ہوتا ہے" بھیا چڑ کر کہتے۔

"اور کیا ہوتا ہے؟" اور پھر ان لوگوں میں بحث چھڑ جاتی چھوٹی بٹیا اکیلے ہی تینوں سے لڑتیں۔ اور بحث میں ان کا پلڑا ہلکا رہتا مگر وہ پھر بھی بحث کئے جاتیں۔ اماں اپنی چھوٹی بیٹی کے خیالات سے متوحش ہو جاتیں اور سوچنے لگتیں کہ اس بدنصیب کو اپنے باپ کی تربیت بہت کم ملی جبھی یہ ایسی ہے ورنہ ان کی بڑی بیٹی اور بیٹا بھی تو ہے۔

پرلی کوٹھی والوں کے گھر چھوٹی بٹیا کا آنا جانا بڑھتا گیا۔ وہ ان کے ہاں وی سی آر پر فلم دیکھتیں ان کی موٹر میں کالج جاتیں ان کا فون استعمال کرتیں۔ یہ خبریں محلے میں ادھر سے ادھر گشت کرنے لگیں کہ چھوٹی بٹیا اکثر پرلی کوٹھی کے خاں صاحب کے انجنیئر بیٹے کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں جو دوبئی سے آیا ہے۔ اماں جی تک یا تو یہ خبریں پہنچتی نہیں تھیں یا پھر وہ ان کو سُن کے ان سُنی کر رہی تھیں۔ بھیا اور آپا نے ان کو منع کرنے کی کوشش کی تو چھوٹی بٹیا نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ اور ایک دن یہ خبر کہ پرلی کوٹھی والے چھوٹی بٹیا کا پیام لے کر غریب خانے آنا چاہتے ہیں بجلی کی طرح غریب خانے پر گری۔ جس کو محمد احمد صاحب کی بیوی لے کر آئی تھیں جو اماں جی کی پرانی جاننے والی تھیں۔

اماں جی جب ان پر بگڑنے لگیں تو انہوں نے صرف یہ کہا "بھابی ہم تو تیل دیکھتے ہیں تیل کی دھار دیکھتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اماں جی گرجیں۔
"میں بتاؤں؟" ان کی بجائے چھوٹی بٹیا بولیں۔ اماں جی سُن سے رہ گئیں۔

"تم چپ رہو" آپا نے آگ بگولا ہو کر کہا۔
"کیوں چُپ رہوں یہ میرا معاملہ ہے۔ آپا میں تمہاری طرح آئیڈیالسٹ نہیں ہوں۔ میں پریکٹیکل ہوں اور مجیدہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"چپ رہ بدنصیب۔ اے خدا مجھے اب یہ دن بھی دیکھنا ہوگا کہ میرے گھر پرلی کوٹھی والے بارات لے کر آئیں گے۔" یہ کہہ کر اماں بے دم ہو کر گاؤ تکیہ پر گر پڑیں۔
"اماں ہم مسجد میں نکاح کرلیں گے بارات آپ کے گھر نہیں آئے گی۔" چھوٹی بٹیا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ بھیا بھی اندر سے نکل آئے تھے اور سراسیمہ کھڑے تھے کہ ایک دم ان کو بریں ولیو آئی اور بولے "اماں جی غریب خانے کے دروازے تو سب پر کھلے رہتے ہیں۔ آپ پرلی کوٹھی والوں پر کیوں بند کرتی ہیں؟"
اماں اُٹھ بیٹھیں اور ایک عجب شانِ تمکنت سے بولیں۔
"کہہ دو آجائیں غریب خانے میں آئیں گے تو خالی ہاتھ نہیں جائینگے۔"

پبلشر اور چیف ایڈیٹر رنجیت الیسر نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷-سی، چنڈی گڑھ سے جولائی ۸۶ء کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ٹی۔ چنڈی گڑھ

تنہا تنہا

الیاس فرحت

آج دن کے گیارہ بجے اچانک ہی اُس کے اسکول میں چھٹی ہوگئی ـــــ اسکول کے کسی ٹیچر کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ تمام بچے جلدی جلدی اپنی کتابیں اور کاپیاں سمیٹنے لگے۔ ساری کلاس میں ایک شور برپا تھا۔ سب بچے اچانک اِس چھٹی پر خوش ہو گئے تھے۔ لیکن اُس کا دل اندر سے ویران تھا اِس لئے اُس کو اِس چھٹی کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اُس نے بڑی بے دلی سے اپنی کتابیں اور کاپیاں اپنے بستہ میں ٹھونسیں اور وہیں بنچ پر کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ اُس کا دل اس وقت گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اتنے میں پنکی خوشی خوشی اُس کے پاس آئی اور اُس کو ساتھ چلنے کیلئے جلدی کرنے لگی۔ اُس نے بڑی بے دلی سے اُس کو آگے چلنے کے لئے کہا اور خود چپ چاپ وہاں بیٹھا رہا۔ جب سب بچے کلاس چھوڑ کر چلے گئے تو وہ بھی بوجھل قدموں کے ساتھ باہر آگیا۔ باہر اسکول کی بس تیار کھڑی تھی۔ وہ اُس میں سوار ہوکر چپ چاپ پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ اُس کا دل اُداس تھا بہت اُداس۔ اُس کو کسی چیز میں کوئی لُطف نہیں آرہا تھا۔ تمام بچے چلتی بس میں شور پکار کرتے رہے۔ کوئی گانا گا رہا تھا۔ کوئی اپنے ساتھی کو کہانی سُنا رہا تھا تو کوئی خواہ مخواہ اُچھل کود کرکے سب کو ہنسا رہا تھا۔ لیکن وہ سب سے بے نیاز خالی خالی آنکھوں سے بس سے باہر کی طرف دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ کتنی دفعہ پنکی نے اُس کو ٹوکا بھی کہ یہ کیا رونی صورت بنائے بیٹھے ہو لیکن اُس نے پنکی کی باتوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیا اور خاموش ہی رہا۔ اُس کا دل اندر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُس کے ممی اور پاپا آپس میں اتنا لڑتے کیوں ہیں۔ اور جب اُن دونوں میں لڑائی چلتی ہے تو اُس کا دل اسی طرح ڈوب جاتا ہے اُس کو کسی بات میں مزہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کی چیزوں میں بھی نہیں۔ نا ہی اسکول میں اور نا ہی پنکی کی باتوں میں حالانکہ وہ بہت اچھی اچھی باتیں کرتی ہے اور اُس کی باتوں پر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتا ہے لیکن جب اُس کے گھر میں ممی اور پپا میں لڑائی ہوتی تھی تو اُس کا دل ایک دم ویران ہو جاتا تھا۔ ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ اور وہ چپ چاپ اور گُم صُم ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اکیلے میں وہ آنسو بھی بہا دیا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اُن میں یہ لڑائی کیوں ہوتی ہے بس وہ سوچ سوچ کر ہی رہ جاتا ـــــ آج کل بھی اُس کے ممی اور پپا میں لڑائی چل رہی تھی۔ اور پچھلے سات دنوں سے اُس کا جینا حرام تھا ـــــ جب اُس کے ممی اور پپا میں لڑائی چل رہی ہوتی تو اُن میں سے کوئی بھی اُس سے پیار نہیں کرتا تھا ورنہ ہر وقت

تو ممی صبح صبح اُس کو بستر سے اُٹھا دیتی تھی۔ اُس کو جلدی جلدی اسکول جانے کے لیئے تیار کرتی۔ وہ نہیں نہیں کرتا رہتا لیکن اُس کی ممی بڑے پیار سے اُس کے مُنہ میں نوالے پہ نوالے ٹھونسے جاتی۔ اُس کو گلاس بھر کر دودھ پلاتی۔ اُس کا مُنہ صاف کرتی اور جب وہ اسکول جانے کیلیئے نکلتا تو اُس کے گالوں پہ ایک پیار بھرا بوسہ دیتی۔ کتنی قوت ہوتی ہے ایک پیار بھرے بوسے میں۔ وہ دِن بھر بلا تکان پڑھتا رہتا۔ اِسی طرح جاتے جاتے جب وہ پپا کو "ٹاٹا" کہتا تو وہ بھی لحاف کے اندر سے جواب دیتے "ٹاٹا بٹو" تو اُس کا سینہ فخر سے اور بھی پھول جاتا اور وہ سینہ تان کر اسکول میں اِس طرح داخل ہوتا جیسے ساری دنیا میں اُس سے بڑھ کر کوئی خوش نصیب نہیں۔! لیکن جب جب اُن میں لڑائی چل رہی ہوتی تو اُس کو کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ خود ہی اسکول جانے کیلیئے تیار ہوتا۔ ممی میز پر کھانا لگا دیتی اور وہ چُپ چاپ زہر مار کرلیتا۔ جاتے جاتے پپا کو ٹاٹا کہتا۔ وہ بھی سُنی اَن سُنی کر دیتے اور اب وہ خود کو دنیا کا سب سے زیادہ بدنصیب لڑکا سمجھتا۔ وہ بے دلی سے اسکول میں داخل ہوتا لیکن اُس کا من کہیں نہیں لگتا۔ بس کہیں بھاگ جانے کو دِل کرتا لیکن کہاں؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

اِسکول کی بس نے اُسے اُس کے بنگلے کے سامنے دھکیل دیا اور وہ جیسے اُتر کر آیا اس نے بنکی کو ٹاٹا بھی نہیں کہا اور بوجھل قدموں سے گیٹ پر آگیا۔ گیٹ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس نے ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول لیا اور اندر چلا گیا۔ گھر میں چاروں اور سناٹا تھا۔ اُس نے گھوم پھر کر سارے کمرے تلاش کر لئے۔ اُس کی ممی شاید کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔ اُس نے بستہ ایک طرف پھینکا اور سیڑھیاں اُتر کر باہر باغ میں آگیا۔ باغ میں بہت ساری تتلیاں پھولوں پر منڈرا رہی تھیں۔ اُس نے سوچا کیوں نہ کچھ دیر تتلیوں کے پیچھے دوڑ کر ممی کے آنے کا انتظار کیا جائے۔ وہ ایک تتلی کے پیچھے دوڑا بھی۔! لیکن وہی۔ کچھ مزہ نہیں آیا اور اُس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور شامو کے جھونپڑے کی طرف آگیا۔ شامو اور اُس کی بیوی اُس کے گھر ہی ملازم تھے اور باغ کے اس کونے میں ایک جھونپڑے میں رہا کرتے تھے۔ اُس نے سوچا کیوں نہ کچھ دیر شامو کے بچوں کے ساتھ گُلی ڈنڈا کھیل کر دل بہلایا جائے لیکن نہیں اس میں بھی کچھ لُطف نہیں مِلا اور وہ وہاں سے چل کر سیدھا لان میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کیوں نہ پنکی کے ہاں چلا جائے۔ شاید وہاں کچھ دل بہل جائے۔ اِس خیال نے قدرے تقویت بخشی اور وہ وہاں سے اُٹھ کر سیدھا پنکی کے بنگلہ میں آگیا۔ جب وہ ڈرائینگ روم پار کر کے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اُس کو پنکی کے زور زور سے ہنسنے اور کبھی بندر اور کبھی شیر کی نقلیں اُتارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ جب وہ اندر پہنچا تو پنکی لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کی ممی گھوڑے کو ہلا ہلا کر جیسے زور زور سے دوڑا رہی تھی۔ بٹو کو آتا دیکھ کر پنکی دوڑتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی پھر دونوں لکڑی کے گھوڑوں پہ سواری کرنے لگے۔ گھوڑے کے اُچھلنے کودنے سے پنکی کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا لیکن بٹو کے ہونٹوں سے جیسے مسکراہٹ غائب تھی۔ وہ چاہتا بھی تو اُس کی ہنسی نِکل نہیں رہی تھی۔ جب اُس کا گھوڑے کی سواری میں بھی دل نہیں لگا تو اُس نے پنکی سے رازدارانہ انداز میں پوچھا "پنکی ایک بات پوچھوں، مگر تم کسی کو بتانا نہیں۔"

"پوچھو پوچھو" پنکی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ "بھلا میں کسی کو کیوں بتانے لگی!" "کیا تمہارے ممی اور پاپا میں بھی کبھی لڑائی ہوتی ہے؟" اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "ہاں ہاں ہوتی ہے پر کبھی کبھی"۔ پنکی نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا اور اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگی۔

"پھر تم کیا کرتی ہو" اُس کے دل کو ڈھارس بندھی۔

"میں" وہ کچھ دیر سوچتی رہی "بھلا میں کیا کر سکتی ہوں جب دونوں میں لڑائی بہت دنوں تک چلتی ہے تو ایک دن گھبرا کر میں پپا سے لپٹ جاتی ہوں اور خوب خوب روتی ہوں۔ اتنا روتی ہوں کہ مجھے بخار چڑھ جاتا ہے پھر پپا مجھے ایک دم گلے لگا

لیتے ہیں اور پھر ہنس کر ممی کو بھی معاف کر دیتے ہیں اور پھر دونوں میں بات چیت ہو جاتی ہے۔"

"اچھا" اُس نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا لیکن پھر اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ کس طرح اپنے پپّا سے لپٹ کر رو سکتا ہے۔ اُس کے پپّا تو بہت غصیلے ہیں کہیں اُس کو دو چار تھپّڑ نہ رسید کر دیں۔ وہ کانپ کر رہ گیا لیکن پھر دوسرے خیال نے تقویت بخشی۔ "کیوں نہ ممّی سے لپٹ کر رویا جائے یہی ٹھیک ہے۔" اُس نے سوچا۔ اُس کو ممی سے ڈر نہیں لگتا تھا پنکی کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ واپس آ گیا۔ اُس کی ممی واپس آ چکی تھیں۔ وہ دوڑتا ہوا اُن کے پاس گیا اور اُچک کر اُن کی باہوں میں اپنے آپ کو سمو دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کی ممّی پریشان ہو گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "کیا بات ہے بٹّو۔ کیوں رو رہے ہو۔ کیا اسکول میں ٹیچر نے کچھ کہا؟" وہ پوچھتی رہیں لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بس روتا رہا۔ ہچکیوں سے جب اُس کی طبیعت کچھ ہلکی ہوئی اور اُس کی ممی بار بار رونے کی وجہ پوچھتی رہی تو وہ کچھ بھی نہیں بتا سکا بس اتنا کہہ دیا کہ اُس کے اسکول کے کسی ٹیچر کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور اُس کی ممی اُس کے اس بھولے پن پر ہنس پڑیں۔ پھر اُس کو گود میں اُٹھا کر اندر لے گئیں اور اُس کا منہ ہاتھ دُھلا کر کھانا کھلایا۔ لیکن اس دوران اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ پنکی نے تو پپّا کے سامنے اِس طرح رونے کو کہا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد ممی نے اُس کا منہ صاف کیا اور بستر پر لٹا دیا اور ہلکے ہلکے اُس کے سر میں مالش کرنے لگی۔ اُس کو بڑا اچھا لگا لیکن پھر بھی دل کے کسی کونے میں ایک پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ کاش پپّا اور ممّی دونوں پھر سے مِل جائیں اور دونوں کا پیار اُس کو ایک ساتھ حاصل ہو۔ پتہ نہیں کب اُس کو نیند لگ گئی اور وہ سو گیا۔

پانچ بجے جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ پپّا سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اُن کے چہرے سے ابھی بھی غصہ ٹپک رہا ہے اُس نے "گڈ ایوننگ پپّا" کہی جس کا انہوں نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا۔ وہ چُپ چاپ اُٹھ کر کچن میں آ گیا۔ یہاں ممّی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اُس نے ممی کو بھی "گڈ ایوننگ" کہا اور ممّی نے بھی بس گڈ ایوننگ بٹّو کہہ کر ٹال دیا۔ اس کا مطلب ہے لڑائی ابھی جاری ہے۔ اُس نے دل میں سوچا اور نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گیا۔

رات کھانے پر بھی بڑی خاموشی رہی۔ ممّی ڈنر ٹیبل کے ایک طرف تو پپّا دوسری طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں میں بڑی خاموشی تھی۔ وہ درمیان میں بیٹھا زہر مار کر رہا تھا۔ پورے ڈائننگ ہال میں سنّاٹا تھا صرف چھُری کانٹے اور چمچوں کی کھنک کبھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی۔ کھانا کھا کر وہ سیدھا بیڈ روم میں آ گیا اور اپنی کتابیں لے کر آ گیا۔ اتنے میں پپّا بیڈ روم میں داخل ہوئے اور الماری میں سے نیند کی گولی کی بوتل نکال کر ایک گولی کھائی اور بستر پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اُس کی ممّی آئیں۔ انہوں نے بھی اُس بوتل سے ایک گولی کھائی اور بستر پر دوسری طرف مُنہ کر کے لیٹ گئیں۔ وہ چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ اُس کا دل پڑھنے میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے کتاب بند کی اور خود بھی آ کر دونوں کے درمیان بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کئے پڑا رہا لیکن آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ پہلے جب وہ ممّی اور پپّا کے بیچ میں سوتا تھا تو دونوں کے چہرے اُس کی طرف ہوتے تھے ممّی اُس کے بالوں کو آہستہ آہستہ اپنی اُنگلیوں سے سہلاتی تھیں پپّا کا ایک ہاتھ اُس کے سینے پر ہوتا تھا تو اُس کو کس قدر مست نیند آتی تھی۔ بستر پر لیٹا اور غائب اُس کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ کب نیند لگ گئی لیکن آج۔ آج اُن دونوں کے چہرے مخالف سمتوں میں تھے اور وہ خود کو اُن دونوں کے بیچ تنہا تنہا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ بار بار پلکیں دبا کر نیند لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیند جیسے آنکھوں سے غائب تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اُسے نیند کی گولیوں کا خیال آیا۔ اُس کو معلوم تھا کہ گولیاں کھانے کے بعد فوراً نیند آ جاتی ہے اُس

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر)



غزل

مہدی پرتابگڑھی

جستجو ہے برسوں سے زندگی نہیں ملتی
جو ملی تھی بچپن میں وہ خوشی نہیں ملتی

شہر کی عملداری ہوگئی ہے گاؤں میں
اب یہاں کسی رُخ سے سادگی نہیں ملتی

ہنستے کھیلتے بچّوں کو ملی جو بے فکری
معبدوں میں بھی اب وہ آگہی نہیں ملتی

وہ بڑے سلیقے سے اپنے غم چھپاتا ہے
پھر بھی اُس کے چہرے پہ تازگی نہیں ملتی

سو گئے ہیں محنت کش فرشِ خاک پہ مہدی
ہم کو خود بستر پہ "پری" نہیں ملتی

غزل

سنتوش انجمؔ

سرد سرد آنکھیں ہیں سانس سانس بھاری ہے
موسمِ گریزاں کی پہلی برق باری ہے

آس تیرے ملنے کی سونپ دی ہے آنکھوں کو
آنچ تیری چاہت کی رُوح میں اُتاری ہے

عمر سے کہیں لمبی ایک سانس کی ڈوری
ایک پل جُدائی کا زندگی پہ بھاری ہے

زندگی بھی سی سفی پہ تمہارے آنے سے
دن ہے کتنا البیلا شام کتنی پیاری ہے

پھول مسکراتے ہیں زخم داد دیتے ہیں
ہم نے اِس سلیقے سے شامِ غم گزاری ہے

زندگی کے رشتوں کا دِل بنا دُولہا اکثر
زندگی نہ جانے کیوں آج تک کنواری ہے

ڈ۔ک۔م۔ ندیمت

رام ناتھ اسیر

دِل کی گہرائیاں چھو لیتی تھیں جس کی ہر بات
مدتوں پہلے کوئی شخص ملا تھا مجھ سے

اور اُس شخص کا اسمِ گرامی ہے۔ جناب پنڈت رام ناتھ اسیر مینی مرزعوی جن سے میری پہلی ملاقات آج سے لگ بھگ تیس برس پہلے ہوئی تھی۔ لمبا قد۔ چوڑا چکلا سینہ۔ بھرا بھرا جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں اور ذہانت کی آئینہ دار کشادہ پیشانی۔ پہلی ہی ملاقات میں اُن کی شخصیت نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدہ بنالیا۔ چند ملاقاتوں کے بعد تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ ہر کسی سے اس طرح گھل مل جاتے کہ ملنے والے کو یہ ہرگز محسوس نہ ہوتا کہ وہ انہیں پہلی بار مل رہا ہے۔ ان کی یہی خوبی یعنی اپنا پن ہر شخص کا دل جیتنے کے لئے کافی تھا۔ مختصر یہ کہ اسیر نہایت ہی سادہ لوح، پرخلوص اور ملنسار انسان تھے۔

اِن دنوں اسیر صاحب موضع فتح گڑھ ضلع انبالہ میں مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بعد میں وہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بنے اور پھر اپنی محنت اور ذہانت کی وجہ سے بلاک ایجوکیشن آفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور کئی سال تک اس عہدہ پر کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

اسیر شروع ہی سے محبِ علامہ حضرت سحر عشق آبادی[1] لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے اور اُن کی گرانقدر اصلاح اور مشورہ سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اسیر صاحب نے بھی ابتداء اساتذہ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر روایتی شاعری سے کی تھی لیکن اُس زمانہ میں اُردو شاعری میں نئے نئے تجربات ہو رہے تھے اور نئے رنگ کا بول بالا تھا جسے اسیر صاحب نے بھی اپنایا۔ پرانی روش اور فرسودہ روایات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے اُردو زبان میں ہندی کی آمیزش کچھ اس طرح کی کہ سننے والے دیر تک اُسکی شیرینی کا مزہ لیتے رہیں۔ اُن کی یہ گنگا جمنی زبان اس قدر مقبولِ عام ہوئی کہ ہر ایک کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ اسیر صاحب کے شعر کہنے کا ڈھنگ بالکل جداگانہ تھا۔ ان کا ہر شعر انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ شعر کہتے ہوئے فارسی کے مشکل الفاظ کے استعمال سے حتی الامکان گریز کرتے تھے بلکہ سادہ زبان میں شعر کہنا انہیں زیادہ پسند تھا۔

اسیر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص انسان بھی تھے۔ زندگی بھر غمِ دوراں کا شکار رہے جس کی جھلک اُن کے کلام میں جابجا پائی جاتی ہے۔ پریشان حالی میں بھی وہ اپنی بذلہ سنجی سے گردشِ حیات کا تمسخر اڑانے سے باز نہیں رہتے تھے۔

دور تک تو میکدے کے ہمیں چھوڑتی رہی
پھر گردشِ حیات کا چہرہ اُتر گیا

اُن کی زبان میں اس قدر سلاست و روانی ہے وہ اس خوبی سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال کرتے ہیں کہ عام فہم شخص کو بھی شعر سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

[1] علامہ سحر عشق آبادی

؎ پیار کا روگ لگا بیٹھی ہے جی کو الہڑ لڑکی
یہ گڑیوں کا کھیل نہیں ہے کون اسے سمجھائے

اسیر ملازمت کے سلسلہ میں زیادہ تر گاؤں ہی میں رہے اور گاؤں کی زندگی اور ماحول سے کافی متاثر ہوئے۔ اُن کے کلام میں جوہڑ کے کنارے کھڑے برگد کے پیڑ، پگڈنڈیوں، آموں کے باغ اور گلی کے موڑ پر کھڑے سوکھے برگد کا ذکر ملتا ہے۔ اسیر نے تقریباً ہر موضوع پر شعر کہے ہیں۔ جن میں چند نذرِ قارئین ہیں :۔ ؎

سچ کہا میں نے تو مجھ کو دار پر کھینچا گیا
لکھ دیا جس نے قصیدہ وہ سخنور ہو گیا

❁

دوست ہوتے تو مدد کرتے سیہ بختی میں
آگ بھی دیتے نشیمن کو ہوا بھی دیتے

❁

سونی ہیں دور دور تک پگڈنڈیاں اسیر
تو کس کے انتظار میں ہے بُت بنا ہوا

❁

گلی گلی میں کتنے ہنستے چہرے اب تک نور فشاں ہیں
لیکن یاد اسیر کسی کی اب بھی رستہ روک رہی ہے

❁

ہم ہیں حساس بہت ہم کو بچا کر رکھو
پھر نہ سمٹیں گے جو اک بار بکھر جائیں گے

❁

اپنی ہی آگ میں جلتا رہا تنہا دن بھر
شام اُتری تو میں سورج کی طرح ڈوب گیا

❁

ہم مر رہے ہیں اپنے احساس ہی کے ہاتھوں
دُنیا اسیر یونہی پیچھے پڑی ہوئی ہے

❁

اُن راہوں میں بھیج دیا ہے تو نے مجھے اکیلا
جن راہوں میں ہو جاتے ہیں بیری اپنے سائے

❁

اسیر زندگی بھر غمِ حیات کے اسیر رہے۔ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے وفائی کا گلہ وہ ہمیشہ کرتے رہے کیونکہ اسیر ظاہر و باطن میں ایک تھے اور ہر کسی سے صاف گوئی کی توقع رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ڈوب کر کہتے۔ اُن کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔ ؎

دِل ہے کہیں دماغ کہیں اور نظر کہیں
اک شخص مجھ کو اس طرح تقسیم کر گیا

❁

اسیر رندِ مشرب تھے۔ شروع ہی سے وہ مے نوشی کے عادی تھے اور اسی کثرتِ مے نوشی سے ان کا جگر خراب ہو گیا اور انہیں اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اب ان کی زندگی بہت کم ہے اور یہ احساس اس قدر بڑھ گیا کہ پکار اُٹھے :۔ ؎

اب دوست مجھے قبر میں جب چاہیں اُتاریں
مرنے سے بہت پہلے کفن باندھ لیا ہے

❁

شراب نوشی انہیں کھوکھلا کر چکی تھی۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود وہ پرہیز نہیں کر سکے۔ اور بالآخر ۲۹ فروری ۱۹۸۷ء کو اسیر ابدی نیند سو گئے۔ اُردو ادب کے اُفق کا ایک درخشندہ ستارہ ڈوب گیا۔ لیکن فن کبھی نہیں مرتا اور جب تک فن زندہ ہے فنکار بھی زندہ ہے۔ اسیر صاحب کی زندگی میں ہندی رسم الخط میں اُن کا ایک مجموعۂ کلام "اُداس برگد" کے نام سے شائع ہوا۔ تاہم کافی کلام ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ جب تک "اُداس برگد" ہے اسیر زندہ ہیں۔

ندیم انصاری شاہجہانپوری

روشنی

ارشاد کے والد دلشاد صاحب شہر کے سب سے بڑے کنٹریکٹر تھے۔ انہوں نے بے شمار دولت کمائی تھی۔ ارشاد ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ دلشاد صاحب جوانی کی سرحدوں کو پار کر چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنے کام میں دلچسپی لینا کم کر دی تھی۔ وہ ان خدا ترس اور با اصول لوگوں میں سے تھے جو دولت کی ریل پیل میں بھی نہیں بہکتے۔ انہوں نے اپنی دولت سے کئی ایسے کارخانے قائم کئے تھے جن سے بہت سے لوگوں کو روزی ملی تھی۔ وہ چاہتے تو اپنے بیٹے ارشاد کو تعلیم سے فراغت کے بعد کارخانوں کا انتظام سونپ دیتے مگر انہوں نے ارشاد کو بی۔ ایس۔ سی کے بعد پی۔ ایم۔ ٹی کے امتحان میں بیٹھنے کی رائے دی۔ ارشاد شروع سے ہی سنجیدہ، ذہین اور فرماں بردار تھا۔ اس نے اپنے والد کی خواہش کا احترام کیا۔ پھر جس دن ارشاد پی۔ ایم۔ ٹی کے مقابلے میں کامیاب ہوا تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ حالانکہ دلشاد صاحب کے بے تکلف دوستوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے پھر ارشاد کو ڈاکٹری پڑھانے سے کیا فائدہ؟" دوستوں کی بات سن کر وہ ہنسے پھر سنجیدہ لہجے میں بولے "دولت کے ساتھ علم و ہنر بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں ارشاد کو ایک باصلاحیت انسان بنانا چاہتا ہوں جو اپنے ہاتھوں سے اپنی کفالت کر سکے اس طرح اُسے روپے کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا" ان کے دوست ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔

پھر جس دن ارشاد ڈاکٹری کی ڈگری لے کر آیا تو دلشاد صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کے قریب ایک پلاٹ لے کر ارشاد کیلئے نرسنگ ہوم پہلے ہی بنوا چکے تھے۔ ارشاد نے آتے ہی نرسنگ ہوم سنبھال لیا۔ دلشاد صاحب کو ایسا لگا جیسے انہوں نے خدا سے جو مانگا تھا وہ انہیں مل گیا تھا۔

آہستہ آہستہ ارشاد کی محنت رنگ لائی اور نرسنگ ہوم میں مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی تو ارشاد نے کئی اور ڈاکٹروں کی خدمات بھی حاصل کر لیں اور ارشاد کا نرسنگ ہوم شہر کا سب سے اچھا نرسنگ ہوم سمجھا جانے لگا۔

ایک دن دلشاد صاحب یوں ہی نرسنگ ہوم پہنچ گئے اور اس کے لان میں ٹہلنے لگے کہ اندر سے ایک جوان لڑکی کو لئے ہوئے دو آدمی باہر آئے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا اور دوسرا جوان۔ لڑکی کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں مُندی ہوئی تھی۔ دلشاد صاحب آگے بڑھے اور یوں ہی پوچھ بیٹھے "کیا ہوا بابا لڑکی کو؟"

بوڑھے نے ویران آنکھوں سے دلشاد صاحب کی طرف دیکھا اور درد بھرے لہجے میں بولا "بابو جی میری بیٹی کو کالا ہو گیا ہے لیکن یہ سوچے بغیر کہ میری جیب میں تو صرف ایک سو بیس روپے ہیں اِس ہسپتال میں آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کسی سستے ہسپتال میں جانے کا

مشورہ دیا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں یاس کا زہر بھرا ہوا تھا۔ بوڑھے کی بات چیت سے دلشاد صاحب نے اندازہ لگایا کہ یہ کسی اچھے گھرانے کا فرد ہے لیکن نامساعد حالات نے اِس کی یہ دُرگت بنا دی ہے۔ بوڑھے کے الفاظ سُن کر دلشاد صاحب ذہنی الجھنوں کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ہمدردی سے بولے "شہر میں صرف یہی ہسپتال نہیں جس میں تمہاری بیٹی کا علاج ہو۔ تم اسے لے کر باہر چلو میں تمہاری بیٹی کو دوسرے اسپتال میں داخل کراؤں گا۔ تم روپے کی بھی فکر مت کرنا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ان تینوں کو اپنی کار میں لے کر چودھری نرسنگ ہوم کی طرف جا رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے تو ارشاد ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ دلشاد صاحب کو دیکھتے ہی وہ بولا "ڈیڈی ابھی ڈاکٹر چودھری کا فون آیا تھا۔"

"اور تمہیں یہ سُن کر ضرور حیرت ہوئی ہوگی کہ میں وہاں کسی کو ایڈمیٹ کرانے کیوں گیا تھا۔ ہے نا" انہوں نے ارشاد کے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی۔ جی ہاں۔"

دلشاد صاحب خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور بڑے جذباتی لہجے میں بولے "بیٹے اِدھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو آج میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں" ارشاد ان کے پاس بیٹھ گیا۔ دلشاد صاحب نے صوفے کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے "برسوں پہلے کی بات ہے۔ ایک امیر آدمی کی ایک ڈاکٹر سے بہت دوستی تھی۔ وہ ڈاکٹر امیر آدمی کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا۔ امیر آدمی کو جب بھی فرصت ملتی وہ اپنے دوست کے کلینک پہنچ جاتا اور گھنٹوں باتوں میں گذار دیتا ایک دن ڈاکٹر کے پاس ایک مریضہ آئی۔ اِس کا چہرہ پیلا تھا اور آنکھیں گڑھوں میں دھنسی جا رہی تھیں۔ اس کو لانے والا ایک نوجوان تھا جو بہت پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا پھر اس نوجوان سے پوچھا "یہ تمہاری کون ہیں؟"

"میری ماں ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا "دیکھو بھئی تمہاری ماں کے پھیپھڑے بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ اگر ان کی زندگی چاہتے ہو تو تین مہینے علاج کرانا ہوگا۔"

اِس کے بیٹے کے چہرے پر فکر کی لکیریں اُبھر آئیں۔ وہ بُجھے بُجھے لہجے میں بولا "ڈاکٹر صاحب میں بہت غریب آدمی ہوں۔ بہت دور سے آپ کا نام سُن کر آیا ہوں۔ میرے پاس تھوڑی سی زمین ہے۔ اسی میں محنت کر کے جیسے تیسے بچوں اور ماں کو روٹی دے پاتا ہوں۔ اتنے لمبے علاج کا بوجھ ...."

ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "یہ سب باتیں میرے سامنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر پیسہ نہیں ہے تو علاج کیلئے یہاں کیوں آگئے؟"

"ماں آخر ماں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔" نوجوان نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے کہہ دیا کہ تین مہینے علاج چلے گا جس میں کم از کم پانچ سَو روپے خرچ ہوں گے۔"

"پانچ سَو" اِس نے ڈوبتی ہوئی سی آواز میں دوہرایا تھا اور صرف پندرہ دن کی دوا لے کر چلا گیا تھا۔

اِس کے جاتے ہی ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے اِس امیر آدمی سے کہا تھا "دیکھا آپ نے کیسے کیسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔ پاس پیسہ نہیں تو خیراتی اسپتالوں میں مریض کو کیوں نہیں لے جاتے۔ میں نے ڈگری اِس لئے تو نہیں لی کہ یہاں بیٹھ کر مفت علاج کروں۔"

ڈاکٹر کے الفاظ تھے یا نشتر جو اس امیر آدمی کے دل میں اُترتے چلے گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ آج کا انسان کتنا بدل گیا ہے۔ اِس کے سامنے پیسے کے آگے انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ چُپ چاپ کلینک سے اُٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔ وہ نوجوان اپنی ماں کو ایک رکشے پر بٹھا کر کچھ دُور جا چکا تھا۔ اِس امیر آدمی نے اپنی کار اِس کے رکشے کے قریب روک دی تھی اور اِس نوجوان کو پاس بُلا کر اپنے پرس سے پانچ سَو روپے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا "ان روپوں کو لینے سے انکار مت کرنا۔ یہ میں اس لئے دے رہا ہوں کہ تم ان سے اپنی ماں کا علاج کرا سکو تاکہ تمہاری ماں کا سایہ تمہارے سر پر رہے کیونکہ ماں دوبارہ نہیں ملتی اور ہاں اب تم کسی دوسرے ڈاکٹر کا علاج کروانا۔ ایسے بے رحم

ڈاکٹر کا نہیں" اتنا کہہ کر اس نے اپنی کار آگے بڑھا دی تھی اور وہ نوجوان حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر اس امیر آدمی نے ایک خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا۔ ایسا ڈاکٹر جو بے رحم نہ ہو، اس کا دل احساس سے خالی نہ ہو۔ اور ایک دن اس امیر آدمی کا خواب پورا بھی ہو گیا لیکن اسے ایک دن پھر ذہنی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے اپنے بیٹے کے اسپتال سے ایک مریضہ کو نکلتے دیکھا جسے صرف اس لئے ایڈمٹ نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس کے باپ کے پاس صرف ایک سو بیس روپے تھے۔ برسوں پہلے کا واقعہ پھر اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کا خواب پورا نہیں ہوا۔ اور شاید اس زندگی میں پورا بھی نہ ہو کیونکہ اس کا اپنا بیٹا انسانی احساسات کھو کر سنگدل بن چکا تھا۔

"ڈیڈی خدا کے لئے اب آگے کچھ مت کہیے" ارشاد عجیب سے لہجے میں بولا پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دلشاد صاحب اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اور اس وقت چونکے جب فون کی گھنٹی بجی۔

انہوں نے فون اٹھایا دوسری طرف سے ارشاد بڑے خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہا تھا "ڈیڈی آپ دو منٹ کے لئے ایمرجنسی وارڈ میں آ جائیں پلیز۔"

دلشاد صاحب نے فون رکھا اور نرسنگ ہوم چل دیئے۔

ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے تو ارشاد ایک بیڈ کے پاس کھڑا تھا انہوں نے دیکھا تو بستر پر وہی مریضہ پڑی تھی جسے وہ ڈاکٹر چودھری کے اسپتال میں ایڈمٹ کرا کے آئے تھے۔ بیڈ کے پاس ہی وہ بوڑھا کھڑا تھا۔ دلشاد صاحب کو دیکھتے ہی بوڑھا جلدی سے ان کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "بابو جی میں یہاں خود نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے معلوم نہیں کیوں مجھ غریب آدمی سے معافی مانگی اور یہاں لانے کے لئے خوشامد کی۔ اب بتلایئے میں انکار کیسے کرتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ خدا کرے تمہاری بیٹی صحت مند ہو جائے۔" اتنا کہہ کر دلشاد صاحب وارڈ سے باہر نکلے تو ارشاد بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے ارشاد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پشیمانی کے نقوش نمایاں تھے۔ انہوں نے بڑی محبت سے اس کے گال کو تھپتھپایا اور یہ کہتے ہوئے اسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ "اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا بیٹا واقعی ایک ڈاکٹر کے دل کا مالک ہے!"

شان بھارتی

غزل



●

دیارِ خاک ہنر سے پکارتا ہے مجھے
کوئی تو ہے جو کھنڈر سے پکارتا ہے مجھے
اسی کو ہو نہ سکا میری ذات کا عرفان
جو اپنے جہل کے ڈر سے پکارتا ہے مجھے
یہ کس کے لب پہ دعاؤں کے پھول کھل اٹھے
یہ کون بابِ اثر سے پکارتا ہے مجھے
وہ یوں بھی کرتا ہے اظہارِ مدعا اے شانؔ
زباں ہو چپ تو نظر سے پکارتا ہے مجھے

تاثرات کی خوشبو

مئی ۸۷ء کے تعمیر ہریانہ میں "خوشحالی کا نقیب ہریانہ" ہریانہ کی تعمیر و ترقی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ نشتر خانقاہی۔ ایم مبین کے افسانے "غیب کی آواز" (ڈرامہ) اور شام داس کھنہ کا "نظیر اکبرآبادی" خوب ہیں۔ "سیندور کی آنچ" بھی اچھا ہے۔ اس بار غزلیات میں، مدہوش۔ راشد جمال فاروقی۔ خوشتر سحاب کی غزلیں قدرے اچھی ہیں۔ مظفر حنفی صاحب کی جدید غزل کا پہلا شعر بہت پسند آیا۔

ڈاکٹر بیتاب علی پوری

ماہ مئی ۸۷ء کا تعمیر ہمدست ہوا۔ مدّتِ مدید سے "تعمیر" زیر مطالعہ ہے۔ آپ نے اس کی وقعت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ مقالوں میں سحر افروز کا "فراق کی شاعری میں لب و لہجہ کا مسئلہ" بے حد معلوماتی، تحقیقاتی اور معیاری ہے۔

نشتر خانقاہی کا افسانہ "یہ دائرے کی یاترا" خوب ہے۔ ان کا اپنا مخصوص رنگ ہر سطر سے عیاں ہے۔ پھر بھی افسانوں کے انتخاب میں مزید سختی برتنے کی گنجائش ہے ان کی تعداد میں کچھ اور اضافہ کیجیے۔

مظفر حنفی، شاہد میر، کرشن مدہوش، خوشتر مکرانوی ناصح انصاری کی غزلیں پسند آئیں۔ اظہر خاں کا "غیب کی آواز" بھی خوب ہے مگر کہیں کہیں یوں ہی سا ہو گیا ہے۔ بہرکیف شمارہ بہت بہتر ہے۔

اظہر نیر دربھنگوی

مئی ۸۷ء کے تعمیر ہریانہ کی تمام تخلیقات پسند آئیں۔ سحر افروز کا "فراق کی شاعری میں لب و لہجہ کا مسئلہ" کافی معلوماتی مقالہ ہے۔ کہانیوں میں "محافظ" اور "سیندور کی آنچ" نے متاثر کیا۔ جناب مظفر حنفی، کرشن مدہوش، راشد جمال فاروقی خوشتر مکرانوی اور نثار احمد نثار کی غزلیں اچھی لگیں "غیب کی آواز" بھی اچھی کاوش ہے۔

"تعمیر" کا ہر شمارہ ایک نئے رنگ و روپ لئے آتا ہے۔ اس کو سجانے سنوارنے میں آپ کی مساعیِ جمیلہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے ترتیب و تزئین بھی عمدہ ہے اس سے آپ کی مدیرانہ صلاحیت اُجاگر ہوتی ہے۔

فردوس گیاوی

مئی ۱۹۸۷ء کا تازہ ترین شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ مطالعہ کے بعد دل سرور و انبساط میں ڈوب گیا۔ اس شمارہ میں نور جہاں صدیقی کا افسانہ "سیندور کی آنچ" اور ایم مبین کا "محافظ" بہت عمدہ رہا۔ اظہر خاں کا ڈرامہ "غیب کی آواز" واقعی قابلِ صد ستائش ہے۔ غزلوں میں مظفر حنفی، شیو دیال سحاب اور خوشتر مکرانوی کی غزلیں قابلِ تعریف ہے۔

حافظ عبدالصمد آزاد

مئی ۸۷ء کے شمارہ میں نور جہاں کا افسانہ "سیندور کی آنچ" کافی پسند آیا، "نظیر اکبرآبادی" "فراق کی شاعری میں لب و لہجہ" معلوماتی مضمون ہیں۔ مظفر حنفی۔ کرشن مدہوش۔ اور نثار احمد نثار کی غزلیں اچھی ہیں۔ خصوصاً کرشن مدہوش کا یہ شعر بہت ہی پسند آیا۔

خود کو بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے کبھی شام ڈھلے
آؤ میخانے چلیں خود کو تو پایا جائے

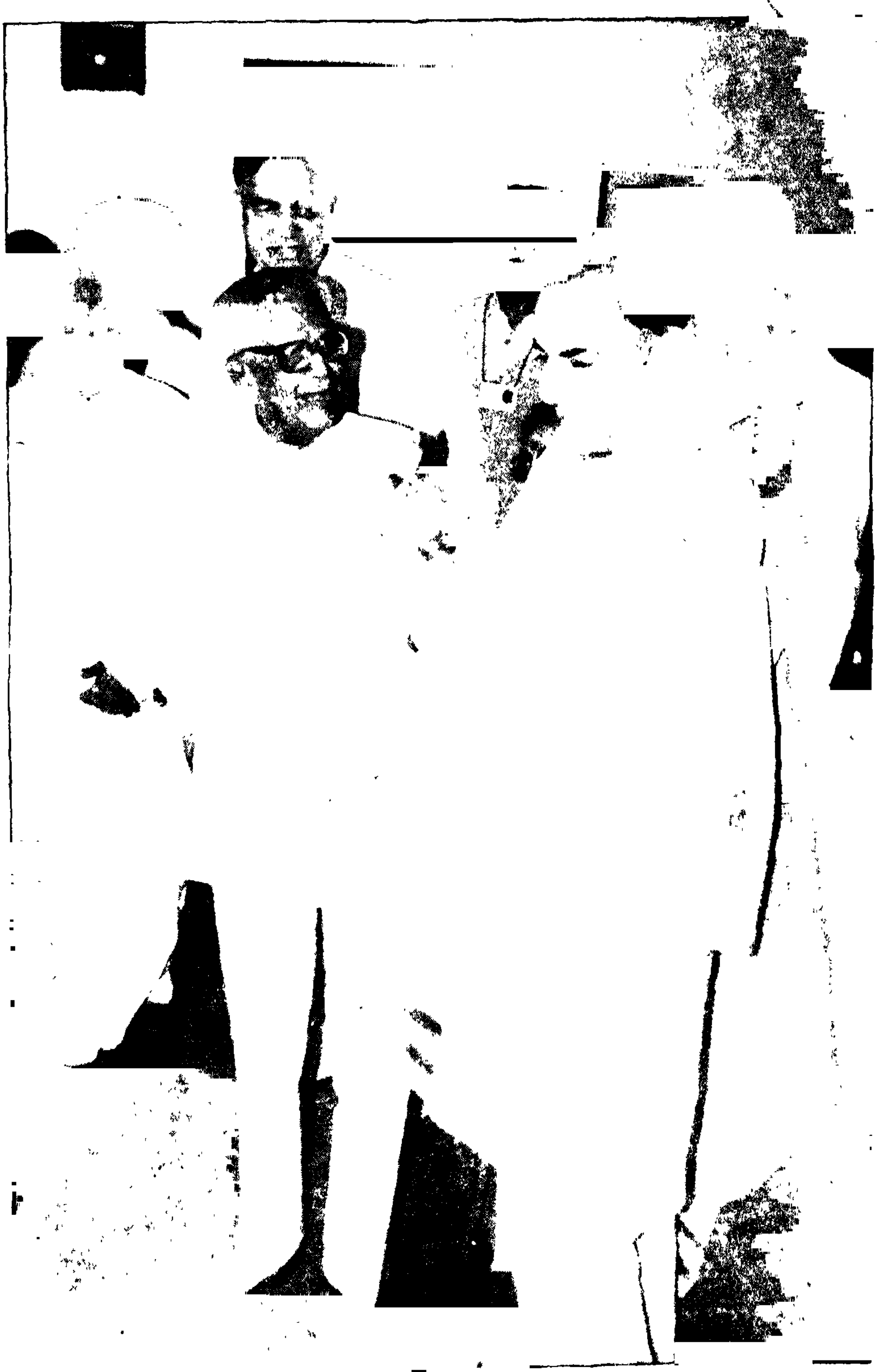
محمد شعبان



صدرِ جمہوریۂ ہند عزت مآب گیانی ذیل سنگھ کی ۱۹ جولائی ۱۹۸۷ء کو چنڈی گڑھ تشریف آوری کے موقع پر ہوائی اڈے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔ گورنر ہریانہ عالیجناب سید مظفر حسین برنی وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب دیوی لال، اسپیکر لوک سبھا جناب بلرام جاکھڑ اور گورنر پنجاب جناب ایس۔ ایس۔ رے بھی اس موقع پر موجود تھے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب دیوی لال چنڈی گڑھ میں اپنے دفتر میں تشریف آوری کے بعد ۶ جولائی ۱۹۸۷ء کو ایڈمنسٹریٹو سیکریٹریوں اور محکموں کے سربراہوں کی پہلی میٹنگ سے خطاب فرماتے ہوئے۔





وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی ۱۶؍جولائی ۱۹۸۷ء کو جناب آر۔ وینکٹا رمن کو صدرِ جمہوریۂ ہند منتخب ہونے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے۔

تعمیر ہریانہ

اگست۔ستمبر ۱۹۸۷ء

19 NOV 1987





گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی اور وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۱۱ اگست ۱۹۸۷ء
کو ہریانہ وزارت میں شامل ہوئے نئے وزراء (بائیں جانب سے) جناب رام بلاس شرما، جناب عظمت خاں،
جناب اوم پرکاش بھاردواج، جناب رگھبیر سنگھ کادیان، جناب حکم سنگھ، جناب راؤ لکشمی نارائن اور
جناب سبھاش کٹیال کے ساتھ۔

Dr. Zakir ... Jamia ... J.M.I. New Delhi

یومِ آزادی نمبر

آپ کا محبوب معتبر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اگست ستمبر ۸۷ء | شمارہ نمبر ۸-۹ | جلد نمبر ۱۵

مدیرِ اعلیٰ:

این۔ کے۔ جین

مدیر:

سلطان انجم

فی شمارہ ۵۰ پیسے
اِس شمارہ کی قیمت ایک روپیہ
زرِ سالانہ ۵ روپے

پیغام

سید مظفر حسین برنی
گورنر ہریانہ

آج ہم اپنی آزادی کی چالیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس روز ہم مہاتما گاندھی کی زیرِ قیادت تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے بے شمار محب الوطنوں کی قربانیوں کو یاد کرتے ہیں۔ آزادیٔ وطن کی اس تاریخی جدوجہد میں ہریانہ نے قابلِ قدر اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

گذشتہ چار دہائیوں میں ریاستِ ہریانہ نے تمام سماجی و معاشی شعبوں میں بے پناہ ترقی کی ہے اور کئی میدانوں میں تو یہ ملک کی دیگر ریاستوں کے لیے مثال بن گئی ہے۔

اس سال، بدقسمتی سے، ریاست کو بدترین قحط سالی کا سامنا ہے۔ عوام کو ان مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے فوراً دیہی علاقوں میں روزگار مہیا کرنے، مویشیوں کے لیے چارے کا انتظام اور پینے کے پانی کی فراہمی جیسے متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

حکومت نے چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، غریب دکانداروں، دستکاروں، درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح کے لیے سماجی و اقتصادی ترقی کی کئی سکیمیں شروع کی ہیں۔ حکومت نے ۲۲۷.۰۵ کروڑ روپے کے قرض معاف کیے ہیں۔ اس سے کمزور طبقوں کے تقریباً ۳۸.۴۰ لاکھ افراد کو فائدہ پہنچے گا۔ مزید برآں حکومت غریبوں، بے سہارا، بیماروں اور ضعیفوں کی ہر طرح سے امداد کرنے کی خواہاں ہے۔ ۶۵ برس سے زیادہ عمر کے ہر مستحق فرد کے لئے سو روپے ماہانہ بڑھاپا پینشن کی ایک نئی سکیم شروع کی گئی ہے۔ اس سے قریباً ۵.۵ لاکھ افراد مستفید ہوں گے۔ اب نوکریوں کے لیے انٹرویو پر جانے والے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کرنے کی سہولت میسر ہوگی۔

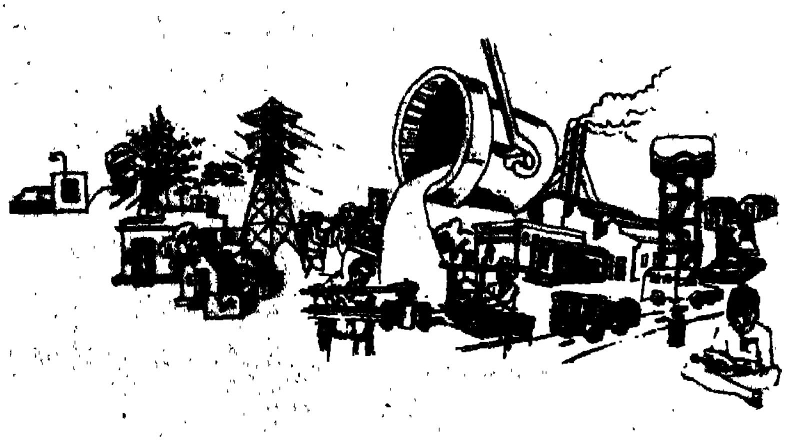
پانی کے بیشتر ذرائع کے بہتر استعمال اور ماڈرنائزیشن پروگرام میں برق رفتاری لاکر آبپاشی سہولتوں میں مزید توسیع پر زور دیا جائے گا۔ ستلج یمنا لنک نہر کی ایک مرکزی ایجنسی کے ذریعے تکمیل کی کوششیں بھی جاری رہیں گی۔ بجلی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے، بجلی کی تقسیم کے طریقہ میں اصلاح کی جائے گی۔ مغربی یمنا کنال ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ اور تھرمل پاور پلانٹ، پانی پت کے پانچویں یونٹ کا تعمیری کام جلد مکمل کر کے بجلی کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے گا۔

حکومت پیداوار بڑھانے میں کسانوں کی مدد کرے گی اور یہ بھی انتظام کرے گی کہ انھیں اپنی اجناس کے اچھے اور مناسب دام ملیں۔ چھوٹی اور دیہی صنعتوں کے قیام اور ایگرو انڈسٹریز کے فروغ پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ ہریانہ کے محنتی اور جفاکش عوام اس قحط سالی پر قابو پالیں گے۔ حکومت انھیں ہر ممکن تعاون دے گی۔ مختلف فرقوں میں اتحاد اور بھائی چارے کی فضا برقرار رکھنے میں حکومتِ ہریانہ نے ایک مثال قائم کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں میں دوستانہ تعلقات استوار رہیں گے تاکہ ملک متحد اور مستحکم ہو۔

اس مبارک موقع پر میں اہلِ ہریانہ کے شاندار اور پُرمسرت مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

(س۔ا)





ہریانہ میں ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز

دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

ہم اپنا اکتالیسواں یومِ آزادی افسردہ دلی کے ساتھ منا رہے ہیں۔ ہریانہ کو شدید اور بدترین قحط سالی کا سامنا ہے۔ گذشتہ سَو سال میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ جولائی میں برسات نہیں ہوئی اور تا حال اگست کا مہینہ بھی تقریباً بارش سے محروم ہے۔ ہم کسانوں کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ ہیں اور ہمیں صورتِ حال پر بے حد تشویش ہے۔

حکومتِ ہریانہ نے مرکزی حکومت کو لکھا ہے کہ وہ ایڈہاک گرانٹ کے طور پر فوراً پانچ کروڑ روپے منظور کرے۔ اِس رقم سے قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت راحت کے کاموں کو شروع کرنے میں فائدہ اُٹھایا جائے گا اور ان لوگوں کو روزگار ملے گا جن کی گذر بسر زراعت پر منحصر ہے۔

ریاست میں ڈپٹی کمشنران کو ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ مرکزی مقامات پر مناسب قیمتوں پر چارے کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔ انہیں دیہات کے تمام جوہڑوں کو قریبی نہروں کے پانی سے بھرنے کی بھی تاکید کی گئی ہے تاکہ مویشیوں کو پینے کے لئے پانی مل سکے۔

مندرجہ بالا تدبیروں کے علاوہ ریاستی حکومت ایک مفصل عرضداشت تیار کر رہی ہے جسے بہت جلد حکومتِ ہند کو پیش کر دیا جائے گا۔ دیہی علاقوں میں فوری روزگار مہیا کرنا چارے کی بآسانی فراہمی اور پینے کے پانی کی سپلائی کو یقینی بنانا جیسے امور سے اس کا تعلق ہوگا۔

ہریانہ ہمیشہ صفِ اوّل میں رہا ہے اور اس نے ہر شعبۂ حیات میں اوروں کو راہ دکھائی ہے۔ موجودہ حکومت کے حق میں عظیم عوامی فتویٰ ایک طویل اور پُر از مصائب جدوجہد کی داستان ہے۔ یہ زبردست بھرشٹاچار کے خلاف ایک فتویٰ ہے جس نے

ریاست کے سیاسی ماحول کو متاثر کیا۔ ودھان سبھا کے حالیہ انتخابات میں لوک دل۔ بھارتیہ جنتا پارٹی محاذ کی بے نظیر کامیابی نے ریاست کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ہم صدق دلی سے انتخابات کے دوران کیے گئے وعدوں کو نبھانے کی کوشش کریں گے۔ ہم غریبی کے خاتمے "ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے خاص طور پر کوشاں رہیں گے۔

اس کا آغاز ہو بھی چکا ہے ہم نے بجلی پانی کا پربندھ۔ بھرشٹاچار بند پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے سماجی و اقتصادی ترقی کی مختلف سکیمیں شروع کی ہیں یعنی پانی اور بجلی کی فراہمی میں اضافہ اور رشوت کی بیخ کنی۔

ہم ماڈرنائزیشن پروگرام میں مزید تیزی لا کر اور آبی وسائل کا بہتر استعمال کر کے آبپاشی سہولتوں میں توسیع پر زیادہ زور دیں گے۔ اراڈی کمیشن کے ذریعہ راوی۔ بیاس کے سرپلس پانی میں سے محض 3.83 ایم-اے ایف پانی۔ نہ صرف ہماری جائز ضروریات کے لیے ناکافی ہے بلکہ یہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ عمل ہے۔ ہم حکومت ہند سے اصرار کر رہے ہیں کہ وہ کسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پانی کی تقسیم صحیح ڈھنگ سے کرے۔

ہم بے تابی سے ستلج یمنا لنک نہر کی تکمیل کے منتظر ہیں۔ ہریانہ میں اس نہر کا تعمیری کام ایک عرصہ قبل مکمل ہو چکا ہے مگر پنجاب کام پورا کرنے میں بے حد تاخیر کر رہا ہے۔ ہم مرکزی حکومت کو دھیان دلانا چاہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق اس کام کو مرکزی ایجنسی کے ذریعہ مکمل کروائے۔ اس فیصلے کے مطابق کل خرچ حکومت ہند کو برداشت کرنا ہے۔

بجلی ماڈرنائزیشن اور ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ صنعتوں کے پہیئے کو حرکت میں رکھتی ہے آبپاشی کے لیے ٹیوب ویلوں کے ذریعے پانی بہم پہنچاتی ہے اور جدید زمانے کی دیگر آسائشیں فراہم کرتی ہے۔ ہم بجلی کی تقسیم کے طریقے میں سدھار کر کے اور پاور جنریشن کو فروغ دے کر بجلی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے سخت اقدامات کر رہے ہیں۔ مغربی یمنا کینال ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کے تیسرے بجلی گھر اور تھرمل پاور پلانٹ پانی پت کی تکمیل سے ہمیں 226 میگاواٹ فاضل بجلی ملنے لگے گی۔ پانی پت میں 210 میگاواٹ کا چھٹا یونٹ اور تاجے والا ہیڈ ورکس پر مغربی یمنا کینال ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کا چوتھا بجلی گھر جس میں آٹھ آٹھ میگاواٹ کے دو یونٹ ہوں گے' قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ ہم جمنا نگر میں بھی 1050 میگاواٹ کا سپر تھرمل پاور پراجیکٹ لگانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ سٹیج I پر جس میں 210' 210 میگاواٹ کے دو یونٹ شامل ہیں' پہلے ہی کام جاری ہے۔ جبکہ سٹیج II کے تحت ایسے ہی 210-210 میگاواٹ کے دو مزید یونٹ اور سٹیج III میں 210 میگاواٹ کا ایک یونٹ زیر غور ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم بجلی کی تقسیم کے طریقہ کار کو سدھار' ہائیڈل اور تھرمل غرض تمام وسائل کو بروئے کار لا کر مانگ اور سپلائی کی خلیج کو پُر کر سکیں گے۔

ہم نے دھرتی کے بیٹے کی حالت سدھارنے کا تہیہ کر رکھا ہے جو سخت حالات کے باوجود کھیتوں میں فصل کو پروان چڑھاتا اور لوگوں کو خوراک دیتا ہے، ہم زرعی شعبوں میں اسکیموں کے ذریعہ کاشتکار کو زیادہ اناج پیدا کرنے کے لائق بنانے اور اس کی اقتصادی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ بارانی کھیتی کو اولیت دی جائے گی تاکہ بنجر اور ریگزار علاقے بھی مستفیض ہو سکیں۔ خوردنی تیل اور دالوں کی طرف بھی ہم فوری توجہ کریں گے۔ کسانوں کو اُن کی پیداوار کی مناسب قیمتیں دلانے کے لیے بھی کوششیں کی جائیں گی۔

حکومت ہریانہ نے کوآپریٹو سیکٹر، ہریانہ ہریجن کلیان نگم، دیگر کارپوریشنوں کی طرف سے اور انٹیگریٹڈ رورل ڈیولپمنٹ پروگرام کی مختلف فلاحی سکیموں کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کو دیئے گئے 227.51 کروڑ روپے کے قرضے معاف کر دیئے ہیں۔ اس سے 7.48 لاکھ افراد کو، جن میں چھوٹے کسان، بے زمین مزدور، غریب دستکار، درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے لوگ شامل ہیں، فائدہ پہنچے گا۔

کسانوں کو اُن کے کھیتوں کے سامنے اُگے ہوئے درختوں کی ایک قطار کی فروخت میں سے پچاس فیصد حصّہ دیا جائے گا تاکہ انہیں اس طرح کے درختوں سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی جا سکے۔ نقصان کی تلافی کے علاوہ اس سے کسانوں کو سڑکوں کے کناروں پر لگے درختوں کی حفاظت کرنے کی تحریک ملے گی۔

صنعت معیشت کو استحکام عطا کرتی ہے اور روزگار کی مزید راہیں کھولتی ہے۔ دیہات خود پر انحصار رکھیں، اس نظریے سے ہم چھوٹی اور دیہی صنعتوں کے قیام پر زیادہ توجہ دیں گے۔ صنعتوں کے قیام میں پسماندہ علاقوں کو ترجیح دی جائے گی اور زراعت پر منحصر صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ نوجوانوں کو نوکریوں کے لئے شہروں کی طرف بھاگنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ اب انہیں گاؤں میں ہی ملازمت کے کافی مواقع میسّر ہوں گے۔

غریب، بے سہارا اور ضعیف زیادہ توجہ اور بہتر دیکھ بھال کے مستحق ہیں۔ ہم نے 17 جولائی 1987ء یا اس سے پہلے 65 سال کے ہو جانے والوں کو سَو روپے ماہانہ بڑھاپا پنشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ لاکھ لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی اس سکیم پر ۶۰ کروڑ روپے سالانہ سے بھی زیادہ خرچ ہوں گے۔

نوکریوں کے لئے انٹرویو پر جانے والے تعلیم یافتہ بے روزگار ہریانہ روڈ ویز کی بسوں میں مُفت سفر کر سکیں گے۔

ملازمین ایک ایسا محور ہیں جس کے گرد تمام انتظامیہ گھومتی ہے۔ ہم نے ملازمین کی تحریک کے سلسلے میں درج ہوئے تمام مقدمات کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب انہیں بے جا تنگ نہیں کیا جائے گا بلکہ ہم ملازمین سے خوشگوار تعلقات اُستوار کریں گے۔

زندگی اور انتظامیہ سے رشوت ستانی کی بیخ کنی ہمارا اہم اور بنیادی مقصد ہے۔ ہم اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دینے والے ملازمین کی یقیناً مدد کریں گے مگر ہمارے نظام میں رشوت لینے والوں اور نالائقوں کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں عوام اور ملازمین دونوں کا دلی تعاون درکار ہے۔

عوام کی شکایتوں کو جلد از جلد دُور کرنے پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ تمام ڈپٹی کمشنران اور ضلع افسران کو ہدایت کی ہے کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ عوام کے پاس جا کر اُن کی شکایات سُنیں اور بغیر کسی پریشانی کے ان شکایتوں کو دُور کرنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ اسی طرح تمام وزراء سے بھی صبح کو اپنی رہائش گاہوں اور شام کو دفتروں میں عوام کی شکایات سُننے کے لئے کہا گیا ہے۔

عوام نے ہم پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اُسے برقرار رکھنے کے لئے ہم جد و جہد جاری رکھیں گے اور اُن کی توقعات پر پورے اُتریں گے۔ ہمیں رشوت، غریبی اور بیروزگاری کے خلاف سخت معرکہ آرائی کرنی ہوگی۔ ہمیں بصیرت، اعتماد اور حوصلے کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے آگے بڑھنا ہوگا۔ آیئے آج کے مقدس دن ہم ذات، نسل اور مذہب کی تمام قیود کو توڑنے کا عہد کریں۔ تشدد سے کترز ہوں اور سخت اشتعال کی حالت

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

ستیش بترا

مسئلہ

" بس بس ! اب اسے مار ہی ڈالوگے کیا ؟" کندن شاہ سے پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو اس بری طرح سے پٹتے دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ وہ اپنی دکان سے اٹھ کر ایک ضروری کام سے بینک جا رہا تھا جب وہ سڑک کے بیچوں بیچ بھیڑ کے دائرے کو دیکھ کر رک گیا تھا۔ اس نے بھیڑ کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہا تھا۔ کچھ لوگوں نے پہچانتے ہی اس کے لئے راستہ بنا دیا۔ بھیڑ کے دائرے کے اندر دو تین آدمی بڑی بے دردی سے ایک لڑکے کو مار رہے تھے۔ اس سے ذرا دور رکشا پر ایک عورت بیٹھی تھی جو لڑکے کو بوکھلائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ لڑکا سزا کا مستحق تھا یا رحم کا۔ وہ تابڑ توڑ گھونسوں اور تھپیڑوں کی بارش کے سامنے بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔ اب تو اس سے رویا بھی نہیں جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر اگلے وار کے ساتھ زمین پر گرنے والا ہو۔

" ارے بھائی کیا کیا ہے اس نے ؟" کندن شاہ نے پوچھا۔

مارنے والے کا ہاتھ ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ " دیکھئے نا! یہ رکشا میں جاتی بہن جی کا پرس لے کر بھاگ رہا تھا!" اس نے رکشا میں بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " اگر اس نوجوان نے چوری کرتے دیکھ کر اس کا اپنی سائیکل پر پیچھا نہ کیا ہوتا۔ . . . " اس نے پاس کھڑے ہوئے نوجوان کو تھپکی دیتے ہوئے سب کی طرف دیکھا۔

" اجی پرس چھین کر یہ گلیوں میں گھس گیا تھا! آدھ میل کی دوڑ دھوپ کے بعد قابو آیا ہے!" سائیکل سوار نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

" اسے اگلی اولمپک کھیلوں میں مقابلے کے لئے بھیجنا چاہیئے!" بھیڑ میں سے کوئی بول اٹھا اور سب ہنس دیئے۔

" کیا زمانہ آگیا ہے ؟ دن دہاڑے لوٹ مار مچی ہوئی ہے! شہر میں کیا اور اجاڑ سڑکوں پر کیا! دہشت پسندوں نے الگ آفت اٹھا رکھی ہے! انسان گھر سے نکلنا ہی بند کر دے!" ایک شخص نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

" ارے ابھی چوری ہی کی ہے نا! کسی اسٹین گن سے کسی کو مارا تو نہیں!" مجمع میں سے ایک آواز آئی۔

" وہ بھی کرے گا! اسی کی تربیت حاصل کر رہا ہے یہ لڑکا!" کسی اور نے لقمہ دیا۔

" یہ لڑکا چور تو نہیں لگتا!" کندن شاہ نے لڑکے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

" یہ شخص کون ہے ؟" بھیڑ میں سے کسی نے کندن شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

" ارے تم نہیں جانتے! کندن شاہ ہے! ملٹری کے سامان کا سب سے بڑا کباڑی! اچھے بھلے شاہ دل!" ایک اور شخص نے جواب

دیتے ہوئے کہا۔
ساری بھیڑ کی نظریں اب کندن شاہ پر جمی تھیں۔ "یہ کیوں بیٹا؟" کندن شاہ نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں نئے نئے آئے ہو کیا؟"

لڑکے نے سسکیاں لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بہن جی آپ کو پرس مل گیا ہے نا؟" اس نے رکشا میں بیٹھی عورت سے پوچھا۔ "کوئی چیز کم تو نہیں ہے؟"

"نہیں بھائی صاحب!"

"آپ جائیے!" پھر انھوں نے سائیکل سوار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شاباش بیٹے! تم نے اپنا فرض خوب نبھایا!"
انھوں نے سائیکل سوار کی پیٹھ تھپتھپائی۔

اب پھر وہ لڑکے کا ہاتھ تھامے بھیڑ سے مخاطب ہوئے۔
"اب آپ سب لوگ جائیے! ضرورت ہوئی تو میں اسے خود پولیس کے حوالے کر دوں گا!"

لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ وہ اُسے اپنی دوکان پر لے آئے۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹے!" انھوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"مہندر!"

"تم نے یہ پرس کیوں چوری کیا؟"

لڑکے کی آنکھ سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے — وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔

"ارے تم اتنے بڑے ہو کر روتے ہو؟ — اچھا بتاؤ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

لڑکے نے سر ہلا دیا۔

"بہت زوروں کی بھوک لگی ہے نا؟ چلو پہلے کھانا کھا لو!"
کندن شاہ اسے پاس کے ہوٹل پر لے گئے۔ جونہی کھانا میز پر آیا، اس نے ایک نظر کندن شاہ کی طرف اٹھائی اور پھر کسی بھی اشارے کا انتظار کئے بنا وہ اس پر بڑی بے صبری سے ٹوٹ پڑا جیسے اگر اس نے فوراً کھانا شروع نہ کیا تو کوئی اس کی تھالی ہی اٹھا کر چل دے گا۔
کھانا کھانے کے بعد سیر ہو کر مہندر نے تشکر بھری نگاہوں سے کندن کی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہیں بار بار قریبی میزوں پر تھالیوں میں رکھے کھانے پر پڑ رہی تھیں۔

"تمہیں گھر میں کسی اور کے لئے بھی کھانا چاہیئے؟" کندن شاہ کی تیز نگاہوں نے مہندر کی ذہنی کشمکش کو بھانپ لیا تھا۔

"ہاں۔ گھر میں ماں ہے!"

"تو اس کے لئے کیوں نہیں کھانا لے جاتے!" اور کندن شاہ نے اسی وقت ایک کھانا پیک کرنے کا آرڈر دے دیا۔

"آپ۔ آپ —" مہندر کھانے کا پیکٹ لئے کندن شاہ کے پیچھے پیچھے دکان پر آ گیا۔ سارے راستے اس کا سر جھکا رہا جیسے اس کا ذہن کوئی اہم گتھی سلجھا رہا ہو۔ دکان پر پہنچتے ہی اُس کی زبان نے اچانک یہ لفظ اُگل دیئے۔

"میں اس چوری کے بارے میں سچ سچ بتانا چاہتا ہوں!"

"آؤ! میرے دفتر میں چلے آؤ!" کندن شاہ اُسے اپنے دفتر لے آیا۔ دفتر پہنچ کر کندن شاہ نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ تم نے یہ چوری بہت مجبوری میں کی ہے! مجھے اس میں کوئی شک نہیں!"

"آ۔ آپ۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"اس لئے کہ میں بھی ایک بار تمہاری ہی طرح چور رہا ہوں!"

"آپ؟ —— چور!"

"ہاں!" اُس نے مہندر کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بٹوارے کے فوراً بعد کی بات ہے۔ ہم سرحد پار اپنا سب کچھ گنوا آئے تھے۔ میں بھی تمہاری طرح اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ میں نے بھی کام ڈھونڈھنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن کسی نے بھی میری کوئی مدد نہ کی۔ میرے ساتھ میری بیوی تھی اور ہمارا چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ۔ مجھ پر تین جانوں کا بوجھ تھا۔ دوسرے بہن بھائی تو راستے میں ہی بچھڑ گئے تھے۔ ہمیں کبھی کچھ کھانے کو ملتا اور کبھی نہیں۔ ہمارا تو جوں توں گزر ہو جاتا لیکن بچے کے لئے دودھ جٹانا ہمیشہ ایک سمسیا رہتی۔ ایک دن ہم سب فاقوں سے بے حد مجبور ہو گئے تھے۔ اور پھر تمہیں معلوم ہے میں نے کیا کیا؟

کہیں سامنے والے مندر میں جا کر میں نے مورتی کے سامنے پڑے ہوئے پیسے چوری کئے۔ ہاں چوری کئے! لیکن میں نے اُس وقت ایک وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اپنی زندگی میں کسی قابل بھی بن سکا تو میری کوشش رہے گی کوئی بھوکے پیٹ نہ رہے۔ خالی پیٹ انسان کو اپنے حواس، اپنی بدھی پہ کوئی اختیار نہیں رہتا! یہ بھوک ہے جو گناہوں کو ترغیب دیتی ہے۔ پیٹ بھرنے پر ہی انسان انسان ہے اور وہ صرف اُسی صورت میں ہی اپنے عمل کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے!

"میں جانتا ہوں۔ بھوک کے پیٹ نے تم سے بھی یہ چوری کروائی ہے!" اور پھر مہندر شاہ نے میز کے خانے میں سے کچھ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا ——— "لو ——— یہ کچھ روپے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں ان کی سخت ضرورت ہے۔ ان سے کچھ دھندا شروع کر لو ——— چھوٹا سا ہی! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ——— پھل سبزی بیچنے کا، کھلونے بیچنے کا۔ کچھ بھی جو تم کر سکو!"

مہندر کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے

"میں رقم جلد ہی لوٹا دوں گا ——— مجھے اپنی ماں کی قسم ہے!"

"ہاں بیٹا یہ رقم اُدھار ہے! لیکن تمہیں اسے مجھے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ——— میں چاہوں گا کہ زندگی میں تمہیں جب کبھی کوئی اپنے جیسا ضرورتمند ملے، تم یہ رقم اسی شرط کے ساتھ اُسے دے سکتے ہو تا کہ یہ سلسلہ جاری رہے، پھیلتا رہے! میں سمجھوں گا کہ تم نے میرا اُدھار لوٹا دیا!"

مہندر نے کندن شاہ کے ہاتھ کو عقیدت سے پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔



کوشن کمار طور

غزل



اب کے اس کی چاہ میں یہ بھی کمال ہوا
خود سے میں باہر آیا تو اک مثال ہوا

درد کی بیڑی شام سے ہی بج اُٹھتی ہے
میں تو اس کے فراق میں اور نڈھال ہوا

وہ میری تعریف کا اب محتاج نہیں
وہ چہرہ تو خود ہی ایک مثال ہوا

اب تو سناٹا بھی بولتا لگتا ہے
اپنے آپ میں یہ بھی ایک کمال ہوا

خود ہی چراغ اب اپنی لو سے نالاں ہے
نقش یہ کیا ابھرا، یہ کیسا زوال ہوا

میں اپنی تنہائی سے شائد عاجز تھا
اس آہٹ کا ورنہ کیسے خیال ہوا

وہ بھی مجھ کو بھلا کے بہت خوش بیٹھا ہے
میں بھی اس کو چھوڑ کے طورؔ نہال ہوا

رام پال



لال بتی

یہ تو دن رات کا تماشہ تھا۔

ہر چند منٹ کے بعد۔ ہری بتی۔ لال بتی۔ چلو۔ رُکو۔ اور پھر رُکو۔ چلو۔ اور اس چند ثانیہ کے وقفے کے ساتھ بہت سی جانیں وابستہ تھیں۔ مختلف پیشے۔ بظاہر مختلف لیکن باطن یکساں۔ اور مقصد ایک۔ کسی نہ کسی طریقے سے دوسرے کی جیب کے سکے اپنی ہتھیلی میں منتقل کرنا۔ یہ ایک مشہور چوراہا تھا۔ اور اس کے باسی بھی چاروں کھونٹ سے آئے تھے۔ لیکن کسی کو نہ گھر یاد تھا۔ نہ بار کا پتہ تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ اس ہی فٹ پاتھ پر ان کی زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ اور رکو، چلو کے ساتھ ان کی زندگی کا رزق بندھا ہوا تھا۔ کاریں، ویں، تھری ویلر، سکوٹر، موٹر سائیکل، سائیکل، بس اور ٹرک۔ حتیٰ کہ پیدل والے بھی رُکنے پر مجبور ہو جاتے۔ سامنے گاڑیوں کا ریلا تھا۔ اور اُن کو عبور کرنا زندگی کی لکیر کو پھلانگنے کے مترادف تھا۔ لیکن یہ 'رکو' کا وقفہ ان کی جان تھا۔ اس کے ساتھ ان کا جہان تھا۔ جہاں ان کی ضروریات محدود لیکن خواہشات لامحدود۔ لیکن وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اس میں ہی مست تھے۔ وہ کاریں دیکھتے جب رُکتیں تو عجب للچائی ہوئی ان کی نظریں اُن کے چمکدار گدّوں پر بیٹھی سواریوں پر اٹکتیں، جو کبھی نہ کبھی ان کی ہتھیلی پر ایک آدھ سکہ رکھ دیتیں اور ہری بتی ان کی نگاہوں کی حقارت کو اُجاگر کر دیتی۔ کبھی نفرت آمیز جذبہ کے تحت جب وہ مٹھی بند کر لیتے اور کبھی تمسخرانہ انداز میں جب ہری بتی آگے بڑھا کے بقیہ ریزگاری ان کے پاس ہی چھوڑ دیتی۔ کاریں کھڑی ہوئیں اور ٹنکو جلدی سے اپنا میلا کچیلا کپڑا کار کے صاف شفاف بونٹ پر پھیرنے لگا۔ نہ معلوم اس کا مقصد صاف کرنا ہوتا تھا یا زیادہ میلا کرنا۔ وہ بائیں ہاتھ سے کپڑا پھیرتا جاتا اور دائیں ہاتھ سے سلام کرتا۔ عام طور پر کار کے پاس گداگر کے اس نئے طریقے سے واقف ہوتے۔ کیونکہ ایک نہ ایک ٹنکو اُن کو ہر لال بتی کے بعد ملتا، سلام کرتا جس کے عوض میں یہ چند پیسے اس کی جھولی میں ڈال دیتے، اور کار کے جانے کے بعد ٹنکو کے لہجے میں ایک عجب قسم کی تلخی آجاتی ”اوہ اتنی بڑی کار، اور دیئے کیا۔ دس پیسے“ جتنی دیر میں وہ اُخ تھو کرتا۔ لال بتی پھر ٹمٹمانے لگتی۔

وہ کتنی دیر سے یہ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ خود اسے اس کا علم نہیں تھا۔ وہ شام کو چوراہے سے پرے بڑی بڑی پائپ لائن کے پاس بی بی موسی کے پاس پیٹ بھرتا۔ یہ اُن سب کا ہوٹل تھا۔ تفریح گاہ تھی۔ دن کے کاروبار کا جائزہ لینے کی جگہ تھی۔ لیکن

موسی حساب کے معاملے میں کسی سے رو رعایت نہ کرتی تھی اور ٹنکو کار والی سواریوں کی نسبت موسی کی طرف زیادہ ترحم انگیز نظروں سے دیکھتا۔ لیکن موسی اگر اِس طرح خدا ترسی کرتی تو بھلا اُس کا دھندہ کیسے چلتا۔ وہ پیٹ بھر کے کھلاتی۔ لیکن گن کے رقم دھرا لیتی۔ اگر اُس میں خوبی تھی تو صرف یہ کہ جب دھندہ مندا ہو۔ ہڑتال ہو۔ شہر میں فساد ہو۔ بارش ہو یا طوفان ہو۔ تو بڑے پائپ میں چولہا سلگا کے کسی کو بھوکا نہ رکھتی۔ چائے پانی روٹی دال۔ جو بھی ہوتا اُسے نہ ٹالتی۔ اور ایسے دنوں کے لئے وہ موسی سے ہر دن مات کھاتے لیکن نہ شکائت زبان پہ لاتے۔ نہ ہی موسی کی چغلی کسی سے کرتے۔ ٹنکو اب اس میلے کپڑے سے تنگ تھا۔ وہ روز سوچتا کہ کرے تو کیا کرے۔

راجہ غبارے بیچتا تھا۔ للو ناریل کی پھانکیں۔ جنو کیلوں کا سوداگر تھا۔ راجو بھیا۔ مونگ پھلی پستہ بادام کی صدا لگا۔ اور یہ چھم چھم کرتی منی اخبار بیچتی۔ کاروبار علیحدہ۔ دھندا ایک پیٹ بھرنا۔ اور زندہ رہنے کی کوشش میں جٹے رہنا جیسے بھی ہو موسی کی طرح ان میں بھی ایک خاموش سمجھوتہ تھا کہ کسی کو بلا وجہ مرنے نہیں دینا۔ کم از کم بھکمری سے تو نہیں۔ باقی پڑے لتے کے معاملے میں ہر کوئی خود کفیل تھا۔ رہنے کے لئے بڑی پائپ لائن تھی کھانا کھلانے کے لئے موسی۔ اور شیخ چلی کے سپنے دیکھنے کے لئے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز تھا۔ لیکن ٹنکو تو اتنا چھوٹا تھا کہ اس کو پوری طرح سے ہوائی قلعے بنانے بھی نہ آتے تھے دوسرے کہتے وہ سنتا۔

راجہ کی منزل بمبئی تھی۔ جہاں وہ فلموں میں کام کرے گا اور وہ ہر فلم پر اپنا مخصوص تبصرہ کرتا۔ اور باقی ساتھی جھوم اُٹھتے وہ بیک وقت کئی کئی ہیروئنیں بغل میں دبا کے ڈسکو ڈانس کرتا۔ فلمی گانے گاتا بے سُرے ہی سہی۔ فلمی ڈائیلاگ بولتا۔ اُلٹے سیدھے چہرے پہ ایسے اتار چڑھاؤ پیدا کرتا۔ کہ کسی کو علم نہ ہوتا کہ وہ آنسو بہا رہا ہے یا ہنسی نکال رہا ہے۔

للو کی منزل۔ تھوڑی سی زمین۔ اپنا ہل بیل۔ اور شاید مقدر میں ہو تو ٹریکٹر بھی۔ ہرے بھرے کھیت۔ وہ ناریل کی پھانکیں بیچتا۔ لیکن من میں گندم۔ چنا۔ چاول۔ ارہر۔ مونگ اور سبزیوں کے کھیت کیاری بنا کے آنے والے وقت کا انتظار کرتا۔ جنو۔ دودھ کشن میں اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دوکان کا نقشہ۔ باتوں باتوں میں ایسا جماتا۔ کہ بنا سودا سلف کے سبھی اُس کے خریدار تھے۔ وہ بھاؤ تاؤ کرتے۔ لڑتے جھگڑتے۔ لیکن پھر ادھار معاف۔ اور پھر اس کی دوکان کھلتی۔ سب میں سودا بانٹتی۔ اور روز کا یہ ڈرامہ کئی بار دہرایا جاتا تھا۔ رامو بھیا۔ پورب میں اپنا دودھ کا دھندہ کرنے کو سوچتا۔ ایک بھینس۔ دو گائے اور چار بکری۔ ان سب کو ملا لیا جائے۔ اور گلے کے دودھ کے بھاؤ سستے داموں بیچ دیا جائے تو کیا منافع ہو۔ یہاں بیچارے کو چائے بھی میسر نہ تھی۔

اور منی کے سپنے پر تو سبھی ہنستے۔ وہ نہ معلوم کس کے آنگن میں بیٹھی کس کے بچوں سے کھیلتی رہتی۔ وہ دھجیوں سے کپڑے کرتی۔ پھر اُن کو بناتی سنوارتی اور کلیجے سے لگا لیتی۔ راجہ لاکھ اُسے کہتا کہ وہ اسے اپنی فلم میں ہیروئین بنائے گا لیکن وہ ٹھینگا دکھا دیتی۔ للو کی کڑک دار اور بارعب گھرکی اسے پسند نہ تھی۔ جنو کا خوشامد بھرا لہجہ اسے نہ بھاتا۔ رامو کی دودھ میں ملاوٹ سے اس کا اندازہ لگاتی۔ رہا ٹنکو۔ لیکن اسے تو خواب دیکھنے نہیں آتے تھے۔ اور منی کبھی کبھی اس پر ترس کھا کر اسے بتاتی کہ بھی کسی دھندے کی سوچے۔ ورنہ اُس کی زندگی میں "لال بتی" ہی رہے گی۔ اور ٹنکو چوراہے پر لگی لال سبز بتیوں کو گھورنے وہ تو موسی کا لاڈلا تھا۔ وہ نہ بہار سے آیا تھا نہ تامل ناڈو۔ نئی زمینوں کی کھوج اسے منظور نہ تھی۔ وہ تو اسی چوراہے پر دھندا کرے گا۔ چائے کی دوکان۔ نمکین دال اور میٹھے بسکٹوں سا تھ۔ اُس نے اپنے اس خواب کا ذکر کبھی بھولے سے بھی کسی آگے نہیں کیا تھا۔ لڑکے اُس سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ وہ پورب پچھم دکشن کے خواب لے کے چلے تھے۔ اُن کے خواب بڑے تھے۔ موسی سے بات اس لئے نہ کرتا تھا کہ وہ مذاق تو نہیں اُڑائے

ں جبکہ یہ لڑکے کہتے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ لیکن اپنے بے بنائے روٹی پانی کے دھندے میں ساجھے دار موسی کو سبھی لینو دیتی پیسے دے دے کے منی تھی جس کے کان میں کھسر پھسر کرتا در وہ کھلکھلا کے ہنستی۔ اور کہتی میں کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ ہارا ٹنکو ایک دن بڑا ہوٹل کھولے گا۔ اور تب وہ تھرکنے لگتی ٹنکو کے ہوٹل میں ناچے گی۔ سب اسے نامعلوم کیسی نظروں سے دیکھتے کہ ٹنکو کھسیانا سا ہو جاتا۔ لڑکے عجیب باتیں بناتے اور ہ جو تو اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے ناچتا۔ باقی سُر تال سے تھرکتے۔ تالیاں پیٹتے۔ سیٹیاں بجاتے۔ اور ٹنکو روہنسا سا ہو جاتا۔ تب منی یکدم اسے اُٹھا کے چھاتی سے لگا لیتی۔ ٹنکو بظاہر جھنجھلاتے ہوئے اسے پیٹتا لیکن اندرونی طور پر اس لمس سے لیا محسوس کرتا وہ خود نہ کہہ سکتا تھا نہ دکھا سکتا تھا۔ مگر سب جانتے اور منی تو کھلکھلا کے اس کے گال تھپتھپاتی۔ اور ٹنکو شرم سے تمتما اُٹھتا۔ اور نہ معلوم اور کیا کیا سوچنے لگتا۔

اور ایک دن لال بتی ہوئی۔

اور اُس دن ہوا بھی زوروں کی تھی۔ اور ایک کار لدی پھندی رکی۔ ڈرائیور کے علاوہ دو عورتیں اور پانچ بچے۔ ٹنکو جلدی جلدی بونٹ پر میلا کپڑا پھیرنے لگا۔ منی نے "پیسہ پیسہ" چلایا۔ اور ڈرائیور نے اٹھنی کی بجائے روپیہ اس کی ہتھیلی پر اس طرح رکھا کہ مٹھی بھینچ گئی۔ اور منی کی بتیسی کھل گئی۔ لیکن عورتوں اور بچوں کا غول فٹ پاتھ پر اُمڈ آیا۔ "بیلون۔ بیلون" بچے چلائے۔ اور راجہ کی چاندی ہوگئی۔ ادھر وہ ایک غبارہ ایک بچے کو پکڑاتا۔ دوسرا جھپٹتا۔ اور ہوا اس غبارے کو دور اُفق کے پار لے جاتی ہوئی پل پل نے آدھی درجن کیلے لئے۔ نوجوان ڈرائیور نے ناریل کی دو پھانکیں لیں اور پتلی دُبلی نرگی نما عورت نے دو تین لفافے مونگ پھلی کے۔ صرف ٹنکو ہی ایسا بچہ تھا جو اس سودے میں سراسر گھاٹے میں تھا۔ کوئی اس کی صفائی دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ جتنا وہ کپڑا پھیرتا اتنی ہی گرد اس پر پڑ جاتی۔ آخر خیرات بھی تو دعاؤں کے بدلے دی جاتی ہے اور اُجرت کسی کام کو بخش

خوبی و کمال سرانجام دینے کے بعد۔ سب کے پاس تو کچھ نہ کچھ تھا لیکن اس کے پاس تو اُٹھا ہوا ہاتھ اور جٹا ہوا کپڑا ہی تھا۔ لیکن مولے بے نیا نہیں ہے۔ اس نے خدا کا نام سن رکھا تھا۔ کرشمہ آج ہی دیکھا۔ کہ جب موٹی پل پل نے بچوں کے غباروں کا حساب چکانے کو اپنا موٹا سا پرس کھولا تو وہ ٹھساٹھس نوٹوں سے بھرا تھا۔ ٹنکو کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے اتنے روپے اکٹھے آج دیکھے تھے۔ اور تب اُس عورت نے ایک گڈی اُٹھائی اور راجہ اس سے حساب میں جُٹ گیا۔ تب کار کے نوجوان ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ کہ اب "لال بتی" کی بجائے "سبز بتی" کے نظارے شروع ہوئے۔ اور وہ جھٹ پٹ اپنی ساڑھی۔ پلو۔ بچے اور پرس سنبھالتی ہوئی کار کی طرف بڑھی۔ تب تک ہوا کے ریلے سے ایک نوٹ اُڑ کے عین بونٹ کے اوپر جا گرا۔ ٹنکو کے میلے کپڑے کی گرفت لاشعوری طور پر اُس نوٹ پر مضبوط ہوگئی۔ اور ٹنکو کے اندر ایک عجب جنگ۔ اُس نے جب نوٹ واپس کرنے کا فیصلہ کیا تب تک کار بہت دور جا چکی تھی۔

ٹنکو اپنے دفینہ کا پتہ کسی کو دبی زبان میں بھی بتانا نہیں چاہتا تھا البتہ اُس رات کھانے وقت اس نے موسی کے سارے سامان کا عجب نظروں سے جائزہ لیا۔ ایک پرانی الومینیم کی پرات ایک توا۔ ایک دیگچی۔ ایک کڑچھی۔ دو تین پرانی کٹوریاں اور ایک آدھ عام چینی کی پلیٹیں۔ یہ تب کام میں لائی جاتیں جب کبھی کبھار کوئی باہر کا گاہک بھولے بھٹکے موسی کے اس ریسٹوران پر آ جاتا۔ یا یہ سب کسی ڈیوٹی پر تعینات فٹ کانسٹیبل کو دعوت دیتے۔ ورنہ سب پُرانے پھٹے اخبارات کے کاغذات پر ہی گذارہ کر لیتے۔ یہ کام منی کے ذمے تھا۔ کھانا بنانے کی ذمہ واری موسی کے سپرد تھی۔ لیکن پیٹ بھر کے کھلانا منی کا ہی فرض تھا۔ ورنہ موسی کے روپے میں تو سب بھوکے پیٹ ہی سو جاتے۔ منی نہ معلوم دال بھاجی پروستے اور روٹیاں بانٹتے ہوئے ہر ایک کے کان میں کیا بات کہتی کہ وہ کھانا بھول کے منی کی بات سنتا۔ لیکن منی تو چٹنی تھی۔ تیکھی۔ تیز۔ ترش جس کو چکھا تو جاتا ہے اس سے پیٹ تھوڑا بھرتا ہے۔ لیکن منی کے برتاؤ سے کھانے کا مزہ بدل جاتا۔ ذائقہ

دوبالا ہوجاتا۔ وہ ٹنکو کو اپنے ساتھ کھلاتی تھی۔ سب کو علم تھا کہ اس کے کھانے میں تھوڑا بہت اور کچھ بھی ہوتا ہے۔ جیسے جنو سے چرائے ہوئے کیلے، للو سے مانگی ہوئی ناریل کی پھانک، رامو بھیا کی دی ہوئی مونگ پھلی اور اپنی کمائی سے خریدی ہوئی کھٹ مٹھی گولیاں، نمکین پاپڑ، چٹ پٹے چھوٹے، نیمبو والی دال، سب جانتے تھے لیکن بھائی چارہ۔ اس کی لذت ہی کچھ اور تھی۔

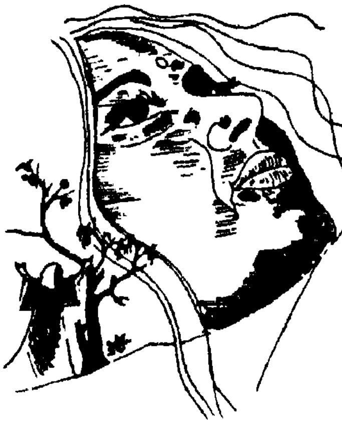
لیکن اس روز وہ چپ چپ تھا۔ وہ گئی رات تک تانے بانے بنتا رہا۔ اور تب آدھی رات کو خلافِ معمول منی کے پاس سرک آیا۔ منی چونک گئی۔ اس کی نظر میں تو ٹنکو ایک بے ضرر کیچوا تھا۔ لیکن کیا آج اس کے دانت نکل آئے تھے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ابھی تو اس کے دودھ کے دانت بھی ٹوٹے نہیں۔ اور تب ٹنکو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ منی بھلا موسی کا یہ سارا دھندہ کتنے میں ہوتا ہے؟ منی نے غور سے آدھے اندھیرے میں دور سڑک کی ٹیوب ویل کی روشنی میں ٹنکو کا چہرہ دیکھا۔ اس پر فقط خلوص تھا۔ اسے جہاں اس کے سرکنے پہ غصہ آیا تھا۔ اب اس پہ پیار آیا۔ "بے چارہ" اس نے چپکے سے کہا اور چھاتی سے لگا لیا۔ "میرے بچے!" "آج تجھے موسی کے دھندے کا دھیان کیوں آیا؟" آج ٹنکو کو اس لمس سے اکتاہٹ ہوئی۔ اس نے پھر کہا۔ "نہ۔ نہ۔ موسی کا دھندہ اسے مبارک۔" پھر رک کے آہستہ سے کہا۔

"یہ بتا۔ چائے کے دھندے پر کتنا خرچ آ جائیگا؟" منی نے ہولے سے کہا۔ "ٹنکو۔ آج تجھے ہوا کیا ہے؟ میلا کپڑا یاد رکھ اور بھول جا۔ کہ چائے کیلئے سٹوو، دیگچی، پیالیاں، پلیٹس، بسکٹوں کیلئے مرتبان اور پھر چائے، چینی، دودھ، بسکٹ، نمکین۔" ٹنکو کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ "مجھے بتلو خرچہ کتنا لگے گا؟" "خرچہ" منی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ انگلیوں پہ حساب کیا "بس یہی کوئی دو سو روپیہ کے قریب" اور پھر بولی "لیکن یہ سب کیوں پوچھتے ہو؟" تب ٹنکو نے اپنے نیفے میں اڑسے ایک نوٹ کو اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ منی نے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا اور کہنے لگی "یہ سو کا ہرا نوٹ نہیں۔ یہ تو بیس کا لال نوٹ ہے نہیں چلے گا" اور خواب کی کھڑکی لال تھی کے سامنے رک گئی۔

●●

منصور عالم

غزل



میں تو بارش آخری جاڑے کی تھا ستیا رہا
کیا لباسِ جسم کو بکسوں میں رکھنا تھا روا
اجنبی بن کر ہی رہنا تھا تو اے خانہ نشیں
خلوتوں میں خوابِ لالہ کیوں مجھے دکھلایا تھا
ایک جرأت ہو گئی تھی ہم نشینی میں کبھی
کیسا ظالم ہم نشیں ہے روز دیتا ہے سزا
میں تو غافل تھا رہا برسوں کنارے ٹھہر کے
کون میرے در پہ سنگِ شوق برساتا رہا
منتشر ہو کر رہا منصور مستحکم سرشت
آپ کی خوش فعلیوں سے اک تماشا ہو گیا

تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

ڈاکٹر مظفر حنفی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو شعر و ادب میں رومانی معاملات اور عشقیہ واردات کی ترجمانی ہی کی جاتی ہے اور اپنی داخلیت پسندی کی بنا پر اردو شاعری خارجی دنیا اور معاشرتی زندگی سے بہت کم تعلق رکھتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اردو شاعری نے ہر زمانے میں بدلتے ہوئے حالات اور انسانی جذبات کی بیک وقت عکاسی کی ہے اور اس میں حُبّ وطن کی بھی اتنی ہی مستحکم روایت موجود ہے جتنی کہ اس کی عشقیہ کیفیات پہ مبنی شاعری وسیع ہے

جائزہ لیں تو ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو کے شاعر و ادیب بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ نمایاں قدم کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جتنے کہ دوسری زبانوں کے قلم کار بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آزادی کی جنگ میں حصّہ لینے والے اردو کے بہت سے فنکار ہمارے چوٹی کے لیڈروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا حسرت موہانی تلک کے بعد دوسرے ہندوستانی ہیں جنھیں انگریزوں نے سیاسی اعتبار سے خطرناک تصوّر کر کے جیل بھیجا۔ حسرت کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے صفِ اول کے قومی رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، علامہ اقبال اور بہت سے دوسرے اعلیٰ پائے کے شاعر اور نثر نگار شامل ہیں۔

یہ فرض کر لینا بھی مناسب نہیں ہے کہ اردو شاعری میں قوم پرست خیالات اور جدوجہد آزادی سے ہم آہنگی کا جذبہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد سے پیدا ہوا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دے رکھا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس عظیم حادثے کے بعد سے ان خیالات و افکار میں ایک نوع کی شدت اور تنظیم پیدا ہو گئی لیکن غائر نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستبرد اور ہندوستانیوں کے استحصال کا احساس اردو کے شعرا کو ہونے لگا تھا۔ مثلاً میر تقی میر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب خرابہ ہوا جہان آباد ٭ ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں ٭ تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا
اب شہر ہر طرف سے ویران ہو رہا ہے ٭ دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

اور دلی کی خرابی کا یہی احساس میر کے دلگداز قطعوں میں بھی کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ دو قطعات دیکھیے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ٭ ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ٭ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ٭ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

اور دوسرا قطعہ:

اے صبا گر شہر میں لوگوں میں ہو تیرا گزر ٭ کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاکِ دلی سے کیا ہم کو جُدا یکبارگی ٭ آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

میر تقی میر کے ہمعصر مرزا سودا کی ہجویات میں بھی قدم قدم پر اپنی مٹتی ہوئی تہذیب اور دلّی کی تباہی اور تاراجی کے نقشے نہایت پُر تاثیر لہجے میں کھینچے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص اُن کا قصیدہ شہر آشوب بھی لائقِ ذکر ہے۔ اس کے دو بند پیش کئے جاتے ہیں:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھے تو دل ہووے زندگی سے اُداس
بجائے گُل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر، نہیں معلوم
نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم
مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گُلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

زمانے کی پریشانی حالی اور عوام کی بے چینی کے یہ مرقعے دراصل اس دور کے شاعروں کی وطن سے گہری محبت کے غماز ہیں۔ چونکہ اس وقت تک انگریزوں کے خلاف کوئی باقاعدہ تنظیم سرگرم عمل نہیں تھی اس لئے ان فنکاروں کی فکر و احساس میں بھی اس نظم و ضبط کا فقدان پایا جاتا ہے، جسے تحریک آزادی سے باقاعدہ مربوط کیا جا سکے اور اس میں وہ رجائی پہلو اور حوصلہ مندی بھی نہیں ہے جو آئندہ آنے والے شعراء میں پائی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے پہلی بار بڑے پیمانے پر برطانوی حکومت سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور فوج نے اس کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ نتیجے میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، اس عہد کی اردو شاعری میں ان کے بڑے واضح نقوش محفوظ کر لئے گئے۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کے قطعہ کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں:

بس کہ فعالِ مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

یہاں اُس غم و غصہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو غالب کے دل میں دلّی کی تباہی کے ذمہ دار انگریزوں کے خلاف موجزن تھا۔

اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو کے شاعر صرف دہلی کی تباہی کا رونا ہی نہیں روتے بلکہ اب سرکشی اور احتجاج کی لے میں قدرے شدت آگئی ہے حتیٰ کہ حالی جیسے صلح جو شاعر کے لہجے میں تلخی اور تندی کا احساس ہوتا ہے۔ ثبوت کے طور پر انکے شعر دیکھیں:

تذکرہ دہلئ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ییکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز

اور اسمٰعیل میرٹھی بزرگانِ قوم کو مشورہ دیتے ہیں:

خبردار یاں اے بزرگانِ قوم کہ اُجڑا پڑا ہے گلستانِ قوم
وہی زندہ ہے جو مرے قوم پر کدھر ہیں کہاں ہیں شہیدانِ قوم

یہی وہ زمانہ ہے جب آخری مغل تاجدار اور ہندوستان کی پہلی ناکام جنگِ آزادی کے سپہ سالار بہادر شاہ ظفر عالم اسیری میں رنگون جاتے ہوئے خاکِ وطن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کتنا ہوں بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اور اودھ کے حکمران واجد علی شاہ اختر اپنی گرفتاری کے وقت الوداعی شعر میں فرماتے ہیں:

درو دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

داغ دہلوی عام طور پہ شاہد پسند باز غزل گو کی حیثیت سے

نے جاتے ہیں لیکن اس دور میں ظفر اور واجد علی شاہ جیسے ہتان وطن کی جلاوطنی اُن سے بھی ایسے عقیقت آمیز اور پُر تاثیر شعر کہلوانے میں کامیاب ہوگئی جن کی عام حالات میں اُن جیسے ساطیہ آہنگ کے شاعر سے توقع نہیں کی جا سکتی یہ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

برنگِ بوئے گُل اہلِ چمن ، چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن ، وطن سے چلے
نہ پُوچھ زندوں سے ہمارے کس چلن سے چلے
قیامت آگئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
کسی سے ڈرتے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرت الیاسؑ بچ کے چلتے ہیں

یہ تو تھے ایک غزل گو شاعر کے نرم و نازک احساسات ان سے ہٹ کر جن فنکاروں کی اُنگلی براہِ راست وقت کی نبض پر تھی اُن کے ہاں ایسے واشگاف انداز میں قوم کی حرمت اور عزت کو للکارا گیا ہے کہ سننے اور پڑھنے والوں کا خون کھو لنے لگے مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

قسمت میں قوم کے ہے لکھی صبح و شام مَرت
بے حُرمتی کے جینے سے بہتر حرام مَوت

ان ہی کے ہمعصر شمس العلماء شبلی نعمانی کی شاعری کا بیشتر حصہ سیاسی افکار پر مشتمل ہے جن میں "ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور" جیسی جوشیلی نظمیں بھی شامل ہیں ۔ اپنے پُرجوش سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ایک نظم میں کہا ہے:

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم
جُرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
مَیں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے
کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگرس سے مجھ کو ہے اظہارِ برأت کیوں نہیں
کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مولانا شبلی کی سیاسی نظمیں ایسی کٹیلی اور تیز و تند ہوتی تھیں کہ ان میں سے بعض کو برٹش حکومت نے ضبط کر لیا تقسیم بنگال سے متعلق ان کی نظم شدتِ تاثیر کی بہترین مثال ہے یہ وہ دور ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس قائم کی جا چکی ہے اور جدوجہد آزادی کی دھن میں حریت پسندوں کا قافلہ ایک مخصوص راہ پر گامزن ہو چکا ہے جس کے ہر نشانِ منزل کے اردگرد اردو شاعری کے نقوش پا برابر اور متواتر نظر آتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادیِ وطن کے ان متوالوں میں نرم و گرم دونوں مزاج کے لکھنے والے شامل ہیں ۔ یہاں نرم دل کے حامی برج نارائن چکبست کی دو نظموں کے ایک ایک بند توجہ اپنی طرف مبذول کر رہے ہیں ۔ "وطن کا راگ" میں کہتے ہیں:

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر
وطن کا پاس ہیں اُن کو سہاگ سے بڑھ کر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر
یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اور یہی چکبست اپنی نظم "آوازۂ قوم" میں ہوم رول کی حمایت میں رطب اللسان ہیں:

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے ، زور ہوم رول کا ہے

اگر نرم دل سے تعلق رکھنے والے شاعر ہوم رول پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں تو اکبر الہ آبادی جیسے کچھ فنکار ہیں جو سرکاری ملازمت میں ہونے کی وجہ سے اپنے سیاسی تصورات کی براہِ راست تبلیغ نہیں کر سکتے اور معذرت خواہی کے انداز میں کہتے ہیں:

مشغولہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اُس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اس معذرت طلبی کے باوجود اکبر الہ آبادی نے اپنا طنزیہ

ومزاحیہ شاعری کے وسیلے سے برٹش راج کے خلاف ہندوستانی قوم میں حریت اور عزتِ نفس کے جذبات بیدار کئے۔ انچی ایک نظم میں وہ جذبہ کیسے انوکھے زاویے سے اُبھارتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں، برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے، خاطر اگر ملول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں اگر اکبر
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

مولانا حسرت موہانی ہمارے چوٹی کے قومی رہنماؤں اور پُرجوش مجاہدینِ آزادی میں شمار کئے جاتے ہیں تا حال یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ حسرت کی حیثیت شاعر کے اعتبار سے زیادہ بلند ہے یا مجاہد آزادی کے اعتبار سے۔ بہر طور ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ سب سے پہلے بلند کرنے والا، عدم تعاون کا نظریہ اور سودیشی تحریک کا تصور ملک و قوم کو دینے والا یہ جانباز مجاہد ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھا اور یہ مشہور مطلع حسرت ہی کا ہے:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

اور مندرجہ ذیل شعروں میں حسرت کے بے باکانہ اور باغیانہ اندازِ فکر کی جھلکیاں دیکھئے:

حُریتِ کامل کی قسم کھا کے اٹھے ہیں
اب سایۂ برٹش کی طرف جائیں گے کیا ہم
ابھی تم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتا دو انہیں گرم پیکار ہو کر
تحریکِ حُریت کو جو پایا قرینِ حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے
روح آزاد ہے، خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار

پنڈت رام پرساد بسمل نہ صرف حسرت کے ہم خیال بلکہ دوست بھی تھے اور اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل شعر، جس نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سپاہیوں کے دلوں میں گرمی اور جوش بھر دیا تھا، حسرت موہانی ہی کا عطا کردہ ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے سر دھڑ کی بازیاں لگا دینے والے جانباز مجاہدین میں "انقلاب زندہ باد" کے نعرے ہی کی طرح علامہ اقبال کا قومی ترانہ بھی مقبول رہا ہے جس کا مطلع ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال کی شاعری کی روح آزادیٔ فکر اور آزادیٔ وطن کو قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کے کلام میں محض جذباتی وطن پرستی ہی نہیں ہے بلکہ منظم فکر اور فلسفیانہ تفکر کارفرما ہے وہ نہ صرف آزادی چاہتے ہیں بلکہ اُن کے ذہن میں آزاد معاشرے کا واضح تصور بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھے
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اور اقبال کے خیال میں ساری مصیبتوں کا علاج ایک اور صرف ایک ہے — آزادی! کہتے ہیں:

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

ہماری تحریکِ آزادی کا ایک اہم اور روشن مینار خلافت

تحریک بھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کے قومی نعروں میں یہ نعرہ بھی شامل تھا:

بولیں اماں محمد علی کی ∴ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ محمد علی خلافت تحریک کے بانی مولانا محمد علی جوہر تھے اور تخلص بتاتا ہے کہ شاعر بھی تھے۔ ابتدائی دور میں گاندھی کی قیادت کے لیے راہ ہموار کرنے والے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے قومی تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالنے والے اس جیالے رہنمائے قوم کے اشعار بھی تحریک آزادی میں نئی جان پھونکتے رہے ہیں۔ موصوف کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
شکر حق ہے کہ ابھی حق کی حمایت کے لیے
جان دینے کو ہیں موجود غلامان حسین
ابھی تک خیر ہے لیکن بہار آئے دے اے بلبل
بلا لائیگا تیرے سر پہ ہر غنچہ گلستاں کا
بنیاد جبر و قہر اشارے سے ہل گئی
ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا

اپنی نظموں سے اس دور میں جوش ملیح آبادی نے نہ صرف وطن سے والہانہ وابستگی کا اظہار کیا بلکہ بغاوت اور انقلاب کے ترانے ایسے پرجوش اور سرشارانہ جذبے کے ساتھ الاپے کہ انگریز سرکار نے ان کی متعدد نظمیں ضبط کر لیں۔ ان میں بطور خاص "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب"، "شکست زنداں کا خواب" اور "بغاوت" اور "شکر اعظم" لائق ذکر ہیں۔ جوش کی ایک انتہائی ولولہ انگیز طنزیہ نظم "وفاداران ازلی کا پیام، شاہنشاہ ہندوستان کے نام" کا یہ جزو ملاحظہ ہو:

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے رئیس پاک دل، اے شہریار نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجیے سلام

آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پہ اک دھجی نہیں ہے، پیٹ کو روٹی نہیں
آپ کو کیوں کر کہیں ہندوستاں پُر ہول ہے
آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے
چو نکیے جلدی، ہوائے گرم و تند آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

قومی آزادی کی یہ لڑائی ہندوستان میں کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک چپے چپے پر لڑی جارہی تھی اگر برطانوی ہند میں جوش ملیح آبادی کے اشعار خون میں چنگاریاں گھول رہے تھے تو حیدر آباد، رام پور اور ٹونک جیسی چھوٹی بڑی سینکڑوں دیسی ریاستوں میں، جہاں راجے اور نواب عوام پر اور زیادہ سخت گیری کرتے تھے، اردو کے شاعروں نے اپنی پُرجوش نظموں سے آگ لگا دی۔ شاد عارفی نے عوام کو آزاد رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

بزدلی ہے جی بجا، با جی حضور ∴ توڑ دے نخوت شعاروں کا غرور
یہ فریب آرزو سے دور دور ∴ لقمۂ تر زندگی کو کیا ضرور
جَو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ

اس ضمن میں شاد عارفی کی "رنگیلے راجا کی موت"، "اندھیر نگری" اور "جبر و قدر" جیسی پُرجوش نظمیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ریاست ٹونک میں آزادی کے نغمے الاپنے والے شاعر اختر شیرانی ہیں۔ بیشتر لوگ انہیں محض سلمیٰ، عذرا وغیرہ فرضی محبوباؤں کے عشق کی داستان سنانے والا رومانی شاعر سمجھتے ہیں لیکن اختر شیرانی نے "بڑھے چلو" اور "اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا" جیسی جوشیلی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ آخر الذکر نظم کے دو بند پیش خدمت ہیں:

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثار آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لے ہاتھوں سے لوائے آزادی
وہ غلغلۂ یلغار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدر آباد میں آزادی کے نغمے گانے کی سعادت مخدوم محی الدین کے حصے میں آئی جنہوں

نے "آزادیِ وطن"، "انقلاب"، "سپاہی" اور "جنگِ آزادی" جیسی متعدد نظمیں لکھ کر عوام میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ مخدوم براہِ راست سیاسی میدان میں بھی سرگرمِ عمل رہے۔ "جنگِ آزادی" کا ایک جزو بطور مثال حاضر ہے:

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

آزادی کے گیت گاتے ہوئے مخدوم کے ساتھ بہت سے دوسرے ترقی پسند شعراء کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ اسرار الحق مجاز جیسا عاشق مزاج شاعر بھی اس معاملے میں دوسرے شاعروں سے پیچھے نہیں رہا۔ اُن کی نظم "بدیسی مہمان" اس کی روشن مثال ہے جس میں وہ انگریز حکمراں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مسافر بھاگ، وقتِ بے کسی ہے ؛ ترے سر پہ اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے ؛ یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
نہ دے ظالم فریبِ چارہ سازی ؛ یہ بستی تجھ سے اب تنگ آ چکی ہے
یہاں کے آسمانِ آتشیں پر ؛ بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے ؛ وہ کشتی دیکھ، ساحل سے لگی ہے

اور ترقی پسند شاعروں کے سرتاج فیض احمد فیض نے اپنی نظم "نثار میں تری گلیوں پہ" میں اعلان کیا:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

ترقی پسندوں کے علاوہ بلا لحاظِ فرقہ و مذہب اور بنا تفریقِ نظریہ و عقیدہ ہر طرزِ فکر کے اردو شاعر نے جنگِ آزادی میں قلمی جہاد کیا ہے۔ اس جنگ میں جگن ناتھ آزاد اور علی جواد زیدی جیسے مختلف نظریات رکھنے والے شعراء شانہ بہ شانہ غیر ملکی حکمرانوں سے لوہا لیتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ دیکھیے جگن ناتھ آزاد "نعرۂ جے ہند" کس بانکپن کے ساتھ لگا رہے ہیں۔

آج پھر سے ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں
حُرّیت کی راہ میں مٹنے کو سب تیار ہیں
آج پھر ہے بے نیام اس ملک کی شمشیر دیکھ
سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ
اس طرح لرزے میں ہے بُنیادِ ایوانِ فرنگ
کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ
حُبِّ قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے
اور توپوں کی زبانوں سے فضا لبریز ہے
فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے
"نعرۂ جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے

بالآخر ہمارے شاعروں کی یہ مشترکہ آرزو پوری ہوئی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے قومی رہنماؤں کی سربراہی میں ہندوستانی عوام نے آزادی کی سنہری منزل پالی۔ اس موقع پر بھی اردو کے البیلے شاعروں نے فتح و نصرت کے نغمے سرشارانہ لے میں خوب خوب گائے۔ اقبال سہیل نے کہا:

اب دورِ مسرت آنے دو، قومی پرچم لہرانے دو
جاتی ہے غلامی جانے دو، صدیوں کا ولدّر جاتا ہے
ہم تم کو لبہ کرنا ہے ہمیں، جینا ہے ہمیں یا مرنا ہے ہمیں
اُٹھو یہ چمن شاداب کرو، وہ غاصب خود مر جاتا ہے

اور تلوک چند محروم نے آزادی کی مبارک باد دیتے ہوئے اہلِ وطن کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو جائیں کہ یہ مرحلہ جنگِ آزادی سے کم دشوار گزار نہیں ہے:

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

یومِ آزادی
کی
چالیسویں سالگرہ

یومِ آزادی کی چالیسویں سالگرہ کے مبارک موقع پر میں سبھی ہریانہ واسیوں کو اپنی جانب سے دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

یومِ آزادی ہمیں محب الوطنوں کے تیاگ، ریاضت اور ایثار کی یاد دلاتا ہے اس موقع پر میں باپوئے قوم مہاتما گاندھی جی اور ان تمام شہیدوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں جنہوں نے ملک کی آزادی کے حصول اور اس کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔

حکومتِ ہریانہ ریاست میں جمہوری اقدار کے قیام کے لئے پُر عزم ہے ہم سیکولرزم میں مکمل یقین رکھتے ہیں۔ ہم ریاست کی ہمہ پہلو ترقی اور سماج کے سبھی طبقوں خصوصاً کمزور اور غریب لوگوں کی سربلندی کے مختلف منصوبوں کو برق رفتاری سے عمل میں لانے کے لئے کوشاں ہیں۔

میں ہر راجیہ واسی سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آج کے مقدس دن، ریاست میں فرقہ وارانہ خیرسگالی، آپسی یکجہتی اور بھائی چارے کی کڑیوں کو مزید مضبوط بنا کر ملک کی سالمیت اور آزادی کی حفاظت کا عہد کرے۔

دیوی لال
وزیر اعلیٰ ہریانہ

۱۵ اگست ۱۹۸۷ء

منظر سلطان



غزلیں

قلم سے آگ پانی کون لکھے
محبت کی کہانی کون لکھے

سنہری ریت میں چنگاریاں ہیں
تمہاری مہربانی کون لکھے

دعاؤں میں عزیزانِ گرامی
حیاتِ جاودانی کون لکھے

سمندر خشک ہوتے جا رہے ہیں
مری تشنہ بیانی کون لکھے

سمتوں سے بے نیاز منازل میں آگئے
گھر سے نکل کے کوچۂ قاتل میں آگئے

جو لوگ نکتہ دانِ نشیب و فراز تھے
وہ بھی فریبِ جادۂ منزل میں آگئے

تنہائیاں گھروں کے منڈیروں پہ ڈال کر
یارانِ خوش لباس کی محفل میں آگئے

جب شخصیت شعور کی پہچان ہو گئی
اپنے تمام لوگ مقابل میں آگئے

یہ شاعری کا فن ہے کڑی دھوپ کا سفر
منظر میاں بھی کون سی مشکل میں آگئے

يوسف ناظم

بمبئی کی برسات

جغرافیے کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ہمارے ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش چیراپونجی میں ہوتی ہے۔ جب کتابوں میں لکھ دیا گیا ہے تو ظاہر ہے یہ بات صحیح ہوگی اور وہاں خوب بارش ہوتی ہوگی۔ لیکن چیراپونجی میں لوگ بہت کم رہتے ہیں۔ وہاں سال بھر مسلسل بارش ہوتی رہے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جنگلوں میں بھی تو بارش ہوتی ہے کسی کا کیا لیتی ہے۔ زندگی تو شہروں میں متاثر ہوتی ہے جہاں بے تحاشہ لوگ رہتے ہیں اور ہر دس برس مردم شماری کرنی پڑتی ہے کہ آخر یہاں کی آبادی میں کتنا اضافہ ہوا۔ شہر تو آج کل اُسی کو کہنا چاہیئے جہاں اتنے لوگ رہتے ہوں کہ پتہ نہ چلے کہ شہر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے اور یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہاں رہنے بسنے والوں کے پاؤں کے نیچے زمین ہے بھی یا نہیں۔ سر پر چھت کے نہ ہونے کا علم تو سبھی کو ہوتا ہے ایسا ہی ایک شہر کا نام ہے بمبئی' جس کا ہر محلہ بجائے خود ایک شہر ہے اسی لئے بمبئی میں جب برسات ہوتی ہے تو پھر کوئی دوسری بات نہیں ہوتی۔ بس برسات ہی برسات ہوتی رہتی ہے لوگوں کے پاؤں کے نیچے زمین کا ہونا تو مشکوک ہوتا ہی ہے۔ بارش اتنی دھواں دھار ہوتی ہے کہ آسمان بھی مشتبہ ہو جاتا ہے سارا شہر ایک جگہ تھم جاتا ہے گویا کسی نے علاقہ ہی کیا دیا ہو۔ اتنی بارش' اتنی بارش کہ معلوم ہوتا ہے جیسے بحیرۂ عرب شہر کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ یہ شہر پہلے ہی تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اس کی ایک طرف' جو کھلی ہوئی ہے وہ بھی برسات کے دنوں میں بند ہو جاتی ہے اور اگر کوئی کرچینٹ تاثیل کی طرف بھی جانا چاہے تو نہیں جا سکتا کیونکہ اس راستے پر بھی اتنا پانی بھر جاتا ہے کہ دل ڈوب جاتا ہے اور آنکھ بھر آتی ہے۔ یہ تو خیر کوئی ایسی بات نہیں جس پر اظہار افسوس کیا جائے لیکن دوسری طرف فریق ثانی لب بام پر نمودار ہو کر گھنٹوں کھڑا رہتا ہے لیکن اس بھری برسات میں ہر طرف سے بس یہی آواز آتی ہے' اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

بمبئی کے سارے شہری برسوں سے ایک دوسرے سے یہی سوال پوچھتے چلے آ رہے ہیں کہ آخر اس شہر میں اتنی بارش کی وجہ کیا ہے' وہ کہتے ہیں جب بمبئی میں ہر کام کا وقت مقرر ہے تو برسات کا بھی وقت مقرر ہونا چاہیئے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس شہر میں بارش کے لئے روزانہ رات کے دو گھنٹے دیئے جانے چاہیئں یعنی رات کے دو بجے سے صبح چار بجے تک۔ ہماری بھی رائے یہی ہے۔ پانچ مہینے سے تین مہینے تک ہو گئے تک روزانہ بارش ہوتی ہے تو صرف بمبئی شہر کے لئے ہی نہیں بلکہ اردگرد کے شہروں کے لئے بھی کافی ہو جائے گی۔ دفتروں کے کام بھی جاری رہیں گے اور بچوں کی تعلیم بھی۔ مدارس اسکول بند ہو سکیں نہ دفتر۔ بمبئی میں یہی

اتنے بند ہوتے ہیں کہ ان کے بعد کسی اور بند کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بڑے شہروں کے لیے واقعی کوئی ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ بارش ٹائم ٹیبل کے مطابق ہو۔

بمبئی میں یوں تو برسات کا پورا موسم ہی بہت دلچسپ ہوتا ہے لیکن پہلی برسات کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ برسات اُس دن ہوتی ہے جس دن کے بارے میں محکمہ موسمیات کا اعلان ہوتا ہے کہ آج بارش نہیں ہوگی اور مطلع بالکل صاف رہے گا۔ بس اُس دن صبح سویرے ہی سے جو جھڑی لگتی ہے تو چھ دن تک رُکتی نہیں ہے۔ پہلے ہی دن شہر کے سارے گٹر اُبل پڑتے ہیں۔ شہر کے سارے علاقوں میں نہریں بہنے لگتی ہیں اور ان نہروں میں ہر قسم کا چھوٹا موٹا سامان۔ اُس دن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر کتنا صاف ستھرا ہے۔ بمبئی کی پہلی برسات پر اگر شہر کا سارا نظام معطل نہیں ہوتا ہے تو کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ بارش کا موسم آیا ہے۔ موٹریں تو موٹریں ہوتی ہیں ان کا قد ہوتا ہی کتنا ہے۔ دو فٹ پانی ان کے ڈوبنے کے لئے بہت ہوتا ہے یہ تو اتنے ہی پانی میں دم توڑ دیتی ہیں لیکن ڈبل ڈیکر بسیں بھی جنہیں ہاتھی تک غور سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ واہ کیا شاندار چیز ہے وہ بھی اس پہلی برسات کے آگے پانی بھرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اُس دن شہر صحیح معنوں میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ٹرینیں پٹریوں پر دم سادھے کھڑی رہتی ہیں۔ ویسے پٹریاں نظر نہیں آتیں چونکہ ٹرین کھڑی دکھائی دیتی ہے اسلئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نیچے پٹری ہوگی۔ ورنہ یہ ٹرین کھڑی کیسے ہو سکتی تھی۔ ہر دو اسٹیشنوں کے بیچ میں ایک نہ ایک ٹرین ضرور کھڑی نظر آتی ہے۔ بارش کے دنوں میں شہر کے کچھ علاقوں میں موٹر گاڑیوں کا پھنس کر رہ جانا اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ ان علاقوں میں کچھ لوگ تو صرف اس لئے گھومتے ہیں کہ چلو آج دو چار موٹریں ڈھکیل کر ہی کچھ پیسہ کما لیا جائے...... یہ بھی ایک تجارت ہو گئی ہے۔ بمبئی شہر کے کسی بھی موٹر نشین شخص سے پوچھ کر دیکھ لیجئے یہی جواب ملے گا کہ ہاں اس موسم میں پہلا کار دو مرتبہ ڈھکیل کر جو سلسلہ شروع ہوا ہے اور میرے اتنے روپے خرچ ہوئے ہیں۔ جو شخص بھی اپنی موٹر نہیں ڈھکیلتا ہے اُس کے اندر بھی خودکشی دیکھئے

کھلنے پڑتے ہیں۔ کار بھی بڑی مشکل سے واپس دستیاب ہوتی ہے۔ ٹیکسی گاڑیاں چلتی ضرور ہیں لیکن ان کا کرایہ اتنا ہی ادا کرنا پڑتا ہے جتنا طلب کیا جاتا ہے۔ یہ کرایہ ہوائی جہاز کے کرایے کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ بس فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تلاشی نہیں لی جاتی۔

بمبئی کی برسات میں چھتریاں بھی ضرور ہیں لیکن یہ کسی کام آتی ہیں سب جانتے ہیں۔ یہ کسی کام نہیں آتیں۔ لوگ چھتری تو اس لئے خریدتے ہیں کہ ہاتھ میں کوئی چیز رہنی چاہیے۔ چھتری کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کا ایک ہاتھ چھتری سنبھالنے پر خرچ ہو جاتا ہے اور آپ دونوں ہاتھوں سے اپنے پینٹ کے پائنچے نہیں سنبھال سکتے۔ بعض نازک ہاتھوں سے تو یہ چھتریاں یوں ہی چھوٹ جاتی ہیں جس طرح مہر النساء عرف انارکلی کے ہاتھوں سے شہزادہ سلیم کے پالے ہوئے کبوتر چھوٹ گئے تھے۔ (چھوٹا تو صرف ایک ہی کبوتر تھا دوسرا مہر النساء نے یہ بتانے کے لئے چھوڑ دیا تھا کہ پہلا کبوتر اُڑا کیسے اور اُس کی اس ادا پر جہانگیر بہت خوش ہوئے تھے) ہوا کچھ ایسی تیز چلتی ہے کہ اگر چھتری چھوٹتی نہیں ہے تو اُلٹی ضرور ہے آسمان کی طرح کاسۂ واژگوں بن جاتی ہے۔ اس اُلٹی چھتری کو اپنے مرکز پر واپس لانے کے لئے چھتری کا مالک بڑی جد و جہد کرتا ہے لیکن یہ چھتری کا دمِ واپسیں ہوتا ہے اور اس کی بے زبانی دیکھی نہیں جاتی۔ بمبئی کی برسات سے بچنے کے لئے لوگ برساتی بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن بارش کچھ اس رفتار سے آتی ہے کہ برساتی کی تہیں کھولنے اور اسے پہننے سے پہلے بلکہ بہت پہلے بوسیدہ مکان کی چھت کی طرح ٹپکنے لگتے ہیں۔ سڑک پر گہرے پانی سے عہدہ برا ہونے کے لئے کچھ لوگ معمولی جوتے نہیں پہنتے گم بوٹ پہنتے ہیں۔ لیکن سڑک پر اگر پانی گھٹنوں برابر ہو تو اس گم بوٹ کی وجہ سے ہر گم بوٹ پوش شخص کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ایک چھتری ایک رین کوٹ اور ایک جوڑا گم بوٹ تینوں چیزوں سے مسلح ہوتے ہیں وہی اندر سے سب سے زیادہ بھیگے ہوئے ہوتے ہیں۔ سڑک پر ہوں تو آگے بڑھ نہیں سکتے اور ریلوے پلیٹ فارم پر ہوں تو ٹرین میں چڑھ نہیں سکتے جو آدمی تین آدمیوں کی جگہ گھیرے اُسے ٹرین میں چڑھنے کون دے گا۔ ایسا آدمی بس دوسرے ہی دن گھر پہنچ سکتا ہے اور وہ بھی اُس وقت جب اُس کے گھر والے اُس کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ لکھوانے تھانے گئے ہوئے ہوں۔ اسی لئے وہ بمبئی کی برسات میں اب مرد تو رین کوٹ پہنتے ہی نہیں ہیں۔

عورتیں ضرور استعمال کرتی ہیں لیکن صرف اس لئے کہ ان کا پہناوا بہت خوبصورت ہوتا ہے اور جب انہیں اتار کر جھٹکا جاتا ہے تو ان سے کئی لوگ سیراب ہو جاتے ہیں۔ اور اسکول جانے والے بچوں کو بھی برساتی تو صرف اس لئے پہنائی جاتی ہیں کہ وہ انہیں آسانی سے پہچان سکیں۔ کوئی غلط بچہ ان کے ہاتھ نہ آ جائے۔

بمبئی میں جب بارش شروع ہو جاتی ہے تو فائر بریگیڈ بہت مصروف ہو جاتا ہے۔ نام اس کا فائر بریگیڈ ہے اور کام اس کا آگ بجھانا ہے لیکن برسات کے موسم میں یہ واٹر بریگیڈ بن جاتا ہے۔ اس کا کام ان دنوں میں یہی ہوتا ہے کہ شہر میں جہاں جہاں بھی پانی جمع ہو گیا ہے اور نہریں بہنے لگی ہیں وہاں سے گھنٹوں پانی خارج کرتا رہے۔ پانی کو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ بہانا ایسا ہی ہے جیسے جنگ روکنے کے لئے ایک نئی جنگ شروع کرنا۔ بمبئی میں ایسے کئی علاقے ہیں جو برسات کے دنوں میں جوائر سٹریٹ الیندر بن جاتے ہیں اور بمبئی بحر ہند تو نہیں بنتا لیکن بحر ہند ضرور بن جاتا ہے۔ سمندر کی موجوں کو ساحل سے ٹکرانے اور ساحل کے ساتھ معاشقہ کرتے تو سبھی نے دیکھا ہوگا لیکن یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ پانی کی موج بھی پانچ سات منزلہ عمارت کی طرح اونچی اٹھ سکتی ہے بارش کے موسم میں سمندر کی موج قیامت کے فتنے سے کم نہیں ہوتی۔ اس بیان میں مبالغہ اس لئے نہیں ہے کہ یہ موج ہر مبالغے سے بڑی ہوتی ہے اور میرین ڈرائیو پر جس سڑک پر دوسری طرف سمندر لہراتا ہے بسیں اور موٹر گاڑیاں سمندر کی موجوں سے بچ کر چلتی ہیں۔ سمندر کی طرف کی سڑک پر تو لوگ بھولے سے بھی اپنی گاڑی نہیں چلاتے۔ دوسری طرف بھی جو گاڑیاں چلتی ہیں بغیر نہائے نہیں گزر سکتیں۔ خود سمندر پر بھی بکثرت بارش ہوتی رہتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے خربوزے چھڑ کر گر رہے ہیں۔ سمندر پر بارش ہونے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مچھلیوں کو شاور سے نہانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ فوارے سے غسل کیا جائے تو بڑی فرحت ہوتی ہے۔ مچھلیوں کے منہ کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہوگا۔ آسمان سے جو پانی اہل زمین کو فراہم کیا جاتا ہے اس میں اتنا زیادہ نمک نہیں ہوتا کہ آپ چکھ بھی نہ سکیں۔

بمبئی کی برسات میں اگر شہر کی دس بیس عمارتیں نہیں گرتیں تو تعجب ان کی بیت النفس ہوتا ہے۔ گرنے والی عمارتیں عموماً وہ ہوتی ہیں جن کے بارے میں مدت تک یہ طے کیا جاتا ہے کہ یہ نہیں گر سکتیں۔ درخت بھی جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں لیکن ان کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ جڑیں تو اس شہر میں سبھی کی کاٹی جاتی ہیں۔ بمبئی میں ایسے لوگ تعداد میں بہت کم ہیں جن کی جڑیں مضبوط ہیں۔ بمبئی میں برسات کے دنوں میں سڑکوں پر بہتے ہوئے مین ہول کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے راہی کو زیادہ دور تک چلنا نہ پڑے۔ ہندوستان کی تاریخ میں جتنی شہرت کلکتہ کے بلیک ہول کی ہے ہندوستان کے جغرافیے میں تقریباً اتنی ہی شہرت بمبئی کے مین ہول کی ہے۔ دونوں میں ٹکر کا مقابلہ ہے۔

بمبئی کے ریلوے اسٹیشنوں پر جہاں جہاں بھی مسافروں کے لئے پینے کا پانی کا بندوبست کیا گیا ہے وہاں اگر کبھی پانی نہ ملے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس سال بمبئی میں بارش کم ہوئی ہے۔ بارش خوب ہو اور بمبئی کی جھیلیں پانی کی سطح مرتفع بن جائیں تو ہر ریلوے اسٹیشن پر لگے ہوئے نل بند نہیں کئے جاتے۔ پینے کے پانی کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ جتنا پانی پلایا جاتا ہے اس سے زیادہ بہایا جاتا ہے۔ اس موسم میں دودھ بیچنے والے دودھ میں پانی نہیں ملاتے، پانی میں دودھ ملاتے ہیں۔ بچے تک ماؤں سے کہتے ہیں کہ ممی ہمیں دودھ اور پانی الگ الگ دیا کیجیے۔

اس موسم میں بمبئی کے ہر باشندے کی ناک کا بہنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کی ناک نہیں بہتی ہے تو اس شخص کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس شخص پر کسی کا سایہ ہے اور سائے کا علاج ہمسائے نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے کسی پہنچے ہوئے شخص کی ضرورت ہوتی ہے اور بمبئی میں پہنچے ہوئے لوگوں کی کبھی کمی محسوس نہیں کی گئی۔

بارش کے دنوں میں سب سے زیادہ ہجوم ڈاکٹروں کے کلینک میں نظر آتا ہے۔ لوگ بارش سے بچنے کے لئے اس کلینک میں جمع نہیں ہوتے یہ سب فلو کے شکار ہوتے ہیں اور اتفاق سے اس مرض کا علاج بھی دوا سے کیا جاتا ہے جس میں دوا کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے فلو کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سات دن سے پہلے دفع نہیں ہوتا۔ دوا بھی ایسی ہوتی ہے۔ اس دوا سے اگر مریض سات دن میں بھی اچھا ہو جائے تو اسے قسمت کا شکر کرنا چاہیے۔ بمبئی کے رہنے والے بارش کے دنوں میں بہت گھبرائے ہوئے لگتا

میں منگواتے اسلئے نہیں کہ ڈبا پہنچانے والے کام پر نہیں نکلتے بلکہ اس لئے کہ برستے پانی میں جب کھانے کا ڈبا انہیں پہنچایا جاتا ہے تو اس میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ایک تو ڈبا اور دوسرے پانی۔ کھانا بڑی محنت سے پکا کر ڈبے میں سجا کر گھر سے بھیجا جاتا ہے معلوم نہیں کہاں اور کیسے بہہ جاتا ہے — ویسے یہ بات ہمیں غلط معلوم ہوتی اور بالکل فلمی کہانی لگتی ہے۔ فلموں میں تو سب کچھ ہو سکتا ہے جب کہ ہیرو سیر ھیوں سے دروازے توڑ کر اپنی موٹر سمیت گھر تک داخل ہو سکتا ہے ایک معمولی ہاٹ کیس سے پکا ہوا کھانا باہر نکل کر کیوں نہیں بہہ سکتا۔

پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ یہ محاورہ ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا لیکن اس محاورے کو اپنی آنکھوں سے بمبئی کی برسات میں دیکھا مطالعے اور مشاہدے میں یہی فرق ہے۔ بمبئی کی برسات میں کپڑے نہیں جلتے آدمی خود ڈھل جاتا ہے۔ آدمی کی جتنی ڈھلائی اس موسم میں یہاں ہوتی ہے اتنی ڈھلائی شاید ہی کسی اور شہر میں ہوتی ہو۔

یہاں ہر سال بڑے بوڑھے ایک ہی بات دہراتے ہیں کہ اتنی بارش تو پچھلے ۵۰ سال میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس بمبئی کی برسات کا ۵۰ سالہ اسکور کارڈ ہے نہیں اسلئے ہم ان کی اس بات کا بُرا نہیں مانتے۔ مُعاف کر دیتے ہیں۔

'بمبئی کی برسات' صرف اسی شہر کے بس کی چیز ہے اسکی جگہ کوئی ایسا ویسا شہر ہوتا تو کب کا نقش بر آب ہو چکا ہوتا۔ ●

بقیہ ہریانہ میں ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز صفحہ ۸ سے آگے

ہیں یعنی فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھیں تاکہ ہم اپنی ریاست کو نئی بلندیوں پہ لے جانے کے قابل ہو سکیں۔ ہم جب تک ہر آنکھ سے آنسو نہیں پونچھ لیتے' چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ یہی خوبصورت اور سہانا خواب بابائے قوم' مہاتما گاندھی نے بھی دیکھا تھا۔

(سوسٹ) ❁

آہ! شریندر پنڈت سوز

"میں صندلی لباس ہوں جلنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا"

مرحوم شریندر پنڈت سوز کا یہ شعر خود اُن کی شخصیت پر پورا اُترتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اتنا پیارا انسان' مخلص دوست اور وقت کے ساتھ قدم مِلا کر چلنے والا ادیب ہم سب سے بچھڑ کر ایسی جگہ چلا گیا ہے جہاں سے کوئی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ چھ اور سات ستمبر (۱۹۸۷ء) کے بیچ کی رات اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اچانک دل کا شدید دورہ پڑنے سے اُردو اور ہندی کا یہ عظیم شاعر اور انگریزی کا انمول افسانہ گو ۵۳ سال کی جوان عمر میں ہی انتقال کر گیا ہے۔ سبھی رشتے دار' دوست واحباب ٹھگے سے رہ گئے ہیں۔ سات ستمبر کو جب اس کا جنازہ شمشان بھومی کے لئے اُٹھا تو وہاں پہ جمع بھاری ہجوم میں کون سی آنکھ تھی جو نم نہیں تھی۔

خوبصورت شخصیت' رنگین طبیعت اور دوست داری مختصر طور پر یہ تین خوبیاں اپنی پوری مقدار میں سوز کے حصے میں آئی تھیں۔ خُدا مرحوم دوست کو جنّت نصیب کرے اور ہم سب کو یہ صدمہ سہنے کی طاقت عطا کرے۔ بات سوز کے اِس شعر سے ہی ختم کروں تو بہتر رہے گا۔ ؎

"آپ سے لوگ کہاں ہم سے مِلا کرتے تھے
حادثے ایسے خیالوں میں ہُوا کرتے تھے"

●

کرشن مدھوش
چنڈی گڑھ

افسانہ

راج شرما

خلش کہاں سے ہوتی

کافی ہاؤس میں کونے والی میز پر بیٹھے سردار جی کو میں بہت دنوں سے دیکھتا آرہا تھا۔ ان کی عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ داڑھی کے بال سفید تھے چہرہ بھرا بھرا سا اور آنکھوں میں ہر وقت ایک مستی سی چھلکتی نظر آیا کرتی تھی۔

سیکٹر سترہ کے اس کافی ہاؤس کے ایک کونے میں کافی کا پیالہ سامنے رکھے وہ کسی نہ کسی سوچ میں مستغرق نظر آیا کرتے۔ انہیں ہمیشہ تنہا بیٹھے دیکھ کر میرے دل میں ان کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش نے جنم لیا۔ آہستہ آہستہ مجھے ان کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔

پتہ چلا کہ وہ ایک دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔ کم بولتے ہیں اور سدا اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے دفتر میں کام پڑ جائے تو وہ بس کسی ماتحت کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی افسر انہیں بلاتا ہے تو اپنے کسی ماتحت کلرک کو بھیج دیتے ہیں۔ دفتر کے ماحول میں ان کا رویہ ایسا ہے جیسے تالاب میں کنول کا پھول۔ بالکل الگ تھلگ۔ صاف شفاف۔

پھر کچھ دن بعد وہ کافی ہاؤس میں مجھے نظر نہیں آئے۔ میری دلچسپی کچھ بڑھی۔ میں نے ایک دوست سے استفسار کیا تو وہ بولا "کہیں باہر تو نہیں گئے؟" ایک اور دوست نے بتایا کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ مجھے حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ انہیں کون سا دکھ تھا؟ وہ تو کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ انہیں کس کا غم تھا۔ کون سا دکھ تھا؟

جو ان کے لیے معمہ بنا ثابت ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا لڑکا میرے ہی دفتر میں کام کر رہا ہے۔ میں نے اسے بلایا اور سردار جی کے بارے میں پوچھا۔ وہ بڑی بے پرواہی سے بولا "ہاں وہ اس دن کوئی ساڑھے تین بجے دفتر سے اٹھ گئے تھے۔ وہ روزانہ اسی وقت کافی پینے جایا کرتے تھے کسی کو بھی یہ نئی یا انوکھی بات نہیں لگی۔ مگر یوں جان پڑتا ہے کہ وہ کافی ہاؤس میں جانے کی بجائے سیدھے جھیل پر چلے گئے۔ جھیل پر لوگوں سے پتہ چلا کہ انہوں نے سردار جی کو جن کی لاش ان کے سامنے پڑی تھی پہلے دن کوئی چار بجے جھیل کے کنارے سیر کرتے دیکھا تھا۔

میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا "انہوں نے خودکشی کیوں کی؟"

اس نے ایک عجیب ڈھنگ سے سر ہلایا اور بولا "اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"

"کیا کوئی دفتری معاملہ تھا؟"

"جی نہیں"

"گھر میں تو....."

"نہیں جی، گھر میں تو وہ بہت دیر سے جایا کرتے تھے۔ رات کھانا کھاتے سو جاتے۔ سویرے گھر سے نکل جاتے واپسی پر نہا دھو کر روٹی کھاتے اور دفتر چلے جایا کرتے تھے۔"

ان کا یہ پروگرام سن کر تو میں اور بھی حیران ہوا۔ ایسا مرنجاں مرنج

اُس نے خودکشی کیوں کی؟ یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

جب اُن کے لڑکے نے دفتر کے عملے کو اُن کی یاد میں رکھے گئے سوگ منانے صاحب کے پاٹھ پر اپنے ہاں مدعو کیا تو میں بھی اُن کے یہاں جا پہنچا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ سردار جی کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکے تو نوکریاں کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری بی۔اے پاس کر کے سلائی اور کشیدہ کاری سیکھ رہی ہے۔ اسکی منگنی بھی ہو چکی ہے۔ سردار جی کے رشتہ دار باتیں کر رہے تھے کہ سردار جی تو ایک سنت آدمی تھے۔ شانت سبھاؤ اور خاموش طبیعت والے۔ تنخواہ میں سے کچھ رقم رکھ کر باقی روپے اپنے گھر دے دیا کرتے تھے۔ گھر پہلے سے ہی اُن کی بیوی کے بل بوتے پر چل رہا تھا۔ بچوں کو اپنے والد کے ساتھ وہ لگاؤ نہیں تھا جو ہونا چاہیئے تھا۔ انکے لئے ان کی ماں ہی سب کچھ تھی۔

کچھ دن بعد دفتر میں ایک گشتی پروانہ آیا کہ ہیڈ کلرک کی آسامی کے لئے اگر کوئی تجربہ کار کلرک جانا چاہتا ہو تو وہ عرضی دے سکتا ہے۔ یہ وہی جگہ تھی جو سردار جی کی وفات سے خالی ہوئی تھی۔ میں نے بھی درخواست دے دی۔ قسمت کی خوبی کہیے کہ وہ خالی جگہ مجھے مل گئی اور میری اُس دفتر میں بطور ہیڈ کلرک تقرری ہو گئی۔ اُس میز پر جہاں کبھی سردار جی بیٹھا کرتے تھے، بیٹھتے ہوئے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک اُبھرے۔

اُس کمرے کا ہی نہیں بلکہ سارے دفتر کا عملہ سردار جی کے کردار کی تعریف کرتا تھا۔ کیا میں اُن کی طرح ہر دلعزیز بن سکوں گا؟ کیا مجھے بھی خودکشی کرنی پڑے گی؟ یہ بلاوجہ خوف کبھی کبھی مجھے بے چین کر دیتا۔

کمرے کے دوسرے میزوں کی نسبت ہیڈ کلرک کی میز ذرا بڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میز کی ایک دراز بند تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چابی ایک کلرک کے پاس ہے۔

"یہ چابی میرے پاس ہی رہتی تھی۔" بابو نے بتلاتے ہوئے تالہ کھول دیا اور سب سے نچلے دراز سے ایک پرانا سا تھیلا نکالنے لگا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

اُس نے کچھ جھجک کر بتلایا "یہ سردار جی کی امانت ہے۔"

"میرا تجسس بڑھا۔" آپ نے یہ تھیلا اُن کے گھر کیوں نہیں پہنچایا؟"

"جی" اُس بابو نے میرے پاس کرسی کھینچ لی اور آہستہ سے بولا۔ "سردار جی نے مجھ سے قسم لی تھی کہ یہ تھیلا میں اُن کے گھر نہیں دوں گا۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو جھیل میں پھینک دوں گا۔ جھیل میں پھینکنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ دیکھ لیں کہ کہیں دفتر سے متعلق کوئی کاغذ نہ ہو۔"

"تم نے دیکھا ہے اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا

"جی نہیں۔ مجھے کھولتے ڈر لگتا ہے۔ میں اسے آج ہی....."

میرے دماغ میں کئی نئی باتیں آئیں۔ میں نے اس بابو سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ ابھی اسے یہیں رہنے دو۔ تھیلا یہاں محفوظ رہے گا۔" اور یہ کہہ کر میں نے اُس سے چابی لے لی۔

میرے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ اس تھیلے میں کیا ہے۔ مگر دفتر کے عملے کے سامنے اس تھیلے کو کھولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ نیا دفتر، نیا ماحول، نیا کام۔ ہر فائل میرے لئے نئی تھی۔ اور میں کافی دیر تک دفتر میں بیٹھنے کے لئے مجبور بھی تھا جب دفتر کا وقت ختم ہو گیا اور سب اہلکار چلے گئے تو میں نے میز کی دراز سے اُس تھیلے کو نکالا اور میز کی اوٹ میں اُسے کھول کر دیکھنے لگا۔ اس میں خطوط کے بنڈل تھے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے وہ بنڈل جو سب سے پرانا معلوم ہوتا تھا اُٹھا لیا اور ایک خط پڑھنا شروع کیا۔

پہلا خط ۱۹۴۳ء کے ماہ جنوری میں لکھا گیا تھا۔ اُس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے.....

"تم جو کبھی میرے تھے مگر اب نہیں..... میں اب بھی تمہاری ہوں اور رہوں گی۔"

ایک اور خط تھا "میں ایک امیر باپ کی بیٹی، جس نے تمہارے تعلیمی معیار کے خطرے کے ڈر سے اور جو تمہارا ساتھ چھوڑ کر میں تمہاری ہمسفر نہ بن سکی۔ آج ایک اسکول میں پڑھانے لگی ہوں۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا میں آج بھی اُس پر قائم ہوں۔"

پھر ایک اور خط تھا۔ "تمہارا کیا قصور تھا؟ تم حالات کا شکار ہو گئے تھے۔ نام تو میرا جیت تھا مگر دل تم نے میرا جیت لیا۔"

میں نے کچھ خط چھوڑ کر ایک چٹھی اُٹھائی۔ لکھا تھا "میں نے رابرٹ براؤننگ کی مشہور نظم "ایولین ہوپ" پڑھی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُس میں جو لڑکی ہے وہ تو تم ہو اور اس کا پریمی میں۔ تمہارا جنم جنم تک انتظار کرتی کبھی نہ تھکوں گی۔ جب تک تمہیں پا نہ لوں۔"

ایک اور خط تھا "تمہارے لڑکا ہُوا۔ مبارک باد۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں تمہارے لڑکے کا پالنا جُھلا سکتی۔ یہ کیسی پابندی ہے کہ میں تمہارے گھر کبھی نہ آ سکوں۔"

۱۹۷۷ء کے بعد کا ایک خط تھا "ہائے بھگوان ایسا کیوں نہ ہُوا کہ ہم اس بھیانک اندھیرے میں گم ہو گئے ہوتے اور پھر اجنبیوں کی طرح ملتے...... اور پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر جیون کی راہ پر چل پڑتے مگر ایسا کیوں نہ ہُوا جیسا ہم چاہتے تھے۔"

پھر ایک اور خط تھا۔ "میں آج ایک ہیڈ مسٹرس ہوں مگر میں نے اپنے آپ کو اٹھارہ برس کی لڑکی سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔"

پُرانے بنڈل چھوڑ کر میں نے ایک نیا بنڈل اُٹھا لیا۔ ایک خط ۱۹۷۹ء کا تھا۔ "میرے بنگلے کے دروازے پر ایک بلب ساری رات جلتا رہتا ہے۔ میں خالی خالی کمروں میں گھومتی پتہ نہیں کیا ڈھونڈتی رہتی ہوں۔"

ایک اور خط تھا جس نے مجھے اپنی طرف دھیان دینے کی ترغیب دی۔ لکھا تھا "بہت دن ہوئے ایک کانٹا چُبھ گیا تھا۔ کانٹا تو نکل گیا لیکن اس کی نوک کا کوئی ٹکڑا میرے جسم کا حصّہ بن گیا ہے۔ جب کبھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے تو مجھے اس کانٹے کی چُبھن کا احساس ہوتا ہے۔ تم آج بھی جنگل میں کِھلی چنبیلی کی طرح پوتر ہو اور تم شیو شنکر کی طرح اپنے دھیان میں مگن...... ؟"

اِس بنڈل کے سب سے اوپر ایک رجسٹرڈ لفافہ تھا۔ یہ حال ہی میں ایک اسکول کی ہیڈ مسٹرس کے نام بھیجا گیا تھا۔ اور ڈاک خانہ والوں نے یہ لکھ کر واپس بھیج دیا تھا کہ اس نام کی ہیڈ مسٹرس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور یہ لفافہ ڈیڈ لیٹر آفس سے ہوتا ہُوا سردار جی کے پاس آ گیا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کسی بھید کو جان لیا ہو۔ میں نے خطوں کے بنڈل کو اُٹھا کر تھیلے میں بند کر دیا اور کچھ سوچ کر اُس تھیلے کو اُٹھا کر...... بھاری اور بوجھل قدموں سے جھیل کی طرف چل پڑا۔

میں نے اپنے بُوٹوں کے تسمے کھولے۔ بُوٹ اُتارے۔ تھیلے کو لے کر جھیل کے کنارے جا کر کھڑا ہُوا۔ میں نے تھیلے کو زمین پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اُسے نمسکار کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے گھما کر تھیلے کو جھیل میں کافی دُور پھینک دیا۔

میں جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ابھی ابھی لال چوڑیوں سے چھنکتے بازو جھیل کے پانی سے باہر نکلیں گے اور اُس تھیلے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیں گے مگر ایسا نہیں ہُوا۔ پانی میں ایک بھنور سا اُبھرا اور تھیلا پانی میں ڈوب گیا۔ سردار جی نے زندگی بھر جس بھید کو اپنی چھاتی سے لگا کر رکھا تھا۔ وہ اب جھیل کی گہرائیوں میں گم ہو چکا تھا۔

آپ اِس واقعہ کو کہانی سمجھ لینے کی غلطی نہ کر بیٹھئے گا......

میں نے یہ واقعہ سُناتے ہُوئے کہیں سردار جی کا نام نہیں لکھا کیونکہ کانٹے کا کوئی نام نہیں ہوتا اور چُبھن...... چُبھن تو بس ایک احساس ہے۔ تیر اگر جگر سے پار ہو جاتا تو یہ خلش کہاں سے ہوتی؟

بقیہ "شاید نہیں" صفحہ ۴۵ سے آگے

نظر ڈالتا ہوں۔ میری کہانیوں کے مسودے جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ بچوں نے اسے اسکیم پتہ سے داغدار کر دیا ہے۔ میز، شیلف، کتابیں، اخبار، بستر، کرسیاں، ایش ٹرے...... کمرے کی ہر شے پر اُداسی اور ویرانی مسلط ہے اور سیلن کی بُو سے دم گھٹتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔ میں سلمٰی کو جگانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخنا چاہتا ہوں کہ اچانک ہی اسٹیٹس سمبل (STATUS SYMBOL) کا خوبصورت نقاب چڑھاتے ہوئے وہ شخص میرے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ مجھے چُپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور سرگوشی میں کہتا ہے۔

"شور مت مچاؤ ورنہ بچے جاگ جائیں گے" اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور اپنے قلم سے میری ہتھیلی پر ایک گہری صاف اور سیدھی لکیر کھینچ دی ہے۔

میز پر رکھی ہوئی شیشے کی نازک اور خوبصورت مورتی کی طرح خاموشی ۔

تسنیم فاروقی

غزلیں

خلد کے نعم البدل سے کم نہیں
میری دھرتی بھی غزل سے کم نہیں

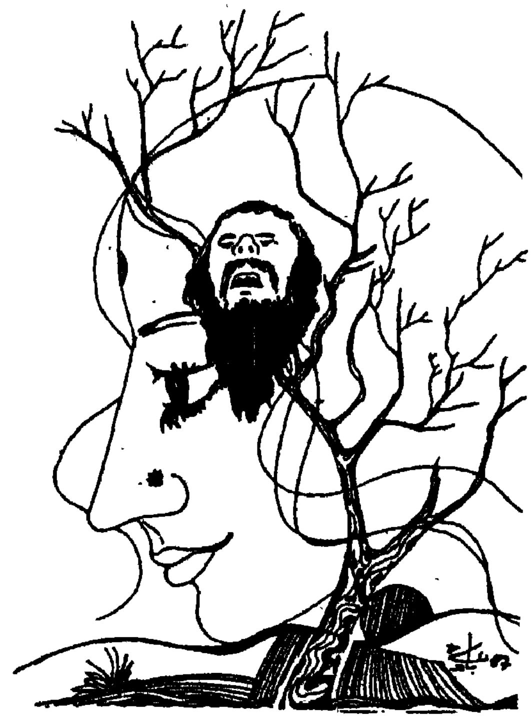
پتہ پتہ بوٹا بوٹا پھول پھل
ذہنِ مانی کے عمل سے کم نہیں

بے نظیری ہے یہاں کی ہر نظیر
ہر مثل ضرب المثل سے کم نہیں

اس کا ہر ذرّہ ہے لَو دیتا ہوا
اس کی جگمگ بھی کنول سے کم نہیں

اس کی مٹّی سے گندھا جس کا خمیر
تول بھی اس کا عمل سے کم نہیں

اس زمیں کو چوم لو تسنیم جی
جھونپڑی بھی یہ محل سے کم نہیں



سایہ سائے کو آ کے لوٹ گیا
جسم خاموشیوں کا ٹوٹ گیا

موجِ مے تھی کہ قامتِ ساقی
ہاتھ سے میرے جام چھوٹ گیا

ایسی تتلی کو کیا کرے کوئی
جس کا چٹکی میں رنگ چھوٹ گیا

وہ مرے پاس آئے بیٹھے ہیں
آج تسنیم کفر ٹوٹ گیا

فاطمہ ترمذی

بھنور دائرے، دھندلکے

کھوں کھوں ــــ اُف ہائے یہ کھانسی ــــ تمام جسم ہل جاتا ہے۔ کتنی راتوں سے وہ پوری نیند نہیں سو سکا ہے۔ شبنم نیند کی دوا دے کر سونے کی ہدایت دے کر چلی گئی ہے۔ مگر نیند کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ یہ کمرہ اس کا پُرانا ساتھی ہے۔ جو اس کا گوشۂ عافیت بھی ہے خواب گاہ بھی اور مطالعے کے لیے پُرسکون پناہ بھی۔

مگر اب تو نظر اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ زیادہ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ یہ کمرہ اور اس میں تمام سامان بہت پُرانے رفیق ہیں۔ یہ ایرانی غالیچہ اس نے ۱۵ برس پہلے لیا تھا مگر کیا فن ہے کہ اب تک آب و تاب باقی ہے۔ اور جاپانی آرٹ کا نمونہ یہ پینٹنگ اسے بے حد پیاری لگتی ہے یہ شیشے کا کنول اس نے دس برس پہلے لیا تھا اور پھر اس میں بجلی کا ہولڈر فٹ کر کے نئے اور انوکھے طرز کا لیمپ بنا دیا ہے نیلے بلب کی روشنی چھن چھن کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ یہ بیضوی آئینہ بلجیم کا ہے جو ناقدری کی نذر ہو گیا تھا مگر اس کی حسن شناس نگاہوں نے اسے تلاش کر لیا۔ چینی نقاشی کے گلدان، صراحی، گلاس۔ یہ فن یہ صناعی حسن و نزاکت کے نمونے اب کہاں، حسن تو مل بھی جائے لیکن پائیداری نہیں۔

یہ اس کا سالہا سال کا جمع کیا ہوا ذخیرہ ہے کس قدر نایاب و نادر یہی اس کا سرمایہ ہے۔ ہاں سرمایہ تو ہے جو اس کی قدرشناس نگاہوں کا مرکز بھی اور ثبوت بھی اس کے ذوقِ جمال کی تفسیر بھی اور تسکین بھی ہے۔

اس نے نیلے بلب کی دھیمی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ مختلف زبانوں کی تصانیف یہ خطاطی کے شاہکار۔ ہر طرف الماریوں۔ آتش دان۔ شیلف میں ہر جگہ اس کا حسن انتخاب جھلک رہا ہے۔ بڑا خواب ناک ماحول ہے۔ خواب جو حقیقت نہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ خوابوں کے آبگینے تو حقیقت کے سنگ گراں سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ خواب کبھی ڈراتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں لیکن دیتے کچھ بھی نہیں۔ اور جن کی تعبیریں اکثر الٹی ہوتی ہیں۔

اکثر الٹی ہی تعبیریں نکلتی ہیں۔ خواب جو کبھی بہت خوش آئند ہوتے ہیں جو آنکھ کھلتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور تلخ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ خواب کبھی ہنساتے ہیں کبھی ہراساں کرتے ہیں۔ مگر دیتے کچھ بھی نہیں ــــ وہ تو عکس ہوتے ہیں تخیل کا بس تو۔

نہ جانے کیا تاریخ ہے، چاند ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے ابھرتے چاند کی تصویریں اس نے کمرے اسی کمرے کی کھڑکی سے اپنے کیمرے میں محفوظ کی ہیں۔ بائیں طرف شیلف پہ رکھی سنگِ مرمر کی مورتی پہ چاند کی اٹھکھیلیاں کرتی پڑ رہی ہیں ــــ نیند اب بھی نہیں آ رہی ہے سونے کی

کوشش ناکام ہو چکی ہے ۔ رات کا سناٹا مسلط ہے کبھی کوئی کار ٹیکسی یا اسکوٹر خاموشی کی چادر میں شگاف کرتا ہوا گذر جاتا ہے۔ شاید رات آدھی گذر گئی ہے ۔

وہ سیدھا لیٹا ہے کہ نگاہیں دائیں طرف بڑھتی ہیں۔ بائیں یہ روشن دان ۔ یہ روشن دان کیسا ہے ؟ ——— یہاں تو کوئی روشندان نہیں تھا ——— این یہ ——— یہ تو کھل رہا ہے ۔ ایک پٹ کھلا ۔ لو وہ دوسرا بھی کھل گیا ۔ دور سے یہ بستی کون سی ہے ۔ جانی پہچانی سی ؟ اور یہ مکان لمبا چوڑا ؟ یہ تو اس کا اپنا مکان ہے اس کا آبائی مکان ——— پرکھوں کی دہلیز ——— جہاں وہ پیدا ہوا تھا جہاں اس کے بابا اور ماں رہتی تھیں ۔ اور یہ بستی اس میں تو اس کا وسیع خاندان تھا ——— وہ گلیاں وہ مقام جہاں اس کا بچپن ——— لڑکپن ۔ اور نوجوانی کا زمانہ گذرا ہے ۔ اب وہ اپنے وطن سے بہت دور ہے ——— وہاں ہے بھی کیا ۔ گذری یادوں کے کھنڈروں کے سوا ؟ ——— بزرگ ختم ہو گئے ۔ نئی نسل اپنے حالات کے اور وقت کے تقاضوں کے ہاتھوں اِدھر اُدھر بکھر گئی ۔ ——— کبھی کوئی چلا جاتا ہے ۔ کبھی وہاں زندگی تھی آبادی تھی ۔ مذہبی فضا تھی اور معاشرتی سماجی حیثیت سے اس کا خاندان کافی معتبر تھا ———

پھڑ ۔ پھڑاک ——— پھڑاک ——— اوہ یہ کیلنڈر کیوں اتنے زور سے اڑ رہا ہے سب صفحے الٹ پلٹ گئے ۔ ماہ و سال دن تاریخ سب پچھل ہیں پیچھے بہت پیچھے کی ہیں ——— جب . . . . . جب ———

یہ تو وہ زمانہ ہے کہ اب صرف یادوں میں زندہ ہے ۔ وہ بچپن سے ہی سب سے الگ تھا ۔ ماں اور بابا بتاتے تھے کہ نہ تو اس نے اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیلنا پسند کیا نہ بچپن میں عام بچوں کی طرح اس کے کوئی شوق تھے وہ بھائیوں بہنوں میں سب سے بالکل مختلف تھا ——— لڑکپن کے بعد جوانی کے باغ و بہار دور میں بھی اس کو نہ تو سنگین تصورات میں کوئی کشش محسوس ہوئی نہ وضع قطع کے اسٹائل میں فرق آیا ۔ ہاں ابتدائی تعلیم سے یونیورسٹی تک علمی میدان میں اس نے مایوس نہیں کیا بلکہ اکثر ساتھیوں سے ممتاز رہا ۔ وہ اپنے آپ میں گم رہتا کوئی کچھ کہتا ۔ کوئی خبطی ——— مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوتا ۔ وہ اپنی رائے اور نظریے ہر پہلو سے بالکل الگ رکھتا ——— اور ایسے ہر اس کام ہر اس راہ سے احتراز رہتا جس کے لئے چار آدمی دلچسپی رکھتے یا پسند کرتے اس لئے نہ تو کوئی اپنا ہمدم و دمساز مل سکا نہ ہم نوا ——— اور ایک تشنگی کا احساس اس کے گرد چھایا رہا ——— آخر انسانی فطرت کے تقاضے بھی تو کوئی معنی رکھتے ہیں اس کی توجہ مونا کی طرف ہوئی تو ادھر ادھر خوشبو پھیل گئی لوگ حیران رہ گئے ۔ بھلا مونا جیکب خاص بات تھی جبکہ خاندان اور خاندان سے باہر بہت سی خوبصورت و قابل لڑکیاں تھیں ——— لیکن حُسن تو اپنی نگاہ میں ہوتا ہے اور دل کی راہ تو ہوتی ہی اور لوگ کیا بڑے ہیں کوئی بیگانہ اس احساس کی نزاکت کو کیا سمجھے گا کیسے محسوس کر سکتا ہے، لیکن اس کی حد سے زیادہ حساس طبیعت اور نازک مزاج پر بڑی گہری چوٹ لگی جب اس کی پسند کسی اور کی ہو گئی ——— احساسِ شکست و ناکامی نے اُسے سخت دھچکا پہنچایا اور اس نے تمام عمر مجرد رہنے کا فیصلہ کر لیا اس کی تنہائی کے ساتھی صرف اس کے ذہنی تانے بانے ہی رہے اور اپنے جذبوں کا خون ہوا تو سرخ پرچم کی تب و تاب میں اس نے اپنے درد کا درماں تلاش کرنا چاہا ——— اگرچہ عملی اور تحریری طور پر کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا لیکن سرمایہ دارانہ نظام اور بورژوا طبقے سے پرخاش و تنفر اس درجہ بڑھی کہ ہر فارغ البال اور آسودہ حال انسان اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا ----- وہ چڑھ جاتا اور اس کی نگاہ نکتہ چینی کی کوشاں رہتی اور زبان پر طنز و طعن کی شان بڑھتی جاتی اسی لئے وہ سب سے کشیدہ رہتا ———

اور اسی افتادِ طبع کی وجہ سے نہ وہ خوش رہ سکا نہ دوسرے ۔ باپا کو دکھ تھا کہ ان کا اتنا لائق بیٹا ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے ۔

تعلیم کے بعد کسبِ معاش میں بھی اس کے انتخاب کا مسئلہ چھڑا اور اس نے اپنی پسند سے ایک کالج میں لکچرر شپ منظور کر لی ——— اب نئے حلقۂ احباب میں بھی اس کے کردار کے

نوعیت حائل رہی اور اپنے شاگردوں میں بھی وہ مقبول نہ ہو سکا کہ کبھی اس کو کچھ سکھا کر اطمینان ہوا نہ سیکھنے والے ہی مطمئن ہو سکے اور اس کی تنقیدی کسوٹی پر کوئی پورا نہ اتر سکا ـــــ اور اسی روز و شب کے سلسلے میں وہ نصف صدی پھلانگ گیا۔

اور پھر اچانک ایک دھماکے کی طرح یہ انکشاف ہوا کہ اس نے روپی سے شادی کر لی وہ ہر قدم چونکانے والا اُٹھانا ہی پسند کرتا تھا ـــــ کافی دن تک موضوع سخن رہا اور عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ بھلا روپی میں کیا تھا جو اس کے عہد کو توڑ ڈالا لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ روپی میں کوئی خصوصیت نہ ہو مگر نباہ کرنے کا ظرف اور سلیقہ تھا۔ اور بڑا مضبوط دل تھا ـــــ وہ کبھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوئی ـــــ سال بھر بعد اشوک ہوا تو دونوں بہت خوش تھے اس نے بڑی توجہ سے اپنے بیٹے کی پرورش اور تربیت کرنا شروع کی اس کی پہلی سالگرہ میں اس کی تصویر کھینچ کر اسی کارڈ پر دعوتی عبارت چھپوائی اور جشن منایا ـــــ پھر دو ـــــ تین سال کے فاصلے سے پرشانت ہوا پھر شیتل اور اسکے بعد کسم ـــــ اس نے ازدواجی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ اشوک فطری طور پر بہت نیک اور سہل تھا، اور شیتل تو اس کی بے حد چہیتی بیٹی تھی بالکل اپنے نام کی نسبت سے ٹھنڈی میٹھی سبک رو ندی کی سی طبیعت تھی اس کی جو تمام و کمال اپنے پیا کے طرزِ تربیت میں سمٹ گئی۔ مگر پرشانت کچھ دن تو اس کے کنٹرول میں رہا لیکن اس فضا اور ماحول میں کھپ نہ سکا۔ اور وہ اس طرح بپھر گیا جیسے تیز آنچ پر رکھا ہوا پانی بھاری ڈھکن سے بغاوت کر دیتا ہے۔ پرشانت نے اپنی راہ اپنی سمت خود الگ کر لی ـــــ اور وہ بے بس ہو گیا کوئی انتباہ پرشانت کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکا۔ وہ اس کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ مگر شیتل اس کی بیٹی آئیڈیل بیٹی تھی جس کی تعلیم و تربیت مثالی تھی اور وہ ہر لڑکی کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسکی شادی خود اس نے اپنی پسند اپنے فیصلے اور اپنے ہی انتخاب سے کی۔ اور بڑی شان سے کی کہ تذکرہ ہوتا رہا۔

مگر یہ دوسری ضرب بڑی کاری لگی کہ شیتل ایک سال کے بعد ہی اپنے پیا کے گھر واپس آگئی۔ "نہیں چاہیئے مجھے یہ مورتی میں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔" ہاں یہی تو کہہ کر واپس بھیج دیا تھا عالی خاندان، اونچے طبقے والے شوہر نے ـــــ اور مصالحت کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی ـــــ اس دھچکے نے ماں باپ دونوں کو توڑ دیا وہ خود بکھر گیا ـــــ شیتل نے ایک حرف بھی نہ کہا ـــــ اشوک کی شادی ہوئی۔ وہ نوکری کے لئے دوسرے ملک جانے پر مجبور ہو گیا ـــــ اور پرشانت اس کے قریب تھا ہی کب؟ اس کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی عمر بھی ڈھلتی جا رہی تھی کئی بار مشورے دیئے گئے کہ کسی طرح شیتل دوسری زندگی شروع کرے مگر شیتل کبھی تیار نہ تھی اور وہ بھی اب کیا آس رکھتا کہ دوسرا تجربہ کامیاب رہے گا یا نہیں۔ اس کی کومل بیٹی اب نئی آزمائش میں نہیں پڑ سکتی۔ کسم کالج میں پہنچ چکی ہے۔ وہ تو ہے اپنی بیٹی کا آسرا ـــــ سہارا ـــــ چند دن بعد کسم بھی ـــــ

چھن ـــــ چھن ـــــ چھناک ـــــ ہائیں کیا ٹوٹ گیا؟ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا ـــــ سنگِ مرمر کا مجسمہ اپنی جگہ پر تھا۔ لیکن اس کی ساکن آنکھیں اس وقت جاندار کیوں لگ رہی ہیں؟ اور یہ تراشیدہ لب متحرک ہیں؟ ـــــ کیسے؟ میرا مستقبل کیا ہے؟ یہ آواز؟ ـــــ یہ تو شیتل کی سی ہے۔ نہیں نہیں شیتل تو اپنے کمرے میں سو رہی ہے ـــــ اور یہ بے جان بول بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ مستقبل میں اپنی شیتل کا سہارا بنے گا اور پھر کسم بھی تو ہے کیا ہوا جو اشوک اپنی بیوی بچوں میں گھر گیا ـــــ کیا ہوا جو پرشانت لاتعلق ہو کر اپنی پسند کی شادی کر کے باہر چلا گیا ـــــ

وہ شیتل کے پاس ہے؟ ...... پھڑ ـــ پھڑاک۔
...... یہ پھڑ پھڑاک کیسی ہے وہ پیچھے مڑتا ہے، چاندی کی آخری کرنیں شیلف پر رکھے چینی کے اطالوی مجسمے پر پڑ رہی تھیں سارے وہ اچھل پڑا ـــــ یہ اس مجسمے کے پر کیسے نکل آئے؟ اور اسکی شکل تو کسم سے مشابہ لگ رہی ہے وہی تیکھا انداز ـــــ کسم اس کی ذہین، اسمارٹ اور انٹلیکچوئل بیٹی۔ ہائے یہ مجسمہ تو اڑ رہا ہے پکڑو پکڑو ـــــ گیا نکل گیا وہ اس کی گرفت سے نکل گیا ـــــ تو کیا کسم؟ ـــــ کسم بھی؟ نہیں ...... نہیں یہ

نہیں ہو سکتا ہے ——— یہ نہیں ہو سکتا۔
وہ پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے گھبرا کر بجلی جلاتا ہے کمرے کی ہر چیز واضح ہو جاتی ہے ..... وہ چاروں طرف دیکھتا ہے .... ہر چیز اپنی جگہ پر سلامت ہے لیکن یہ آوازیں کیسی ہیں! چھن چھن .. .... کیا ٹوٹ رہا ہے آخر؟ ——— وہ آگے بڑھتا ہے آئینے میں یہ شکل کس کی ہے کیا وہ خود ہے؟ یہ سفید بال ——— جھریوں بھرا پژمردہ چہرہ ——— بجھی بجھی سی آنکھیں ——— مگر یہ نشان کیسے ہیں! اسکے چہرے پر؟ یا آئینے پر؟ وہ آئینے پر ہاتھ پھیرتا ہے نشان اب بھی ہیں ہاں سوالیہ نشان ...... جو ......
شیتل کی آئندہ زندگی کا سہارا کون ہے؟ آخر پرشانت بے راہ کس لئے ہوا؟ تم نے اپنے فرائض ایمان داری سے انجام دیئے۔ مگر ہر جگہ ہر پہلو ہر زاویے سے اپنے اصول اپنے معیار اپنے نظریات اپنی ذات اپنے عقائد مدنظر رہے۔ اپنا فلسفہ تمہیں عزیز رہا ——— تم نے بے جان حسن کو اپنا مرکز فکر و نظر بنایا۔ ادب، شاعری، فنون لطیفہ۔ اخلاق پر تمہاری نگاہ رہی لیکن انسانی فطرت، جذبات کو نہ پڑھ سکے ——— انسان خود ایک کتاب ہوتا ہے اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں شخصیت کی تہیں ہوتی ہیں ——— تم ڈھلے ڈھلائے کردار کے متلاشی و متمنی رہے ——— انفرادیت کی کھوج کرتے رہے مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ باغ کے مالی کو تو معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سا بروا کس کیاری میں زیادہ اچھی طرح پنپ سکے گا ——— کس پودے کو کتنے پانی، ہوا، کھاد اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقت کے تقاضوں کو تم نے نظر انداز کر دیا کہ وقت جسکی فطرت میں تبدیلی ہے جو کروٹیں بدلتا ہے۔ تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ اور وقت کی اس فطرت کے سانچے میں ڈھل جانے میں ہی کامیاب زندگی کا راز مضمر ہے۔ حالات بدلتے ہیں زمانہ تو ایک ہی رہتا ہے تو حالات سے سمجھوتہ کئے بغیر کہاں گذر ہو سکتی ہے ———
گھڑی کی ٹک ٹک اور، ان کے اندر کی سائیں سائیں اور دل کی دھڑکن ایک تال میں سنائی دے رہی تھیں ——— نہیں اس نے تو کچھ نہیں کیا۔ شیتل کے لئے تو وہ خود چاہتا ہے کہ اس کا مستقبل سنور جائے .... نہیں یہ جھوٹ ہے؟ تم جانتے ہو کہ گھر شیتل کے بل بوتے پر چل رہا ——— دونوں بیٹے الگ ہو چکے ہیں ...... تم جن خود ساختہ بتوں کی پرستش کرتے رہے وہ ٹوٹ چکے ہیں، مگر تم اعتراف نہیں کر سکتے، اپنے آپ سے بھی نہیں؟ ——— اُف یہ سرگوشیاں کون کر رہا ہے کہاں سے یہ آوازیں آ رہی ہیں یہاں تو ہر چیز بے زبان ہے بے جان ہے، میں کہاں ہوں؟ ہر چیز اپنی جگہ پر ہے ——— مگر میری آنکھوں میں یہ دھند کیسی ہے؟ میرا پلنگ گھوم رہا ہے سر گھوم رہا کیا یہ بھنور ہے میں بھنور میں پھنس گیا ہوں ...... یہ دائرے ...... دائرے در دائرے شیتل اشوک، پرشانت ...... گستم ...... روہنی ...... کہاں ہو تم سب کوئی چہرہ نظر نہیں آتا ——— کوئی آواز نہیں کوئی آہٹ نہیں ——— آہ سب خاموش ہیں ——— اتھاہ ...... گہری خاموشی ...... کچھ نظر نہیں آتا ...... کچھ بھی نہیں ...... بس دھند ہے ...... بھنور ...... دائرے .... دھندلکے .... ●

بقیہ تحریک آزادی اور اردو شاعری

صفحہ ۲۱

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل
ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوش طرب میں کبھی غافل
تخریب تو آسان ہے تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل ہے کٹھن آج

سلیم شہزاد

جدید غزل کی لفظیات

ہر عہد کی غزل کا اصل سرمایہ اور اس کی فوری شناخت مسلمہ طور پر غزل کی لفظیات ہی رہی ہے کہ غزل برسوں بیشتر متعین کردہ ہیئت میں متغزل الفاظ کی مخصوص ساخت و ریاضت سے اپنا وجود پاتی ہے۔ قدیم سے آج تک غزل کی ہیئت کو چھیڑے بغیر آزاد غزل کے تجربے سے قطع نظر۔ صرف اور صرف نئی لفظیات کے دخول و شمول نے غزل کو نئے نئے اسالیب دیے اور یہی اسالیب غزل کی جدت کے ضامن ٹھہرے، میر کی غزل محض مخصوص لفظیات کی بدولت میر کی غزل ہے۔ سودا کی غزل کی شناخت بھی وہ لفظی برتاؤ ہے جس سے سودا کی غزل کا اسلوب نمو پاتا ہے۔ آتش و ناسخ کی غزلوں کے فرق سے تو غزل کا طالب علم بھی واقف ہوتا ہے اور یہ فرق آتش و ناسخ کے لفظی برتاؤ کا فرق ہے۔ ذوق و غالب کے یہاں بھی فرق زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اقبال کی غزل صرف اقبال کی لفظی شوکت آرائی کے سبب فراق کی لفظی نرم روی سے مختلف ہے اسی لئے اقبال و فراق کی غزل کا رنگ و آہنگ جدا جدا ہے۔ نظیر اور داغ، حالی اور اکبر، حسرت اور یگانہ، فانی اور جگر، اختر اور مجروح، ناصر اور شکیب غرض ہر دو مختلف شاعروں کی غزلیں ان کے مختلف لفظیات کو برتنے کے انداز سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف رنگوں کی حامل ہوتی ہیں، چاہے دونوں ایک ہی زمین میں شعر کہیں۔

غزل کی لفظیات سے مراد وہ شعری لفظیات ہے جو غزل میں مستعمل ہو کر اس کا ایک مخصوص شعری آہنگ مزاج اور صنفی حیثیت سے ایک مخصوص شناخت پیدا کرتی ہے۔ واضح رہے کہ اس اصول سے نظم کی لفظیات کی نوعیت جداگانہ ہو جاتی ہے۔ مجموعی طور پر غزل اور نظم کی لفظیات شعری لفظیات ہے جس کی اکائی شعر میں موجود کلیدی لفظ ہوتا ہے جس کے گرد شعر کے خیال کے تانے بانے بُنے جاتے ہیں اور لفظ بہ لفظ انسلاک کی وجہ سے اس کلیدی لفظ کی معنوی سرایت ترکیبِ لفظی، شعر میں بیان کئے گئے خیال کے سیاق و سباق اور شعری صورت و واقعہ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح شعری لفظیات کی اکائی محض تنہا لفظ نہ رہ کر کبھی ترکیبِ لفظی، شعری محاورہ، ایک مصرعہ اور بعض صورتوں میں مکمل شعر بھی بن جاتی ہے۔ لفظیات کی روشنی میں غزل کے تین نمایاں ادوار مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ قدیم، ترقی پسند اور جدید۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کو حالی نے بھی پرانی غزل کیلئے مختص الفاظ قرار دیا ہے۔ اسی بناء پر بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کی شعر میں موجودگی شعر کو طرزِ قدیم کا حامل بنا دیتی ہے۔ میر کے دیوانِ اول کی ردیف الف سے ماخوذ شعری لفظیات :

دل ناصبور، خرابات نشین، چشم کی گریانی، سائے رندِ عیاش جہاں کے وحشت، بہارِ رفتہ، تیرگئی محملِ لیلیٰ، زنداں میں بھی شورشِ نہ گئی اپنے جنوں کی، دل کی مملکت، زنجیرِ پا، موسمِ گل، دامِ زلف، شیخ کو جب لہر آئی، زخم سینے کا، عیشِ روزِ وصل دن حشر کا تا چرخ نالہ پہنچا، گریے پہ رنگ آیا، نگاہِ مست، اُٹھ جا مری بالیں سے، آہِ بے تاثیر، جذبِ عشق، عالمِ حباب تھا امیج تک شمع سر کو دھنتی رہی، داغِ فراق وحسرتِ وصل آرزوئے شوق، ہر یک موج میں ہے زلف کا ہی دماغ، گدائے آستاں، اسیرِ قیدِ حیات، شیریں لبی کی حسرت، خاک تیری گلی کی، دشتِ خار کا داماں، ترے کشتگاں خوش نصیبی آہوانِ دشت، گل وبلبل بہار میں، درد، داغ، زخم، وار، غم سے نکار، اشکِ تر، قطرۂ خون، لختِ جگر، پارۂ دل، شہیدِ ناز، صد نشترِ مژگان، شمشیرِ ستم، مذہبِ عشق، چاہ بے جا نہ تھی زلیخا کی اگر*
بماہِ کنعاں عزیز کوئی تھا . . . .
. . . . صیدِ زبوں
سرِ نشینِ رہِ میخانہ، فوغائے نیاحت، غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا، مت دیر وحرم کی راہ چل، خضر نے سفر سے حذر کیا، دامن پکڑ کسو کا، غبارِ دیدۂ پروانہ، جامِ مئے ناب، جامۂ احرامِ زاہد، شانِ تغافل، طائرِ جاں، قفسِ تن کا گرفتار، بسمل، در خون تپیدہ، دودِ فلک کا رخانہ، معطائے گوہر پاش، تماشایاں غیر کو شوق سے دے، سیلِ اشک، نالے کے انتظار میں، دامانِ صحرا، وصفِ خط وخال، اس نے تو تیغ کھینچی ——

یہ وہ شعریت کی حامل کلیدی لفظیات ہے جو پرانی غزل میں زبان وبیان کے قلیل اختلاف کے ساتھ سبھی غزل گو شعرا کے کلام میں اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ زبان کے عام اصول کے تحت لفظیات اپنی حرکی اور نامیاتی خصوصیات کی بنا پر انشائے معنی اور وسعتِ معنی میں معاون کرتی ہے۔ اس سے کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں نہ صرف تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں بلکہ اضافہ بھی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن الفاظ پر قدامت کا سکہ لگ چکا ہے وہ آج بھی اپنی اصل یا متبادل صورتوں میں جدید شعر میں در آتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے انہیں پرانی غزل ہی سے مخصوص خیال کیا جاتا ہے۔

مجروح کی غزل ترقی پسند شعری روایات کو اپنی ان لفظیات میں متصور کرتی ہے:

کج کلاہی، اہلِ ہوس، بند قبوں کے ستم، لبس نوازشِ جاناں، دل بہت پریشاں ہے، شکستِ زنداں، جادۂ طلب، یہ ذرا دور پہ منزل، یہ اجالا، یہ سکوں، ہر خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ، پاؤں کی زنجیر، شاعرِ آوارہ مزاج، لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، عزمِ جنوں، غمِ حیات، رہروانِ حیات، کشاکشِ پیہم، سکھائے دستِ طلب کو ادائے بے باکی، بازوئے محنت، زنجیر کو ملکے سنواریں، غمِ دوراں، رسمِ زباں بندی، معجزۂ دستِ عمل، آنکل کے میداں میں، عہدِ انقلاب آیا، رل کے سانے پہ نظم ہیں کہ ایک محنت کش، میری جاں ہے جنہیں بھی جہاں، فردوس، ہوائے ظلم، زخمِ نو، داغِ کہن، اسیرِ چمن، اپنا سلسلہ دار ورسن تک ہے، شہرِ نگاری، اربابِ مے خانہ، فغاں، رقصِ جنوں، کی کام آئے بہت لوگ، سرِ مقتل، ظلمات، گہرِ گندم وجو، نرغۂ راہزن، قزاقِ بہار، کاروانِ سحر، متاعِ گرچہ، دبازل جامِ بکف، سر بکفن، بابِ قفس، پرچمِ شوق، معیارِ جنون، جشن چراغاں، طلوعِ صبحِ نشاط، کف قاتل، جو گھر کی آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے، ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ، انجمنِ شب، شاہ وغیرہ۔

اور ان کے علاوہ معنوی انسلاک رکھنے والے دوسرے الفاظ وادب کے ترقی پسند دور میں نظم وغزل میں بتکرار برتے گئے۔ تحریک کے زیرِ اثر اشتراکی

* مثل شعر کی لفظیاتی اساس کی مثال میں دو مصرعوں کے بیچ ترچھا خط لگایا گیا ہے۔

نظریے کی ترسیل کرنے والے متعدد الفاظ بھی زبان وادب کا حصہ ہیں اور اپنا کردار ادا کر کے نئے ادب کے طلوع ہونے پر یا تو متروک ہو گئے یا نئے مطالب کے حامل بن کر نئے ادب میں سرایت کر گئے۔ عوام سے براہِ راست مخاطب ہونے کی وجہ سے ترقی پسند شاعر نے نظم یا گیت کو ترجیح دی۔ معدودے چند شعراء غزل کی طرف ملتفت رہے مگر ان کی غزلوں پر بھی نظم کا رنگ غالب رہا۔ اس دور کے شاعر نے اقبال اور جوش کی طرح ایک خاص نظریے کی تبلیغ کی چنانچہ مجموعی لحاظ سے ان کی شعری لفظیات میں نہ صرف بہت سے معنوی ابعاد ایک دوسرے سے مماثل ہیں بلکہ شعری اظہار کا لفظی انتخاب بھی ان میں قدرِ مشترک کے طور پر نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔

جدید غزل کی لفظیات کے انتخاب کے لیے بانی کی غزلوں سے گزرتے ہیں تو ——

ہری سنہری خاک، شفق شجر تصویر (ایک ترکیب) خلا، رنگ، شام، ہوا، چھتوں پہ بارش، گھر، بہت ذرا سی اوس، بہت ذرا سی آنچ، ہوٹیں بیداری، سفر میں تنہا، گھنی گھنیری رات، سناٹے کی طرح بکھرنے والا، بن، منظر، سایہ، لہر، مجھے بھنور میں لے آئی، کرن کرن سی دھوپ، زردی اوڑھے کھڑے ہیں پیڑ، منظر ہے بے کراں کا، ندی کے دونوں طرف ساری کشتیاں گم ہیں، گم شدہ دنیا میں، موج معروف ہے پانی کو بھنور دینے میں، سفر صرف بادباں سمندر، گزر سکوں گا نہ اس خواب خواب بستی سے، یہاں کی مٹی بھی زنجیر پا ہے میرے لئے، گھنے قربتوں کے سائے، ایک لمحے کا افق امید بھر الجھی ہوئی آندھی، حصارِ جسم، سکوں فردوس، دھند مرے خوں میں، پیہم پھیلا پرندے، جنگل میں گم فصلِ دھند میں گم سب خواب، ریت میں گم بستر میں اپنے اندر کی بہار، اک زیاں فردا بہ فردا، خواب اندر خواب اندھی تشنگی، روشن پرندہ، کماڑ سے دھوئیں کا منظر، بے پناہی کا سفر، کٹا پھٹا سا ددش، دیوارِ شکستہ، برگِ آخر نے کہا لہرا کر مجھے موسم کی انا لکھ دینا، اسے برابر قدم دوستو میں تھا اپنا کھنڈر، بتا کہ عکسِ منتشر، صبح کا پہلا پرندہ، آسماں بھر میں اکیلا، خالی رات کے اندھے کنوئیں میں، نگر بھر میں اکیلا، اک جزیرہ دور افتادہ سمندر میں اکیلا، لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر، سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اترتے ہوئے نہیں ہے آنکھ کے دریا میں ایک بوند سراب، میرے وجود سے جو کٹ رہا ہے گام بہ گام، بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت، نظارہ لاسمتیت، سناٹے کا پیکر، بجز صدا، پورے دن کا جتا، سورج کے پیٹ میں لوٹتی آخری کرن، عدم زوال، شب شکن، امکان ہزار امکان، طوفانِ نفی، لمحۂ سادہ امیدی، فصلِ صدرنگ معنی۔

وغیرہ لسانی اظہارات کو بحیثیت یکسانیت میں زبان کے تازہ کار اسلوب سے مملو اظہارِ خیال کی جدتوں کی حامل اور شاعر کی شخصیت کی آئینہ دار شعری لفظیات سامنے آتی ہے۔ ان میں مستعمل مجرد الفاظ خلا، گھر، موج، دریا، سورج، دھوپ، جزیرہ، سمندر، پیڑ، سناٹا، لمحہ، عکس اور صدا وغیرہ جدید غزل کی شناخت ہی بن گئے ہیں شعری پیکر اور علامتوں کی تخلیق ان الفاظ کو برتے بغیر ناممکن ہے۔ جدید شعری لفظیات میں اُردو کے علاوہ دیگر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی الفاظ کی شمولیت نے اسے مزید توسیع دی ہے اگرچہ ان کی اجنبیت انہیں شعریت کے حامل الفاظ کی حیثیت سے قبول کرنے میں مانع آتی ہے مثلاً ریل، فون، تار، مشین، جہاز، کرنٹ، فیوز، بلب، کار اور قطعی غیر شعری الفاظ مکڑی، کبوتر، چیل، ابابیل، مچھلی، چھپکلی، سانپ، چمگادڑ، بھوت، بلا، آسیب، شاعری میں ان کی شمولیت کے متعدد اسباب ہیں جنہیں جدید زندگی اور جدید فکر کے تناظر میں تلاش کیا گیا ہے یہ عصر اور زندگی کی جدتوں سے مربوط شعری اظہار کرنے اور نکھرنے والے لاتعداد الفاظ عموماً جدید شاعری اور خصوصاً جدید غزل کا وصفِ امتیاز

بن گئے ہیں۔ واضح رہے کہ مجرد لفظوں سے غزل کی شاعری نہیں ہوتی جیسا کہ ان فہرستوں سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے بلکہ ان چند الفاظ کے پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر عہد کی غزل میں یہ اور دیگر الفاظ بہ تکرار مستعمل رہے ہیں، غزل کے موضوعات ان سے ماخوذ ہیں ان پر موضوعات کی بنیاد ہے۔ ان میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا فکری پس منظر وسیع تر ہو کر فلسفوں میں بدل گیا۔ مثلاً جنوں، عزم، عصر، تسلط، جبر، انا اور ذات وغیرہ۔ یہ تصورات مروجہ ادبی اور غیر ادبی زبان سے اچھے صنعتی، سیاسی اور تقاعلی انسلاکات کا اخذ و اکتساب کر کے ایک ایسی معیاری زبان تشکیل دیتے ہیں جو شعر و ادب کے اظہار کا وسیلہ بنتی ہے۔ اسی کے تناظر میں شعر و ادب کی قدامت اور جدت کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ معیاری زبان مختلف عصر میں مختلف معنوی زاویوں کی حامل اور مختلف عصری افکار و میلانات کی ترسیل کا ذریعہ ہوتی ہے یعنی کہا جا سکتا ہے کہ زبان ہی کے توسط سے غزل کے موضوعات، اظہارات اور اسالیب کا تعین کیا جاتا ہے جو اپنے عصر کے پس منظر میں قدیم یا جدید ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر آج کی غزل کو گذشتہ عہد کی غزل سے جدا نوعیت کی غزل، روایت سے منحرف غزل، جدید غزل اور بالآخر لسانی غزل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جدید غزل ان معنوں میں جدید ہے کہ اس کے موضوعات، اس کے موضوعات کی ترسیل کی زبان اور زبان و بیان کے اسالیب کل کی غزل کے موضوعات وغیرہ سے یکسر مختلف معلوم ہوتے ہیں حالانکہ عہد بہ عہد مستعمل غزل کی لفظیات کا عہد بہ عہد ارتقا یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ روایت سے منحرف نظر آنے والی جدید غزل کا رشتہ کہیں دور اپنے ماضی اور اپنی روایت سے جڑا ہوا ہے چاہے بظاہر چند نئے موضوعات کے سبب جو خاص نئے عہد کی دین ہیں، جدید غزل کا چہرہ روایتی غزل کے چہرے سے مشابہت نہ رکھتا ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو جدید شاعر اپنی روایت کی جڑوں میر و غالب کی روایات سے پیوستہ دیکھتا ناصر کاظمی کے عہد کی رات کا سلسلہ میر کے عہد کی رات سے نہ ملتا۔ یہ سلسلہ دیگر غزلیہ عوامل سے قطع نظر زبان کے تشکیلی اجزا — الفاظ — ہی کی بدولت پیوستگی سے ملتا ہے۔ میر کی جو لفظیات عہد متوسط کی غزل نے برتی تھیں پائی ہے وہ مجرد لفظی

صورت میں یہ ہے:

خرابات، شورش، جنوں، زنجیر، آستاں، اسیر، حیات، خوں، شمشیر، ستم، صید، دیر و حرم، بسمل اور تیغ

اسی طرح جدید غزل نے گذشتہ دو نسلوں کی غزل سے جو لفظی اکتساب کیا ہے اس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میر سے مستعار موسم، لہر، زخم، رنگ، حباب، شمع، صبح، موج، قید، خاک، گل، دشت، غبار، طائر اور صحرا اور مجروح سے مستعار شکست، منزل، خواب، زنجیر، زمین، ظلمات، سحر، کوچہ، بازار، آگ اور چراغ جیسے الفاظ شامل ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ اپنے ابلاغ کے لیے عصر کے پس منظر کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ لفظ کے معنی ہر عہد میں جامد اور منجمد نہیں ہوتے بلکہ بعض عوامل کی تاثر آفرینی سے لفظ کے معنوں میں عہد بہ عہد نمایاں تغیرات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مذکورہ تمام الفاظ میر کی غزلوں میں بے شمار مرتبہ اظہار کے عمل سے گزرے ہوئے ملتے ہیں، دور متوسط کی مخصوص فکر اور نظریے سے وابستہ غزل بھی انہیں الفاظ کو برت کر اپنے پیغام کی ترسیل کرتی ہے یعنی زبان کا مظہر یہاں بھی مشترک ہے مگر معنوی بُعد و اختلاف دو مختلف زمانوں کی عکاسی کرتا ہوا ہے۔ جدید غزل کی زبان کوئی آج کے عہد کی پیداوار نہیں۔ اس میں کبھی میر کے عہد کی زبان کے اثرات، مجروح کے عہد کی زبان کے اثرات سے ہم آہنگ ہو کر اظہار کی گہرائیوں تک اترتے ہوئے ہیں۔ ایک ہی لفظ ہے لیکن بُعد زمانی نے اس کی معنوی صورتوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ شعوری تنقید جدید شاعری کی جس جدید زبان کا تذکرہ کرتی ہے اس کا تعلق شاعری کے چند نئے موضوعات سے ہے جو عصری مشینی زندگی کی دین ہیں۔ ظاہر ہے کہ معاصر حالات کا بیان معاصر زبان کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں اور یہ زبان ایک مخلوط زبان ہے جو مروجہ علوم اور تکنیکیت کی مروجہ اصطلاحات سے پُر، غیر جذباتی اور کھردری ہے۔ اس کی لفظیات میں غیر زبانوں کے الفاظ بافراط ملتے ہیں لیکن اس تکنیکی زبان سے یہاں بحث نہیں بلکہ شاعری کی عمری زبان سے بحث ہے جو اس نے روایت، وراثت اور وراثت میں پائی ہے اور مخصوص جدید شعری زبان جس کا ایک محدود مظہر ہے۔

غزل کے تینوں ادوار کی لفظیات کا فرق جدید غزل کو گذشتہ

غیر جدید غزل سے ممیز کرنے کے لئے کافی ہے۔ قدیم سے منافرت رکھنے والے لسانی برتاؤ کے فرق کے سبب اس کی لفظیات کی جدت اور تنوع کے جو چند پہلو دریافت کیے گئے ہیں ان کے سلسلہ وار مشاہدے سے جدید غزل کی لفظیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً شعری پیکروں اور علامتوں کے استعمال سے ترسیلِ خیال کیلئے منتخب الفاظ کی ترکیبوں کا ایجاز و اختصار جو اُردو حروفِ اضافت (کے۔کی۔کا) کے سقوط یعنی فارسی طرزِ اضافت کے اختیار اور متلفظ خیال (جملے) کی نحوی ترکیب کو برقرار رکھتے ہوئے حروفِ اضافت کی حتمی غیر موجودگی سے پیدا ہوتا ہے: شفق شجر تصویر (شفق کے شجر کی تصویر) عدم زوال (عدم کا زوال) سکوں فردوسما (سکوں کی فردوسما) رفتی پرندے، گلاب بستر، شہر باہر، ندی کنارے وغیرہ سے جدید متغزل لفظیات کی نشان دہی ہوتی ہے۔

زبان کا غیر روایتی لیکن تخلیقی اور تازہ کار اسلوب جو بانی جیسے کسی غزل گو شاعر کا نجی لب و لہجہ اور شعری رنگ و آہنگ ہے کو مبہم پرواز پرندے (مبہم مائل بہ پرواز پرندے) باطن راستوں کے سلسلے (باطن کے راستوں کے سلسلے: یہاں اسم "باطن" کو بطورِ صفت بھی تصور کیا جا سکتا ہے) نمک تشنہ گداز فصلیں (نشے کا نمک / ذائقہ / رکھنے والی گداز فصلیں) فضا کہ پرواز بھر کشادہ، امکاں ہزار امکاں سفر، عدم تاثیر لہجہ، برابر قدم دوست بہ ایسے مرکبات ہیں جو اسلوبی نکتۂ نظر سے نہ صرف شخصیت کے آئینہ دار ہیں بلکہ لسانی اظہارات کے فنی برتاؤ کے ہزار امکانات بھی روشن کرتے ہیں۔ یعنی ان سے زبان کے تخلیقی استعمال کے بے شمار نئے زاویے اُجاگر ہوتے ہیں۔ جدید غزلیت بنج کی یہ لفظیات کئی فنکاروں کے یہاں نظر آتی ہے / سیہ سخت موج، رنگ بارشیں، بدن حصار۔ عمر صرسیل، انا انکار، فسوں، فریب، فضا، کاغذ کشتیاں، لفظ پرندے جسم جادو، سفر زاویوں کے نشاں، شب افسوں، تسلسل اسیر، انا آسماں امتحاں، شور گم گشتہ بے صدا موسم، خطر خواہش بھنور وغیرہ۔ اسلوبی تخصیص کے باوجود یہ نئی لسانی برتاؤ لسانی تعمیم کی طرف مراجعت کرتا ہوا ہے۔

لفظیات کی ان زیریں سطحوں سے کچھ اوپر جدید غزل میں جو غیر روایتی لیکن عمومی شعری ترکیب سازی کا عمل نظر آتا ہے اس میں لہو کا سمندر، سورج کی تاریکی، لفظوں کا لشکر، ساتھ میرے مجھے کیا خبر کون تھا، پرندہ، کنواں دھند، دیدۂ منظر کے سلسلے، اندھا سفر، چھت پر کبوتر، کبھی پتھر میں پانی بولتا ہے، تتلیوں کے پر روشن، ریت سے دریا اٹھے ہیں، کس کا دروازہ یہ بچے کھٹکھٹانے آئے ہیں، ہواؤں کا ہم سفر، بارش کا لطف بند مکانوں میں کچھ نہیں، ہر نئے موڑ پہ کچھ لوگ بچھڑ جاتے ہیں، بھیڑ سے کٹ کے نہ بیٹھا کرو، وہ دور ایک جزیرہ دکھائی دیتا ہے، ہماری بستیوں پہ دور تک پھیلے ہوئے بادل، آواز کا بوسہ، ہجومِ رہگزر میں اکیلا، آنکھ کھولی تو وہی دشت کے منظر نکلے، دُھواں پھیل گیا چہروں پر، شہر بے چراغ، سورج کا سایہ، دھوپ کا صحرا، شب کے پنچھی کی چیخ، گئے دنوں کی لاشیں پر پڑے رہوگے کب تک یادوں کا سونا مقبرہ، کوئی پتا نہیں ہرا، پتھروں کو پانی دے، شہر کج رواں، عجب اک بے بدن نقطہ، درآمد کردہ کچھ سکّے، جنگل جنگل سنّاٹا سفّاک ہَوا، زندہ ہوا الہڑائی، نشیب سیہ آب درختوں کے تلے سائے نہیں ہیں، اس کڑی دھوپ میں، ہر ایک ہاتھ میں سنگِ گراں، ہر سفر کے بعد اک لمبا سفر رہ جائے گا، ہم آندھی میں اُکھڑے پودے مایا کے ستّو چہرے، بچھڑا ہر ایک فرد، میں کھلونا ہوں تیرے ہاتھوں میں، اشجار کو برف ڈھک رہی ہے، ٹوٹتے لمحوں کی صدا، ناؤ کاغذ کی، گنبد میں قید ہوں، جسم بھی نیلے ہوئے، راکھ ہے دامن، لباس چہرہ بدن گھر سبھی ہیں شیشے کے، اپنا ہی سامنا تھا ہمیں، فاصلوں کی برف، کالی دیوار پہ چسپاں ہے

* "جدید غزل" (معید رشیدی دہلی) سے ماخوذ

پرانا موسم، میرا چہرہ بھی اب نہیں میرا، مجھ کو
ٹھکرا دے کسی کو دیا جلے، اندر کا آدمی، بجھا
چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی، در و دیوار پہ
روداد شہر، دو پہر ڈھلے آپ مجھ کو حوصلہ دیتے
ہوئے، خرابے میں کہاں خواب کے آثار۔

زبان کے یہ پیرائے ندرت، جدت اور وسعت رکھتے ہیں ان میں سورج، صحرا، سمندر، شجر اور پتھر جیسے وہ کثیر الاستعمال الفاظ بھی شامل ہیں جو جدید غزل کی علامات بن گئے ہیں اور اشعار میں جن کی موجودگی کو جدت یا جدیدیت خیال کیا جانے لگا ہے۔ لسانی اظہار کی جدت طرازی کے لیے ترسیل خیال کرنے والے کلیدی الفاظ، شعری تراکیب یا شعری لفظیات کی بجائے منتخب مجرد الفاظ کے استعمال سے نیا پن پیدا کرنے کی دھن میں بہت سے شاعروں نے محض نقل اور خیال کی تقلید کی ہے۔ یہ رویہ چند الفاظ کو کسی صنف سخن کی پہچان پانے سے نمو پاتا ہے جیسا کہ متذکرہ الفاظ کی موجودگی سے جدید غزل کے سلسلے میں ہوا۔ لفظ کے فنکارانہ برتاؤ کے لئے نہ صرف لفظ کا بلکہ معنی کی ابعاد کا شعور بھی لازمی ہے "صحرا" یا "سمندر" لغوی معنوں میں "ریگ زار" یا "آب زار" ہو سکتے ہیں لیکن شاعری الفاظ کے معروف معنوں سے یوں ہی سا تعلق رکھتی ہے۔ ان کے اصل معنی جو متعدد ہو سکتے ہیں، متعدد تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جنہیں جذبات و احساسات، شعور و ادراک، تخیل و تصور اور فکر و بصیرت کی فرداً فرداً یا مجموعاً ترغیب کے بغیر محسوس نہیں کیا جا سکتا اور کثرت معنی کا احساس ہی دراصل اسلوب کی شناخت کا عمل ہے۔ ابلاغ معنی کے لئے ضروری یہی عوامل فنکار کے وجدان و اظہار کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔ اگر وہ ان کا حامل نہیں تو اپنے شعر میں "سورج" چمکا کر یا اسے سیاہ کر کے شعر کو جدید شعر کی حیثیت سے چمکا نہیں سکتا البتہ تقلید کے نتیجے میں خود روسیاہ ضرور ہو سکتا ہے۔

غیر اردو الفاظ کی شمولیت:

آکاش سے چراغ، چل تیاگ دیں تپتے بدن،
مکان کی نیو تیستم کا لگ، بدل گئی رت،
خواہش کا روپ دھارے گا اپنے ساتھی کون
میں دیتا جسے شراب، ملاح پشاچوں کا شہر ہیں،
مانس کی کھیتیاں، لب پہ امرت زہر سینے میں،
شام تک میلہ ہے پاگل پیڑ پنچھی کس کے میت
ہیں یہ، جو باسی ہیں باس، میں دیوتا تھا کبھی
ایک دیو داسی کا، گھٹا موہن سوہن کی، حسین توتلی
سے کال اٹھا، مخملی کی رشمیاں ٹوٹے ہوں، پیکر
کے میل میں کر رہا ہے آف ٹیبل لیمپ، کیبنے کے بک
کونے میں، سگریٹوں کی راکھ ہوں، ہاتھ سگنل کا یہ
اپنے روم کی کھڑکی میں جاتے ڈرتا ہوں، قدموں سے
لپٹی فٹ پاتھ، کیلنڈر پہ بے رنگ موسم لکھا تھا،
ہوٹل میں کہاں ہوسٹ لگائیں، بیکار ناولوں کے ورق
کھولتا رہا، کار کی زد میں آگیا موسم، میں کرفیو
آسیب سیاہ کھلے سے لان میں عرق نچوڑنے والی
مشین پیاسی ہے، اجلے فر کے کوٹ پہنے دو ملبے
چشمے سے، اب تو کوئی پوسٹر تازہ لگا، کمرے
کے کمبل میں پول،

ہندی اور انگریزی کے عام طور پر مستعمل الفاظ غزل میں در آئے ہیں۔ تغزل کو غزل کی نمایاں خصوصیت قرار دیا جاتا ہے اور یہ خصوصیت سبک و شیریں تلفظ الفاظ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جدید غزل نے آکاش، پنچھی، تیاگ، روگ، رت اور شراب وغیرہ اور ہوٹل، لان، پول، سگریٹ، لیمپ اور کوٹ وغیرہ بے شمار الفاظ اختیار کر کے تغزل کا روایتی تصور بدل دیا ہے۔ ان الفاظ کی شعریت کا انحصار خیال، احساس اور جذبے کی شعری صداقت پر ہے شعری اظہار کے عمل میں غیر زبان کا ہر اجنبی لفظ ضروری نہیں کہ مناسب اور برمحل ہو۔ نظم کے وسیع ترکینوس میں ایسے الفاظ بآسانی کھپ سکتے ہیں، لیکن غزل میں ان کی موجودگی اور شعری لفظیات کی حیثیت سے ان کی قبولیت ہر آن خطرے میں ہوتی ہے۔ محولہ ہندی الفاظ کی حد تک تو یہ قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر مانوس، دشوار تلفظ اور غیر شعری الفاظ ہندی ہونے کے باوجود اردو غزل میں نہیں چل سکتے۔ اس صورت میں انگریزی الفاظ کے لئے مزید رکاوٹیں آتی ہیں۔ روزمرہ کی زبان سے

ماخوذ دیگر لفظیات جو غیر ادبی بھی ہو سکتی ہے، جدید غزل میں اب عام
مستعمل ہو گئی ہے۔ ان کی شعریت اور تغزل جو غیر ادبی الفاظ کی شعریت
اور تغزل کی طرح شعری صداقتوں پر منحصر ہے، غزل میں اپنی
سرایت کے طویل عرصے کے سبب اب مسلّم ہو چکے ہیں۔ مثلاً :

ہوا بیٹھا جن کی اندھی کھڑکیوں پر سر پٹکتی ہیں /
میں ان کمروں میں پھر شمعیں جلا کر دیکھ لیتا ہوں،
چڑیا نے اس کی آڑ میں اک نیا گھر بنا لیا، بستر
پہ لیٹی تھی تھکی ہوئی شام، کھڑکی سے لان میں سب
لوگ بیٹھے چائے پیتے، کاغذ کی کترنوں کو بھی
کہتے ہیں لوگ پھول، ایک سمندر بن کر پھیل گیا
سڑکوں پر / اس لڑکی کے جسم کے بکھرے ٹکڑوں
کو چنتا ہوں، دل وہ بگڑا ہوا بچہ ہے، گاؤں کی اول
چلی دھوپ سی گزشتہ تھا ہی میز پہ گر کے بھی
موتی سے چھنے، برتن، بچوں سی مہکتی شب، اسکی
پھٹی قمیص مرے ساتھ ہو گئی، پتھر پرندے
شبدوں کو دیمک چاٹ گئی، دھیان کی سیڑھیوں
پہ پچھلے پہر، ہونٹوں کے نقش چھوڑ گیا ہے کوئی آ
پر، برگد کی چھاؤں میں، دل اک کھوٹا سکہ ٹھہرا
خود کو ان الماریوں کے تنگ خانوں میں نہ رکھو،
گھر سے نکلا ہوں تو اس چوک سے کیسے ہو آؤں۔

عصری تقاضوں نے آج چونکہ غزل کے موضوعات کو بھی بدل دیا، یا ان میں نئے موضوعات کا اضافہ کر دیا ہے اس لیے ان تبدیلیوں اور اضافوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غزل کے فنی رویوں اور تیوروں کے مطابق غزل کے اظہار پر اس کی روایتی زبان سے مختلف صفات رکھنے والی زبان کا اثر ہونا لازمی ہے اور یہ اثر مذکورہ مثالوں میں شامل عام زندگی کی زبان سے ماخوذ کھڑکی، کمرہ، لان، میز، کرسی، برتن، چائے، بچے، لڑکی، سڑک، چوک جیسے الفاظ کا غزل میں دخول و قبول ہے۔

باقی آئندہ

غزلیں

انور پانی پتی

نئے زمانے کی تہذیب کا یہ قصہ ہے
کبھی کسی نے کسی کا نہ حال پوچھا ہے
نشانِ زخم کی تفصیل دیکھنے کے لئے
نظر کے سامنے اک آئینہ بھی رکھا ہے
ازل سے میرے تعاقب میں لوگ ہیں انورؔ
کہاں مقامِ سکوں راستے میں آیا ہے

بات الفت کی روبرو ہوگی
کوئی حسرت نہ آرزو ہوگی
نفرتیں دل سے جب نکل جائیں
زندگی کتنی خوبرو ہوگی
دوستوں میں خلوص ہو انورؔ
آنکھ پھر کیوں لہو لہو ہوگی

ہربنس لال شرما

عظیم رہنما کے نام

واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

بوڑھوں کی پنشن لگوا دی ۔ گھر بیٹھوں کو رقم پہنچا دی
ان کی زندگی اور بڑھا دی۔ تیرا حکم ہے حکم فولادی
کون بھلا سکتا ہے مثال ۔ واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

اس کو کہتے ہیں کچھ کرنا۔ دُکھی دِلوں کی پیڑا ہرنا
لگے گھاؤ پر مرہم دھرنا۔ کام جھٹا پھٹ۔ کسی کا ڈر نہ
عرضی دو ۔ پنشن تت کال۔ واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

کہاں گیا وہ بھرشٹا چار۔ اب نہیں ہوتا دُر ویوہار
ہر دفتر میں ملتا پیار۔ پوجا آدر اور ستکار
تُو نے ہی یہ بدلی چال۔ واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

بدل دیا اتہاس پرانا۔ تُو لایا ہے نیا زمانہ
تیرا کام ہے وچن نبھانا ۔ کتنا شُبھ ہے تیرا آنا
جیتا رہو ہزاروں سال۔ واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

میں دیتا ہوں تجھے دُعا۔ طاقت دے گا تمہیں خدا
ہو گے اور بڑے نیتا۔ ہو گے سب کے درد مٹا
بدلو گے گردوں کی چال
واہ رے چودھری دیوی لال
تیرا شاسن بہت کمال

[illegible]

افسانہ

رفیع حیدر انجم

شاید نہیں

دراصل اب تک کچھ طے نہیں کر سکا کہ مجھے اس بات کو سچ سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے یا رد کر دینا چاہیئے۔ اسکی شخصیت اور اپنے وجود کے درمیان ایک سیدھی اور صاف لکیر کھینچ پانے میں ناکام رہا ہوں اور شاید اسی لئے میرے ذہن کے اسکرین پر آڑی ترچھی اور مبہم لکیروں کا ایک جال سا بنتا جا رہا ہے۔ میں اس میں ایک کمزور مکھی کی طرح پھنس چکا ہوں اور زندگی ایک زہریلے مکڑے کی طرح لمحہ بہ لمحہ مجھے چاٹتی جا رہی ہے۔

نہیں، مجھے اس کی بات میں ذرا بھی سچائی نظر نہیں آتی کہ وہ ماسوا اپنے ہر شئے کو کمتر جانتا ہے اور مجھ سے راہ و رسم صرف اس لئے بنائے ہوئے ہے کہ میری محرومیوں کو دیکھ کر اپنی انا کی تسکین کر سکے۔ دوستی، وفا، خلوص اور محبت اس کے لئے محض کراسٹ کے گھر ہیں۔ وہ اپار چونسٹ ہے۔ بیوروکریٹ، سناب ......

کل تک ہم اسی شہر کے ایک کافی ہاؤس میں تادیر ادب، آرٹ، فلسفہ، پالیٹکس، انسانی رشتوں اور قدروں کی اُلجھی ہوئی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ زندگی کی کتاب پر آدرش کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور اوراق انسانیت کے درد و غم اور خوشی اور مسرت سے معمور تھا۔ لیکن آج وہ اسٹیٹس سمبل (STATUS SYMBOL) کا خوبصورت نقاب چڑھائے اپنی شخصیت کو میرے اوپر مسلط کرنے کی ترحم آمیز کوشش کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا یا جانتے ہوئے بھی نہیں جاننا چاہتا کہ اس کا عکس عکس آج بھی میری زندگی کی نفی ہے۔ لیکن میں رہتا ہوں جیسے جنم سے گونگا ہوں۔ کوئی ہے میرے اندر جو مجھے بولنے نہیں دیتا۔ کون ہے وہ؟ میرے سامنے آئے تو شاید میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔ چیخنا چاہتا ہوں لیکن میرے ہونٹوں پر خاموشی کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ قوتِ گویائی کو کیا ہو گیا ہے؟ میرے ہاتھ احتجاج کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ اس کا عکس میرے وجود کو اپنے دائرے میں لینے لگا ہے۔ میرے جسم کا ایک ایک انگ اس کے دائرے میں سمٹ آیا ہے اس دائرے میں سی گرمی، جلن، سوزش اور بے چینی ہے۔ میں شاید کسی گیس چیمبر میں ہو گیا ہوں اور کچھ ہی لمحہ بعد ...... میں درد کی شدت سے تلملا اٹھوں کہ دفعتاً ایک شناسا چہرہ میرے حلق کے اندر مسکراہٹوں کے پھول ڈال دیتا ہے۔

"تم! ڈاکٹر شدھیر رنجن ...... تم یہاں؟"

"ہاں .... میں ..... میرے لئے کوئی وقت اور جگہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا درد جانتا ہوں۔ وہ درد بھی جو ڈاکٹر نہ ہوتا تب بھی جانتا۔ یاد ہے وہ پہلی ملاقات جب تم نے مجھے کہانیاں سنائی تھیں اور میں نے کہا تھا کہ یہ زندہ کہانیاں ہیں۔ وہ کالا اور تو تلا لڑکا اور وہ ادھورا اپاہج آدمی کسی سڑک یا فٹ پاتھ پر پڑا

...زوں کی ہمدردی بٹور رہا ہوگا۔ ایک انقلاب کی ضرورت ہے میرے بھائی..... کرانتی لانی ہوگی....."

"کرانتی..... انقلاب.....لیکن میں ایک کمزور آدمی؟"

"نہیں! تم کمزور نہیں ہو۔ کمزور ہے وہ آدمی جو تمہیں اپنے دائرے میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمارے گردوپیش ایسے بہت سے دائرے ہیں۔ ہمیں ان سے لڑنا ہوگا۔ ان دائروں کو توڑنا ہوگا۔"

"ہاں! مجھے اس دائرے سے باہر آنا ہی ہوگا ورنہ...... ورنہ ان دائروں کے جنگل میں کھو جاؤں گا۔" میں بے ارادہ سڑک پر چل رہا ہوں۔ یہ سڑک کہاں جاتی ہوگی؟ کیا اس سڑک کے آخری سرے پر بھی یہی دنیا آباد ہے؟ میں سوچنے لگتا ہوں مگر میری سوچوں کے آئینے کرچیوں کی شکل میں سڑک پر بکھر جاتے ہیں۔

"کن اندیشوں میں کھوئے رہتے ہو؟ کئی دنوں سے تمہاری تلاش ......" میں چونک پڑتا ہوں۔ آئینے پر پتھر کس نے پھینکا؟

"اچھا تو تم ہو..... اچل..... تمہارا وقت اور جگہ تو مقرر ہے پھر اس وقت یہاں کیسے؟"

"بس یونہی...... ہمیشہ دائروں میں رہنا اچھا نہیں لگتا بلکہ میں تو دائروں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن......" وہ خاموش ہو جاتا ہے کہ اس 'لیکن' کے بعد خاموشی ہی دور تک ساتھ دے سکتی ہے۔ وہ مسکرانے لگتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں اپنائیت کا گہرا رنگ جھلکنے لگتا ہے لیکن اس رنگ کے پیچھے بھی ایک رنگ ہے اور جو دراصل بہت بے رنگ ہے اور جسے وہ ہمیشہ چھپا کر رکھتا ہے اور میں سب کچھ جان سمجھ کر بھی خاموش رہتا ہوں اور یہ کہ خاموشی ہم دونوں کا مقدر ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور میں بھی اس سے مل کر اپنا درد چھپانے لگتا ہوں۔ اس نے مجھے چائے کی آفر کی ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں پھر سگریٹ سلگا کر کینٹین سے باہر آ گئے ہیں۔ ہمارے درمیان دوبارہ ملنے کا ایک خاموش کمٹمنٹ ہے اور اسی لئے ہم خاموشی سے اپنی اپنی سمت چل پڑتے ہیں۔

میں بے ارادہ سڑک پر گھوم رہا ہوں۔

میرے دائیں بائیں اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ موٹر گاڑیاں آٹو رکشا اور سائیکلیں اپنی اپنی منزلوں کی تلاش میں بدحواس بھاگ رہے ہیں۔

میں تنہا ہوں لیکن میرے اندر اور باہر جانے انجانے چہروں کی ایک بھیڑ موجود ہے..... کسی کے ہاتھوں میں کتاب ہے۔ کسی نے اپنی مٹھیوں میں خنجر دبا رکھا ہے۔ کسی کی ٹانگیں نہیں ہیں اور بیساکھیوں کے سہارے چل رہا ہے۔ کوئی اندھا ہے کوئی بہرا اور کوئی گونگا۔ کوئی مادرزاد برہنہ اور کوئی سرتاپا سفید کپڑوں میں ملبوس۔ آنسو، قہقہے، سرگوشی، درد، دھواں، حیرت، محبت، شور، چیخ، نفرت اور احتجاجی نعروں کے درمیان میں سڑک پر تنہا اور بے مقصد گھوم رہا ہوں۔ میری خواہشوں، ارادوں اور حوصلوں پر برسوں سے سڑک کی دھول جمتی چلی آ رہی ہے۔ گرد و غبار کی اس دبیز تہہ پر میں اپنی انگلی پھیر کر ایک صاف اور سیدھی لکیر کھینچنا چاہتا ہوں مگر وہ میرا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو تم؟" وہ میرے شانوں کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگتا ہے۔ میں حیرت زدہ سا اسے دیکھ رہا ہوں۔

"ارے! کندن تم؟ میں تو بھول ہی گیا کہ تم اچانک ہی کہیں مل جاؤ گے اور اپنی شخصیت کے طلسم سے حیرت زدہ کر دو گے۔ لیکن تم اپنے ساتھ شیشے کی یہ نازک مورتی لئے کہاں گھوم رہے ہو؟ میں حیرت زدہ ہوں کہ اس شہر سنگ میں تم اسے بچا کر یہاں تک کیسے آ گئے؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور شیشے کی وہ مورتی مجھے دے کر ترتیب وار سارا قصہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ بھی دراصل ایک فن ہے اور اپنے گردوپیش کے دائروں سے بچنے کے لئے اس فن کی باریکیوں کو جاننا ضروری ہے۔

وہ اس فن کی باریکیوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور میں اپنی خواہشوں، ارادوں اور حوصلوں کو شیشے کی نازک اور خوبصورت مورتی پر لپیٹ کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا گھر کی طرف لوٹ پڑتا ہوں۔

رات کا پہلا نصف گزر گیا ہے۔ اپنے تنہا گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوتا ہوں۔ گھر کی ہر شے خاموشی کی دھند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بچے سو گئے ہیں لیکن سلمیٰ ابھی تک جاگ رہی ہے۔ نہیں..... وہ سو گئی ہے...... لیکن..... اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کیا آنکھیں کھول کر بھی سویا جا سکتا ہے؟ شاید نہیں...... اندیشوں میں ڈوبا ہوا میں تا دیر اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھتا رہتا ہوں اور یکایک مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پیٹ کی بھوک جاگتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے اور اس کے کپڑے جگہ جگہ سے دھول کی شکل میں سمٹے ہوئے ہیں۔ میں کمرے پر ایک

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

غزلیں

ساجد حمید



میری سانسوں میں جو مہکتا ہے
وہ تیری یاد کا اجالا ہے
اے فصیلِ شبِ فراق بتا
وصل کا چاند کب نکلتا ہے
میں کہ اک گونج تھا زمانوں کی
مجھ کو خاموشیوں نے گھیرا ہے
پھر بدن پر اُگے ہیں کچھ نغمے
یاد کا لمس پھر سے جاگا ہے
ان چھلکتی مہکتی آنکھوں کو
ہم نے ساجد اداس دیکھا ہے

درد سے یا خواب سے باتیں کریں
رات کس مہتاب سے باتیں کریں
یا پئیں ہم جرعہ جرعہ روشنی
یا شبِ بے تاب سے باتیں کریں
تو بھی آ اے تشنگی! ہم رات بھر
چشمۂ بے آب سے باتیں کریں
سطح پر ہیں بلبلے نا فہم سے
بستیٔ غرقاب سے باتیں کریں

صابر ابوہری

انقلاب

خواجہ احمد عباس پیشے اور اُفتادِ طبع کے لحاظ سے صحافی تھے۔ تاہم انہیں افسانہ گوئی اور ناول نویسی میں بھی یدِطُولیٰ حاصل تھا۔ ان کے ناول "انقلاب" کا شمار "گئودان" "آگ کا دریا" اور "آخرِ شب کے ہمسفر" کی طرح اُردو کے شاہکار ناولوں میں ہوتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کا پہلا تاریخی ناول ہے جس میں جنگِ آزادی اور اس کے دوران رُونما ہونے والے اہم واقعات مثلاً سائمن کمیشن کی مخالفت، "ڈانڈی مارچ" بھگت سنگھ کا اسمبلی میں بم پھینکنا، جواہر لال نہرو کے زیرِ صدارت کانگریس کا سنہ ۱۹۲۹ء میں منعقدہ لاہور اجلاس اور جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کا ذکر نہایت دلچسپ اور موثر ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔

انور، انجم، سلمیٰ، رامیشور داس اور اکبر علی کے علاوہ اس کے باقی سبھی اہم کردار مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ بھی جنگِ آزادی کے مجاہدوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ناول کے ہیرو انور نے تو ان سے بذاتِ خود ملاقاتیں بھی کی ہیں۔ عباس نے ان سب کے ظاہری خدوخال، عادات و خصائل اور سیاسی عقیدوں کی وضاحت نہایت فنکارانہ طور پر کی ہے۔

مہاتما گاندھی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں "گاندھی جی فرش پر بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ ان کی ناقابلِ تسخیر رُوحانی طاقت کے آگے نئی دلّی کے محلوں میں ظالم حکمران گھبرا اُٹھے۔ وہ کہا کرتے تھے ۔۔۔ انگریزی حکومت نے ہمارے عظیم ملک کو اخلاقی، مادی، تہذیبی اور رُوحانی طور سے تباہ کر دیا ہے۔ میں ایسی حکومت ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ میں نے اس حکومت کو ختم کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اب بغاوت میرا مذہب ہے۔ ہماری لڑائی اہنسا کی لڑائی ہے"۔

نہرو کے بارے میں لکھا ہے، "خوبصورت چہرہ کھلاڑیوں جیسا پھرتیلا بدن .... پنڈت جی تصویروں میں جیسے خوبصورت لگتے تھے، سچ مچ وہ اتنے ہی خوبصورت تھے۔ شیروانی کے تیسرے بٹن میں گلاب کا پھول لگا رہتا تھا۔ ان کے بارے میں ان گنت قصے مشہور تھے جیسے کہ وہ پرنس آف ویلز کے ساتھ پڑھے تھے اور یہ کہ اُن کے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے تھے۔ انہوں نے قوم کی خاطر اپنی چلتی ہوئی بیرسٹری اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دی۔ اگرچہ وہ کانگریس کے جنرل سیکرٹری اور صدر رہے مگر ان کا تعلق ایسے لیڈروں سے بھی تھا جو انقلابی تھے مثلاً یُوتھ لیگ اور انڈی پینڈینس لیگ آف انڈیا"۔

خان عبدالغفار خاں کی تصویر کشی ملاحظہ فرمایئے، "ان سے زیادہ لمبا آدمی شاید ہی کوئی ہو۔ دوسرے لوگ ان کے آگے بالکل بونے لگتے تھے۔ ان کی لمبی سی جھکی ہوئی ناک اور چٹان جیسا سخت کھردرا چہرہ جس پر داڑھی اُگی ہوئی تھی شمال مغربی سرحدی صوبے کے سخت پہاڑی علاقے کی یاد دلاتا تھا جس پر کوئی قابو نہیں پا سکا تھا۔

اپنے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود ان میں بچوں جیسی معصومیت اور سنتوں جیسی نرمی تھی۔ وہ اتنی نرمی سے باتیں کرتے تھے کہ سننے والا شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ان کا یہ یقین تھا کہ گاندھی جی کے اہنسا کے راستے پر چل کر ہی پٹھانوں کو نجات مل سکتی ہے۔"

حادثات میں امرتسر میں واقع جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی تفصیل دیکھیے:-

"شام کے چار بجے جلیانوالہ باغ میں جلسہ منعقد ہوا۔ بیس ہزار لوگوں کے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر بعد تیس چالیس انگریز اور گورکھا سپاہیوں کا ایک دستہ آ کر باغ کے پھاٹک کے سامنے تعینات ہو گیا۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ ایک لال منہ والے انگریز افسر نے گورکھوں سے چلا کر کچھ کہا۔ اس پر انہوں نے اپنی بندوقیں تان لیں اور بھیڑ کی طرف نشانہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر اس لال منہ والے افسر نے حکم دیا۔۔۔ "فائر!" اور گورکھوں نے گولی چلانا شروع کر دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکی۔ مرد، عورتیں اور بچے چاروں طرف گولیوں کا شکار ہو کر گر رہے تھے۔ دم توڑتے ہوئے اور زخمی لوگوں کی گولیوں کی تڑاتڑاہٹ کے بیچ "یا اللہ"، "ہے بھگوان" اور "ارے میری ماں" کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جلیانوالے باغ پر موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ چاروں طرف زمین پر لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے جیسے گیہوں کی فصل کاٹ دی گئی ہو۔"

بھگت سنگھ نے اسمبلی میں جو بم پھینکا تھا اس کا بیان اس طرح کیا ہے:- "ایک بم سرکاری افسروں کے سامنے فرش پر گرا اور بھیانک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد لال لال پرچوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ممبروں میں خاص طور پر افسروں اور سرکاری ممبروں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر کوئی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا چیمبر بدبو دار دھوئیں سے بھر گیا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جو اس گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئے۔ ایک تھے وٹھل بھائی پٹیل، لمبی داڑھی والے سپیکر اور دوسرے موتی لال نہرو۔ اس بھاگ دوڑ، شور و غل اور پولیس کی سیٹیوں کو دبا کر ایک آواز چیمبر میں بار بار گونج رہی تھی۔

"انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!" یہ ایک مونچھوں والے نوجوان کی آواز تھی جو ایک کرسی پر نڈر کھڑا تھا۔ ایک پورے سامراج کے خلاف ایک اکیلا آدمی۔ اور وہ نعرہ لگا رہا تھا۔ جو پورے ملک کے لئے جدوجہد کی للکار بننے والا تھا۔ بعد میں جب پولیس کے ایک داروغہ نے اس کا نام پوچھا تو اس نے بڑے فخر سے جواب دیا۔ "بھگت سنگھ"۔ اس کی مونچھوں میں اب بھی بغاوت کا بانکپن تھا۔"

تاریخی واقعات کے علاوہ ناول میں اس وقت کی سماجی برائیوں مثلاً چھوٹی عمر کی شادی، امیر لوگوں کی عیش پرستی اور ہوسناکی، مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر بھی عبرتناک طریقے سے کیا گیا ہے۔ انور کی بہن انجم کی بے وقت موت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے: "بہت کم عمر میں اس کی شادی کر دی گئی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں بچہ ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ یہ تو جان بوجھ کر مار ڈالنا ہے۔ جہالت ہے، بلا کی جہالت ہے۔ نہ جانے کتنی عورتوں کی جان اس میں جاتی ہے۔"

اسی طرح مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ فسادات کے الم ناک نتائج کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "پتہ چلا کہ شہر کے دو غنڈوں میں کوئی ذاتی جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ دونوں طرف کے کٹر مذہبی لوگوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر جھوٹی افواہیں پھیلائی تھیں اور دونوں فرقوں کے بیچ جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ جو کل تک آپس میں بھائی بھائی اور دوست تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد فساد تو ختم ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے دلوں میں جو دشمنی پیدا ہو گئی تھی وہ دور نہیں ہوئی۔"

یہ ناول سر والٹر سکاٹ کے ناولوں کی طرح تاریخی اہمیت کا حامل تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ یہ خود نوشت سوانحِ عمری کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں خواجہ احمد عباس کی ذاتی زندگی اور ان کے مذہبی اور سیاسی عقاید کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے مثلاً ان کا علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پانا، محبت میں ناکامی، جنگِ آزادی سے دلچسپی اور اس بنا پر یونیورسٹی سے نکالا جانا، صحافت کی

زندگی اختیار کرنا، جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے عقیدت، مذہبی تعصب سے نفرت۔ بھائی چارے، وطن پرستی، یک جہتی، سیکولرزم اور سوشلزم میں کامل یقین وغیرہ۔

خواجہ احمد عباس نے یہ ناول ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ کافی ضخیم ناول ہے۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو باوجود انتہائی کوشش کے۔ چھ سو صفحات کی ضخامت کے پیشِ نظر اردو کا کوئی پبلشر اسے چھاپنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ لہٰذا یہ پہلی بار ۱۹۵۵ء میں روسی زبان میں وہاں کی یونین آف رائٹرز کی مدد سے شائع ہوا۔ مگر وہاں اس کا نام "سیتنا انڈی" یعنی ہندوستان کا بیٹا رکھا گیا کیونکہ انقلاب نام کے وہاں پہلے ہی بہت سے ناول شائع ہو چکے تھے۔ اسی سال اس کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں یہ انگریزی زبان میں شائع ہوا اور ۱۹۶۱ء میں ہندی میں۔ روس کی دوسری زبانوں مثلاً یوکرینین، آذربائی جانی اور تازتا میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ روس میں تو یہ لاکھوں کی تعداد میں بکا ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، خواجہ احمد عباس نے لاچار اپنے ۱۶ ویں سال یعنی ۱۹۷۵ء میں خود کتابت کروائی، خود ہی چھپوایا اور اپنے خرچ سے خود ہی شائع کیا۔ اس بارے میں انہوں نے نہایت ہی تاسف آمیز لہجے میں لکھا ہے: آخر کار یہ ناول میری اپنی زبان میں سب سے آخر میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی ...۱ جلدیں چھاپی ہیں۔ دیکھیں یہ کتنے برسوں میں بکتی ہیں۔

ادبی، سماجی اور تاریخی نکتۂ نظر سے یہ ایک قابلِ تعریف تخلیق ہے جس میں ہماری جنگِ آزادی کا بیان نہایت دلآویز ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں نہ صرف اہم واقعات ہی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس دور کے بیسیوں مشہور سیاسی رہنماؤں اور مجاہدینِ آزادی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے مطالعے سے اعلیٰ انسانی قدروں، اخلاقِ حسنہ اور اخوت، مساوات، حریت، جد و جہد، حبِ وطن اور قربانی ایسے ارفع جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ آجکل کے نوجوانوں کے لئے جو عہدِ حاضر کے علمبردار اور عظیم قربانیوں سے حاصل کی گئی ہماری آزادی کے امین ہیں، اس کا مطالعہ خاص طور پر ناگزیر ہے۔

چندر پرکاش جوہر بجنوری

غزل



پھر اسی خواب کا ہر لمحہ مکرر دیدے
پھر وہی شب کا سماں، حسن کا منظر دیدے

چند قطروں سے کہیں پیاس بجھی ہے ساقی
تجھے دینا ہی اگر ہے تو سمندر دیدے

ایک دل کم ہے غمِ زیست اٹھانے کیلئے
ایک دل اور مجھے دل کے برابر دیدے

سرِ ظالم کو کچل دے جو ہمیشہ کے لئے
وقت کے ہاتھ میں ایسا کوئی پتھر دیدے

وہ نہ چاہے تو مری کوششِ پیہم بےسود
وہ اگر چاہے تو ہر شے مجھے جوہر دیدے

بودھ راج ظفر

قدیر بنارسی



غزلیں

لوگ کیوں حق سے ہیں بیزار یہ کیا قصّہ ہے
کیوں ہے باطل سے انھیں پیار یہ کیا قصّہ ہے

دیکھ کر فرقہ پرستی و تعصّب کی وبا
کیوں ہیں خاموش قلم کار یہ کیا قصّہ ہے

سخت حیرت ہے ہمیں یہ کہ خدا والوں کی
ہے خدا والوں سے تکرار یہ کیا قصّہ ہے

آج لیلےٰ کو نہیں قیس سے رغبت کوئی
قیس لیلےٰ سے ہے بیزار یہ کیا قصّہ ہے

جانِ جاں آج بھی ہم جس کو سمجھتے ہیں ظفؔر
ہے وہی جان کا آزار یہ کیا قصّہ ہے

غیر محفوظ ہیں گھروں میں بھی
آگ ہوتی ہے پتھروں میں بھی

اپنا ذوقِ نظر مساوی رکھ
دیکھ تاریک منظروں میں بھی

بے جھجک وہ جو مان لیتا ہے
جان ہوتی ہے مشوروں میں بھی

وہ جو لطف و کرم کا پیکر تھا
اس کو دیکھا ستمگروں میں بھی

صرف سچائی پھونک سکتی ہے
روحِ گویائی کنکروں میں بھی

راجندر

تحریکِ آزادی اور ہریانہ

● ہندوستان کو آزاد ہوئے تقریباً نصف صدی ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء سے نوّے سال پہلے یعنی ۱۸۵۷ء کو اگر جنگِ آزادی کا آغاز سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ قوم کی پوری دو۲ نسلیں حصولِ آزادی کی جدوجہد کے لئے وقف ہو گئیں کہ دورِ حاضر کی نسل جس نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ہوش سنبھالا ہے، کو یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ آزادی اور غلامی کی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی نعمت سے محرومی کا احساس ہی ہمیں اُس کی وقعت اور عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ کیا ہم اُس زمانے کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں جب اپنے ہی ملک میں ہم سر اونچا کر کے نہیں چل سکتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں ہر شہری کو جمہوری حقوق حاصل ہیں۔ تقریر و تحریر کی آزادی اور اپنے نمائندوں کو چُننے کا اختیار۔ ذرا تصور کیجئے اُس زمانہ کا جب ہندوستانی عوام کو اپنی آواز بلند کرنے یا اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا، ایک غیر مُلکی سامراج سارے ہندوستان میں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

لیکن وقت کے دھارے کو کوئی روک سکتا ہے؟
تغیّر اور تبدّل قدرت کا اٹل قانون ہے۔
نظامِ کہنہ کا ماضی میں دھکیلا جانا ہی ترقی اور ارتقا، کا دوسرا نام ہے۔

ہندوستانی عوام کے دلوں میں آزادی کی تڑپ کا جاگنا بھی دورِ غلامی کا ایک قدرتی ردِ عمل تھا اور ہریانہ نواسیوں کے لئے یہ امر باعثِ صد افتخار ہے کہ اس علاقے کے غیور اور بہادر عوام قومی تحریک میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس جدوجہد میں تمام ہریانہ نواسیوں نے بلالحاظ مذہب و ملت، رنگ و نسل نہایت ہمت و حوصلے کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کو انگریزوں کے زرخرید مورخوں نے محض غدر یا "فوجیوں کی بغاوت" کا نام دے کر اس کی اہمیت کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کے مجاہدوں کو ڈاکو، قاتل اور لٹیرے کہہ کر ہندوستانی محب الوطنوں کی کردارکشی کی ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے

۱؎ ۱۹۶۶ء کے بعد جو پردیش ہریانہ کے نام سے عالمِ وجود میں آیا اُس کے کچھ حصے ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی یا دیسی ریاستوں یا متحدہ پنجاب میں شامل تھے — تاہم قومی تحریک میں ہریانہ کے رول کی پہچان کسی خاص تشریح و وضاحت کی محتاج نہیں۔ سیاسی سماجی ڈھانچہ کیسا بھی ہو ہریانہ کے لوگوں کا طرزِ زندگی زبان و ثقافت منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

واقعات ایک قومی بغاوت کا حصہ تھے۔ ہریانہ کے لوگوں نے اسے ایک عوامی جدوجہد بنادیا۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں راجے مہاراجے اور نواب تو انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اُترے ہی تھے لیکن ہریانہ میں بغاوت کے یہ شعلے گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں بلند ہوئے۔ جن دنوں یہ بغاوت اپنے عروج پر تھی ہریانہ کے تمام علاقوں میں انگریزی راج کا نام ونشان تک مٹ گیا تھا۔ دہلی کے گردونواح کے ہریانوی علاقوں میں تو بہادر شاہ بادشاہ کا ہی جھنڈا لہراتا تھا۔ رام پورہ، ریواڑی، بلب گڑھ، فرخ نگر، جھجر، روہتک، انبالہ، کرنال، ہانسی، حصار، تھانیسر اور کئی دوسرے مقامات تھے جہاں یہ بغاوت بھڑکی۔ ہریانہ کا نام ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اسی لئے ہی چمکا کیونکہ کوروکشیتر کے مقدس سرووَر (تالاب) میں اُگنے والے لال رنگ کے کمل کے پھولوں کو انقلاب کی نشانی کے طور پر چنا گیا۔ روایت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دو عظیم رہنما نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں سارے ملک میں انقلاب کو منظم کرنے کے لئے دورہ کرتے کرتے کوروکشیتر بھی آئے جہاں انہوں نے اعلان کیا کہ ان کمل کے پھولوں پر ہاتھ رکھ کر سب دیش بھگت عہد کریں گے۔ اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ کوروکشیتر کی پنچایت براہمناں نے لال کمل کے پیغام کو ملک کے کونے کونے میں پہنچایا۔ لوگوں کا تو یہاں تک بھی عقیدہ ہے کہ میرٹھ سے انقلاب کی جو آواز اُٹھی تھی وہ بھی ہریانوی مجاہدوں نے بلند کی تھی۔ اس وقت میرٹھ شہر کے کوتوال راؤ مدن گوپال تھے اور گوڑ گاؤں (ریواڑی) کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے میرٹھ سے دہلی تک مارچ کرنے والے انقلابیوں کی رہنمائی کی اور لال قلعہ میں بہادر شاہ بادشاہ کی باقاعدہ تخت نشینی اور کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان انہی انقلابیوں نے کروایا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جھجر کے نواب عبدالرحمٰن خاں کو انگریزوں نے لال قلعہ کے سامنے میدان میں تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ روہتک ضلع کے گاؤں نصیب پور میں چودھری اُودے کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر جان سے مار ڈالا گیا۔ اور سارے علاقے میں بے پناہ مظالم انگریزی سرکار نے توڑے۔ ہانسی شہر کو تہ وبالا کر دیا گیا کیونکہ یہاں کے ایک سرکردہ دیش بھگت چودھری ہُکم چند نے اعلانیہ طور پر بہادر شاہ بادشاہ کے تئیں وفاداری کا اعلان کیا تھا۔ ریواڑی کے راؤ تلا رام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اپنی پوری طاقت سے جنگ جاری رکھی۔

آخر کار وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور ہندوستان سے باہر غریب الوطنی کی حالت میں جاں بحق ہوئے۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد ہریانہ کے عوام کو برٹش سرکار کے غیض وغضب کا خاص طور پر نشانہ بننا پڑا۔ قتل وغارت کا دور تو چلنا ہی تھا اور خوب چلا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے اقدامات بھی کئے گئے..... کہ ہریانہ کے عوام کو اپنی ہستی کا بھی احساس نہ رہے۔ بہت سے علاقے دہلی ایڈمنسٹریشن کو منتقل کر دیئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ مرکز میں بیٹھے انگریز افسر ان علاقوں سے پورا پورا انتقام لے لیں۔ بہت بڑا علاقہ پٹیالہ، نابھہ، جیند کی ریاستوں کو دے دیا گیا کیونکہ ان راجاؤں نے انگریزوں کے ساتھ وفاداری دکھائی تھی اور دہلی میں انگریزی راج پھر سے قائم کرنے میں مدد کی تھی۔ جو لوگ دیسی راجاؤں کی ریاستوں میں دھکیل دیئے گئے تھے اُنہیں دوہری غلامی بھگتنی پڑی۔ کیونکہ راجے اور مہاراجے تو انگریزوں کے غلام تھے۔ اس لئے ان کی پرجا کو "برٹش انڈیا" کے لوگوں کے ساتھ جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ کا بھی شکار ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہریانہ کے اضلاع حصار، روہتک، انبالہ، کرنال وغیرہ صوبہ پنجاب کا حصہ بنا دیئے گئے۔ اس طرح "ہریانہ" کا نام محض ایک ادھورا اور ایک خواب بن کر رہ گیا۔ اس محرومیت کا احساس ہی ہریانہ واسیوں کے دلوں میں ایک خلش پیدا کرتا تھا۔ اگر ہریانہ ترقی کے میدان میں کسی حد تک پسماندہ رہ گیا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ یہاں کے لوگ مجبوری اور بے کسی کی حالت میں برٹش سرکار کے رحم وکرم کے محتاج رہیں اور یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو ہمیشہ غیر ملکی حکمرانوں کی وفاداری کا راگ الاپتا رہے اور ہوا بھی یہی۔ ہریانہ میں انگریزوں کے حامیوں کی ایک خاصی تعداد اُبھر آئی جو پالیٹکس میں بھی دخل دینے لگی۔ پچھلی صدی کی آخری چوتھائی تک ہریانہ میں سیاسی زندگی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا کیونکہ برٹش امپیریلزم کے استبداد، جبر وتشدد نے عوام کو بالکل بے دست وپا کر دیا تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب سوامی دیانند سرسوتی کی قائم کردہ آریہ سماج کی جڑیں ہریانہ میں کافی مضبوط ہو گئیں۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۱۶ء تک ہریانہ کے علاقے پنجاب میں شامل تھے۔ اس لئے اس زمانے میں جہاں کہیں بھی پنجاب کا ذکر آتا ہے اُس میں ہریانہ کا وجود بھی ضمناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے نے میدان میں قدم رکھا۔ آپ نے حصار میں اپنی وکالت شروع کی۔ کلکتہ شہر میں

انڈین نیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس (۱۸۸۶ء) میں ہوا۔ کانگریس کے اکابرین میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد ـــــــ اور لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک جیسی نامور ہستیاں شامل تھیں۔ اس میں ہریانہ کی نمائندگی کرنے کے لیے جھجر (ضلع روہتک) کے پنڈت دین دیال ویاکھیان واچسپتی اور روہتک قاعدے کے بابو بالمکند ہند کے ایک عالم اور نامور صحافی تھے۔ پنڈت دین دیال ویاکھیان واچسپتی ایک فصیح البیان مقرر تھے جن کی خطابت اور زورِ قلم کو سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ الہ آباد میں انڈین نیشنل کانگریس کا چوتھا اجلاس ۱۸۸۸ء میں ہوا تو لالہ لاجپت رائے ہریانہ کے نمائندہ کے طور پر اس میں شامل ہوئے۔ اس وقت لالہ جی کی عمر صرف تیئیس سال تھی۔ آپ نے اس اجلاس میں تقریر بھی کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس جب لاہور میں ہوا۔ اس میں لالہ لاجپت رائے نے حصار کی نمائندگی کی۔

انڈین نیشنل کانگریس نے جس سیاسی بیداری کو جنم دیا، اُسے ہریانہ کے علاقہ میں آریہ سماج اور دیگر سوشل ریفارم کی تحریکوں سے اور زیادہ تقویت ملی۔ جب پبلک کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد ہوں اور حکومت سے سیدھا ٹکراؤ ممکن نہ ہو تو لوگوں کا دبا ہوا جذبہ سماج سدھار یا پرانی تہذیب کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوششوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ آریہ سماجی پرچارکوں اور ستیا سیوکوں نے اپنے اُپدیشوں میں قومی بیداری اور دیش کی آزادی کو پوری اہمیت دی۔ جس کے نتیجہ میں ہریانہ میں کانگریس کا پرچار اور سماج سدھار دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ ہندوؤں میں آریہ سماج کے ساتھ ساتھ سناتن دھرم کو پھر سے زندہ کرنے کی تحریک بھی چلی جس کے رہنما پنڈت دین دیال ویاکھیان واچسپتی تھے۔ اسی قسم کی سماج سدھارک تحریکیں مسلمانوں میں بھی شروع ہوئیں۔ سر سید احمد خاں کی علیگڑھ مہم کو پانی پت کے مولانا الطاف حسین حالی اور دوسرے ممتاز رہنماؤں نے آگے بڑھایا۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز میں ہریانہ سیاسی بیداری کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

اس ضمن کا ایک قابلِ ذکر واقعہ ۱۸۶۴ء میں وہابی مجاہدینِ وطن کے خلاف انبالہ کی عدالت میں چلایا گیا ایک تاریخی مقدمہ ہے جس میں وہابی انقلابیوں کو طویل میعاد کی بامشقت اسیری کی سزائیں دیکر انڈیمان کی کالی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ وہابی مذہبی خیالات کے ایک خوددار سید بزرگ عبدالوہاب (وفات ۱۷۹۲ء) کے پیروکار تھے جن کا عقیدہ تھا کہ کوئی بھی مسلمان اپنے مذہب یعنی اسلام کے تئیں اپنے فرض سے کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا اگر وہ اپنی مادرِ وطن کو آزاد کرانے کے لیے جہاد نہیں کرتا۔ یعنی آزادیٔ وطن کے لئے جدوجہد ہر مسلمان کے مذہبی فرائض کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ ہندوستان میں وہابی تحریک کے رہنما سید احمد بریلوی تھے۔ آپ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ۱۸۲۶ء میں جہاد کا اعلان کیا تھا۔

یہاں ہریانہ کے سبھی دیش بھگتوں کے نام تحریر کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند ایسی ہستیوں کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے قومی تحریک کی داغ بیل ڈالی مثلاً انبالہ ضلع کے لالہ مُرلی دھر، لالہ دونی چند انبالوی اور خان عبدالغفار خان، حصار ضلع کے پنڈت ٹھاکر داس بھارگو ـــــ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو (سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب) لالہ شام لال ایڈووکیٹ، روہتک ضلع کے لالہ شام لال ممبر سنٹرل اسمبلی۔ ان میں سے اکثر بزرگ تو جاں بحق ہو چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہریانہ کے معمر سیاسی بزرگ پنڈت شری رام جی شرما اب بھی ہمارے درمیان ہیں۔ ساٹھ سال سے بھی زیادہ مدت سے آپ قومی خدمت میں مصروف ہیں۔ آپ آزادی کی لڑائی کے آزمودہ جرنیل رہے۔ ۱۹۰۷ء میں ایک ہریانوی انقلاب پسند نوجوان نے اپنے زورِ قلم سے انگریزی راج کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا۔ اُس نے ایک ہفتہ وار اُردو اخبار "سوراجیہ" (الہ آباد) میں صرف ایک ایڈیٹوریل ہی لکھا تھا جس پر اُسے عمر قید کی سزا دی گئی اور انڈیمان کی جہنمی جیل میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ اس نوجوان کا نام موتی رام تھا اور وہ ہریانہ کا رہنے والا تھا۔ "سوراجیہ" اخبار دُنیا بھر کی انقلابی صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس اخبار کو لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کے آشیرواد سے ۱۹۰۷ء میں جاری کیا گیا تھا اور صرف تین سال میں ہی اُس کے آٹھ ایڈیٹر گرفتار کئے گئے جن میں سے پانچ کو بیس بیس سال کی قید بامشقت کی وحشیانہ سزا صرف ایک ایڈیٹوریل کے چند شعر یا نظمیں لکھنے کی پاداش میں بھگتنی پڑی۔ بابو موتی رام ابتدا میں انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے لا

ایک عام آدمی کی طرح اُن کے دِل میں بھی اُمنگ تھی کہ وہ دھن دولت کما ئیں اور آرام کی زندگی بسر کریں لیکن قسمت نے انہیں "سوراجیہ" اخبار سے جوڑ دیا۔ واقعہ یوں تھا کہ اُن دِنوں اخباروں میں ایک عجیب و غریب اشتہار شائع ہُوا جس کا لُب لباب یہ تھا۔ آزادی کا جھنڈا بلند رکھنے کے لئے ایسے نوجوان ایڈیٹروں کی ضرورت ہے جو غربت اور بھوک کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہوں اور ضرورت پڑنے پر اگر جیل کی سلاخوں میں بند ہونا پڑے تو میدان سے پیچھے نہ ہٹیں۔ بابو موتی رام ورما کے دِل میں وطنِ عزیز کی محبت نے جوش مارا اور آپ نے "سوراجیہ" کی ادارت سنبھال لی۔ اِس طرح ہریانہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس کا نام "سوراجیہ" اخبار اور لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے۔

اُس زمانہ میں دہلی اور ہریانہ میں کوئی فرق نہیں تھا، کیونکہ ہریانہ میں سرکاری انتظام دہلی کے ساتھ ہی چلتا تھا۔ یہ دن ہارڈنگ بم کیس کے تھے۔ اس مقدمۂ سازش میں ماسٹر امیر چند بھائی بالمکند اور ستری اودھ بہاری کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ لالہ ہردیال مفرور ہو گئے تھے۔ اس مقدمۂ سازش کا چرچا ہریانہ کے ہر گاؤں اور شہر میں ہُوا۔ واقعہ یہ تھا کہ سن ۱۹۱۲ء میں جب لارڈ ہارڈنگ ایک شاہی جلوس میں دہلی شہر کو کلکتہ کی بجائے ہندوستان کی راجدھانی بنانے کا اعلان کرنے جا رہے تھے، اُن کے ہاتھی پر بم پھینکا گیا تھا۔

ہریانوی انقلاب پسندوں نے ہندوستان کے باہر بھی انگریزی راج کے خلاف اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ سن ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اُن دِنوں امریکہ میں غدر پارٹی کی بُنیاد رکھی گئی۔ اِس جماعت کا مقصد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف انقلاب کا بگل بجانا تھا۔ ہریانہ کے چند اضلاع چونکہ پنجاب میں بھی شامل تھے۔ اس لئے غدر پارٹی کے ہریانوی ممبروں کو بطور پنجابی ہی یاد کیا جاتا ہے۔ انقلابی نوجوان ـــ گجراتی، بنگالی، مدراسی کوئی بھی ہوں تھے تو ہندوستانی ہی۔ ان نوجوانوں میں انبالہ ضلع کے پنڈت کانشی رام اور بابا پرتھوی سنگھ آزاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنڈت کانشی رام نے اپنی کرولڑوں کی جائداد آزادی کی راہ میں قربان کر دی اور خود ہندوستان واپس آگئے اور

انقلابی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ آخرکار آپ کو لاہور کے سن ۱۹۱۵ء کے مشہور مقدمۂ سازش میں ملوث کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا موت کی سزا سنائی گئی اور تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ بابا پرتھوی سنگھ آزاد بقیدِ حیات ہیں آپ کو بھی سزائے موت سنائی گئی تھی جسے بعد میں عمر قید میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد بابا جی کی زندگی ایک انقلابی مجاہد کی کہانی ہے جس میں قدم قدم پر مفروری اور رُوپوشی کی حالت میں شدت سے مقابلہ کرنا اور ہندوستان کی سرحدوں کو خفیہ طور پر پار کر کے دوسرے ممالک میں ہندوستان کے کاز کے لئے جد و جہد کرنے کا بیان آتا ہے۔ آجکل بابا جی ہندوستان بھر کے سوتنترتا سنگرامیوں کی تحریک کے روحِ رواں ہیں۔ غدر پارٹی کے بانیوں میں لالہ ہردیال کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد ہریانہ میں دورِ جدید کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ سن ۱۹۱۷ء میں روہتک میں پہلی بار کانگریس کمیٹی بنی۔ چوہدری چھوٹو رام اس کے صدر تھے۔ روہتک کے لالہ شام لال، جو بعد میں سنٹرل اسمبلی کے ممبر رہے، اس کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ اسی زمانہ میں پنڈت منی رام شرما نے بھی دیش سیوا شروع کی۔ آپ کا جنم ضلع حصار کے ایک گاؤں میں ہُوا تھا۔ آپ نے وارانسی میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ آپ رامائن اور دُوسری دھارمک پُستکوں کی کتھا کرنے کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ شروع شروع میں آپ نے پنڈت دین دیال ویاکھیان واچسپتی کی زیرِ رہنمائی سناتن دھرم سبھاؤں کی تنظیم کی۔ بعد میں آپ نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ دیسی ریاستوں میں بیگار کی لعنت نے کسانوں اور مزدوروں کو پریشان کر رکھا تھا۔ نیکی رام شرما نے بیگار کے خلاف رائے عامہ بیدار کرنے کے لئے ایک زبردست تحریک شروع کی۔

سن ۱۹۱۸ء میں دہلی میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہُوا۔ اس کے صدر بھارت بھوشن پنڈت مدن موہن جی مالویہ تھے۔ اس اجلاس میں ہریانوی نمائندوں میں پنڈت سری رام جی شرما اور چودھری پیرو سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنڈت سری رام جی شرما کی زیرِ رہنمائی تو ہریانوی نوجوانوں کے ایک جتھے نے اسی اجلاس کے موقع پر دیش سیوا کا عہد لیا۔ پنڈت جی تب سے لگاتار کانگریس سے وابستہ رہے ہیں اور کئی بار جیل یاترا کر چکے ہیں۔ سن ۱۹۲۳ء میں

پنڈت شری رام جی شرما نے اپنا مشہور ہفتہ وار اخبار "ہریانہ" جاری کیا جواب تک شایع ہو رہا ہے۔ جب پنڈت جی جیل میں ہوتے تو قدرتی طور پر اس کی اشاعت رُک جاتی لیکن پنڈت جی نے جنتا کی پُر زور حمایت کے بل بوتے پر اس اخبار کو زندہ رکھا اور انگریزی حکومت کے سخت گیر اقدامات کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ پھر عدم تعاون کی تحریک کے دن آئے۔ اس کے ساتھ ہی خلافت کا مسئلہ بھی اُبھرا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے گاندھی جی کی زیرِ قیادت قومی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ ہریانہ میں تحریکِ خلافت کے دو بڑے رہنماؤں مولوی لیق اللہ اور صوفی اقبال کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان لیڈروں سے ملاقات کرنے کے لئے مہاتما گاندھی بہ نفسِ نفیس روہتک تشریف لائے، لیکن برٹش سرکار نے ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ جس سے روہتک اور گرد و نواح کے علاقوں میں بے چینی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی نے روہتک شہر کی اناج منڈی میں ایک زبردست تقریر کی جسے لوگ آج تک نہیں بھول سکے۔ اس جلسے میں گاندھی جی کے ساتھ ہریانہ کے ایک مسلمان قوم پرست رہنما مولانا غلام بھیک نیرنگ (ایم۔ اے۔ ایل سینٹرل) بھی موجود تھے۔

ہریانہ کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ اس پردیش کے شہر پلول میں گاندھی جی کی ۱۹۱۹ء میں ۸ اپریل کی وہ تاریخی گرفتاری ہوئی جس نے ملک بھر میں زبردست سیاسی ہلچل پیدا کر دی تھی۔ اس کے بعد پنجاب میں جلیانوالہ باغ کا خونی سانحہ ہوا۔ جلیانوالہ کے گولی کانڈ کے بعد ہریانہ میں بھی غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ روہتک اور دوسرے شہروں میں بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ کئی جگہوں پہ ریل کی پٹڑیاں بھی اُکھاڑ دی گئیں۔ حصار۔ سرسہ۔ ٹوہانہ۔ ڈبوالی۔ روہتک۔ سونی پت۔ انبالہ۔ گنور۔ بہادر گڑھ وغیرہ مقامات سے ہڑتالوں۔ مظاہروں اور احتجاجی جلسوں کی خبریں آئیں۔ اس طرح ہریانہ میں "گاندھی یگ" کی سیاست کا آغاز ہوا — اب جگہ جگہ کانگریس کمیٹیاں بنانے۔ کھادی پرچار اور تلک سوراجیہ فنڈ اکٹھا کرنے کا پروگرام شروع ہوا۔ اُن دنوں مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے روہتک اور بھوانی وغیرہ شہروں میں تقاریر کیں۔ بہت سے ہریانوی دیش بھگت جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے

جھجر میں پنڈت شری رام شرما کی زیرِ قیادت قومی جھنڈے کو میونسپل کمیٹی کے دفتر پر لہرانے کے سوال پر ستیہ گرہ شروع ہوا۔ اس واقعہ کی صدائے بازگشت مہاتما گاندھی تک بھی پہنچی اور انہوں نے اس مسئلہ پر "ینگ انڈیا" (YOUNG INDIA) میں ایک شذرہ سپردِ قلم کر کے ہریانوی دیش بھگتوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں بھوانی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے برطانوی حکومت کو "شیطانی راج" کہا تھا۔ ان کے ان الفاظ کو لے کر برطانوی سرکار نے مہاتما جی کے خلاف باغیانہ تقریر کرنے کا مقدمہ بھی چلایا تھا۔ تحریکِ عدمِ تعاون میں سرکاری عدالتوں، سکولوں، کالجوں، بدیشی کپڑے، شراب وغیرہ کا بائیکاٹ بھی کیا گیا۔ لوگوں نے سرکاری خطابات واپس کر دیئے اور وکلاء نے قانونی پریکٹس کو خیرباد کہہ دیا۔ ان میں سے لالہ دُنی چند انبالوی، مولانا غلام بھیک نیرنگ، بخشی رام کشن، لالہ شام لال (سرسہ) اور لالہ شام لال روہتک قابلِ ذکر ہیں۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں روہتک میں ایک عظیم الشان پولیٹکل کانفرنس ہوئی۔ یہ ایک بڑی تحریک کی پیش خیمہ تھی جو ۱۹۳۰ء میں سارے ملک میں مکمل آزادی کے حصول کے لئے شروع ہونے والی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کانفرنس میں قومی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ پنڈت موتی لال نہرو کی شمولیت نے اس موقعہ کی شان کو دوبالا کیا۔ پنڈت شری رام شرما اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ تھے اور کرسیٔ صدارت پر پنجاب کے مشہور رہنما ڈاکٹر ستیہ پال جلوہ افروز تھے۔

۔ ۔ تحریکِ آزادی ایک فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچی جب لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے زیرِ صدارت یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان نے اب مکمل آزادی ہی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سے کم ہم کسی بھی طرح کی سیاسی رعایتوں کی سودے بازی پر رضامند نہیں ہوں گے۔

مہاتما گاندھی نے مارچ ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی یاترا شروع کی۔ اُن کے جتھے میں ہریانہ سے بھی کچھ ستیہ گرہی شامل ہوئے تھے۔

اپریل ۱۹۳۰ء کے پہلے ہفتے میں گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد تمام ملک میں ستیہ آگرہ کا بگل بج گیا۔ ہریانہ میں بھی اس تحریک نے زور پکڑا۔ ہریانہ کی خواتین نے بھی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نمک بنایا اور جیل جانے والی ان بہنوں میں شریمتی کستوری بائی اور شریمتی مایا دیوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن سمجھوتہ ہوا جس کے تحت ملک بھر میں ستیہ گرہیوں کی جیلوں سے رہائی ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں روہتک میں ایک بھاری جلسہ ہوا جس میں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے عوام سے خطاب کیا۔

۱۹۳۲ء میں تحریک سول نافرمانی پھر شروع ہوئی۔ اس دور کا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ روہتک میں آزادی کے مجاہدوں نے "قومی سرکار" قائم کی۔ پنڈت شری رام شرما ضلع روہتک کے پولیس کپتان بنے اور لالہ شام لال ایڈووکیٹ پبلک کی طرف سے ڈپٹی کمشنر بنائے گئے۔ ۱۹۳۲ء کی تحریک کے بعد ملک میں پارلیمنٹری طریقوں سے آزادی کی جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۳۴-۳۵ء میں ہریانہ میں سنٹرل اسمبلی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات ہوئے جن میں کانگریس کو زبردست کامیابی ملی اور قومی تحریک کا دیہات میں خوب پرچار ہوا۔ پنڈت نیکی رام شرما کی زیرِ قیادت لوہارو، جیند، پٹودی اور دوسری دیسی ریاستوں میں پرجا منڈل کی تحریک نے زور پکڑا۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت تمام صوبوں میں انتخابات ہوئے۔ اور صوبائی خود مختاری کا دور شروع ہوا۔ اس طرح قومی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ لیکن پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے حکومت بنائی۔

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ ان حالات میں کانگریس کی سرکاروں نے استعفے دے دیئے اور برٹش امپیریلزم کے خلاف جدوجہد شروع کی جو کہ بعد میں "بھارت چھوڑو" کی شکل اختیار کر گئی۔ ۱۹۴۲ء کو "بھارت چھوڑو تحریک" میں ہریانہ کے دیش بھگتوں کو پنجاب کی ملتان اور میانوالی جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ جہاں انہیں مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی دیش بھگت شہید بھی ہوئے۔ ان میں سے کرنال کے مان سنگھ راہی کرنال ہی سے کامریڈ سروپ چند۔ ریواڑی کے ڈاکٹر ستیہ نارائن کو لوگ اب تک بھی ادب اور احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ "بھارت چھوڑو" تحریک (اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۴ء) تک ہریانہ میں چار ہزار سے زائد قومی کارکن گرفتار ہوئے۔ ان لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر جنتا میں جوش پیدا ہوا اور نتیجتاً ہریانہ میں بھی توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہوئیں۔ چار ریلوے اسٹیشن جلا دیئے گئے۔ اور گیارہ ڈاکخانوں کو نقصان پہنچا بہت سے مقامات پر ٹیلیفون یا ٹیلیگراف کے تار کاٹے گئے۔

"بھارت چھوڑو" تحریک کے بعد ہندوستان میں آزادی کا آفتاب دکھائی دینے لگا۔ لڑکھڑاتی ہوئی انگریزی حکومت کو آخری دھکا نیتا جی سبھاش چندر بوس اور اُن کی آزاد ہند فوج کے حملوں اور بمبئی کی بحری فوج کی بغاوت سے لگا۔ ۲۷۰۰ سے بھی زیادہ ہریانوی سپاہیوں اور افسروں نے آئی۔ این۔ اے میں شمولیت اختیار کی۔ اس میں سے ۳۴۰ نیتا جی کی زیرِ کمان مختلف مورچوں پر انگریزی راج کے خلاف لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

یہ ہے مختصر سی تاریخ، حصولِ آزادی کے لئے جدوجہد کی۔ اس میں ہریانہ کا اہم حصہ ہے۔ لیکن ہندوستان کے سارے اتہاس کے پس منظر میں ہی ہریانہ کی مخصوص انفرادیت اجاگر ہوتی ہے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کیسے بھی واقعات ہوں اُن سب میں ایک ہی بنیادی اندازِ فکر کام کرتا ہے کہ ہم سب ایک ہیں اور ہمارا قومی اتحاد ناقابلِ تسخیر ہے۔ ●........

اور چبھن ختم ہوئی

ایاز نظر

میں نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا اٹھا کر رضیہ کے دالان کا جائزہ لیا۔ ندرت اب بھی وہیں بیٹھی رضیہ سے باتیں بنا رہی تھی۔ اسے وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا احساس تھا شدید احساس! مگر میری یہ بے اعتنائی کوئی بے وجہ تو نہ تھی۔

ندرت کافی دیر پہلے میرے کمرے پر آئی تھی۔ مگر دروازے پر لگا تالا دیکھ وہ اپنی عادت کے مطابق رضیہ کے گھر جا کر میری راہ تکنے لگی۔ رضیہ بھی میری طرح اس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ رضیہ جانتی تھی کہ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں۔ میرے کمرے کے دروازے پر تالا رضیہ کے بھائی رضی نے ہی ڈالا تھا۔ میرے کہنے پر۔ میں یہ حرکت پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ میری اس حرکت کا مطلب ندرت سے گریز کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں ندرت سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ندرت نے میرا قد چھوٹا کر رکھا تھا۔ ندرت جو مجھے بونا بنائے دیتی تھی۔ ندرت جو میری شریکِ حیات بننا چاہتی تھی اور میں، جو ندرت کے سائے سے بھی خوف کھاتا تھا۔ ندرت جو مجھ سے پیار کرنے کی دعویدار تھی۔ اور میں جو ندرت سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ندرت جو میرے پڑوس میں بیٹھی میری منتظر تھی اور میں جو اپنا ہی قیدی بنا ہوا تھا۔

وہ مجھ سے پوچھتی۔ "تم نے کیا سوچا؟" میرا جواب یقینی طور پر اس کے حسبِ منشا "ہاں" تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس سے شادی کرنے پر کیسے تیار ہو جاتا۔ مجھے تو اس سے نفرت تھی۔ شدید نفرت! اتنی نفرت جتنی بلی سے چوہے کو ہوتی ہے جتنی مہاتما گاندھی کو تشدد سے تھی۔

ندرت کبھی میری کلاس فیلو تھی اور آج وہ مجھے لیکچر دیتی ہے۔ میں دو سال فیل اور تیسرے سال پاس ہونے کا ریکارڈ بنا رہا تھا۔ اس طرح جب میں ایم۔ ایس۔ سی پارٹ ٹو میں پہنچا تو وہ کیمسٹری کی لیکچرر تھی۔ اب بھلا میرا اس کا کیا جوڑ۔۔؟ چلو مان لیا ہم دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ مگر کتنا فرق تھا دونوں کے درمیان؟ کتنا فاصلہ تھا دونوں کے بیچ۔۔؟ ایک گھسٹتا ہوا اسٹوڈنٹ۔۔ ایک آگے بڑھتی ہوئی لیکچرر۔۔ پھر دونوں کے نظریات میں بھی تو کتنا فرق تھا۔۔!

میں جب ہائی اسکول کی طرح انٹر میں بھی دو سال فیل ہوا تو ندرت نے مجھ سے اپنی عادت کے مطابق بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا۔ "پھر فیل ہو گئے۔ ویسے تو بڑے تیس مار خاں بنتے تھے"۔۔ "پھسڈی" تو اس نے میرا نام رکھ دیا تھا۔ بہت

دنوں تک جب کہیں ملتی یہی کہتی "کس حال میں ہو پھسڈی!"

اور پھر یوں ہوا کہ جب بھی میں اسے دیکھتا احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو بونا محسوس کرنے لگتا۔ اور میری حالت کا مذاق اڑاتی۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی۔ یہیں سے مجھے ندرت سے نفرت ہونے لگی اور نفرت کی یہ خلیج دن بہ دن گہری ہوتی چلی گئی۔

میں نے پھر کھڑکی سے جھانکا۔ اب ندرت دکھائی نہیں دی۔ میں نے رضی کو کھڑکی سے آواز دی۔ اس نے آکر دروازے پر سے تالا کھولا۔

رضی کے جانے کے بعد میں آرام کرسی پر گر گیا۔ میں نے ندرت کے خیال سے اپنے ذہن کو صاف کرنا چاہا مگر رہ رہ کر اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

جب میں انٹر میں تھا تو ندرت بی ایس سی کر رہی تھی۔ یہ تب کی بات ہے میں ایک روز اپنے کمرے میں بیٹھا ایک ادبی رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک ندرت آگئی۔ شلوار سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں کورس کی کتابیں اٹھائے۔ دیر تک وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھی اور میرے ہاتھ سے رسالہ لے لیا۔ پھر وہ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا مجھے۔ کتنا اپناپن تھا اس کے اس انداز میں — وہ میرے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولی

"تم رسالے نہ پڑھا کرو"

"کیوں" میں نے پوچھا۔

"تم پچھلے سال بھی رسالے زیادہ پڑھتے تھے اور کورس کی کتابیں کم۔ اسی لئے تو تم فیل ہو گئے۔"

بس ایک دم نہ جانے کہاں سے آگیا بونا پن مجھ میں۔ سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ پورا جسم اندر ہی اندر کپکپانے لگا۔ میں نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا دیا۔ میرے اس اچانک بدلتے رویے سے وہ چونک گئی پھر ذرا فاصلے پر پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں اٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھا تو میں چلتی ہوں۔ لو یہ کیمسٹری کی کاپی رکھ لو تمہیں کام دے گی۔ نوٹس یاد کر لینا" وہ کاپی سامنے ڈال کر چلی گئی میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں وہیں بیٹھا رہا پتھر کے بت کی طرح۔ نہ جانے کتنی دیر — جب میں کچھ سنبھلا تو اس کی دی ہوئی کاپی دیکھنے لگا۔ کاپی کے اندر ایک خط رکھا ہوا تھا۔ ایک خوشبودار خط، خط کو پڑھا وہی روایتی خط، محبت کا رونا۔ میں نے اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

میں اپنی روایت کے مطابق دوسرے سال بھی فیل ہو کر تیسرے سال انٹر میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ سب ہی خوش تھے لیکن ایسی ہی خوشی تھی سب کے چہروں پر جیسے کسی ساٹھ سالہ بوڑھے کی شادی پر اس کے ہم عمروں کو ہوتی ہے۔ مگر میرے پاس ہونے پر ندرت کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر میرے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ دیکھ کر میں جل بھن کر راکھ ہو گیا۔ میں نے سوچا یہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر میرا مذاق بنانے آئی ہے۔ مٹھائی کے ڈبے میں مٹھائی کے دانے نہیں بلکہ پتھر کے ٹکڑے ہیں جو مجھے مارنے کیلئے لائے گئے ہیں۔

دیر تک وہ کھڑی رہی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ وہ مجھے گھورتی رہی۔ بڑی پیار بھری نظروں سے پھر بولی۔

"مبارک ہو، تم پاس ہو گئے مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن دو سال کا کام تم چار سال میں کرتے ہو خیر کوئی بات نہیں۔ اب محنت کرو۔ بی۔ ایس سی انٹر سے بھی مشکل ہے۔"

اور پھر میں محسوس کرنے لگا بونا پن ..... جس میں تھی سوئیوں کی چبھن اور ایک شدید کپکپاہٹ۔

وہ اب بھی بول رہی تھی لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ اور چھوڑ گئی مٹھائی کا ڈبہ جو میز پر رکھا تھا اور جسے دیکھ کر مجھے عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ ایک خوف سا طاری تھا جیسے وہ مٹھائی کا ڈبہ نہ ہو کر کوئی بم ہو جو بس پھٹنے ہی والا ہو اور مجھے و میرے جیتے جاگتے چلتے پھرتے جسم کو گوشت کے لوتھڑوں میں تقسیم کرنے کی فکر میں لگا ہو تبھی دروازے پر فقیر نے صدا لگائی "جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا" میں نے اس مٹھائی کے

ڈبے سے نجات حاصل کرلی۔ ڈبہ ویسے ہی اٹھا کر فقیر کو تھما دیا تب کہیں جاکر جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ فقیر لوٹ کر آیا اور ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما کر یہ کہتا ہوا چلا گیا "بابوجی یہ لفافہ مٹھائی کے ڈبے میں تھا۔ میں نے سوچا شاید آپ کے کسی کام کا ہو۔"

اب میرے ہاتھ میں تھا ایک خوشبودار لفافہ۔ ایک محبت نامہ۔ مجھے لگا جیسے کسی نے چھپکلی کا بچہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہے۔ میں نے گھن سی محسوس کرتے ہوئے گھبرا کر لفافہ بنا کھولے ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اس کے بعد بھی نہ جانے کتنے خط آئے لیکن میں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا لیکن ہر خط مجھے سونپ جاتا اور زیادہ بونا پن......اور زیادہ چبھن......اور زیادہ کپکپاہٹ۔

وقت گذرتا گیا۔ میں شعر و شاعری کی دنیا میں آگیا تھا۔ رسائل و اخبارات میں میرا کلام شائع ہونے لگا۔ مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ شروع ہوا رہی۔ ایس سی۔ پر لویس کا فارم بھرا۔ ریکارڈ کے مطابق فیل ہوا۔ دوسرے سال فارم نہ بھر سکا۔ مشاعرہ بازی نے فرصت ہی نہ دی۔

کچھ دنوں میں ایک کافی ہاؤس میں ندرت سے ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی پوچھ بیٹھی "کیوں؟ کیا بالکل ہی ہمت ہار گئے؟ فارم بھی نہیں بھرا۔ کوئی پریشانی تھی تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔"

"میں فارم بھروں یا نہ بھروں تم سے کیا مطلب؟" میرے لہجہ کا کڑوا پن اگرچہ اس کیلئے نیا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ میرے جواب پر دم بخود رہ گئی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی پھر کافی ہاؤس سے میرے ساتھ ہی اٹھی۔ تھوڑی دور تک خاموشی سے ساتھ چلتی رہی پھر ایک گلی کے موڑ پر رکتی ہوئی بولی۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں مگر ایک بات مزید پوچھوں گی بی۔ ایس سی کتنے سال میں پاس کرنے کی پلاننگ ہے۔؟"

میں چپ رہا۔ وہ کچھ دیر میرے جواب کا انتظار کر کے چلی گئی مگر میرے لئے چھوڑ گئی — وہی بونا پن......وہی چبھن......وہی کپکپاہٹ......اور میں گھبرا کے آگے بڑھ گیا۔

پھر ندرت سے کئی سال تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کا خیال بھی میرے ذہن سے محو ہوتا گیا۔ اگر کبھی آیا بھی تو کچھ اس طرح جیسے بچپن میں ایک چھپکلی پیٹھ پر گری اور بھاگ گئی۔

لیکن آج اچانک وہ کلاس میں آگئی۔ سب ہی اسٹوڈنٹ اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ مجھے بھی مجبوراً کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے احترام میں جو کبھی خود میرے سامنے کھڑی ہوتی تھی دوسروں کا احترام کرنے کیلئے — مجھے کھڑا ہونا پڑا اس کے احترام میں جو مجھے محبت نامے لکھا کرتی تھی، جن کا جواب دینا مجھے کبھی گوارا نہ ہوا۔ مجھے کھڑا ہونا پڑا اس کے احترام میں جسے میں نفرت کرتا تھا۔

ادھر وہی بونا پن — وہی چبھن — وہی کپکپاہٹ جو گذشتہ چند سالوں سے میرا پیچھا چھوڑ چکی تھی دوبارہ مجھ پر مسلط ہو گئی۔ اور جب ندرت نے مجھ پر تیکھی۔ ترچھی نظریں ڈالیں تو سر جھکائے کلاس سے اٹھ آیا اور کنٹین میں جا بیٹھا۔ کافی دیر بیٹھا رہا۔ پیریڈ ختم ہوا تو ندرت بھی وہیں پہنچ گئی۔ جو بونا پن میں کچھ دیر پہلے کلاس میں چھوڑ آیا تھا وہ مجھ پر پھر حاوی ہو گیا۔

ندرت نے کیا کہا۔؟ میں نے کچھ نہیں سنا! میں نے کیا کہا؟ مجھے خود نہیں پتہ۔ اب ندرت مجھے روز ملتی کبھی کلاس میں۔ کبھی ریڈنگ روم میں — اور کبھی کالج کنٹین میں۔ وہ میرے نوٹس دیکھتی اور سرخ سیاہی سے جہاں چاہتی کراس بنا دیتی اور کہتی "محنت کرو محنت" — میرا چہرہ غصہ سے لال ہو جاتا۔

گذشتہ روز اس نے بتا دیا تھا کہ وہ کل میرے گھر آئے گی وہ آج آئی بھی لیکن میں اسے نہیں ملا!

آج کالج میں چھٹی تھی رات کالج میں اردو ایسوسی ایشن کی جانب سے مشاعرہ ہے۔ بڑے زور شور سے تیاریاں چل رہی ہیں۔ میں ذرا ستانے کی غرض سے کالج کنٹین میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ تبھی ندرت وہاں آگئی۔ اسے دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا اور پھر میرے اوپر طاری ہو گیا وہی بونا پن — ندرت کہہ رہی تھی "بیٹھئے جناب، اب ایسا بھی کیا اجنبی پن — ؟" سوئیوں کی چبھن اور کپکپاہٹ مجھے عاجز کئے دے رہی تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں تمہارے گھر گئی تھی مگر باہر تالا لگا تھا۔ کافی دیر تک رضیہ کے یہاں بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا پھر اُس نے کنٹین بوائے کو بلا کر کافی کا آرڈر دیا اور بولی۔

"تم تو بڑے شاعر ہو گئے ہو۔ رسائل میں خوب چھپتے ہو۔ مشاعرے بھی خوب لوٹتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور اپنا پرس ٹٹولنے لگی۔ میں اس سے نظریں بچا رہا کچھ ہی لمحے بعد وہ ایک کاغذ نکالتے ہوئے بولی۔

"میں بھی غزل کہنے لگی ہوں۔"

"اچھا! کب سے؟" میں ایک دم بول اٹھا۔ بونا پن چبھن۔ کپکپاہٹ اب بھی میری جان سے چمٹے تھے۔

"جب سے تم نے خط کا جواب نہ دینے کی قسم کھائی ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پرس سے نکالا ہوا کاغذ میری جانب بڑھایا۔ "ذرا اس کی نوک پلک تو درست کر دو۔ میں بھی آج پروگرام میں غزل پڑھوں گی۔"

"میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا۔ غزل پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ تقریباً سبھی مصرعے بے بحر تھے۔ نہ کوئی وزن۔ نہ نیا خیال۔ میں نے جیب سے لال پین نکالا اور پوری غزل پر ایک کراس بناتے ہوئے بالکل اُسی کے انداز میں کہا۔ "محنت کرو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے لگا جیسے سارا بونا پن۔ ساری چبھن، ساری کپکپاہٹ اپنے آپ غائب ہو گئی ہو۔ ایک دم غائب۔

- تخلیقات بھجواتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔
- تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں
- تبصرے کیلئے کتاب کی دو جلدیں بھجوائیں۔

عبدالنبی خاں کامل

اَے زمینِ وطن

اے زمینِ وطن، اے زمینِ وطن
دلکشِ باغِ رضواں ترا ہر چمن　　رشکِ فردوس ہیں تیرے دشت و دمن
تجھ کو جھک جھک کے چومے نہ کیونکر گگن

تیرے دامن میں امرت کے دریا رواں　　سلسلے کوہ کے نازشِ آسماں
سنگ ریزے بھی تیرے ہیں لعلِ یمن

تیرے دہقاں حوادث کے پالے ہوئے　　خود کو محنت کے سانچے میں ڈھالے ہوئے
جن کے دم سے ہے گلپوش کوہ و دمن

آ گئی تجھ پہ جب کوئی مشکل گھڑی　　اور تجھ کو ہماری ضرورت پڑی
ہم صف آرا ہوئے سر سے باندھے کفن

فتنہ گر بیج فتنوں کے بوتے رہے　　ظلم اپنوں کے ہاتھوں بھی ہوتے رہے
پھر بھی آئی نہ ماتھے پہ تیرے شکن

اپنی شانِ شجاعت دکھاتے ہوئے　　برف کی گود میں مسکراتے رہے
تیرے سینک پہاڑوں پہ تیرے جیالے زناں

سربکف سرحدوں پر بہادر جواں　　یہ محافظ ترے یہ ترے پاسباں
ان پہ قربان کامل کا ہر بانکپن
اے زمینِ وطن، اے زمینِ وطن

نام کتاب : پیاسے لوگ
مُصنف : ممتاز شارق
ناشر : ادارہ "بزم" آزاد نگر۔ جمشید پور ۸۳۲۱۱۰ (بہار)
قیمت : مجلّد۔ دس روپے۔ غیر مجلّد آٹھ روپے

"پیاسے لوگ" پندرہ افسانوں کا ایک مختصر مگر دِل چسپ مجموعہ ہے۔ اس میں مصنّف نے عوامی زندگی کے کرداروں کی عکاسی اپنے منفرد اور اچھوتے انداز میں کی ہے۔ ان کہانیوں کا موضوع۔ زندگی کے وہ عام واقعات ہیں۔ جن سے انسان تقریباً ہر روز دوچار ہوتا ہے۔ لیکن ان عام واقعات کی حقیقت۔ اصلیت اور اہمیت کا احساس۔ اور زندگی پر ان کے تاثر کا شعور ان کے مطالعہ سے ہی بیدار ہوتا ہے شارق کی کہانیوں کے کیریکٹر اکثر و بیشتر وہ عوام ہیں۔ جو گلی کوچوں۔ کارخانوں۔ دفتروں۔ وغیرہ میں ملتے ہیں۔ جن کے مصنوعی چہروں کو شارق نے بے نقاب کرکے ان کے کریہہ المنظر خاکوں کو عیاں اور اس طرح موجودہ نام نہاد مہذب معاشرہ اور بظاہر غازہ و غمزہ سے درخشاں زندگی کے پس پردہ گھناؤنے ماحول کو منکشف کیا ہے۔ شارق نے اپنی کہانیوں میں گدا گروں سے لے کر مذہب اور روحانیت کے اجارہ داروں اور معمولی ملازموں سے افسروں تک کے حقیقی کرداروں سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جیسے نظام میں جو چیز کی لعنت عام ہے۔ لیکن یہ بات کس حد تک ہمارے معاشرہ میں سرایت کر چکی ہے۔ اس کا احساس اور اندازہ "پیاسے لوگ" میں چھپی پہلی کہانی "نشتر" کے مطالعہ سے ہوگا۔ کشمکشِ حیات میں جابریت اور استحصال کی کارفرمائی۔ مذہبی تنگ نظری اور موجودہ مشینی دور کی نفسانفسی ان افسانوں میں واضح ہے۔ جو شعورِ انسانی پر تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔

"پیاسے لوگ" کے افسانے جواں سال افسانہ نگار کے گہرے مشاہدہ۔ حساس طبع اور اس کے حسنِ بیان کے شاہد ہیں۔ زبان سادہ اور دلکش ہے۔ افسانوں کا غیر معمولی اختصار۔ جس میں تغزل بیت کو بھی پوری طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ اس مجموعہ کا طرۂ امتیاز ہے مثلاً "چراغ تلے" محض ایک صفحہ میں محیط ہوتے ہوئے بھی نہایت جامع اور معیاری تخلیق ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کی کتابت اور طباعت پر پوری توجہ نہیں دی گئی۔

—— ہر دیال شوق



"تعمیر" کے شمارے پابندی سے مل رہے ہیں۔ تازہ شمارہ (جون ۸۶ء) بھی مندرجات کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ کئی چیزیں بطور خاص پسند آئیں۔ زاہدہ زیدی کی تعزیتی نظم بہت ہی پرتاثیر ہے انہوں نے خواجہ صاحب کے تعلق سے اپنی ساری عقیدت اور غم بڑے ہی فنکارانہ انداز میں اس نظم میں سمو دیا ہے۔ دوسری چیز ابراہیم یوسف کا مضمون ہے۔ ڈرامے سے متعلق اس مضمون کو سرسری نہیں کہا جا سکتا۔ باقی جیسے شاعر پر لکھنے کے لیے بڑے ہی ادراک اور خلاقانہ ذہن کی ضرورت ہے۔

فاروق شفق (کلکتہ)

"تعمیر" جون ۸۶ء پیش نظر ہے۔ خوشی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ "تعمیر ہریانہ" کا ایک منفرد مزاج و معیار بنتا جا رہا ہے۔ یہ خوبی دوسرے سرکاری رسالوں میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔
اس بار افسانوں کا ایک خوشگوار انتخاب ہے۔ افسانہ "گرفتارِ بلا" "روشنی روشنی" اور "خانے تہہ خانے" جدید اشاراتی / استعاراتی کہانیاں ہیں۔ کچھ ہلکی پھلکی تفریحی تخلیقات بھی شامل ہیں

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "تعمیر ہریانہ" ہر مکتبۂ فکر و خیال میں مقبول ہے۔ ترتیب میں جو توازن ہے وہ آپ کی مدیرانہ صلاحیت کا عکاس ہے۔

رفیع حیدر انجم (پورنیہ)

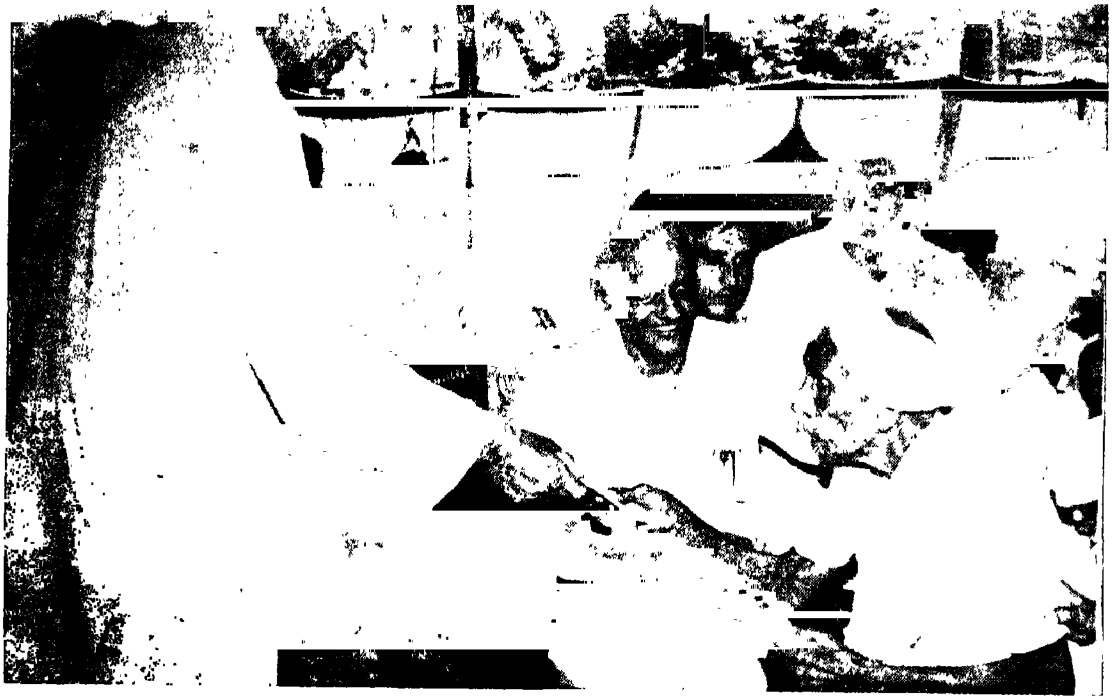
اس شمارہ کی جان محترم ابراہیم یوسف صاحب کا تحقیقی مقالہ "اردو ڈرامے میں لیلیٰ مجنوں کی روایت" ہے۔ اس معلومات افزا مقالہ کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ افسانوی حصہ جاندار ہے۔
زاہدہ زیدی نے بڑے ہی بھرپور انداز میں خواجہ احمد عباس کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ قمر جلال آبادی، حافظ سہارنپوری، طلعت عرفانی کی غزلوں میں کیف و اثر ہے۔

محمد خضر حیات (ناگپور)

دس برسوں سے "تعمیر ہریانہ" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ تازہ شمارہ جون [illegible] ہاتھوں میں ہے۔ شعری حصے میں قمر جلال آبادی، بادا کرشن گوپال مغموم، انجم عرفانی، طلعت عرفانی اور رونق شہری قابل تعریف ہیں۔ نثری حصے میں "اردو ڈرامے میں لیلیٰ مجنوں کی روایت" اور "جدید اردو غزل اور باقی" بہترین اور معلوماتی ہیں۔ افسانے اچھے لگے۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے۔

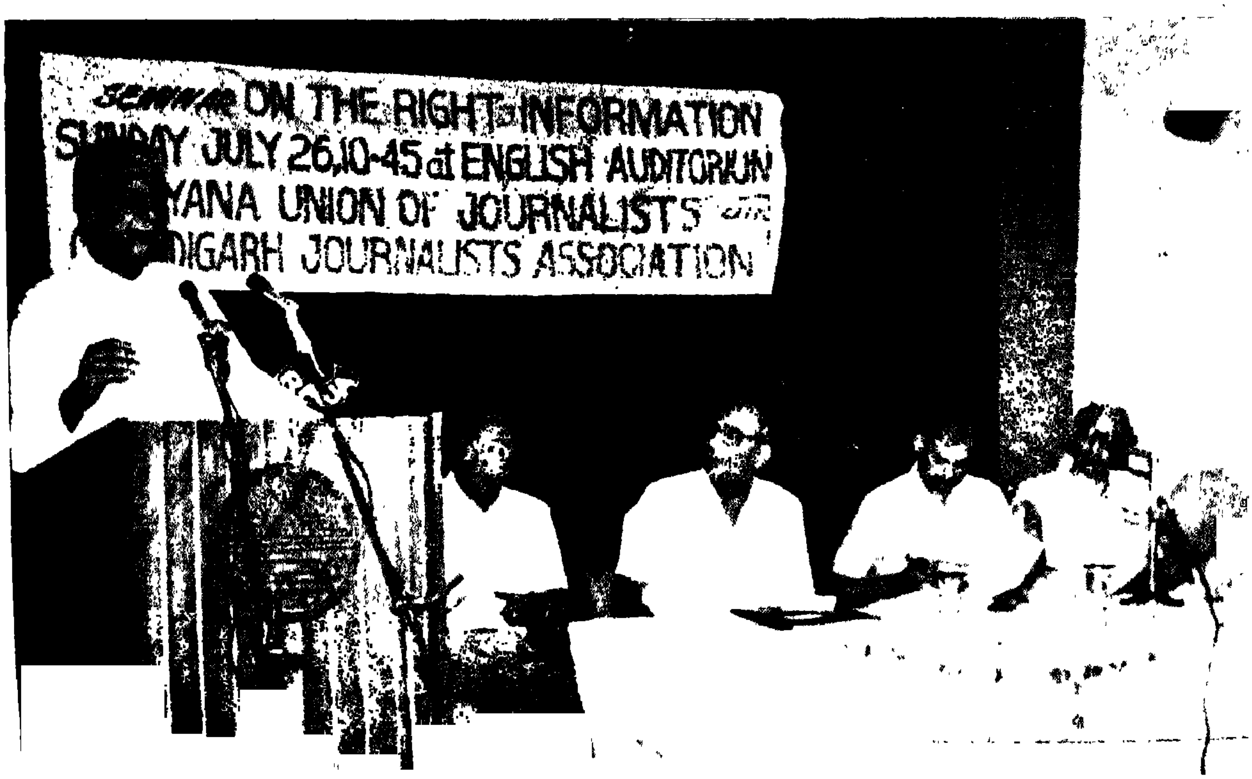
اسلام شاہی (بھاگلپور)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر این۔ کے۔ جین نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او ۱۰۹–۱۱۰ سیکٹر ۱۷۔سی، چنڈی گڑھ سے اگست ستمبر ۸۶ء کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ



یکم اگست ۱۹۸۷ء کو پپلی (ضلع کوروکشیتر) میں منعقدہ ایک تقریب میں ضعیفوں کو
پنشن دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ ہریانہ، عالیجناب دیوی لال

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال، ہریانہ یونین آف جرنلسٹس اور چنڈی گڑھ جرنلسٹس ایسوسی ایشن
کے باہمی اشتراک سے ۲۶ جولائی ۱۹۸۷ء کو چنڈی گڑھ میں منعقدہ ایک سیمینار
"دی رائٹ ٹو انفارمیشن" کا افتتاح فرماتے ہوئے۔





وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء کو سنیہت سرووَر کوروکشیتر
میں جل پرواہ کرتے ہوئے ۔

عالیجناب دیوی لال، وزیر اعلیٰ ہریانہ ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء کو کوروکشیتر میں ریلوے اوور برج کا
افتتاح فرماتے ہوئے ۔



22 DEC 1977





گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی ۲ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو گاندھی جینتی کے موقع پر
بابائے قوم مہاتما گاندھی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

گورنر ہریانہ عزت مآب سید مظفر حسین برنی اور وزیراعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۲ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو
ہریانہ وزارت میں شامل ہوئے نئے وزراء (بائیں جانب سے) جناب بلبیر سنگھ، محترمہ کملا ورما، جناب نر سنگھ،
جناب مہا سنگھ، جناب نربیر سنگھ اور جناب خورشید احمد کے ساتھ۔



آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۷ء شمارہ ۱۱-۱۰ جلد ۱۵

مدیر اعلیٰ

این کے جین

مدیر

سلطان انجم

سرورق: امرول

فی شمارہ ——— پچاس پیسے
اس شمارہ کی قیمت ——— ایک روپیہ
زر سالانہ ——— پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او نمبر ۱۹۱-۱۸۹
سیکٹر ۱۷ سی۔ چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں

ترتیب

۱۰۰ دن : نئے ریکارڈ

موجودہ حکومت نے سودنوں میں یہ ثابت کردیا ھے کہ اس کے قول اور عمل میں یکسانیت ھے۔ وزیرِ اعلیٰ عالیجناب دیوی لال نے رائے دھندگان سے جتنے بھی اھم وعدے کئے تھے، وہ تمام نہ صرف اس مختصر سے عرصہ میں پورے کردیے ھیں بلکہ سرگرم عمل ھوکر مستعد اور پاک صاف انتظامیہ کی نظیر قائم کی ھے۔ قابلِ ذکر حصولیابیاں مندرجہ ذیل ھیں :

- سرکار نے چھوٹے کسانوں، چھوٹے دوکانداروں، دیہی دستکاروں، بے زمین مزدوروں اور غریب لوگوں کے ۲۲۷٫۵۱ کروڑ روپے کے قرضے معاف کرکے ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے لیے بھی ایک نظیر قائم کی ہے۔ اس سے قرض کے بوجھ تلے دبے ۷ لاکھ ۸۴ ہزار لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔
- کھیت کے بالکل ساتھ اُگے درختوں کی اوّل قطار کی فروخت سے ہونے والی آمدنی میں سے ۵۰ فیصد رقم مالکانِ اراضی کو دی جاتے گی۔ تاکہ ایسی شجرکاری سے ہوئے نقصان کی تلافی کی جا سکے۔
- نوکری کے لیے انٹرویو پر جانے والے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کرنے کی سہولت دی گئی ہے۔
- موجودہ سرکار نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد ۱۷ رجون ۱۹۸۷ء کو ۶۵ برس کے ہو جانے والے ضعیفوں کو سو روپے ماہانہ کے حساب سے "بڑھاپا پنشن" دی ہے۔ ان سو دنوں میں ایسے ۵ لاکھ ۸۲ ہزار افراد کی پنشن منظور کی گئی ہے۔ ہریانہ ملک کی اوّلین

ریاست ہے جہاں بڑھاپا پنشن اسکیم جاری ہے۔

- حکومت ہریانہ نے خشک سالی سے پیدا شدہ حالات کا سامنا کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے ہیں۔ جوہڑوں اور تالابوں میں پانی ڈلوایا گیا ہے۔ مویشیوں کے چارے کے لیے انتظامات کیے گئے ہیں۔ باہر سے چارہ خرید کر لانے کا کرایہ حکومت خود ادا کر رہی ہے۔
- تقاوی اور آبیانہ کی وصولی ملتوی کر دی گئی ہے۔ فصلِ ربیع کے لیے کسانوں کو بیجوں پر ۲۵ فیصدی سبسڈی دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔ ربیع کے لیے کسانوں میں ۱۵۴٫۵۰۰ کوئنٹل بیج اور ۲٫۸۹٫۰۰۰ ٹن کھاد تقسیم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔
- ستلج یمنا لنک نہر کی تعمیر کو جلد از جلد مکمل کرانے کے لیے مرکزی حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اپنی کسی ایجنسی سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء تک اس نہر کی تعمیر مکمل کرا دے اور ہریانہ کو اس کے حصے کا پورا پانی دے۔
- خشک سالی سے نپٹنے کے لیے گذشتہ تین ماہ میں ۷۰۰۰ ٹیوب ویلوں کو کنکشن دیے گئے ہیں ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے ٹیوب ویلوں کو نئے کنکشن دینے کا نشانہ ۲۰٫۰۰۰ سے بڑھا کر ۲۵٫۰۰۰ کر دیا گیا ہے۔
- نہروں میں ان کی مقررہ صلاحیت سے زیادہ پانی چھوڑا گیا ہے تاکہ نہر کے آخری کنارے تک پانی پہنچ سکے۔
- جون، جولائی اور اگست ۱۹۸۷ء میں روزانہ بالترتیب ۱۶۳ لاکھ یونٹ ۱۹۳ لاکھ یونٹ اور ۲۰۱ لاکھ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی جبکہ گذشتہ سال اتنے وقت میں بالترتیب ۱۲۳ لاکھ یونٹ، ۱۵۲ لاکھ یونٹ اور ۱۶۸ لاکھ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی تھی۔
- دیہی علاقوں میں جون، جولائی اور اگست ۱۹۸۷ء میں ۱۱ سے ۱۲ گھنٹے تک بجلی سپلائی کی گئی جبکہ پچھلے برس اتنے عرصے میں ۶ سے ۱۰ گھنٹے ہی بجلی سپلائی کی گئی تھی۔
- خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کا انتظام کرنے کے لیے راحت کے فوری اقدامات کی صورت میں کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ واٹر سپلائی اسکیموں میں اضافہ کی غرض سے ۱۹۰ لاکھ روپے الاٹ کیے گئے ہیں اور دیہی علاقوں میں مزید ۵۴ ٹیوب ویلوں کی کھدائی کی جا رہی ہے، شہروں کے لیے ۱۰۰ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔
- سرکاری محکموں میں بھرشٹاچار کے معاملوں میں گرفت پر فوراً کارروائی کرنے کے لیے تمام محکموں میں فلائنگ اسکواڈ قائم کیے جا رہے ہیں۔ انٹی کرپشن اقدامات کے موثر طریقے سے نفاذ کے لیے وزیرِ اعلیٰ کی صدارت میں انٹی کرپشن بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

موجودہ سرکار عوامی رہنما وزیرِ اعلیٰ عالیجناب دیوی لال کی مربیانہ قیادت میں سماجی و اقتصادی حالات کو بدل کر کسانوں، بے زمین مزدوروں، دستکاروں اور غریب عوام کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے پُرعزم ہے۔

OO

یومِ ہریانہ پر خصوصی

پیغام

سیّد مظفّر حسین برنی

گورنر ہریانہ

میں ۲۲ ویں یومِ ہریانہ کے مبارک موقع پر ریاست کے تمام باشندوں کو اپنی دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں ۔ آج ہمیں ہریانہ کو عوام کی توقعات اور خوابوں کے مطابق اور زیادہ خوشحال و ترقی پذیر بنانے کے حلف کو دوہرانا ہوگا۔

۲۱ سال کے مختصر عرصے میں ہریانہ نے سماجی و اقتصادی محاذ پر بے حد ترقی کی ہے۔ بدقسمتی سے ریاست کو بدترین خشک سالی اور قحط کا سامنا ہے۔ ایسے حالات میں خشک سالی سے متاثرہ عوام کے دکھ درد کو کم کرنا حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔ لہٰذا خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے فوری قدم اٹھائے گئے ہیں اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں مویشیوں کے لیے چارہ اور پینے کے پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا ہے قحط زدہ علاقوں کے کسانوں کو راحت پہنچانے کی غرض سے وہاں آبیانہ اور تقاوی کی وصولیابی فوراً روک دی گئی ہے۔ قلیل المدّتی قرضوں کو وسط المدّتی قرضوں میں تبدیل کیا گیا ہے اور ان کسانوں کو فصلِ ربیع کے بیج پر ۲۵ فیصد سبسڈی بھی دی گئی ہے۔

مزید برآں اس وقت ریاستی حکومت کی پوری قوّت اس بدترین خشک سالی کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ ریاست میں مختلف سماجی و اقتصادی ترقیاتی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ جن سے چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں، دستکاروں، درج فہرست اور پسماندہ طبقات کے عوام کو خاص طور پر فائدہ ہوا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ ہریانہ کے محنت کش عوام اس بدترین قحط پر بھی قابو پالیں گے۔ میں انھیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اس آفت سے نجات دلانے کے لیے انھیں ہر ممکن راحت دے گی۔ امید ہے کہ ہریانہ کے لوگ آپسی بھائی چارے اور اتحاد کی عظیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کو متحد اور مستحکم بنانے میں دل و جان سے تعاون دیں گے۔

میں اہالیانِ ہریانہ کے روشن مستقبل کے لیے ایک بار پھر اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ہریانہ کی بدلتی ہوئی تصویر



دیوی لال
وزیر اعلیٰ ہریانہ

آج ہریانہ کو ملک کی ریاستوں کی صف میں شامل ہوئے ۲۱ سال پورے ہو چکے ہیں۔ ہریانہ کا قیام محض ایک اتفاق نہیں تھا بلکہ اہلِ ہریانہ کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سخت جدوجہد اور معرکہ آرائی کرنی پڑی۔ اُن کے خوابوں میں ایک ایسی ریاست کا تصور تھا جس کو وہ اپنی ریاست کہہ سکیں اور اپنی سماجی، ثقافتی اور باہمی اتحاد و اخوت کی مشترکہ وراثت کی پاسبانی کر سکیں۔

قیام ہریانہ کے وقت ریاست کی حالت اس قدر بہتر نہیں تھی۔ یہاں بے حد غریبی اور پسماندگی تھی۔ اس کے علاوہ تعلیم کی بھی یہاں بہت کمی تھی۔ تاہم مقدس گیتا کی اس پاک سرزمین کے باشندوں کا "کرم" (عمل) میں یقین ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہریانہ ابتدا سے ہی میدانِ عمل کے طور پر معروف ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اس صورتحال کے چیلنج کو قبول کیا۔ وہ مقدس گیتا کے اُپدیشوں کی روشنی میں صدیوں پرانی مفلسی اور پسماندگی کے خاتمہ کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۲۱ سال کے اس قلیل عرصے میں ہریانہ نے بے نظیر ترقی کر کے ملک کی دیگر ریاستوں کے لیے ایک

مثال قائم کی ہے۔ آج کے اس جدید دور میں بھی حق و باطل کی معرکہ آرائی میں سچائی کی جیت ہوتی ہے۔ اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں لوک دل ۔ بھارتیہ جنتا پارٹی محاذ کی شاندار کامیابی اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

موجودہ سرکار کو اپنی ذمہ دار سنبھالے ہوئے بمشکل چار ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے۔ اس مدت میں اس کی حصولیابیاں نہایت اہم ہیں۔ حکومت ذات پات سے قطع نظر سماجی و اقتصادی انصاف پر مبنی ایک ایسے سماج کی تعمیر کی خواہاں ہے جس میں سبھی کو زندگی کرنے کے یکساں مواقع اور حقوق حاصل ہوں۔

ضعیفوں، غریبوں، ضرورت مندوں اور پسماندہ لوگوں کی دیکھ بھال ہمارا اہم ترین مقصد ہے۔ ضعیفوں کے لیے بڑھاپا پینشن سکیم کا اجراء حکومت کے اس عزم کا اوّل قدم ہے۔ ۱۷ جون ۱۹۸۷ء کو ہریانہ ملک کی پہلی ریاست بن گئی ہے جہاں ۶۵ سال عمر کے تمام ضعیفوں کو ۱۰۰ روپے ماہانہ پینشن دی گئی ہے۔ اس اسکیم سے ۶ لاکھ ۲۰ ہزار سے بھی زیادہ معمر مرد، عورتیں فائدہ اُٹھائیں گے۔ اس اسکیم کے تحت ان میں ۶۰ کروڑ روپے سالانہ تقسیم ہوں گے۔ پینشن اسکیم کو نہایت آسان بنادیا گیا ہے۔ پینشن حاصل کرنے والوں کو اب ان کے گھر پر ہی منی آرڈروں سے رقم بھیج دی جاتی ہے۔

بینکوں کے قرضے معاف کرنا میری سرکار کا ایک اور تاریخی قدم ہے۔ انتخابات کے وقت رائے دہندگان سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرتے ہوئے ہم نے ۲۲۷ کروڑ ۵۱ لاکھ روپے کے قرضے معاف کر دیے ہیں جن سے ۷ لاکھ ۸۳ ہزار چھوٹے کسانوں، دوکانداروں، دیہی دستکاروں، بے زمین مزدوروں اور غریب لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ قرض کے بوجھ تلے دبے یہ لوگ ایک بار پھر اپنے روزگار نئے سرے سے شروع کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

کھیتوں کے بالکل ساتھ لگی درختوں کی اوّلین قطار کی فروخت سے ہونے والی آمدنی کی ۵۰ فیصد رقم زمین کے مالکان کو دی جائے گی تاکہ اس طرح انھیں ہونے والے نقصان کی تلافی کی جاسکے۔

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو نوکری کے لیے انٹرویو پر جانے کے لیے ہریانہ روڈویز کی بسوں۔

میں مفت سفر کرنے کی سہولت دی گئی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں "برابر کی امداد" کی جو اسکیم ہم نے شروع کی تھی اُسے نئی صورت دی جا رہی ہے۔ مقامی باشندوں اور ہریانہ سے باہر رہنے والوں سے اسکول کی عمارتوں، دھرم شالاؤں، مویشیوں کے اسپتال جیسے اداروں کی تعمیر میں مالی تعاون کی اپیل کی گئی ہے۔ وہ لوگ ان اداروں کا نام اپنے عزیزوں بزرگوں کے نام پر رکھنے کے لیے آزاد ہیں۔ سرکار حسب ضرورت اس کام کی تکمیل کے لیے پچاس فیصد "برابر کی امداد" بھی دے گی۔

ہریانہ اس صدی کی بدترین خشک سالی سے دوچار ہے۔ کل ۶۷۳۵ گاؤں میں سے ۶۳۵۱ گاؤں میں قحط جیسے حالات ہیں۔ اس قدرتی آفت کے مقابلہ کے لیے مرکزی حکومت نے صرف ۳۵ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے کی امداد دی ہے۔ ہم اپنے محدود وسائل کے باوجود لوگوں کو راحت پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ مویشیوں کی جان بچانے کے لیے جوہڑوں اور تالابوں میں پانی بھرا جا رہا ہے اور چارا کیندر کھولے گئے ہیں۔ اسی طرح پینے کے پانی کی اسکیم کو مہمیز کرنے کے لیے ۱۹۰ لاکھ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ کسانوں کو مزید راحت دینے کی غرض سے قلیل المدّتی قرضوں کو وسط المدّتی قرضوں میں بدل دیا گیا ہے۔ اور آبیانہ و تقاوی کی وصولی ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ فصل ربیع کے تمام بیجوں پر ۲۵ فیصد سبسڈی دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ کسانوں کو ۲۵ فیصد سبسڈی ربیع کی فصلوں کے لیے ۱،۵۴،۵۰۰ کوئنٹل بیج اور ۲،۸۹،۰۰۰ ٹن کھاد تقسیم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ کسانوں کو ۲۵ فیصد سبسڈی دے کر جراثیم کش ادویات فراہم کرائی جائیں گی۔ ٹیوب ویلوں کو روزانہ ۱۲-۱۱ گھنٹے بجلی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ سال کے دوران ۲۰ ہزار ٹیوب ویلوں کو نئے کنکشن دینے کے نشانے کو بڑھا کر اب ۲۵ ہزار کر دیا گیا ہے۔

قحط سے بُری طرح متاثرہ علاقوں کے بے زمین مزدوروں اور غریب لوگوں کو روزگار فراہم کرانے کے لیے دیہی روزگار اسکیم کو تیز کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اندازہ ہے کہ فصلِ ربیع کے دوران بھی قحط سی حالت بنی رہے گی اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے کسانوں کو چنے، سرسوں اور جو جیسی کم پانی چاہنے والی فصلیں بونے کی صلاح دی گئی ہے۔

ستلج یمنا لنک نہر ہریانہ کے لیے زندگی ہے۔ اس نہر کی تعمیر کا کام ہریانہ کے علاقے میں کافی عرصہ

قبل ہی پورا ہو چکا ہے۔ مگر پنجاب اپنے علاقے میں نہر کی تعمیر کو مکمل کرنے میں بے حد تاخیر کر رہا ہے۔ ہم نے مرکزی حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اس نہر کی تعمیر کو اپنی کسی ایجنسی کے ذریعہ ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء تک ضرور مکمل کرائے اور ہریانہ کو اس کے حصے کا پانی مہیا کیا جائے۔ نہر کی تکمیل کے بعد ہریانہ کے کسانوں کو آبپاشی کے لیے مزید پانی حاصل ہوگا اور ریاست میں ایک زرّیں دور کی شروعات ہو گی۔

بجلی، زرعی پیداوار میں اضافہ، صنعتوں کے فروغ اور دیہی علاقوں کو جدید صورت عطا کرنے میں اہم کردار نبھاتی ہے۔ ہم بجلی کے تمام ذرائع کو موثر بنا کر بجلی کی کمی کو دور کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھا رہے ہیں۔ مغربی جمنا نہر پن بجلی پراجیکٹ کے تیسرے بجلی گھر اور پانی پت تھرمل پاور اسٹیشن کے ۵ ویں یونٹ کے پورا ہونے پر ۲۲۶ میگاواٹ مزید بجلی پیدا ہونے لگے گی۔

پانی پت میں ۲۱۰ میگاواٹ کا چھٹا یونٹ اور تاجے والا ہیڈ ورکس پر مغربی جمنا نہر پن بجلی پراجیکٹ کے آٹھ آٹھ میگاواٹ کے دو یونٹوں والا چوتھا بجلی گھر قائم کرنے کی تجاویز زیر غور ہیں۔ یمنا نگر میں ۱۰۵۰ میگاواٹ کے ایک سُپر تھرمل پاور پراجیکٹ کے قیام کی تجویز بھی زیرِ غور ہے۔ اس کے پہلے مرحلے میں ۲۱۰ - ۲۱۰ میگاواٹ کی دو یونٹیں ہیں جن پر کام شروع ہو چکا ہے۔ دوسرے مرحلے میں ۲۱۰ - ۲۱۰ میگاواٹ کی دو یونٹیں ہوں گی اور تیسرے مرحلے میں ۲۱۰ میگاواٹ کی ایک یونٹ کا قیام زیرِ غور ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمام ذرائع کو بروئے کار لا کر مانگ اور سپلائی کی درمیانی خلیج کو ایک حد تک پُر کر دیا جائے گا۔

ہریانہ میں صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کے باعث صنعتی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور صنعتی اکائیوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ دیہی صنعتی اسکیم کے تحت قائم ۲۹۳۸۷ صنعتی یونٹوں میں ۷۶ ہزار سے زیادہ لوگ برسرِ روزگار ہوئے ہیں جن میں سے ۵۰ فیصد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔ اس وقت ہریانہ میں ۷۴ ہزار چھوٹے صنعتی یونٹ اور ۳۷۲ بڑے و اوسط درجے کی صنعتی اکائیاں قائم ہیں۔ ہریانہ الیکٹرونکس کے میدان میں لمبی پرواز کے لیے تیار ہے۔ اندازہ ہے کہ

الیکٹرونکس اشیاء کی موجودہ پیداوار ۱۵۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۹۳-۱۹۹۲ تک ایک ہزار کروڑ روپے ہو جائے گی۔

ہمارے مقصد میں ایک بات یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے سے بھرشٹاچار جیسی برائیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے تمام محکموں میں چوکسی شعبے بنائے جاچکے ہیں اور اس کی دیکھ ریکھ کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی انٹی کرپشن بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ ریاست کے تمام ڈپٹی کمشنروں سے کہا گیا ہے کہ وہ وقت نکال کر روزانہ ایک گھنٹہ عوام کے درمیان جاکر ان کی شکایتیں سنیں اور اُن کو حل کرنے کے لیے فوری اقدامات کریں۔ اس سے نہایت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کیونکہ اب لوگوں کو چنڈی گڑھ آنے کی زحمت سے نجات ملی ہے۔ ان تمام اقدامات سے حکومت پر عوام کا اعتماد بڑھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہریانہ بہت جلد ملک کی امیر اور مثالی ریاست بن جائے گی۔

آیئے، آج ہم سب مل کر اس مُبارک موقع پر بھرشٹاچار، افلاس، بھوک، بیماری اور ناخواندگی کے خلاف صف آرا ہونے کا حلف لیں۔ یہ بہت سخت معرکہ ہے تاہم پر عزم اور متحد ہو کر یلغار کی جائے تو ہمیں یقیناً کامیابی نصیب ہوگی۔ اور ہریانہ کے عوام میں یقینِ محکم اور اتحاد کا یہ جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ (س۔ا)



انجم عرفانی

غزلیں

دیکھا نہیں ہے جوئے سماعت نے کب سے چاند
کر دے طلوع اَب تو ذرا اپنے لَب سے چاند

اَب تو عمل ہتھیلی سے ہوتا ہے یہ طلوع
آتا تھا پہلے وادیٔ نام و نسب سے چاند

زِینہ بہ زِینہ اَوجِ سفر اس کا ہے نصیب
مِلتا ہے چونکہ پہلے یہاں جُھک کے سب سے چاند

ہر گام لڑکھڑاتا ہُوا، جھومتا ہُوا
آیا ہے اُٹھ کے پہلوئے بنتِ عنب سے چاند

اِس کو بھی ہو نصیب شرفِ باریابی کا
دستک تِرے دریچے پہ دیتا ہے کب سے چاند

آنگن میں دِل کے آئے تو جائے نہ پھر کبھی
ہم ہر دُعا میں مانگیں گے اک ایسا رب سے چاند

کیسے رہے گا آخرِ شب تک یہ ہم سفر
انجم تھکا تھکا سا ہے آغازِ شب سے چاند

ہر پل ہے اگر بار تو کیا، بار اُٹھا لے
اے تہمتِ ہستی کے خریدار اُٹھا لے

گھر بار بنا، چھوڑ کبھی یہ خانہ بدوشی
پڑ جائے گی چھت بھی کبھی دیوار اُٹھا لے

خاموشیٔ زنداں کو سکتے دیتی ہے مجروح
زنجیر تو رہنے دے یہ جھنکار اُٹھا لے

دِکھلاتے ہیں حالاتِ جہاں یہ کبھی یہ تفصیل
تو ساغرِ جم کی طرح اخبار اُٹھا لے

قبل اس کے کہ ہر سر میں ہو سودائے بغاوت
تو شہر سے رسمِ رسن و دار اُٹھا لے

یا صفحۂ ہستی کا بنا پھر ہمیں عنوان
یا ہم ہیں جہاں کے لئے بیکار اُٹھا لے

نیلام نہ ہو جائے سرِ عام وہ انجم
کہہ دیجئے قاتل سے کہ بازار اُٹھا لے



افسانہ

اوم کرشن راحت

ایک تنکا ہلکا سا

میری اور ڈاکٹر اشونی کی دوستی کا سبب صرف یہ تھا کہ میں برج بہت اچھی کھیلتا تھا اور ڈاکٹر اشونی کی سب سے بڑی کمزوری برج تھی۔ وہ ماہر نفسیات ہونے کے باوجود تاش کے اس کھیل میں ہارنے سے بہت گھبراتے تھے۔ ہار میں پیسے ویسے کا تو کوئی چکر تھا نہیں کیونکہ برج کھیلنے کے بعد وہ مجھے اچھی وہسکی اور اچھے ریستوران میں بہت اچھا کھانا کھلانے پر بہت زیادہ خرچ کر دیتے تھے۔

جب انہوں نے جرمنی سے لوٹ کر اس شہر میں اپنا کلینک کھولا تھا تو پہلے پہل بہت گھبرائے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ملک میں ان کی یہ بات بہت کم لوگ سمجھ پائیں گے کہ ذہنی مریض بغیر دوا کے بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں لیکن ان کی قسمت کہیے کہ دو ایک فیکٹریوں کے مالکان ان کے ہاتھوں شفایاب ہوئے تو سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی ڈاکٹر بیوی کے میٹرنٹی کلینک کو بھی چار چاند لگ گئے۔

جب ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی میں ان دنوں ایک معمولی کلرک تھا لیکن اس کے باوجود ان کے دوستوں کی فہرست میں میرا نام کافی اوپر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ میں ایک لاابالی، چنچل اور حساس طبیعت کا مالک ہوں لیکن وہ نفسیات کے ماہر ہونے کے ناطے میری ان کمزوریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہوتا تو وہ اپنے کسی دوست، کسی افسر یا بڑے انڈسٹریلسٹ سے میرا تعارف کرانے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان کے گھر میں کسی بھی پارٹی ہو وہ نہ مجھے اور میری بیوی رکشا کو بلانا نہیں بھولتے تھے۔ میری شادی کی سالگرہ یا میرے بچوں کا جنم دن وہ ان تاریخوں کو مجھ سے بھی زیادہ یاد رکھتے تھے۔ ان کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ میری بیوی شہر کے بگنے چنے انڈسٹریلسٹوں میں سے ایک کی بہن ہے اور سکول میں پڑھاتی ہے اور KNITTING یعنی ہاتھ کی بُنائی میں سونے کا تمغہ حاصل کر چکی ہے اور یہ کہ وہ کسی شاعر کی طرح حساس اور کسی جوگن کے خیالات کی طرح شانت سبھاؤ کی ہے۔ ڈاکٹر اور ان کی مسز مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ رکشا بھابی کو کبھی ہنستے تو دیکھا نہیں۔ ایک بار ہمارے کلینک میں لے آؤ پھر دیکھو وہ کیسے پھول کی طرح کھل اٹھتی ہیں۔

محسوس تو میں بھی ایسا ہی کرتا تھا کہ رکشا ہمیشہ بجھی بجھی سی رہتی تھی جیسے اس کی خوشی کہیں کھو گئی تھی لیکن میں یہ سوچ کر ہی ڈر جاتا کہ اگر میں اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں لے گیا تو سارا قصور میرا ہی نکلے گا۔ وہ مجھے ڈانٹیں گے کہ تم نے زندگی بھر اس کو اور اس کی چھوٹی چھوٹی امنگوں کو خواہشوں کو کچل کے رکھا تھا اس کی سادگی اس کے شانت سبھاؤ کا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب چھوٹی چھوٹی پرنشانیوں والے مریضوں کو تو چٹکیوں میں ہی بھلا چنگا کر دیتے تھے اور معاملہ

اگر کچھ اُلجھا ہُوا ہو تو ہفتہ دو ہفتہ ہی میں مریض ٹھیک ہو جاتے تھے۔ وہ مریضوں کی آنکھوں میں جھانک کر نہ جانے ان کے دل کے کون سے کونے میں اُتر جاتے اور کس طرح ان کے غم کی پرتوں کو اپنی میٹھی اس بھری گفتگو سے پرے ہٹا دیتے اور مریضوں کے غم کا بوجھ ہلکا کر دیتے کہ لوگ ان کی فیس کی بھاری رقم دے کر بھی ان کے کلنک سے ہنستے مسکراتے ہوئے نکلتے۔

میں نے کئی بار بے دلی سے رکشا سے کہا بھی تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کر لیں کہ اس کی مسکراہٹ کہاں کھو گئی تھی لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی۔ "میں اچھی بھلی تو ہوں۔ مجھے کیوں مریض بنانے پر تُلے ہوئے ہو" یہ کہتے ہی ساون بھادوں کی پھواریں باہر تو نہیں اس کے دل کے اندر پڑنا شروع ہو جاتیں اور میں اس کی اداسی کو دیکھ کر جھلّا اٹھتا وہ اور اُداس ہو جاتی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہنسے کیونکہ ہنسنا ہی زندگی ہے لیکن وہ شاید ہنسنا، خوش رہنا بھول ہی چکی تھی۔

ایک رات کلب میں جب برج میں ڈاکٹر اشونی میرے پارٹنر تھے، میں پتے بانٹ رہا تھا کہ ہماری برج کی میز کے قریب سے ایک صاحب جاتے ہوئے رُک گئے اور میرے ہاتھوں کی پھرتی پر حیران و ششدر رہ گئے اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ "بھئی کمال ہے" تو ڈاکٹر صاحب نے تاش کے باقی ساتھیوں سے کہا تھا۔ "آپ نے کبھی ہماری بھابی کو سویٹر بُنتے نہیں دیکھا۔ .... ان کے ہاتھوں میں تو بھگوان نے مشین فٹ کی ہُوئی ہے" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "کل اتوار ہے، بھابی کو ہمارے ہاں ضرور بھیجنا، مسز اشونی یاد کر رہی تھیں۔ شاید ان کے ہاتھ سویٹر کا کوئی نیا ڈیزائن لگا ہے اور وہ اسے ٹھیک سے اُتار نہیں پا رہی ہیں۔ یاد رکھنا بھُولنا نہیں۔"

"ضرور بھیج دُوں گا۔ آپ پتے اٹھائیے۔" میں نے کہا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے ہماری برج کی نشست ختم ہوئی — ڈاکٹر صاحب اپنی کار میں مجھے گھر چھوڑ گئے۔ جب میں گھر میں داخل ہُوا تو رکشا سر باندھے لیٹی تھی۔ تکیہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ میری بڑی بیٹی سینیہ اپنی ممی کا سر گود میں لئے اسے چُپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی خود بھی سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"کیا ہُوا" میں نے پُوچھا

"کچھ نہیں" رکشا نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ رونا دھونا کیسا" میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"یُونہی سر میں تھوڑا سا درد ہے۔ آپ کھانا کھائیے گا۔" رکشا نے چارپائی سے اٹھتے ہُوئے کہا۔

"دیکھو رکشا بات کو ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔" میں نے پیار سے پُوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں" اس نے جھُوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"سینیہ بیٹی تم بتاؤ — کیا ہُوا ہے تمہاری ممی کو" میں نے اسے لاڈ سے اپنی طرف کھینچتے ہُوئے کہا۔

"ڈاکٹر آنٹی آئی تھیں آج شام کو۔ وہ یہ سویٹر دے گئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ وہ اس کا ڈیزائن ٹھیک سے اُتار نہیں پا رہی ہیں — وہ — وہ یہ سویٹر لیڈیز کلب کے چوکیدار سے مانگ کر لائی تھیں — یہ سویٹر اس چوکیدار نے پہنا ہُوا تھا ڈیڈی —" سینیہ نے بڑی حیرانی سے کہا۔

سویٹر کو دیکھ کر ہی میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ رکشا کی بھیگی بھیگی آنکھیں سینیہ کی باتوں کے درمیان کبھی مجھے اور کبھی سینیہ کو دیکھتیں۔ میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ میں نے رکشا کو دلاسہ دینا چاہا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ میں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔ "بھلا ایسی چھوٹی موٹی باتوں ___"

"یہ چھوٹی بات ہے ڈیڈی؟" سینیہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

رات بھر رکشا روتی رہی۔ رات بھر میں حیران و پریشان وقت کے بدلتے ہوئے دھاروں پر غور کرتا رہا — سینیہ روتی روتی اپنی ممی کے سر کو سہلاتی ہوئی فرش پر ہی سو گئی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے رکشا کی آنکھوں کے سوتے سوکھ چکے تھے۔ اب نہ وہ کچھ بولتی تھی نہ روتی تھی بس ایک ٹک خلا میں گھُورے جا رہی تھی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں اسے پُکارا اور وہ آنکھ جھپک کر رہ گئی تھی۔ میرے دماغ میں ہتھوڑے سے چلنے لگے۔ مجھے اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ گھر برباد ہوتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنی سائیکل نکالی اور فوراً ہی ڈاکٹر اشونی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ابھی اپنے بیڈ رُوم ہی میں تھے۔ مجھے وہیں بُلوا لیا اور مجھے پریشان اور بے وقت اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے:

"ارے یار ایسی کیا بپتا آن پڑی ہے۔ اس قدر پریشان کیوں ہو"

"ڈاکٹر صاحب رکشا ___" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"کیا ہوا بھائی کو" مسز اشونی جو چائے بنا لائی تھیں بولیں:

"میں کل شام ہی کو تو مل کر آئی تھی ان سے۔ وہ تو بھلی چنگی تھیں اس وقت۔"

"ہاں بھابی ___ آپ جو سویٹر لے گئی تھیں نا ___"

"بس بھابی وہی سبب بن گیا ہے ___ ڈاکٹر صاحب وہ نہ اب بولتی ہے نہ چالتی ہے۔ گم صم خلاء میں گھورتی ہے۔ پکارو تو بس پلک جھپک دیتی ہے" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "تو گھبراتے کیوں ہو ___ ٹھیک ہو جائے گی ___ تم لے آؤ انہیں ___ لیکن یہ سویٹر والا معاملہ ___ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا ___ ذرا تفصیل سے کہو۔ آخر وہ کون سا سویٹر ہے جسے دیکھ کر ___" ڈاکٹر نے بڑے پیار سے پوچھا

"ہاں ڈاکٹر صاحب معاملہ سویٹر ہی کا ہے۔ یہ سویٹر رکشا نے پچھلے ہفتے راتیں جاگ جاگ کر بنایا تھا۔ اپنے بھیا کے لئے ___ پرسوں اس کے بھیا کا جنم دن تھا ___ وہ اب بہت امیر ہو گئے ہیں نا ___ اب انہیں ایسے سویٹر اچھے نہیں لگتے ___ وہ اب IMPORTED سویٹر ہی پہنتے ہیں۔ اپنی غریب بہن کا تحفہ کہاں پسند آتا ہے انہیں ___ رکشا کا بنا ہوا سویٹر انہوں نے لیڈیز کلب کے چوکیدار کو دے دیا تھا ___ ڈاکٹر صاحب مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب رکشا کا بھائی اپنی بہن کو خط لکھا کرتا تھا۔ پیاری بہن تمہارے بھتیجے اور بھتیجی کے پاس کوئی سویٹر نہیں، سردیاں شروع ہونے والی ہیں ان کے لئے ایک ایک سویٹر بُن کر بھیج دو اور اگر تمہیں وقت ملے تو ایک سویٹر میرے لئے بھی۔ جب میں تمہارے ہاتھ کا بُنا ہوا سویٹر پہنتا ہوں تو دوستوں کی بیویاں دیکھتی ہی رہ جاتی ہیں۔ اُون کے روپے اگلی تنخواہ ملنے پر بھیجوں گا۔" پھر رکشا نہ دن دیکھتی نہ رات۔ راتوں جاگتی اور جب سویٹر بُن کر تیار ہو جاتے، مجھے دکھاتی، اپنی نند کو دکھاتی اور اپنی سہیلیوں کو لئے پھرتی، سب لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ اس کے بھیا کے تعریف بھرے خط آتے اور بھابی کی شکایت بھری چٹھی، پھر اُون خریدی جاتی، پھر وہ رات رات بھر جاگتی اور اپنی بھابی کے لئے سویٹر بُنتی۔ یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ برسوں اگلی تنخواہ ملنے پر بھیجنے کے وعدے بھرے خط موصول ہوتے۔ پھر ___ پھر آپ کو معلوم ہے ڈاکٹر صاحب ___"

"ارے اتنی سی بات پر بھابی پریشان ہو گئی ہیں ___ ارے تمہاری چائے تو بالکل ہی ٹھنڈی ہو گئی ___ بھئی اس کے لئے ایک کپ چائے کا اور بناؤ ___ گرم گرم" ڈاکٹر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولے: "تو چائے پی ___ اور لے آ جا کر بھابی کو یہاں ___ چٹکیوں میں ٹھیک کر دیں گے انہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب وہ ٹھیک ہو جائے گی نا؟" میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا:

"ارے یہ کوئی برج کا کھیل تھوڑے ہی ہے کہ کسی کو جیتنے ہی نہ دو گے۔ آرام سے چائے پیو اور لے آؤ جا کر بھابی کو کلنک میں ___" ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آپ جلدی سے تیار ہو کر مجھ سے ذرا بات سمجھ کر جہاں تہاں کہوں ہو آیئے گا۔"

میں رکشا کو لے کر آیا تو ڈاکٹر صاحب اپنے کلنک میں تھے۔ مجھے باہر بیٹھے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو میں پریشان ہو اُٹھا۔ میں کلنک کا دروازہ کھول کر اندر گھسنے والا تھا کہ مسز اشونی نے مجھے روکا اور وہ رکشا کو لے کر اندر چلی گئیں۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ میں دُعائیں مانگ مانگ کر تھک گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کئی قسمیں کھائیں کہ اگر وہ ٹھیک ہو گئی تو اب میں اس کی بہت دیکھ بھال کروں گا۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کا خیال رکھا کروں گا۔ اسے پہلے کی طرح نظر انداز کبھی نہیں کروں گا۔ اسے سبھی گھریلو جھمیلوں سے دُور رکھوں گا۔ میری خود غرضی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ میری لاپرواہیاں مجھے کوس رہی تھیں۔ کلنک کے اندر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی گڑگڑا کر کچھ کہہ رہا تھا جو میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا۔ کلنک کا ایک دروازہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں بھی کھلتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید ڈاکٹر صاحب نے رکشا کو دیکھ بھال کے بعد گھر میں بھیج دیا تھا اور دوسرے کسی مریض کا معائنہ کر رہے تھے کیونکہ گڑگڑانے کی آواز کسی مرد کی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ڈاکٹر صاحب کی بیوی اور رکشا کلنک سے باہر نکلیں۔ رکشا ہنس تو نہیں رہی تھی لیکن اس کا حال پہلے جیسا بھی نہیں تھا۔

"لو بھیا سنبھالو بھابی کو۔ کل انہیں اسی وقت پھر لانا ہوگا ___" مسز اشونی نے ہنستے ہوئے کہا۔

حامدی کاشمیری



ہراس سے احتراز کرنا
مکان کے دروازے باز کرنا
گلو میں خنجر اُتر سکے گا
کلام کو دلنواز کرنا
سیاہ پتھر بنوں تو کیا ہے
مجھے بھی آگاہِ راز کرنا

وہ تشنۂ خوں بھی ہیں انھیں میں
شجر شجر امتیاز کرنا

یہی وسیلہ نجات کا ہے
تباہئ جاں پہ ناز کرنا

حروف صورت نمود ہوگی
بدن تپش سے گداز کرنا

میں حیران تھا کہ رکشا کو پوری طرح ٹھیک نہیں تھی لیکن لیسی بُجھی بُجھی بھی نہیں تھی۔ گھر لوٹتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہُوا کیسے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک رہتے ہوئے میں نے کئی ایسے ریض دیکھے تھے لیکن انہیں ٹھیک ہونے میں کچھ تو وقت لگتا ہی تھا۔ اس معاملے میں تو ڈاکٹر صاحب نے معجزہ ہی کر دکھایا تھا جس کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل رکشا کے ساتھ ہُوا تو وہی کچھ تھا جو میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تھا اور اس واقعہ کا رکشا کے دماغ پر اثر ہونا عین قدرتی بھی تھا۔ میں رکشا سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن چپ رہا۔ میں ڈر رہا تھا کہ معاملہ کہیں سے پھر نہ بگڑ جائے۔

گھر پہنچ کر رکشا حسبِ معمول پھر چھوٹے موٹے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ سیتیہ ماں کو قدرے ٹھیک دیکھ کر چہک اُٹھی تھی۔ میں اب بھی ڈاکٹر کے اس معجزے پر غور کر رہا تھا پھر مونچھ سے دامن چھڑاتے ہوئے میں نے کہا: "رکشا میرا خیال ہے تم میں اب کام کرنے کی وہ ہمت نہیں رہی اور بھگوان کی کرپا سے اب میں سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گیا ہوں۔ بھلا نا ہم ایک چھوٹا سا نوکر رکھ لیں"

"نا۔ نا۔ بالکل نہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں نوکروں کا حال ـــ وہ مُوا کمار تو ڈی تو دے بیٹھ گیا تھا۔ کلب کی میٹنگ کا۔ میری بھابی کے ہاں اور اُٹھا لایا وہاں سے بھیّا کا سویٹر ـــ پھر کہیں کا گڑ گڑا رہا تھا ڈاکٹر صاحب کے سامنے کہ صاحب مجھے بچا لو نہیں تو مجھے قید ہو جائے گی۔ میری نوکری چلی جائے گی۔ مجھے بچا لو ڈاکٹر صاحب میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ سویٹر آپ خود ہی کیشپ صاحب کو لوٹا دیجئے گا ـــ مُوا چور کہیں کا۔"

میں ڈاکٹر اشونی کے طریقۂ علاج پر حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے کلنک میں دو تین نشستوں کے بعد رکشا مُسکراتی بھی ہے ہنستی بھی ہے۔ میری لاابالی طبیعت اور لاپرواہیوں پر فقرے بھی چست کر دیتی ہے۔ بُنتے وقت اس کے ہاتھ مشین ہی کی طرح چلتے ہیں۔ لیکن اپنے بھیّا کا نیا خوبصورت سویٹر بُنتے بُنتے وہ کئی بار بُننے کی سلائی کو ہونٹوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگ جاتی ہے اور میرا دل دھک دھک سے رہ جاتا ہے کہ اسے کہیں ڈاکٹر اشونی کے نسخے کا پتہ نہ چل جائے۔

●●

ڈاکٹر نریش

ہندوستان کی غیر مروّج رسوماتِ طفلی

ضعیف الاعتقادی کے حامل ہندوستانی معاشرے میں مختلف قسم کے رسم و رواج مروّج رہے ہیں۔ کسی زمانے میں ان رسومات کی ضرورت بھی تھی اور افادیت بھی۔ قدیم مذہبی علماء، رشیوں، منیوں کی ایجاد کردہ ان رسومات کو یکسر بے معنی قرار دینا تو ان کی ذہانت اور حکمتِ عملی سے انحراف کرنا ہوگا، جسے میں غلط سمجھتا ہوں لیکن زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے بعض رسمیں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔ بعض رسمیں تو تغیراتِ زمانہ کے باعث اپنی افادیت بھی کھو چکی ہیں اور اہمیت بھی۔ بعض رسمیں ایسی بھی ہیں جو بامعنی و بامقصد ہونے کے باوجود ضعیف الاعتقادی کے باعث ایسی ایسی علامتی صورتیں اختیار کر چکی ہیں کہ عام آدمی کے لئے ان کا مقصد تو درکنار مطلب تک سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ علم و ادب کی روشنی کے باوجود بعض رسمیں تو روایت کے طور پر ادا کئے جا رہا ہے اور بعض اپنی سماجی حیثیت قائم رکھنے کے لئے بلکہ سماج میں اپنی ناک رکھنے کے لئے ادا کرتا ہے۔ جن رسومات کو ادا کیا جاتا ہے ان کی ادائیگی میں بھی آسان طریقے وضع کر لئے گئے ہیں، لیکن بعض رسومات ایسی ہیں جن کا چلن بند ہو چکا ہے۔ بلا مضائقہ ایسی رسموں کو غیر مروّج رسمیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ موجودہ مروّج رسموں میں ان متروک رسموں کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں... اور بعض علاقوں میں یہ رسمیں کسی نہ کسی صورت میں تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر موجودہ معاشرہ ان کے چلن سے کنارہ کش ہو چکا ہے۔ ذیل میں ایسی ہی غیر مروّج رسموں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

● رسمِ تحمیل

اس رسم کا اصل نام گربھادان سنسکار ہے۔ عہدِ قدیم میں جب مرد اولاد حاصل کرنے کی غرض سے اپنی بیوی سے ہم بستری کرتا تھا تو اس سے قبل گھر میں رسمِ تحمیل ادا کی جاتی تھی۔ اس رسم کی ادائیگی میں یجیہ کیا جاتا تھا، ناندی شرادھ (خیرات برائے بہبود) گنیش پوجا اور طعام کے بعد میاں بیوی تنہائی میں چلے جاتے تھے جہاں شوہر خاص منتر بولتے ہوئے مباشرت کرتا تھا۔

● رسمِ نرینہ

یہ رسم اس غرض سے ادا کی جاتی تھی کہ حاملہ عورت نرینہ اولاد پیدا کرے اسے "پُنسون" کہا جاتا تھا۔ حمل کے تیسرے یا چوتھے مہینے چاند کے کسی نرینہ ستارے میں ہونے پر اس رسم کو ادا کیا جاتا تھا۔ اس دن عورت روزہ (ورت) رکھتی تھی۔ گھر کی عورتیں برگد کی چھال کو پیس کر اس کا رس نکالتی تھیں۔ رات میں منتروں کی تلاوت کے ساتھ اس رس کی بوندیں عورت کے ناک کی دائیں سمت میں ٹپکائی جاتی تھیں۔ درحقیقت اس رسم کے ذریعے تِلّی کی بیماریوں مثلاً طحال اور ورمِ طحال

کو دکھا جاتا تھا۔

رسمِ زُلف آراستگی

حمل کے پانچویں مہینے میں بچے کا ذہن تیار ہونے لگتا ہے۔ اِس دوران عورت کو خوش و خرم رکھنے سے پیٹ کے بچے کے جسم اور ذہن کو تقویت ملتی ہے۔ عورت کو شادکام کرنے کی غرض سے رسمِ زُلف آراستگی وجود میں آئی، جسے سیمنتونین کہا گیا۔ یہ لفظ دو لفظوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ سیمنت کہتے ہیں سر کے بالوں کو اور اُنّین کہتے ہیں اُوپر اُٹھانے کو۔ مطلب ہُوا آرائشِ زُلف۔ اِس رسم کے دن بھی عورت ورت رکھتی تھی۔ گھر میں ہَون ہوتا تھا۔ ہَون کے دَوران عورت مقدس آگ کے مغرب میں بیٹھتی تھی۔ اِس کا شوہر اِسکی زُلفوں کو اُوپر کی طرف اُٹھا کر ان کی آرائش کرتا تھا۔ اِس کے بعد شوہر بیوی کی گردن میں گُولر کی ٹہنی لپیٹ دیتا تھا۔ اِس موقع پر ناچ گانا ہوتا تھا۔ جب تک ستارے نمودار نہیں ہوتے تھے، عورت مَون ورت رکھ کر خاموشی اختیار کئے رہتی تھی۔ تارے نکلنے پر، گائے کا بچھڑا چھونے سے اِس کا مَون ورت ختم ہوتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی یہ رسم ادا ہو جاتی تھی۔

رسمِ پیدائش

بچے کے پیدا ہوتے ہی رسمِ پیدائش کی تقریبات شروع ہو جاتی تھیں۔ اِسے "جات کرم سنسکار" کہا جاتا تھا۔ اس رسم کے تین حِصّے ہُوا کرتے تھے۔ پہلے حِصّے کو 'ذہنی ساخت' (میدھا جنن) کہا جاتا تھا۔ بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملتے ہی اس کا والد زچہ گھر میں جا کر سید ھے ہاتھ کی چوتھی انگلی سے اور سونے کی سلائی سے بچے کو گھی اور شہد چٹاتا تھا۔ اِس موقع پر بچّے کا اسمِ مخفی بھی رکھ دیا جاتا تھا، جس کا علم ماں باپ کے علاوہ کسی دُوسرے کو نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ دوسرے حِصّے میں طویل عمری (آیوشیہ) کا عمل ہوتا تھا۔ بچّے کی ناف یا اس کے داہنے کان کو مخاطب کر کے اس کا باپ چند منتروں کی تلاوت کرتا تھا جن کا مطلب بچّے کے لیے طویل عمر کی دُعا کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد پانچ براہمنوں کو بُلا کر زچہ گھر میں سے جایا جاتا تھا، جہاں وہ مختلف سمتوں سے بچے پر پھونک مارتے تھے۔ اسے "شواس پر شواس کرم" کہا جاتا تھا۔ تیسرے حِصّے میں طاقت (بل) کا عمل ہوتا تھا۔ اس میں بچے کا باپ، بچے کے بہادر ہونے کے لیے پُوجا کرتا تھا۔ نرینہ اولاد ہونے کی صُورت میں اِس موقع پر ماں کے لیے تعریفی کلمات بھی کہے جاتے تھے۔ اس کے بعد بچّے کی ناف کاٹ دی جاتی تھی اور بچّے کو نہلایا جاتا تھا۔ اب وہ پہلی بار ماں کا دُودھ پیتا تھا۔

رسمِ چاہ

اوّل اوّل تو یہ رسم بچّے کو پہلی بار گھر سے باہر لانے تک ہی محدود تھی اور اسے "نِشکرمن" کہا جاتا تھا۔ بچّے کی پیدائش کے بارھویں روز اسے پہلی بار گھر سے باہر لایا جاتا تھا۔ اس روز گھر میں آٹھوں سمتوں کے محافظین (اشٹ وکپال) سُورج، چاند، واسودیو اور آکاش کی پُوجا ہوتی تھی۔ بچّے کا ماموں اسے پہلی بار گھر سے باہر لاتا تھا۔ وہ بچّے کو مندر تک لے جا کر گھر لوٹا لاتا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ رسم فرشتۂ آب (واری دیوتا) سے منسوب ہو گئی۔ پوجا کے بعد بچے اور اس کی ماں کو چاہ پہ لے جایا کرتے تھے جہاں ماں اور بچّے سے کُنوئیں کی پرستش کرائی جاتی تھی۔

رسمِ طعم

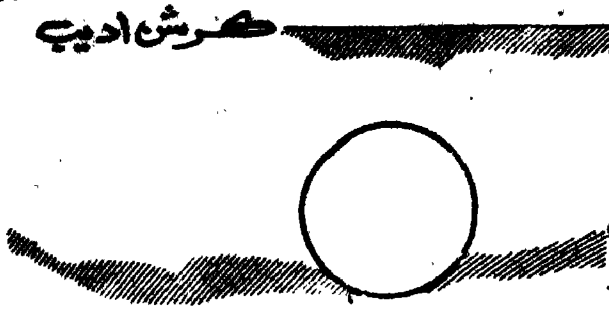
بچہ جب چھ مہینے کا ہو جاتا تھا، تب پہلی بار اس کے منہ کو اناج کا ذائقہ دے کر اس کی شیر خواری بند کر دی جاتی تھی۔ اسے "اَن پراشن" کہا جاتا تھا۔ شمالی ہندوستان میں بچّے کے پہلا دانت نکالنے پر اس کے منہ کو جو کھوپا گری لگائی جاتی ہے، وہ اس رسم کا ہی تبدیل شدہ رُوپ ہے۔ عہدِ قدیم میں اناج کو پکا کر اسے یگیہ کے ذریعے پاک کیا جاتا تھا اور بچّے کے منہ کو لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بچّے کی شیر خواری بند ہو جاتی تھی۔

باوجود اس کے کہ موجودہ دانتوں کے کھوپا گری منہ کو لگانے میں رسمِ طعم کا بنیادی مقصد موجود ہے، شیر خواری بند کرنے کا اس رسم کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں ہے۔

رسمِ وید خوانی

عہدِ قدیم میں بچہ اس رسم کے ساتھ وید پڑھنا شروع کرتا تھا۔ اسے "وید آرنبھ سنسکار" کہا جاتا تھا۔ کسی اُستاد (آچاریہ) کو گھر پر مدعو کر کے اس سے ہَون کرایا جاتا تھا۔ اُستاد [illegible]

خورش ادیب



غزل

چاند کی ہتھیلی پر صبح کا ستارا ہے
دُودھیا سے منظر کو رُوح میں اُتارا ہے

پھول تیرے وعدوں کے آج بھی مہکتے ہیں
حسن تیری یادوں کا آج بھی کنوارا ہے

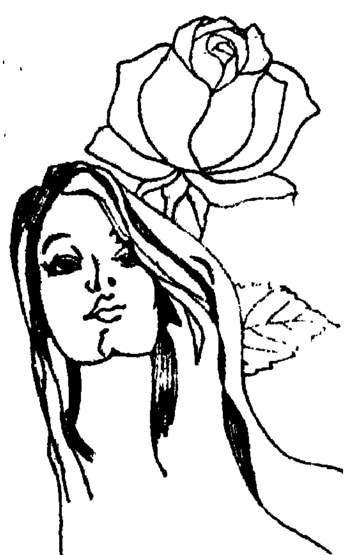
ہر گذرتا موسم اب یاد بنتا جاتا ہے
نقش اپنے ماضی کا ذہن پر اُبھارا ہے

آسماں میں اُڑتے ہیں، تھک کے لوٹ آئیں گے
صبح کے پرندوں کو شام نے پکارا ہے

اپنا بھی تھا اِک ساحل، اب کہیں نہیں ملتا
اجنبی جزیرے ہیں زندگی کا دھارا ہے

مستقل اُداسی کو ساغروں میں گھولا ہے
قرض اپنی شاموں کا اس طرح اُتارا ہے

تجربوں کے گلشن میں شعر میرے کھلتے ہیں
رُوپ میں نے غزلوں کا خون سے سنوارا ہے



مقدس آگ کا طواف کر کے شاگرد کو آگ کے مغرب میں بٹھا دیتا تھا۔ اُستاد منتروں کی تلاوت کرتا تھا اور شاگرد مقدس آگ کو گھی اور سامگری کی آہُوتیاں دیتا تھا۔ نذر نیاز کے بعد اُستاد بچے کو وید پڑھانا شروع کرتا تھا۔

● رسمِ واپسی

سماورتن کے نام سے مشہور یہ رسم اس عہد میں ایجاد ہوئی تھی۔ جب طلباء حصولِ تعلیم کے لئے علماء کی خانقاہوں میں جا کر رہا کرتے تھے۔ تعلیم ختم کر کے جب شاگرد کو اپنے گھر لوٹنا ہوتا تھا تب رشی کے آشرم میں ہی اس رسم کو ادا کیا جاتا تھا۔ جس لئے یہ رسم ادا ہونا ہوتی تھی، اس دن علی الصباح طالب علم کو ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ دوپہر میں کمرہ کھولا جاتا تھا اور طالب علم باہر آ کر اُستاد کی قدم بوسی کر کے، اس سے اپنی تجردی زندگی کے اختتام کی اجازت مانگتا تھا۔ اُستاد اس سے ہون کراتا تھا۔ ہون کنڈ کے قریب پانی سے بھرے آٹھ گھڑے رکھ دیئے جاتے تھے طالب علم ہر گھڑے میں سے پانی لے کر اشنان کرتا تھا۔ اس غسل کے بعد وہ اپنی برہمچاری (مجرد) زندگی کی نشانیاں کمربند، ہرن چھال، ڈنڈا پھینک دیتا تھا اور نئی لنگوٹی پہن لیتا تھا۔ اس موقع پر طالب علم کے عزیز و اقارب موجود رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ خوبصورت لباس پہن کر اُستاد کو نذر نیاز دے کر رشتہ داروں کے ہمراہ گھر لوٹ آتا تھا۔ ●●

اپنا افسانہ سرِ دار سنانے والے
ہم ہیں افکار کی قندیل جلانے والے

سربلندی مری تقدیر میں لکھی ہی رہی
جھینپ کر رہ گئے سب تار ہلانے والے

پہلے دیوانہ سمجھ کر نظر انداز کیا
اب مجھے ڈھونڈتے پھرتے ہیں زمانے والے

وقت نے کھینچ دیں کتنی ہی لکیریں اس پر
اب کہاں ہیں تیری تصویر بنانے والے

منتظر بیٹھے ہیں ہم راہِ وفا میں کوثر
جانے کب آئیں گے وہ لوٹ کے آنے والے

مہرچند کوثر

تیری رنجش، تیرے عتاب کی رات
میں نے کاٹی ہے کس عذاب کی رات

تیری یادوں نے پورا ساتھ دیا
یوں تو کٹتی نہ تھی شباب کی رات

ہائے یہ خامشی، یہ تنہائی
اُس پہ یہ درد و اضطراب کی رات

دُور تک سوجھتا نہیں کچھ بھی
کتنی کالی ہے ماہتاب کی رات

آئے ہیں وہ غریب خانے پر
کیا یہی ہے وہ انقلاب کی رات

غزلیں



امروز جہاں

افسانہ

بُزدل

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی تھی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ کیلاش نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی روشنی بند کی اور بستر پر دراز ہو کر سگریٹ سُلگا لیا۔ سردی سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے کمبل کھینچ کر سینہ تک برابر کیا۔ آنکھیں نیم وا تھیں، لبوں میں سگریٹ دبا تھا اور دل نہا نے بیتے ہوئے کتنے لمحوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس ویران اور تنہا رات کی سوگواری سے اُس کی رُوح بھی اُداس تھی۔

آج کامنی کی شادی ہے۔ اس کی زندگی کی حسین اور سب سے اہم رات۔ ان گنت خوبصورت جذبوں میں گھری بیٹھی ہوگی۔ اُس کے انگ انگ سے خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے ہوں گے۔ لیکن نہیں...... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اُداس ہو۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوں گے۔ اُس کے لب کانپ رہے ہوں گے۔ اُس کے دل میں میری یادیں مچل رہی ہوں گی، جس طرح میں کامنی کی یادوں کو سینے سے لگائے اندھیرے کمرے میں سسک رہا ہوں۔ پر کیلاش کے دل میں شک کی دیواریں پھر کھڑی ہو گئیں۔ وہ یہ سب کیوں کرے گی۔ وہ ایک عورت ہے۔ جو چند خوبصورت جملے سُنتے ہی پگھل جاتی ہے۔ اپنے پتی کی سرگوشیوں میں ڈوب کر اُسے کوئی کیلاش یاد نہ ہوگا۔ آنکھیں بند ہوں گی، ہونٹ مسکرا رہے ہوں گے۔ ایک سائے نے اُسے ڈھک لیا ہوگا۔ جس کی تمنا میں نے کی وہ سب کسی اور نے پا لیا ہوگا۔ ایک نشہ اس پہ طاری ہوگا۔ پیار کا نشہ، ملن کا نشہ، شاید میں ساری عمر یونہی تڑپتا رہوں گا۔

اس نے کروٹ بدل کر سوچا اب فائدہ بھی کیا ہے کچھ سوچنے اور یاد کرنے کا، جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہوگا۔

وہ بے قرار سا اُٹھا، ایک گلاس پانی پی کر پھر بستر پر گر پڑا۔ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کو سگریٹ کے دھوئیں میں گم کر دینا چاہا۔ ذہن میں پھر ایک سایہ لہرایا...... کامنی!

روشنی کی پرستار اور وہ خود اندھیرے کا باسی۔ جس کے مقدر میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وہ سوچنے لگا۔ میں دے بھی کیا سکتا تھا اُسے۔ کوئی لڑکی اتنی ایثار پسند نہیں ہوتی جو صرف پیار کے سہارے زندگی گزار دے۔ اچھا ہی ہوا جو اُس کے کرور پتی ڈیڈی نے اُس کے لئے ایک کروڑ پتی جیون ساتھی منتخب کیا۔ میرے دامن میں مفلسی کے سوا تھا ہی کیا۔ ایک روتے بسورتے شاعر کی بے شمار غزلیں بھی اپنا محبوب کی ضرورتیں تو پوری نہیں کر سکتی ہیں۔

کیلاش نے یہ چاہا تھا کہ کامنی خود ہی اس بات کا اظہار اپنے ڈیڈی سے کرے۔ وہ چاہتی تو میرے دُکھوں اور میری زندگی کے اندھیروں کو اپنے پیار کی روشنی سے سنوار سکتی تھی۔ لیکن اُس نے تو میرے ساتھ صرف فلرٹ کیا تھا۔ اس سے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو میں ہی دیوانہ ہوا جو اُس کے لئے اپنی دُنیا لُٹائے بیٹھا ہوں۔ شادی سے چند روز قبل وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اُف

سندیپ تھا۔ آنکھوں میں آنسو، سوکھے ہوئے لب۔ چال میں لڑکھڑاہٹ
چہرے پر دُنیا جہاں کی اُداسیوں کا خول چڑھائے ہوئے۔ جیسے یہ
سب حقیقت ہی تو ہے اور وہ واقعی میرے لئے اُداس اور بے حال
—— کتنا خوبصورت فریب تھا مجھ سے دامن چھڑانے کے لئے۔

وہ کہہ رہی تھی ———— "تمہاری دُنیا سے میں
دُور کی جا رہی ہوں کیلاش، مجھے تم سے جُدا کیا جا رہا ہے۔ مجھے بچالو
سب سے ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ ڈیڈی ایک ہفتہ کے اندر میری شادی
دیپک سے کر دینا چاہتے ہیں۔ تم بن جینا محال ہے۔ میں مر جاؤں گی،
کیلاش۔ میرے سپنے جل رہے ہیں۔ کچھ تو کرو۔ تم اس طرح
خاموش کیوں ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اب اور کچھ سوچنے کا وقت
نہیں، پلیز کیلاش!"

میں نے دھن والوں کے رنگ روپ بہت دیکھے تھے۔ میں
نے کہا۔ "اس ڈرامے کے لئے تمہیں کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی ——
ممی ڈیڈی! —— اگر تمہیں سچ مچ مجھ سے پیار ہوتا تو تم اپنے ڈیڈی
کے سامنے اپنا مُدعا بیان کر سکتی تھیں۔ کیوں نہیں اپنی خواہش کا اظہار کیا
ان کے سامنے۔ اس طرح چھُپ کر میں تمہیں اپنا بنانے کا قائل نہیں۔ تم
برومت، میں تمہاری شادی کے بعد یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔
اپنے ڈیڈی کا کہا مان لو، زندگی سنور جائے گی......!

التجائیں کرتی، کیلاش اُسے فریب کا رنگ دیتا رہا۔ اُس نے سوچا
کہ خوبصورت ہوتے ہیں فریب کے بدلتے ہوئے رنگ بھی بھلا نہیں اُس کی
بات مان کر اُسے ڈیڈی کے غنڈوں کا شکار ہونا تھا اور ایک دن میری
نعش شہر کے کسی ویران علاقے میں پائی جاتی اور تب میری بوڑھی،
بیوہ اور بیمار ماں کا کیا ہوتا، میری جوان بہنوں کا کیا ہوتا جو یہ سوچ
سوچ کر بوڑھی ہو رہی ہیں کہ کبھی تو میرا بھائی ہمارے ارمان اور
ہماری تمناؤں کی تکمیل کے لئے قدم اُٹھائے گا۔

ایسے باپ اپنی بیٹی کی مانگ کا سیندور پونچھ کر اپنی مرضی کا
سیندور سجانا بھی خوب جانتے ہیں۔ اپنی پوزیشن بنائے رکھنے کے لئے
اپنے دل میں شفقت اور محبت کا گلا گھونٹ کر اپنے ہاتھوں سے منگل سوتر
توڑ کر پھینک دینا اپنی شان سمجھتے ہیں۔

اس کا ذہن تلخ ہونے لگا۔ بزدل...... بے وفا......

اس سے زیادہ کی اُمید اس سے کی بھی نہیں جا سکتی۔ ایک بہانہ بناتی
ہے، مجبوری کا احساس دلاتی ہے اپنے عورت ہونے کا۔ آنسوؤں کے
چند قطرے ٹپکاتی ہے اور پھر مُسکرا کر زندگی کی بہار سمیٹتی ہے۔

کامنی جو میری شاعری سے متاثر ہو کے مجھ سے ملی تھی۔ اور
میں اپنی غزلوں کی فرضی محبوبہ کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے لگا تھا۔
کاش! وہ مجھ سے ملی ہی نہ ہوتی زندگی روگ تو نہ بنتی۔ کاش اُسے
خونِ تمنا کے لباس میں ایک بار دیکھ سکتا۔ مجھے لوٹ کر دیپک کے
نام کا سیندور اپنی مانگ میں سجا رہی ہوگی۔

کیلاش نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور برآمدے میں نکل آیا۔
سویرا ہو چکا تھا۔ دُنیا کے کاروبار پھر سے شروع ہو چکے تھے۔ وہ سوچنے
لگا اب کامنی کی وداعی کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ پیا ملن کے سپنوں
میں کھوئی وہ خراماں خراماں ساجن کے دیس جانے ہی والی ہوگی۔

اُف! کامنی تم بن یہ پت جھڑ کا موسم جو سدا ہی میرے جیون
میں ہوگا کس طرح بیتے گا۔

کال بیل کی آواز سن کر دروازہ تک گیا اور اخبار لے کر پھر اسی
ادھیڑ بُن میں اُلجھ گیا۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پلکیں بھاری
ہو رہی تھیں۔ جیسے سارا درد انہیں پلکوں نے اُٹھا رکھا ہو۔ آنکھوں ہی
آنکھوں میں رات کاٹ دینے سے طبیعت بوجھل تھی۔ تکلیف دہ خیالات
کو منتشر کرنے کے لئے اُس نے اخبار پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اچانک
ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ وہ پڑھتا گیا۔ ایک۔ دو.... تین.... چار....
پانچ..... جانے کتنی بار اُس نے یہ ہولناک خبر پڑھی..........
"سیٹھ ارجن داس کی اکلوتی لڑکی کامنی نے اپنی شادی کی رات آتم ہتیا
کر لی ——" اُس کے ہاتھوں سے اخبار چھوٹ کر گر پڑا۔

ڈیڈی کی سختی اور کیلاش کی بے اعتنائی نے اُسے مرنے پر مجبور
کر دیا۔ دُکھوں کا بوجھ اُٹھا کر وہ دیپک کی جیون ساتھی بننا
نہیں چاہتی تھی۔

کیلاش کے دماغ میں شور مچا تھا...... ایک خیال بار بار
آ رہا تھا۔ اُس نے کامنی کو بزدل سمجھا تھا..... بزدل...... کامنی۔
بزدل...... کامنی......

جانے کون بزدل تھا، وہ یا کامنی!

تعمیر و ترقیٔ ہریانہ

کیا خوب ہیں کرشمے امدادِ باہمی کے!
ہر سمت بڑھ رہے ہیں اب ہاتھ دوستی کے

ندیوں میں ناچتی ہیں امواجِ حوضِ کوثر
چشمے اُبل رہے ہیں ہر سمت سرخوشی کے

ہر جادہ خُلد منظر۔ ہر راہ رُوح پرور
ہر شاہ راہ پر ہیں سامان دلکشی کے

ہے موجِ آب رقصاں ہر ریگذار میں اب
باغِ عدن کے منظر ہیں اس کے آگے پھیکے

ہریانے کی زمیں پر جُھکتا ہے سر فلک کا
ذرّے ہیں یا منارے، فوّارے روشنی کے؟

ہر گاؤں میں رواں ہیں علم اور فن کے دریا
ہر شہر میں ادارے قائم ہیں شاعری کے

امراض کا نشاں تک کافور ہو چلا ہے
اب موت کانپتی ہے سائے سے زندگی کے

بی۔ ڈی۔ شید انبالوی

طارق کفایت

آنجہانی نوبہار صابر سے

انٹرویو

آئینۂ کلام میں

طارق: آداب عرض ہے قبلہ! زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں
آپ اجازت دیں تو آپ سے چند سوالات کرنے کی جسارت
کروں تاکہ آپ کے وہ عقیدت مند اور قارئین جو آپ کی
زندگی میں آپ کی ملاقات سے فیضیاب نہیں ہو سکے، آپ
کے خیالات سے واقف ہو سکیں۔

صابر: ؎ کس کو آواز دے رہا ہے میاں
وقت کب مُڑ کے دیکھتا ہے میاں

طارق: قبلہ اگر آپ اسے گستاخی نہ سمجھیں.... تو چند ذاتی قسم
کے سوال کرنا چاہوں گا۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ
عالمِ خاکی کے ہنگاموں سے دور عالمِ ارواح کی یہ زندگی آپ
کو کیسی لگتی ہے۔

صابر: ؎ عشرت کدہ لگے، کبھی وحشت کدہ لگے
یہ زندگی بھی طرفہ طلسمات ہے میاں

طارق: بزرگوار آپ کے بعد شہر کی ادبی محفلیں ویران ہیں اور
شعر و سخن کا میدان خالی ہے۔ ارباب قلم مہر بلب ہیں گویا آپ
ہی کے الفاظ میں ان کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ

؎ بیٹھے ہیں انجمن میں سبھی بُت بنے ہوئے
اہلِ نوا سے حرفِ سخن کون لے گیا

سبھی لوگ آپ کی کمی کو نہایت شدت سے محسوس کر رہے ہیں
جیسے شعر و ادب کا ایک باب ختم ہوا۔ ایک جسم ہے جس کی روح باقی
نہیں ایک چمن ہے جو بے صدا ہے ایک تحریر ہے جو ....

صابر: اب میں نہیں تو شہرِ وفا کیوں اُداس ہے
یہ تو نہیں کہ رونقِ بازار میں ہی تھا

طارق: محترم! آپ کے ملنے والے سبھی جانتے ہیں کہ آخری دنوں
میں ایک طویل علالت کے عذاب سے آپ کو گذرنا پڑا۔ اُف!
اس قدر طویل علالت غیروں کو تو کیا اپنوں کو بھی بیزار کر دیتی ہے
آپ کے خاص دوست تو یہ سوچ کر کہ

؎ پُرانا یار ہے دیکھ آئیں چل کے صابر کو
کبھی کبھی سے سُنتے ہیں ہم صاحبِ فراش ہے

آپ کی ملاقات کو آتے رہتے تھے مگر دوسرے لوگ خواہ ان سے آپ کا
تعلق بہت معمولی سا ہی رہا ہو کشاں کشاں آپ کی عیادت کے لیے
حاضر ہوتے تھے۔ کونسی کشش اور کونسا جذبہ اس کے پیچھے تھا

کرتا تھا اور آپ کی کون سی ادا نے انہیں آپ کا گرویدہ بنا رکھا تھا؟

صابر: ؎ صابر میں سو عیب ہیں لیکن ایک تو اس میں گُن دیکھا
جس کو اپنا کہہ دیتا ہے اُس پر جان چھڑکتا ہے

طارق: قبلہ! جن لوگوں کو زیادہ دیر آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ان کی روایت ہے کہ ان میں سے بیشتر نے آپ کو اسی حالت میں دیکھا ہے یعنی جہاں عموماً ذہنی طور پر آپ ہمیشہ ہی ان کو چاق و چوبند ملے وہیں جسمانی طور پر انہوں نے آپ کو لاغر و کمزور ہی دیکھا کیا یہ صحیح ہے؟

صابر: ؎ ہوا زمانے کی طوفاں بدوش تھی صابر
بچا اس کی زد سے پرانی کتاب ایسا تھا

طارق: لیکن قبلہ یہ حالت ہمیشہ تو نہیں رہی ہوگی جوانی تو آپ پر بھی آئی ہوگی اور جوشِ جوانی بھی ہوگا۔ اس ضعیفی کے عالم میں آپ کا عزم و حوصلہ نوجوانوں کو شرماتا تھا تو کیا اس وقت یہ کم ہوگا بالخصوص اس دور میں جب مادرِ وطن کی آزادی کے لیے آپ سربکف نوجوانوں کے قافلے میں شامل تھے اس وقت کی بھی کہیے۔

صابر: ؎ پرچھائیوں سے برسرِ پیکار میں ہی تھا
لڑتی رہی ہوا سے جو تلوار میں ہی تھا

طارق: ایک روایت یہ بھی ہے کہ جد و جہد لسانیات کے باوجود معاشی طور پر کبھی بھی آپ کو اطمینان بخش فراغت نصیب نہیں ہوئی اگرچہ لیلائے زر کے ایک ایک جلوے کے لیے آپ نے کئی محل جھانکے یا عوامی محاورے میں کئی پاپڑ بیلے۔ اس ناکامی کے عوامل یا وجوہ؟

صابر: ؎ ہر ڈگر سے آئی مجھ کو نقطۂ آغاز پر
گھومتا پھرتا رہا میں دائروں کے درمیاں

طارق: ان ناکامیوں نے آپ کو آزردہ کیا ہوگا اور آلام روزگار کا شکار ہو کر آپ کے قویٰ متاثر ضرور ہوئے ہوں گے لیکن عام مفروضے کے برعکس عملی زندگی کی تلخیاں حقارت بیزاری اور نفرت کی شکل میں آپ کے کلام میں کسی جگہ نظر نہیں آتیں۔ اس کے بجائے شگفتگی اور رجائیت کی ایک لطیف زیریں لہر آپ کے تمام کلام میں غیر محسوس طور پر جاری و ساری ہے۔ اس کا سبب آپ کے خیال میں کیا ہے؟

صابر: ؎ اہلِ دل کی یہ فطرت ہے صابر
ہر نئی چوٹ پہ مسکرا اٹھیں

طارق: جنگِ آزادی کے دور کی بات ہو رہی تھی تو مجھے یاد آیا کہ اس زمانے میں آپ کی انقلابی نظمیں "پیامِ بیداری" کے عنوان سے شائع ہوئی تھیں اور فرنگی حکومت کی جانب سے انہیں ضبط کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان نظموں سے تبرکاً ایک آدھ شعر عنایت فرمائیے۔

صابر: ؎ ہر رگ کا لہو صرف ہے تعمیرِ وطن میں
دشوار تھا یہ کام مگر ہم نے کیا ہے
جینا تو وطن کے لیے مرنا تو وطن پر
یہ عہدِ وفا شام و سحر ہم نے کیا ہے

طارق: صابر صاحب! ایک عام خیال ہے کہ شعر ایک تخلیقی عمل کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے اس کے لیے شاعر کو ایک مخصوص تخلیقی کرب سے بھی گزرنا پڑتا ہے تبھی وہ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو اشعار کی شکل دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ فن اور فن کار کے اس رشتے پر آپ اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے کچھ روشنی ڈالیں گے؟

صابر: ؎ لمحہ مرے شعور کی ابریشمی قبا
الفاظ میری سوچ کے اظہار کا بدن

طارق: بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ واقعی الفاظ کو فکر و ادراک کی مجسّم شکل کہا جا سکتا ہے غالباً اسی لیے اشعار کو شاعر کی معنوی اولاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ نے لمحے کی بات کی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیے کہ آپ کبھی نظریاتی طور پر کسی مخصوص مکتبِ فکر سے بھی وابستہ رہے ہیں؟ جہاں تک کلام کا تعلق ہے میرے ناقص ذہن کو اس سے کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ شروع کے مجموعوں کو چھوڑ کر ...... آپ نے وطن پرستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی انقلابی نظمیں کہیں تو یہ عمر کا تقاضا اور عہد کا قرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ اسی طرح آپ کے ابتدائی مجموعے "کاروانِ خیال" کے "میں منظوم منظومات" "بشارت" "اعلان" "لو پھٹی" اور اسی قبیل کی دیگر نظموں کو ترقی پسند

تحریک کی صدائے بازگشت سمجھا جاسکتا ہے لیکن جب ہم آپ کے آخری مجموعۂ کلام (اُردو) یعنی دھنک رنگ جسے بجا طور پر آپ کے فن کی معراج اور آپ کے شعور کی پختگی کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایک عجیب تحیّر سے دوچار ہوتے ہیں ایک طرف آدمی، زندگی اور موت، "شفق"، "شام" وغیرہ نظموں اور اسی طرح "کہکشاں"، "جگمگاتے خواب"، "راہِ زندگی پر عکس ہیں" ایسی مختصر ترین نظمیں ہیں جن سے آپ کے متعلق ایک جدید اور روایت شکن شاعر کا تصور ابھرتا ہے مگر دوسری طرف آپ کے اسی مجموعے کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اور اس میں نعت اور سلام بھی شامل ہیں جو ایک خالص روایت پرستانہ انداز سے آخر آپ کو —

— اب تو اس پھول کی نکہت سے مہکتی ہے حیات
زخمِ دل زخم تھا تہذیبِ نظر ہونے تک

اور

انگ بھبھوت رمائے جوگی بن دکھیا ہیں نام جپے
من ہرجائی گھوم رہا ہے نگر نگر بھرمایا سا

آپ کے سامنے قارئین بھی اس تضاد کو سمجھ گئے ہوں گے جسے میں واضح کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

صابر: [illegible]

طارق: آپ کی بات تسلیم۔ لیکن ایک بات تو آپ بھی مانیں گے ...... کہ آپ کے لہجے کی ندرت، بیان کی متانت اور فکر کی پختگی نے آپ کو اُردو شعراء بالخصوص معاصرین میں ایک منفرد مقام دلایا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے یقیناً آپ کو ایک طویل ادبی مسافت طے کرنی پڑی ہوگی اور نصب العین کے طور پر کچھ رہنما اصول آپ نے مقرر کیے ہوں گے۔ کیا آپ قارئین کو ان سے روشناس کرائیں گے؟

صابر: — مانوس راستوں کا سفر بھی ہے کچھ سفر
اک راہ گزار سب سے جدا چاہیے مجھے

صابر: بلکہ روایت [illegible]

طارق: قبلہ آپ سے میری گستاخی پر معمول نہ فرمائیں — میں اپنی بات مکمل کرنا چاہوں گا کہ بات صرف موضوعات ہی کی نہیں اسلوبِ سخن اور انتخابِ الفاظ وغیرہ میں بھی آپ کے ہاں کوئی متعین راہ نظر نہیں آتی۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے متذکرہ بالا مجموعے سے ہی دو اشعار پیش کرتا ہوں:

نوبہار صابر

منزل بہ منزل

نام: نوبہار سنگھ مرحوم

تخلص: صابر

ولادت: ۱۱ر نومبر ۱۹۰۷ء۔ ٹوہانہ۔ ضلع حصار (ہریانہ)

تعلیم: ماڈل ہائی اسکول پٹیالہ و مہندرا کالج پٹیالہ

تصانیف: راج کماری للتا (ڈرامہ) ۱۹۲۷ء

رشمی درشن (منظوم سوانح) ۱۹۲۸ء

پیامِ بیداری (انقلابی نظمیں جنہیں فرنگی حکومت نے ضبط کیا) ۱۹۳۲ء

کاروان خیالوں کے (شعری مجموعہ) ۱۹۶۹ء

دھرتی کی خوشبو (قومی و وطنی نظموں کا مجموعہ) ۱۹۷۶ء

زرد پتے (غزلیات و منظومات کا مجموعہ) ۱۹۷۸ء

دھنک رنگ (" " " ") ۱۹۸۳ء

احساس کا سفر (انتخابِ کلام دیوناگری رسم الخط میں) ۱۹۸۴ء

تالیفات: لہو ترنگ (ہند و پاک جنگ پر منظومات) ۱۹۶۶ء

ارمغانِ تاشقند (ہند و پاک معاہدے پر منظومات) ۱۹۶۷ء

لہو پکارے گا آستیں کا (بنگلہ دیش کے قیام سے متعلق منظومات) ۱۹۷۳ء

اعزاز: ۱۹۷۱ء میں حکومتِ ہریانہ کی جانب سے "شاعرِ وقت" کا خطاب

انعامات: آپ کی تصانیف پر متعدد سرکاری و غیر سرکاری انعامات مل چکے ہیں

وفات: ۱۰ر نومبر ۱۹۸۷ء پٹیالہ

طارق: صابر ایک ذاتی قسم کا سوال پیش کرنے سے پہلے پیشگی طور پر معافی کا خواستگار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر یہ گفتگو نامکمل رہے گی اس لیے اس کا پوچھنا ناگزیر ہو گیا۔ تو محترم بات یہ ہے کہ عوام میں شعرا بالخصوص اُردو شاعروں کے متعلق یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ ان کے بیشتر اشعار شراب کے نشے میں کہے گئے ہیں دوسرے الفاظ میں کہ شراب کے بغیر اچھا شعر کہا ہی نہیں جا سکتا اور شعر کہنے کے لیے جس وجدانی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف شراب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں اور کیا آپ کے اشعار بھی شراب ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ کیا آپ نے کبھی نشہ کیا ہے؟

صابر: ~~ شعر سے کسب نشہ کر صابر
کیوں رہینِ شراب ہوتا ہے

طارق: ایک شاعر کو عوام سے کیا چیز ممتاز کرتی ہے اور کیا سبب ہے کہ ایک عام شخص جن حقائق و مناظر پر سرسری نظر ڈال کر انہیں ناقابلِ اعتنا سمجھ کر چلتا بنتا ہے انہی میں شاعر حیات و کائنات کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اپنے اشعار کے ذریعے وہ ایسے گوشے دوسروں کے سامنے لاتا ہے جو انہیں انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

صابر: ~~ آنکھ جوہر شناس ہو تو میاں
ذرہ بھی آفتاب ہوتا ہے

طارق: قبلہ! غزل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ظالم و مظلوم صنفِ سخن ہے۔ ظالم ہونے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن مظلومیت؟

صابر: ~~ کچھ لوگوں نے صابر اس کی مانگ بھری
کچھ لوگوں نے کیا غزل کا ناس بہت

طارق: آپ نے صحیح فرمایا کہ غزل کی مانگ بھری اور اُجاڑی جاتی رہی ہے۔ نہ جانے اس نے کتنے انقلاب دیکھے ہیں اور نہ جانے کتنی بار یہ مر کر زندہ ہوئی ہے لیکن ایک وصف جس نے غزل کو اب تک بچائے رکھا اور اسے ایک خاص مزاج عطا کیا ہے وہ اس کا تغزل ہے اور اس کی وہ چیز جسے ابھی تک کسی نے

نہیں چھیڑا وہ اس کی ہیئت ہے لیکن پچھلے چند سالوں سے اس پر بھی نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اور ایک نئی صنف "آزاد غزل" کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کیا اس سے غزل کی مقبولیت متاثر نہیں ہو گی؟

صابر: ~~ دیکھیے صابر غزل کی جامہ زیبی کا کمال
ہر نئی پوشاک پر جچتی ہے یہ کافر ادا

طارق: بجا ارشاد فرمایا۔ آج کے بیشتر شائقینِ ادب بھی اس طرح آپ سے اتفاق کریں گے لیکن آپ اسے کیا کہیں گے کہ آپ کے معاصرین میں ایک اچھی تعداد ان شعرا کی بھی ہے جن کے لیے شاعری اور بالخصوص غزل آج بھی حسن و عشق کی داستانیں اور گل و بلبل کے افسانے کا نام ہے وہ جدید شاعروں کے ہی مخالف نہیں نئی شاعری کو بھی قابلِ گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔

صابر: ~~ ایٹمی دور میں رہتے ہوئے صابر کچھ لوگ
سنگ و آہن کے زمانے میں جیا کرتے ہیں

طارق: اور چند شاعر ایسے بھی تو ہیں جن کی شاعری محض الفاظ کی جادوگری ہے اور اپنے شعر کی عمارت وہ محض الفاظ کے الٹ پھیر یا ان کی تکرار پر ہی استوار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ مشاعروں میں داد بھی بہت پاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ تاریخِ ادب میں بھی کوئی مقام رکھتے ہیں؟ کیا ان کے ہاں دوامیت کا کوئی عنصر ہے؟

صابر: ~~ ان سخن طرازوں کا دور جا چکا صابر
شعر میں جو لفظوں کے پینترے بدلتے ہیں

طارق: صابر صاحب! آپ نے اُردو ادب کا بہت عمیق مطالعہ کیا ہے۔ دیگر زبانوں کی ادبیات پر بھی آپ کی نظر ہے۔ اُردو شاعری کے ہر دور میں ایک سے ایک بلند قامت اور عالی مرتبت شاعر موجود رہے ہیں لیکن اگر آپ کو ان میں صرف کسی ایک شاعر کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے یا یوں کہیے وہ عہد ساز شخصیت جس کی انفرادیت نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہو . . . .

صابر: ~~ ہے سب سے جُدا رنگِ سخن غالب کا
یکتائے جہاں ہے بانکپن غالب کا

موضوعِ سخن، لطفِ زباں، طرزِ ادا
ہر باب میں منفرد ہے فنِ غالبؔ کا

طارق: واقعی غالبؔ کی عظمت سے کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا لیکن قبلہ اُردو نے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ جیسے شاعر بھی تو پیدا کیے ہیں جنہوں نے اپنے اشعار سے ایک پوری قوم کو بیدار کر دیا اور اُردو شاعری کو دوسری عالمی شاعری کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

صابرؔ: ؎ جس کے فن کو کبھی زوال نہیں
- ایسا صاحبِ کمال تھا اقبالؔ
کوئی اس کا حریف ہو نہ سکا
آپ اپنی مثال تھا اقبالؔ

طارق: موجودہ عہد میں جبکہ اُردو کے پڑھنے لکھنے والے حضرات کی تعداد میں کافی کمی آئی ہے اُردو کی مقبولیت اسی طرح برقرار ہے۔ آج بھی مشاعروں میں وہی روایتی رونقیں دیکھنے کو ملتی ہیں بلکہ اخراجات کے اعتبار سے آج مشاعروں پر کہیں زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ مشاعرے اُردو زبان کی بقا کے ضامن نہیں؟

صابرؔ: ؎ انگشت بدنداں ہیں زمانے والے
گرد کھا رہے ہیں گلے نہ کھانے والے
کرتے ہیں مشاعرے بیادِ غالبؔ
غالبؔ کی زباں کو بھول جانے والے

طارق: آپ کے تجربات تلخ ہیں لیکن ایک دُوسرے پہلو سے بھی تو سوچیے۔ کیا مشاعروں سے اُردو شعرا کی عزت و توقیر میں اضافہ نہیں ہوا؟ نئی نسل کے آج کتنے ہی نوجوان مشاعروں میں ٹیپ ریکارڈ یا گورمکھی رسم الخط میں اپنے پسندیدہ شعرا کا کلام نوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی شاعر کے فین FAN کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے آج نسبتاً زیادہ لوگ شاعر بننے کے خواہش مند نظر آتے ہیں...

؎
لیجیے ہم بھی تخلص رکھ کے شاعر بن گئے
یہ وہ [illegible] ہے کہ بیشماری کا نام

چار سطریں اُلٹی سیدھی لکھ کے چھپوالی کتاب
رکھ دیا موتی محل اس چار دیواری کا نام عو

طارق: قبلہ! میرا مدعا آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہرگز نہیں تھا اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ ہم تھوڑا سا موضوع بدل لیں تو شاید اچھا رہے۔ آپ نے متعدد نعتیں بھی تو لکھی ہیں ان کا کوئی شعر ارشاد فرمائیں گے؟

صابرؔ: ؎ منزلِ عشقِ احمد ہے صبر آزما
راہ رو بے نیازِ تعب چاہیے
ہے یہی صابرؔ! اب صُورتِ عاشقی
یادِ خیر البشر روز و شب چاہیے

طارق: صابرؔ صاحب! اس امر سے شاید بہت کم لوگ واقف ہیں کہ آپ مزاحیہ انداز میں بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ آپ کی ایک پیروڈی "نہ یہ بات ہوگی نہ وہ بات ہوگی" کا تذکرہ اپنے بزرگوں سے بھی اکثر سنا ہے۔ اس کی جتنی تعریف سُنی ہے اس کو دیکھتے ہوئے پُوری پیروڈی سُننے کا اشتیاق ہے لیکن سردست کم از کم ایک بند تو ضرور سنائیے:

صابرؔ: ؎ کہا تم جو سُنتے نہیں قصۂ غم
تو بس اب سے ترکِ مُلاقات ہوگی
وہ بولے یونہی 'بور' کرتے رہیں گے
"نہ وہ بات ہوگی نہ یہ بات ہوگی"

طارق: اَدبی مسائل پر آپ نے اپنے خیالات کا جو اظہار فرمایا اس کے لیے میں تہِ دل سے آپ کا ممنون ہوں اور یہ یقیناً میری خوش بختی کی دلیل ہے۔ مزید کرم ہوگا اگر حالاتِ حاضرہ سے متعلق بھی اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں۔ اس تناظر میں سوالات کی ابتدا میں آپ کے ذاتی عقائد سے متعلق سوال کرنا چاہوں گا کہ عمومی مذہبی تعلق سے قطع نظر کیا آپ کسی مخصوص مسلک یا مذہبی فرقے سے نسبت رکھتے ہیں۔ اپنی عملی زندگی میں کیا آپ مخصوص قسم کے نظریات پر کاربند ہیں۔

صابرؔ: ؎ توڑ کر صابرؔ عقیدوں کی فصیل
وہم کے زنداں سے نکلا چاہیے

طارق: آپ کا یہ فرمانا تو درست ہے مگر آپ نے یہ بھی تو محسوس کیا ہوگا کہ فی زمانہ اچھے تعلیم یافتہ اور ترقی پسند نظریات والے لوگ بھی اپنا تعلق آستانوں سے جوڑتے ہیں یا کسی بزرگ کی خدمت میں باقاعدگی سے حاضری دیتے ہیں اور اس کو مذہبی فراخدلی کا نام دیتے ہیں۔

صابر: ؎ خانقاہیں مزار اور ڈیرے ہیں
سب ہے دھندے کا سلسلہ یارو

طارق: آج جبکہ انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ خلا کی وسعتیں اس کے لیے قدموں میں بچھ چکی ہیں کیا اس ترقی نے اسے ذہنی و قلبی سکون کی دولت بھی عطا کی ہے؟ کیا آج ہر آدمی اپنے معاشرے کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے؟ بحیثیت مجموعی آج کے انسان پر آپ کا تبصرہ کیا ہے۔

صابر: ؎ بجا وہ پھول جیسا تازہ و شاداب لگتا ہے
مگر اس شخص کے اندر کا موسم کس نے دیکھا ہے

اور

اپنے ماحول سے ہر شخص ہے مائل بہ فرار
کوئی بیزار ہے گھر سے کوئی گھر مانگے ہے

طارق: اس دور میں مروت و محبت کا مفہوم کیا ہے؟

صابر: ؎ دوستی نام کی چیز کا دہر میں
کال بھی تھا، آج بھی کال ہے دوستو

طارق: ملک میں آج ہر جگہ بد امنی، فرقہ وارانہ فسادات، لوٹ مار منافرت کا جو بازار گرم ہے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

صابر: ؎ یہ لوٹ یہ غارت یہ تباہی توبہ
آغوشِ سحر میں یہ سیاہی توبہ
جس دیس میں پیدا ہوا گاندھی سا بشر
اس دیس کا یہ حشر الٰہی توبہ

طارق: لیکن جناب آخر اس کا حل کیا ہے ایک باشعور و باوقار شہری اس میں کیا کر سکتا ہے؟

صابر: ؎ تیشہ بدست نکلیں اُجالوں کے پاسدار
دیوار بن کے راہِ سحر میں کھڑی ہے رات

طارق: صابر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اس ملاقات کے لیے اتنا وقت دیا اور خندہ پیشانی سے میرے سوالات کا جواب دے کر اپنے خیالات سے قارئین کو بہرہ یاب ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ رخصت ہونے سے پہلے نئی نسل کے فن کاروں کی رہنمائی کے لیے آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

صابر: ؎ کہو یہ شاعر و صورت گر و مغنی سے
تمہارا فن جو پیمبر نہیں تو کچھ بھی نہیں

●●

بقیہ طوفانوں کے ملاح صفحہ ۳۵ سے آگے

مت رکھیے جن کا مقصد محض امتحان پاس کرنا ہو۔ آپ لوگ ایسے نوجوان تلاش کیجیے جو نہ کھڑے پانی کے ملاح نہ ہوں۔ جن کے طوفان بھی ہوں تو وہ طوفان خود پیدا کر سکیں۔ اور جن کے خوابوں میں بھی سلیم میاں کی طرح طوفانوں کا مسکن ہو جو ہر منزل پار کر جائیں اور پھر کہیں کہ یہ تو ابھی پہلا قدم ہے۔ جو طوفانوں کے رخ کو اپنے بازوؤں کے زور سے موڑ دیں، جن کے دل میں یہ امنگیں دلولے ہر دم جنم لیتے رہیں کہ ہم نے اپنے لئے اور اپنے وطن کے لئے نئی راہیں ڈھونڈنی ہیں۔

آپ لوگ مجھ سے روپیہ لیجیے، میرا آشیرواد لیجیے۔ اور اپنا کام شروع کر دیجیے۔ آپ سب لوگ مجھے بس یہ یقین دلا دیجیے کہ آپ اس یونیورسٹی میں ایسے "طوفانوں کے ملاح" تیار کر سکیں گے۔

کتنی چھوٹی سی بات تھی۔ مگر۔ کتنا بڑا کام تھا۔

●●

رؤف خوشتر

مزاحیہ ڈرامہ

ذرا دم ہو تو...

(کالونی کے ایک مکان کا منظر۔ ڈرائینگ روم میں میاں بیوی محوِ گفتگو ہیں)

شریف : بیگم غضب ہوگیا۔ نہیں نہیں غضب ہونے والا ہے امان پھر جان کھانے کو آگئے۔ کہیں سے حضرتِ عیسیٰ کا قول: "پڑوسیوں سے محبت کرو" پڑھ لیا ہے شاید — اب زندگی بھر.. اسی قول کو فعل میں بدلنے کا ہمارے یہاں مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ دیکھو مسلسل دستک دے رہے ہیں۔ حمیدہ اب میں کیا کروں؟

حمیدہ : (غصہ سے) اجی تم نے تو ڈرائینگ روم کو کالونی کی لائبریری بنا چھوڑا ہے۔ دُنیا بھر کے اخبارات اور پرچے منگواتے ہو تو ہر کوئی مُنہ اٹھائے بلکہ آنکھ اُٹھائے پڑھنے کے لئے چلا آتا ہے۔ اُدھر کسی نے گھر میں قدم رکھا ادھر مجھے چائے کا برتن چولہے پر رکھنے کو کہتے ہو لیکن سُنو جی آج تو میں گھر میں رہنے والی نہیں۔ پڑوسن کے پاس چلی جاتی ہوں۔

شریف : دیکھو حمیدہ۔ اگر تم اِس طرح چلی جاؤ گی تو کچن میں کون رہے گا۔ اچھا تمہارے اوصافِ حمیدہ میرا مطلب ہے بچے کہاں ہیں؟

حمیدہ : وہ تو کب کے باہر کھیلنے گئے ہیں۔ لو اب میں بھی جاتی ہوں سنبھالو اپنا گھر اور اپنے دوستوں کو۔

(حمیدہ چلی جاتی ہے۔ دروازہ پر پھر دستک ہوتی ہے)

شریف : اُف ہو۔ یہ وبالِ جان امان بھی عجیب آدمی ہے۔ بیوی تو مرگئی۔ مرتی نہیں تو اور کیا کرتی۔ اب دوسروں کی بیویوں کو مارنا چاہتے ہیں۔ بیگم تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں۔

(دستک کی آواز کے ساتھ ایک شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے)

امان : ذرا دم ہو تو ... کیوں بھئی کیا کر رہے تھے؟ کب سے آواز دے رہا ہوں۔ کیا بھابی صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔ اگر ہیں تو میرا آداب کہنا۔

شریف : آیئے آیئے امان بھائی۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپ کی بھابی پڑوسن کے یہاں گئی ہیں۔

امان : یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اچھا تو یہ دیکھو اخبار میں خبر چھپی ہے کہ اسرائیل نے پھر حملہ کردیا۔ میاں میری سُنو قابیل کا برادرانہ قتل ہو یا اسرائیل کا بہیمانہ قتلِ عام۔ دنیا کے ہر واقعہ اور حادثہ کی تہ میں یہی قول نظر آتا ہے۔ یعنی ذرا دم ہو تو —— یہاں طاقتور کے پاس دم اور کمزور کے پاس غم ہوتا ہے۔ طاقتور ملک بم اور غریب ملک پرابلم رکھتے ہیں۔ اِسی دم کے غم سے تو

دُنیا کے سارے کاروبار چلتے ہیں

(دروازہ پر پھر دستک اور اجازت لے کر وہ شخص کمرہ میں داخل ہوتے ہیں)

شریف : ارے بابر اور شاکر بھائی اچھا ہُوا آپ آگئے بیٹھ جائیے

(دونوں سلام کرکے بیٹھ جاتے ہیں)

امان : ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا اچھا اب بابر میاں کی مثال سامنے ہے۔ چونکہ یہ شریف النفس خاموش طبیعت آدمی ہیں اس لئے ان کی بیگم ان سے لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی ہے۔ اور یہ بیچارے کہتے ہی رہے کہ ....

بابر : ؎ ہم بیاہ کرکے بھی تنہا رہ گئے

امان : ایک وہ بابر تھا جو اپنے حریفِ حیات کو بغل میں دبائے فصیل پر چڑھتا تھا اور ایک یہ بابر ہیں جو اپنی شریکِ حیات کو باعزت طور رکشا میں بٹھا کر اپنے یہاں نہیں لا سکتے اس لئے کہ ان کی بیگم کے رشتہ دار ان سے پُوچھتے ہیں کہ لے جاؤ اگر ذرا دم ہو تو .....

شاکر : امان بھائی۔ آپ ان کے خُسر اور سالے کے متعلق نہیں جانتے۔ خُسر جلاد ہے تو سالا غنڈا ہے۔ وہ بابر بھائی کو اپنے محلہ میں قدم رکھنے نہیں دیتا۔ گھر پر سخت پہرہ ہے۔

شریف : خُسر اور سالے سے کیا ڈرنا؟ جب کہ ان کو اپنی منکوحہ بیوی لانا ہے۔ لوگ تو اب دُوسروں کی بیویوں کو لے اُڑتے ہیں۔ بس لانے کے لئے ذرا سا RISK لینا ہے۔

بابر : ؎ یہ رسک نہیں آساں اِتنا ہی سمجھ لیجے
اِک ناگ کا پہرہ ہے اور وائف کو لانا ہے

امان : بس تو پھر آپ کا نام بابر نہیں لاغر ہونا چاہیئے۔ میاں میری شادی کے بعد ایسا ہی معاملہ ہُوا تھا۔ میں نے خُسر صاحب کو ایسی دھمکی دی کہ وہ اپنی بیٹی کو خود لاکر چھوڑ گئے۔ نصف بہتر کے لئے نصف برتر بھی بننا پڑتا ہے۔ ذرا دم ہو تو ...

شاکر : اچھا امان بھائی آخر آپ نے کس بات کی دھمکی دی تھی کہ وہ بیچارے اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال رکھے بغیر آپ کے پاس چھوڑ گئے؟

امان : ذرا دم ہو تو ... بھئی تم شاکر نہیں شاطر ہو۔ دراصل ہمارے سالے صاحب کا ایک خاتون ٹیچر سے معاشقہ چل رہا تھا۔ اتفاق سے سالے صاحب کا تحریر کردہ عشقیہ خط میرے دوست باقی میاں کے ہاتھ لگا۔ باقی نے وہ خط مجھے دیا۔ میں نے باقی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

بابر : ؎ ذرا دم ہو تو یہ چھوٹی بڑی تدبیر ہے باقی

امان : واہ بابر میاں تم نے تو میرے مُنہ کی بات چھین لی۔ بس پھر کیا تھا۔ ساری خُدائی ایک طرف رکھتے ہوئے جورو کے بھائی نے اپنی بہن کو ہمارے گھر پہنچا دیا۔

شریف : اچھا امان بھائی ادھر کچھ عرصہ سے ایک عجیب خواہش ہو رہی ہے پتہ نہیں کیوں؟

شاکر : آخر ہم بھی سُنیں آپ کے دل میں کون سی خواہش انگڑائی لے رہی ہے؟

شریف : میں غریب بننا چاہتا ہوں۔

امان : بھئی اب تک تو ہم عجیب وغریب کی اصطلاح سُنتے آئے تھے۔ اب تم شریف وغریب کی اصطلاح کا سبب بننا چاہتے ہو ذرا غم ہو تو آدمی کئی سطحوں پر غریب بن سکتا ہے تم کس اعتبار سے غریب آدمی بننا چاہتے ہو؟

شریف : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟

امان : بھئی دیکھو آدمی مالی، سماجی، اخلاقی، سیاسی اور ذہنی سطحوں پر غریب رہتا ہے۔ تم اگر ان میں کسی ایک میدان میں غریب بننا چاہتے ہو تو نسخہ آسان ہے۔ مالی حیثیت سے غریب ہونے کے لئے دروازہ شب و روز کھول دو۔ سماجی طور پر چاہتے ہو تو لوگوں کو کڑوے کسیلے بول دو، اخلاقی اعتبار سے چاہتے ہو تو شب و روز جام و ساغر تھام کھول دو اور ...

امان : ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ذہنی اور ادبی طور پر دیوالیہ ہونے کے لئے فلمی و جنسی ادب کو مول لو۔ ادب تھا ادث پٹانگ

جینت پرمار

غزل

اس نے مذاق سمجھا مرا دل دکھا گیا
اس کا سلوک آگ لہو میں لگا گیا

نکلا تھا خود کو ڈھونڈنے اس رہگزار میں
مایوس ہو کے راستا واپس چلا گیا

بستر پہ لیٹے لیٹے مری آنکھ لگ گئی
یہ کون میرے کمرے کی بتی بجھا گیا

اک اک گلی میں ڈھونڈ رہی تھی ہوا مجھے
لہروں کے ساتھ ساتھ مرا نقش پا گیا

تنقید لکھ کر ہنگامہ کھڑا کر دو' ہر شاعر اور ادیب کی تخلیقات کا پوسٹ مارٹم کر دو مثلاً

بابر : ع ٹپک رہا ہے در و دیوار پر مرزا غالبؔ

امان : اچھا میاں کیا صرف باتیں ہی باتیں ہوں گی یا پھر کچھ ٹھنڈا گرم بھی ملتا ہے یہاں۔

شریف : شریف کی بیوی یعنی سب کی بھابھی اس وقت مکان میں نہیں ہیں۔ کچن میں میں نے سفید سیال دیکھا ہے۔ ابھی پتی سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ دودھ ہے یا کچھ اور ہے آخر غریب کا گھر ہے۔ یہاں آپ کو کیا ملتا ہے میں ابھی آتا ہوں۔

امان : کل تو پھل' بسکٹ اور دودھ سے خاطر تواضع کی گئی تھی دیکھیں آج غریب' میرا مطلب ہے شریف سے...

بابر : ع دیکھیں ہمیں غریب سے اب اپنے کیا ملے؟

شریف : یہ لیجئے بسکٹ' میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔

شاکر : اچھا امان بھائی۔ آپ تو بابر بھائی کو بیگم کو میکے سے لانے کی تدبیر بتلا رہے تھے۔ کچھ ایسے گر بتایئے کہ بیگم گھر سے میکے چلی جائے اور ہم مزے کریں۔ کیوں کہ

بابر : ع جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرقت کے رات دن

امان : یار یہ بابر ہے یا سہراب مودی۔ جو کہتا ہے منظوم ہی کہتا ہے۔ ذرا دم ہو تو... میرا مطلب ہے کہ بیوی کو میکے بھگانے کے کئی نسخے ہیں۔ بُوشرٹ پر لمبے لمبے بال لگوانا۔ آفس سے دیر گئے آنا۔ جیب میں دو چار فالتو فون نمبر رکھنا۔ زیادہ بن سنور کر نکلنا پھر دیکھو تمہاری بیگم لڑ جھگڑ کر کیسے میکے نہیں جاتی اور تم آزاد ہو جاؤ گے —

اور...

(اندر سے زنانی آواز گونجتی ہے)

زنانی آواز : اجی بھائی صاحب آپ نے تو اپنی بیگم صاحبہ کو اللہ میاں کے یہاں بھیج دیا۔ اب کیا کالونی کی دیگر عورتوں کو ان کے ماں باپ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ آپ جیسے کاہل چرب زبان اور غلط مشورہ دینے والے لوگوں سے ہی معاشرہ خراب ہو رہا ہے۔ آپ کیوں دوسروں کے ہنستے کھیلتے گھروں کو برباد کرنے پہ تلے ہوئے ہوتے ہیں۔ فوراً نکل جایئے ہمارے گھر سے۔ آئندہ قدم رکھا تو میں اپنے ابا اور بھائی صاحب کو بلا کر خوب مرمت کراؤں گی۔

امان : ارے بھائی بھاگ نکلو۔ اب ادھر کا رخ کبھی نہیں کرنا۔

(تینوں چلے جاتے ہیں۔ شریف اور حمیدہ کمرے میں آتے ہیں)

شریف : بیگم یہ تو کمال ہو گیا۔ جو کام میں کئی سالوں سے نہ کر سکا۔ اس کو تم نے منٹوں میں کر دیا۔ لیکن یہ سب تم سے کیسے ہوا۔

حمیدہ : اجی کیا نہیں ہوتا۔ بقول تمہارے امان بھائی کے... ذرا دم ہو تو...

(دونوں ہنستے ہیں' پردہ گرتا ہے)

●●

ایس۔ ایس۔ چاولہ

طوفانوں کے ملّاح

انہی دنوں میں ایک مشہور کمپنی کا نمائندہ تھا۔ یہ کمپنی انگلستان اور جاپان سے سائیکل منگوا کر ہندوستان میں فروخت کرتی تھی۔ مانگ کافی تھی۔ اور سپلائی کو جان بوجھ کر کم رکھا جاتا تھا تاکہ منافع زیادہ ہو۔ اور اس منافع میں سے سب لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور ملتا تھا۔ ہم بیچنے والے بھی اپنا مناسب حصّہ پاتے تھے۔

جب ٹور پر گیا اور یو۔ پی کے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر اُترا۔ مجھے یہاں سے چار اور جگہوں پر جا کر شام کو لوٹ آنا تھا۔ سٹیشن سے شہر دس میل دُور تھا۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ نہ تو یہاں پر کوئی ہوٹل ہے اور نہ ہی کھانے کے لیے کوئی ڈھابہ ہے۔ گاڑی گزرنے کے بعد سٹیشن قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ سٹیشن کے قریب ایک سرائے تھی۔ وہاں پر مول تول کرنے پر چار آنہ روز پر ایک کمرہ ملا جس میں چارپائی کا کرایہ بھی شامل تھا۔ کمرہ بے حد گندہ تھا اور دن کی کھلی دُھوپ میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ سامان اندر رکھا۔ کھانے پینے کے لیے پوچھ تاچھ کی اور پھر سٹیشن پہنچا۔ یہ دیکھ کر متلی آنے لگی تھی کہ پوڑیاں اور آلو کی سبزی ہزاروں مکھیوں سے ڈھکی پڑی تھیں۔ کھانے کو من نہیں مانا۔ اُدھر بھوک پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

سٹیشن سے باہر آیا تو وہاں پر ایک پان کی دوکان نظر آئی۔ ایک دُبلا پتلا۔ چست نوجوان وہاں کھڑا تھا۔ جب میں نے اُس سے کھانے کے متعلق پُوچھا تو اُس کی بولی سن کر حیرانی ہوئی تھی۔ زبان میں مٹھاس تھی۔ بولنے میں روانی تھی اور الفاظ کے چُناؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا انسان ہے اور کسی اچھے خاندان کا فرد ہے بعد میں پتہ لگا کہ وہ میٹرک پاس ہے۔ نوکری کی کوشش کی۔ وہ نہ ملی تو دوکانداری شروع کر دی تھی۔ میں نے پُوچھا کہ یہاں کہیں دُودھ۔ چائے۔ ڈبل روٹی۔ مکھن بسکٹ۔ کچھ بھی اچھا کھانے کو مل سکے گا۔ اس نے کہا۔ یہ لوگ سوائے دُودھ کے دُوسری چیزوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ ہوں گے۔ میں نے کہا کہ یہاں پر کوئی ایسا گھر ہو گا جہاں کھانا مل سکے گا؟ اس نے کہا: "سردار صاحب کھانا تو آپ غریب خانہ پر بھی کھا سکتے ہیں مگر آپ وہاں کھانا پسند نہیں کریں گے۔" میں نے پوچھا کہ تمہارے گھر میں میرے کھانا نہ کھا سکنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا کہ ادھر کے لوگ ہمارے ساتھ میل جول تو رکھ سکتے ہیں مگر کھانا کھانے پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے جا کر کھانا لے آؤ۔ وہ کہنے لگا کہ بھائی صاحب جب آپ ذرّہ نوازی کرنے پر تُلے ہیں تو چلئے گھر

چلتے ہیں۔ وہاں پر آپ کی دعوت شیرازی ہو جائے گی۔ اس نے دکان بند کی۔ نوجوان کا نام تھا سلیم۔ اس کے گھر میں اس کی ماں اور چھوٹی بہن تھی۔ انہوں نے عزت سے بٹھایا اور بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ میں نے کہا کہ میں ہر شام کو کھانا کھانے آیا کروں گا۔ ماں نے کہا۔ بیٹا۔ اپنا گھر ہے۔ جب مرضی ہو چلے آنا۔ میں نے پیسے دینے چاہے انہوں نے کہا کہ ہم بیٹے سے پیسے نہیں لیں گے۔ اُن کی عظمت کے سامنے میرا سر جھک گیا۔

اگلے دن جب میں اپنے ایجنٹ میسرز بنسی لعل کرشن چندر کو ملنے گیا تو انہوں نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بنسی لعل کرشن چندر کے پتا جی تھے اور کرشن چندر میرا ہم عمر تھا۔ وہ زبان کے صاف اور لین دین کے پکے لگتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں مال ضرورت کے مطابق ملتا رہے یا فاضل مل سکے تو وہ ہر سائیکل پر مجھے مزید پیسے دے سکتے ہیں۔ انہوں نے بڑا زور لگایا کہ میں اُن کے پاس ٹھہروں مگر مجھے اپنی سہولت کی وجہ سے انکار کرنا پڑا۔ بہر حال میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ جانے سے پہلے انہیں مل کر جاؤں گا۔

مانگ اور سپلائی کا فارمولا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے میں نے سلیم کے کانوں میں یہ بات ڈالنی شروع کر دی تھی کہ تم سٹیشن کے باہر ایک چھوٹا سا ڈھابہ کھول لو۔ بعد میں ترقی کرتے ہوئے وہاں ہوٹل بنا لینا۔ میں سلیم کو اپنے ساتھ بنسی لعل کرشن چندر کے پاس لے گیا۔ اپنے بِل کھاتے میں سے میں نے ایک سو روپیہ سلیم کو دلوایا اور انہیں ہدایت کر دی کہ میرے بِل کھاتے میں سے نکلتا جتنا روپیہ سلیم میاں چاہیں انہیں دے دیا جائے۔ سلیم نے انکار کیا تو میں نے کہا بھئی تم کاروبار چلاؤ اور جب تم خوب ترقی کر جاؤ تو میرا روپیہ واپس لوٹا دینا۔

پہلے ٹور کے بعد میں کئی بار وہاں آیا۔ سلیم نے ڈھابہ کھول لیا تھا۔ کئی چارپائیاں وہ کرائے پر دیتا تھا۔ ایسے وقت گزرتا گیا۔ پھر میں نے کمپنی کا کام چھوڑ دیا۔ اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا اور اُسی میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ تب تک سلیم میاں نے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ جب بھی میں وہاں گیا، کھانا میں ان کے گھر پر ہی جا کر کھاتا تھا۔ مجھے سلیم کی ترقی دیکھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

میرا کاروبار اچھا چل نکلا تھا۔ پھر شادی ہو گئی، بچے آئے، بڑے ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ دو لڑکے میرے ساتھ کاروبار میں لگ گئے۔ چھوٹے کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ انجینئرنگ کرنا چاہتا تھا۔ اب ڈاکٹری یا انجینئرنگ میں یا تو بے حد قابلیت پاس ہو۔۔۔ یا سفارش لڑائی جائے یا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا چندہ دیا جائے اور عوض میں ایک سیٹ حاصل کر لی جائے۔ سلیم میاں والے سٹیشن کے قریب حال ہی میں ایک انجینئرنگ کالج کھلا تھا۔ جس نے بہت کم عرصہ میں بے حد شہرت پائی تھی۔ سو ہم نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو اپنے بیٹے کو وہاں داخلہ دلایا جائے۔ میں اور میرا بیٹا وہاں پہنچ گئے۔ اب وہ بہت بڑا سٹیشن بن چکا تھا۔ کئی بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ تانگہ اڈا تو کہیں بھی دکھائی نہیں دیا البتہ ٹیکسیاں۔ آٹو رکشا۔ لائن در لائن کھڑی تھیں۔ میں نے سلیم کے متعلق پوچھا بھی مگر کوئی بھی اس نام سے آشنا نہ تھا۔

ہم لوگ کالج پہنچے تو ہمیں لاؤنج میں بٹھا دیا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد ایک باوقار شخصیت۔ شانِ بے نیازی سے ہم لوگوں کے قریب سے گزری۔ کسی نے کہا کہ یہ سید صاحب اس کالج کے بانی ہیں۔ ایک بجے کے قریب ہمیں کھانے کے لئے ایک گھنٹہ کی چھٹی ملی۔ ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو کالج کا ایک کارندہ ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ سید صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ دفتر کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہم بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ بعد سید صاحب تشریف لائے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ارے۔ سلیم میاں۔ کیا حال ہے؟" وہ مُسکراتا ہوا جُھکا اور میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے کہا بھائی صاحب میں نے تو آپ کو آپ کے تِل کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔ مزید تصدیق اپنے بیٹے کی عرضی سے کر لی تھی۔ مگر آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ میں نے کہا کہ تمہاری چال کی وجہ سے تمہارے قدموں کی تیزی جو دل کی تیزی کی ترجمانی کرتی ہے، تب میرے لئے باعثِ دلچسپی تھی اور آج باعثِ پہچان ہوئی ہے۔ میں نے سلیم کو اپنے بیٹے سے ملوایا۔ اس نے ہمیں گھر چلنے کے لئے کہا اور بتایا کہ امی جان تو اب بیٹوں کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں ہونگی۔ وہ تو اپنے اصلی گھر چلی گئیں۔ بہنیں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ خدا نے دو بیٹے دیئے تھے، وہ واپس لے لئے۔ اب ایک لڑکی نسیم ہے۔ سلیم کی آنکھوں میں نمی تھی، ایسے جب قریب ہوں تو جذبات اور زبان دونوں آزادی

حاصل کرلیتے ہیں۔

گھر کیا تھا۔ ایک محل تھا۔ سنگ مرمر کی یہ عمارت بناوٹ و سجاوٹ میں کسی شاعر کے خواب کی تعبیر تھی۔ بیگم سلیم کی صورت بے حد دلکش تھی۔ مسکراتا چہرہ نیک سیرتی کی گواہی دیتا تھا۔ نسیم بہت پیاری گڑیا سی لڑکی تھی۔

سلیم نے کہا کہ دیکھو بیگم یہ ہمارے بڑے بھائی صاحب ہیں اور ساتھ ہی ہم آپ کی خدمت میں ایک خوبصورت بانکا بیٹا پیش کر رہے ہیں۔ میرا بیٹا مجھ کا تو ماتا کی ممتا سے بھی ڈوب ڈوب کر ابھرتی آواز آرہی تھی۔ "بیٹا! جب دل جھک جاتا ہے تو آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ آنکھیں جھک جائیں تو جسم کو جھکنے کی تکلیف نہیں دینی چاہیئے" پھر انہوں نے مجھے میرے بیٹے کو پیار اور ان گنت دعاؤں سے لاد دیا۔ نسیم نے میرے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ چلو بھیا۔ پہلے تمہیں اپنا گھر دکھادوں۔

کھانے کے دوران سلیم کہنے لگا۔ "بھائی صاحب۔ ہمارا بیٹا اب ہمارے پاس ہی رہے گا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں ہوں گے تو گھر مکمل لگے گا۔" میرے بیٹے نے کہا۔ "نہیں انکل۔ رہوں گا تو میں ہوسٹل میں ہی وہاں پڑھنے کا ماحول اور ہوتا ہے۔ ویسے آپ کو ملنے روز آجایا کروں گا" نسیم کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ بھائی جان اگر آپ ہوسٹل میں رہنا پسند کریں گے تو میں بھی وہاں ہی رہوں گی" ان دونوں میں نوک جھونک چل رہی تھی کہ سلیم کا قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے کہا۔ "بھائی صاحب۔ آج ان دونوں کی باتیں سن کر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے صحرا میں باد نسیم چلنے لگی ہے" ..... بیگم سلیم نے کہا۔ "دیکھو بیٹا! اس گھر میں صرف ایک پابندی تم پر لگے گی کہ تم ناشتہ۔ دوپہر اور رات کے کھانے پر موجود ہوگے۔ اس کے علاوہ تمہارے اور کسی کام پر پابندی نہیں ہوگی" کچھ انکار ہوا کچھ اصرار ہوا اور آخر میرا بیٹا وہاں رہنے پر رضامند ہوگیا۔

سلیم نے کہا کہ بھائی صاحب۔ آج شام کو سب مل کر لالہ جی کے گھر چلتے ہیں۔ وہ بھی بغیر اطلاع دیئے۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ہم لالہ جی کے گھر پہنچے۔ لالہ جی کہنے لگے "سلیم میاں۔ عید تو نہیں آئی مگر آج ہمارے گھر کے آسمان پر عید کے دو دو چاند کیسے طلوع ہوگئے!" لالہ جی نے کیا غضب کی پہچان پائی تھی۔ مدتوں بعد میں انہیں ملا تھا اور جیسے بس تہ دل کی گہرائیوں سے ہی انہوں نے پہچان کو ناپ لیا تھا۔ وہ بہت پیار و تپاک سے ملے۔ جلدی ہی گھر کے افراد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ مرد بزرگ الگ۔ عورتیں ایک طرف۔ اور نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک طرف۔ میں نے کہا "سلیم نے اتنی ترقی کرکے ہم سب کا سر فخر سے بلند کردیا ہے"۔ سلیم نے انکساری سے کہا "میں تو لالہ جی سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے سردار بھائی میرے ہوں گے۔ کاروبار۔ اس کالج کے بانی ہیں اور لالہ جی ان تمام کاموں کے دانی ہیں۔ اور میں تو محض ایک کرم چاری ہوں۔ سردار بھائی اگر مجھے پڑھا دا نہ دیتے۔ پہلا سو روپیہ اور مزید روپیہ نہ دیتے اور پھر لالہ جی آپ میرے لیے اپنی تجوری کا منہ نہ کھول دیتے تو میں تو سٹیشن کے باہر پان سگریٹ کے اسی سٹال کا مالک ہوتا"۔

رات کی دعوت لالہ جی کے ہاں رہی۔ ہم سب لوگ اکٹھے بیٹھے تھے کہ لالہ جی نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا "آج میں چند باتیں آپ سب کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے آج اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا مگر خوبصورت ہندوستان نظر آرہا ہے۔ جہاں۔ ہندو۔ مسلمان، سکھ بھائی چارہ ایک خاندان میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔ سلیم نے ٹھیک کہا ہے کہ میرا سردار بیٹا، سلیم کے ان تمام کاموں کا بانی ہے اور میرا بیٹا دانی ہے۔ جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ سلیم کی مالی امداد کی جائے۔ سلیم نے پان کی دکان کے بعد ڈھابہ کھولا۔ ہوٹل کھولا۔ بیوپار شروع کیا اور آج اس کی ترقی پر ہمیں فخر ہے۔ ہمارے زمانہ میں اپنے تو اپنے ہوتے ہی تھے۔ ہم لوگ دوسروں کو بھی اپنا کر انہیں اپنا بنا کر فخر کرتے تھے۔ مگر آج کے دور میں ہم دوسروں کو تو کہاں اپناتے ہیں۔ ہم اپنوں کو بھی اپنے سے دور کرکے فخر محسوس کیا کرتے ہیں۔ سو آپ اپنوں کو بھی اور غیروں کو بھی اپنانا سیکھیئے۔ ترقی اور خوشی کی طرف یہ پہلا قدم ہوتا ہے۔ پہلے سلیم اکیلا تھا۔ اب تم تینوں ہو۔

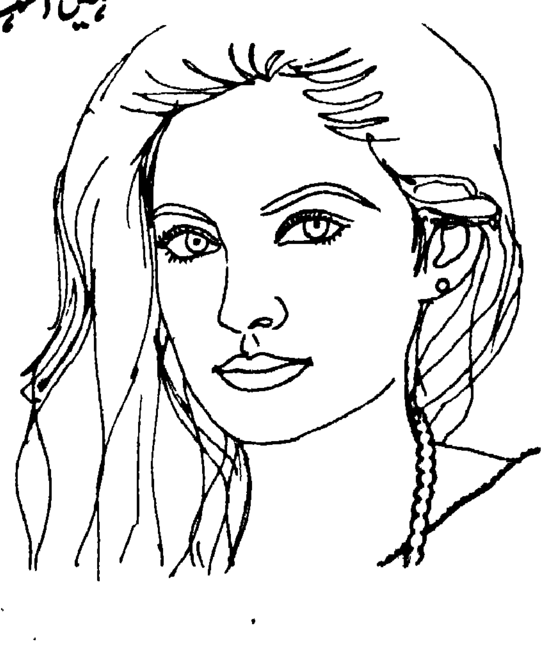
سب سے اہم کام آپ لوگ یہ کیجئے کہ آپ اس کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کیجئے۔ اس کام کے لئے ۲۰ لاکھ میں آپ کو ایک کروڑ روپیہ دیتا ہوں۔ جتنا روپیہ اور چاہیئے وہ بھی فراہم کروں گا۔ اور جتنی زمین آپ کو جہاں کہیں چاہیئے۔ وہ بھی میں لے کر دوں گا۔ بس کام آپ کو کرنا پڑے گا کہ اس یونیورسٹی میں عام پڑھنے والے طالب علم

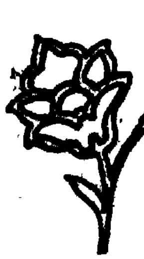
(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

غزل

شو دیال سحاب

یہ حُسنِ زندگی ہے زِندگی میں
مقدم ہے غم اُن کا ہر خوشی میں
خوشی ہوتی بھی کیا میری خوشی میں
جو اُن کا غم نہ ہوتا زندگی میں
یہ اعجازِ نظر ہے آگہی میں
گلستاں دیکھتا ہوں ہر کلی میں
نظر جانے لگی اب ہر کسی پر
نظر آنے لگے تم ہر کسی میں
مَیں خود سے بھی جُدا۔ دِل سے بھی بے دِل
یہ کیا جادُو ہے تیری دِلبری میں
تمہیں یا تم ہو یقیناً کارفرما
محبت کی نظر میں، بے رُخی میں
اِک اِک انداز کی سَو سَو زباں ہے
ہزاروں شوخیاں اِک سادگی میں
اَزل سے غم کا رِشتہ ہے خوشی سے
نہیں غم کے سِوا کچھ بھی خوشی میں
کِھلیں بھی تو خزاں میں پھُول کیوں کر
اجل پنہاں ہے بے موسم ہنسی میں
کہیں اظہارِ مستی ہو نہ جائے
سحاب اِس احتیاطِ ضبط ہی میں





عظیمہ اقبال　　　　افسانہ

سمجھوتہ

حمیدہ کے لئے تو گویا زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔ زبان تو جیسے گنگ ہو گئی ـــــ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔ کبھی بہت سی باتیں کرنے کے باوجود آدمی وہ نہیں کہہ پاتا جو وہ کہنا چاہتا ہے اور کبھی کچھ نہ کہہ کر بھی آدمی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ حمیدہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کی خاموشی نے احمد سے بہت کچھ کہہ دیا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ حمیدہ خود کو نہ تو کچھ سمجھا ہی پا رہی تھی اور نہ ذہنی طور پر اس جھٹکے کے لئے خود کو تیار ہی کر پائی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے لاڈلے بیٹے احمد نے اسکو دیا تھا۔ احمد نے خوشی سے ماں کو لپٹایا اور فیصلہ کن انداز میں اسکو بتایا "امی میرا تقرر ہو گیا ہے۔ میں اگلے اتوار کو ریاض جا رہا ہوں"۔ یہ کہہ کر احمد ایک بار پھر ماں کے گلے میں جھول سا گیا۔ "کیوں ٹھیک ہے نا ماں؟" احمد نے خوش ہو کر پوچھا۔

حمیدہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ احمد کے الفاظ نے ہی نہیں بلکہ اسکے لہجے نے بھی اسکو چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ سوچنے لگی اجازت مانگنے کا کتنا انوکھا انداز ہے اس ماڈرن زمانہ کا۔ جب سب کام مکمل کر لیا تو ماں کو بھی خبر کر دی۔ اس طرح گویا اُن پر بڑا احسان کیا اور اس پہ طرہ یہ کہ پوچھتے ہیں ٹھیک ہے نا۔ واہ! کیا خوب اجازت مانگی ہے۔ دل کا کام تمام کر دیا اور اس لڑکے کے لئے جسے انہوں نے اپنا خون پلا کر پالا ہے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ان سے جُدائی اس کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ حمیدہ کو لگا جیسے وہ زندگی کے سفر کی کافی سیڑھیاں اُتر چکی ہو اور آج اچانک ہی آگے کی سیڑھیاں غائب ہو گئی ہوں۔ ان کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں باوجود انتہائی ضبط کے چھلچھلا آئیں۔

ماں کی خاموشی اور اس کی آنکھوں کا چھلچھلا جانا احمد کو اچھا نہیں لگا اور اس نے رُوکھے پن سے کہا۔

"امی! تم واقعی بڑی جذباتی ہو۔ زندگی جذبات سے نہیں کٹتی۔ زندگی گزارنے کے لئے جذبات کا نہیں عقل کا سہارا لینا پڑتا ہے"۔ یہ کہہ کر اور کچھ کاغذات بغل میں دبا کر احمد دروازہ سے باہر نکل گیا۔ احمد کا یہ رویہ حمیدہ کے لئے تکلیف دہ تھا لیکن اس کے لئے ایسا کرنا بعید از قیاس نہیں تھا کیونکہ اس پر باہر جانے کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اور یہ نشہ اس کے دل و دماغ میں سرایت کر گیا تھا۔

حمیدہ کے لئے تو احمد کے کھلنے بھرسے ہی پلک جھپکتے ہی جیسے بہار خزاں بن گئی ہو۔ انہیں زندگی میں پہلی بار اپنے بیوہ اور بے سہارا ہونے کا احساس ہُوا۔ اب تک تو احمد کا سہارا ان کی تلاطم خیز زندگی میں ٹھہراؤ تھا۔ جب انسان کی خوش فہمیاں حقیقت کی ٹھوس چٹانوں سے ٹکراتی ہیں تو ایسے میں دل کی حالت محسوس کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہر احساس کو نہ تو ظاہر ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہر جذبہ کو انسان زبان ہی دے سکتا ہے۔ آج انہیں اس حقیقت کی سچائی کا احساس ہوا کہ کبھی کبھی کوئی دماغی تکلیف جسمانی تکلیف سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

بڑی منتوں اور مُرادوں کے بعد تو حمیدہ کی گود ہری ہوئی تھی۔ اسکی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ان کا آنگن سونا تھا۔ بچّے کے لئے حمیدہ اور اس کا شوہر دونوں ہی پریشان تھے لیکن ابھی قدرت کے یہاں دیر تھی۔ علاج بھی بیکار رہا۔ اسی کشمکش میں چھ سال کا عرصہ بیت گیا اور وہ دونوں مایوس ہو کر بیٹھ رہے کہ اچانک حمیدہ کی گود ہری ہو گئی۔ ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ حمیدہ کی صحت اور غذا کا خُوب دھیان رکھا جانے لگا۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اچانک ہی حمیدہ کے شوہر کی موت ہو گئی — نہ دُکھ نہ بیماری۔ بس بیٹھے بیٹھے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ پُورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ حمیدہ کی عمر اس وقت مشکل سے ۲۵ سال ہوگی اور اس پر بیوگی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دُکھ کے ان لمحات میں بھی حمیدہ نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ آنے والے بچّے کی خاطر اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پیتی رہی۔ اس غم و الم کی حالت میں تین ماہ بعد حمیدہ نے احمد کو جنم دیا۔ پھر خود کو احمد کی ذات میں مدغم کر دیا۔ لے دے کر احمد کی ذات ہی تو تھی جس کی وجہ سے اس نے دُنیا سے ناطہ جوڑ رکھا تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا بجھایا کہ دُوسری شادی کر لو۔ ابھی جوان ہو۔ بچّہ کا ساتھ ہے۔ کس طرح پہاڑ سی زندگی کٹے گی لیکن انہوں نے اپنے بچّے کی خاطر بیوگی کا دائمی چولا پہن لیا۔ اگر انہوں نے دُوسری شادی کر لی تو ان کا پھول سا بیٹا کمہلا جائے گا اس لئے وہ کبھی یہ قدم نہیں اُٹھائیں گی۔ اس کی زندگی میں کبھی خزاں کا گزر نہیں ہونے دیں گی۔ احمد ہی تو ان کے شوہر کی واحد نشانی ہے۔ اسلئے حمیدہ نے اپنے لاڈ پیار اور توجہ سے احمد کی پرورش کی۔ زمانہ کی سرد گرم ہواؤں سے بچا کر اس کو اپنے آنچل کی چھاؤں میں محفوظ رکھا۔ اس کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ انجینئرنگ کا کورس کرایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور کسی طرح بھی احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو کہ باپ کے نہ ہونے سے وہ اُونچی تعلیم سے محروم رہا۔

احمد کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور حمیدہ کو اس کی نوکری کی فکر دامنگیر تھی کہ وہ جلدی سے کہیں لگ جائے تب وہ اس کا گھر بسا سکیں گی، من چاہی بہو لائیں گی۔ ان کا سُونا آنگن بھی بہو بیٹے کے ہونے سے دمک اُٹھے گا اور پھر ان کے یہاں بھی ننھی کونپلیں پھُوٹیں گی — بچوّں کی کلکاریوں سے ان کے آنگن میں بھی بہار آجائے گی۔

لیکن انسان کی سوچ کب پُوری ہوتی ہے۔ وہ نئے نئے منصوبے بناتا ہے لیکن قُدرت پل بھر میں ان کا خاتمہ کر دیتی ہے! احمد نے جو فیصلہ ان کو سُنایا تھا اس نے اُنہیں توڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ اسی سوچ میں نہ جانے کب اور کیسے ان کو جھپکی آ گئی۔ جب آنکھ کھُلی تو دیکھا کافی وقت ہو چکا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، بال سنوارے اور پھر چائے بنانے لگیں کہ اتنے میں احمد باہر سے آ گیا اور حمیدہ سے بولا:

"امّی! کیا چائے بن گئی؟"

"ہاں بیٹا"

"پھر فوراً نکال دیجئے۔ مجھے جلدی جانا ہے۔"

حمیدہ نے دو پیالیوں میں چائے نکالی۔ بسکٹ، نمکین پلیٹوں میں رکھ کر احمد کی طرف بڑھا دی۔ احمد نے جلدی جلدی چائے منہ میں انڈیلی ایک پھنکا نمکین کا مارا اور منہ میں ایک بسکٹ دبا کر ہاتھ ہلاتا ہُوا غائب ہو گیا۔ اس وقت احمد بے حد مشغول تھا اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اس درجہ مسرور تھا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔

حمیدہ احمد کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ اُداسی، افسردگی اور مایُوسی کے مِلے جُلے تاثرات اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے اور وہ من مسوس کر رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ انسان کے سپنے اکثر سپنے ہی کیوں رہ جاتے ہیں؟ ماں باپ اپنی زندگی میں کوئی

لطف و کیف باقی نظر نہیں آیا۔ دل جب زیادہ گھبرایا تو کھڑکی میں آ کھڑی ہوگئی۔ شاید باہر کے نظارے سے اس کے دلِ بیقرار کو قرار آ جائے۔ باہر تھوڑی خنکی تھی۔ سُرمئی بادل خراماں خراماں ہوا کے دوش پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ سامنے برگد کے پیڑ میں چڑیا کا گھونسلہ اب بھی جیوں کا تیوں تھا۔ چڑیا معمول کے مطابق اپنے بچوں کے لئے محنت شاقہ اور جانفشانی سے دانہ تلاش کر کے لائی اور خود اپنی ہی چونچ سے وہ دانہ ان ننھے منھے بچوں کے منہ میں ڈالنے لگی۔ چڑیا کے بچے خود نہ تو دانہ چُگنے کے قابل تھے اور نہ پرواز کرنے کے۔ لیکن آج وہ قدرے بڑے لگ رہے تھے۔ بار بار اپنے پروں کو سمیٹ کر جست سی لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حمیدہ نے سوچا اب دو چار روز میں یہ بچے اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر اُڑ کر دُور چلے جائیں گے۔ تب ان کو ماں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ پھر یہ بچے اپنی ماں کے پاس کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک کوندا سا لپکا اور حمیدہ نے سوچا کہ چڑیا کو تو اپنی مقررہ حد معلوم ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا اور اس کے بچوں کا ساتھ یہیں تک رہنا ہے۔ اس لئے وہ نہ تو اپنے بچوں سے کوئی اُمید رکھتی ہے اور نہ اس نے اس بابت کوئی خواب ہی بُنے ہیں۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ ہر چیز کو سُود و زیاں کی ترازو میں تولتا ہے۔ یہی اس کا پیمانہ ہوتا ہے۔ وہ اتنے معمولی پرندے سے بھی گیا گزرا ہے۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ کھونے اور پانے کے پلڑوں میں برابری کیسی؟ زندگی صرف لینے اور دینے کا نام ہے لیکن ماں جس ہستی کا نام ہے وہ تو صرف دینا ہی جانتی ہے اپنی ممتا کا انمول امرت ——— اپنی مادرانہ محبت کے عوض میں اگر وہ اولاد سے کچھ پانے کی طلب گار ہے تو اس کا یہ عمل اس کے مرتبہ کی عظمت کے خلاف ہے۔ یہی سب سوچ کر حمیدہ کے دل پر مرہم سا لگا کہ سب کچھ بڑے بڑے نفع کے لئے نہیں کیا جاتا۔ بہت سی باتیں اطمینانِ قلب اور روحانی سکون کے لئے بھی کی جاتی ہیں۔ پھر حمیدہ کا خیال چڑیا کی طرف لوٹ آیا۔ چڑیا ایک مرتبہ کے انڈوں کو سے کر بچے نکلنے اور ان کے پر نکلنے کے مراحل طے کرنے کے بعد جب بچے اُڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ماں کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں تو پھر وہ نئے سرے سے گھونسلہ بناتی ہے۔ انڈے دیتی ہے اور پھر بچوں کو پروان چڑھاتی ہے اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ آج ایک گیا ہے، کل دوسرا ۔ ۔ ۔ جائے گا اور پرسوں تیسرا۔ یہی دستورِ دُنیا ہے۔

اس لئے حمیدہ نے بھی ایک پختہ ارادہ کر لیا۔ خوف و ہراس افسردگی اور مایوسی کو اپنے دامن سے جھٹک دیا۔ وہ اٹھیں، غسل کیا، بال سنوارے اور احمد کی ہدایت کے بموجب اس کے کپڑے نئے پہن لئے۔ جو کمرے سے تھے ان کو دھو دیا، جن کو درست کرنا تھا ان کو ٹھیک کیا اور دوسری چیزیں جو احمد سے متعلق تھیں ان کو یکجا کر دیا کہ احمد کو ادھر اُدھر بکھری اپنی چیزوں کو سمیٹنے میں دشواری نہ ہو۔ پھر وہ رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ احمد کے لئے آج کوفتے اور مٹر پلاؤ پکاؤں چونکہ وہ ان چیزوں کا بڑا شائق ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر حمیدہ ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگیں لیکن جو پڑھتیں وہ دوسرے ہی لمحہ دماغ سے نکل جاتا۔ خیالات بار بار منتشر ہو رہے تھے سوچتیں کہ احمد کے جانے کے بعد ان کی مصروفیت کیا رہ جائے گی؟ جو کچھ تھا اسی کے دم سے تھا۔ جینے کی اُمنگ اب کس کے لئے باقی رہے گی؟ لیکن پھر خیال آیا کہ ہمت اور حوصلہ کھونا بھی تو جوانمردی نہیں۔ وہ اتنی بات کے لئے کیوں ہتھیار ڈال دیں؟ ابھی تو ان کی زندگی کے صرف ۵۰ سال ہی بیتے ہیں ابھی تو کافی بڑی زندگی جینا ہے ان کو۔ اگر احمد اپنی پسند سے ملازمت کرنا اور اپنے ڈھنگ سے جیون جینا چاہتا ہے تو وہ بھی کوئی کاٹھ کی مورتی نہیں ہیں۔ گوشت و پوست کی انسان ہیں۔ انہیں بھی اپنے ڈھنگ اور اپنی پسند سے زندگی گزارنے کا حق ہے۔ احمد جا رہا ہے تو ضرور جائے، شوق سے جائے، شوق سے جائے۔ وہ کچھ نہ کچھ اپنا بندوبست کرے گی۔ جیون جینے کے لئے کئی بار سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ منہ مانگی چیز دُنیا میں کسے میسر آتی ہے؟ اگر یہی زندگی ہے تو یونہی سہی۔ وہ اس سے بھی سمجھوتہ کرے گی۔ اگر بڑی خوشی انسان کو میسر نہ آئے تو اس کی چھوٹی خوشیوں کو ہی گلے لگا لینا چاہیئے۔ حمیدہ سوچنے لگی کہ وہ احمد کو بتا دے گی کہ وہ بھی جی سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کر بھی سکتی ہے اور زندگی کا یہ طویل سفر وہ اس کے بغیر بھی ہنسی خوشی کاٹ سکتی ہے۔

سوچتے ہی انہیں اپنے پڑوسیوں کا خیال آ گیا۔ ان کے گھر کے بائیں طرف تو متوسط طبقہ کے لوگوں کے مکانات تھے۔ پہاڑ

مسٹر یادو کا تھا جو نکڑ بازار میں کپڑے کی چھوٹی سی دکان تھی ان کے پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا اس کے برابر ایک عمران فوٹوگرافر رہتا تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ عمران کے مکان سے ملحق تحصیلدار صاحب کا پکا مکان تھا۔ ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ کاشتکار تھے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی کافی دھوم دھام سے کر چکے تھے۔ تینوں لڑکے ابھی پڑھ رہے تھے۔

دائیں جانب غرباء کے مکانات تھے۔ ان میں زیادہ تر باورچی تھے کچھ قلعی گر اور سبزی و پھل فروش تھے کچھ کپڑوں کی پھیری کرنے والے تھے۔ ان گھروں میں حمیدہ کا آنا جانا کاہے کو ہوتا البتہ ادھر ہی ایک ماسٹرنی بھی رہا کرتی تھیں ان سے ان کا بہناپا تھا۔ اکثر فرصت کے اوقات وہ ان کے پاس اٹھ بیٹھ آتی تھیں خاص طور سے جاڑوں میں اون اور سلائیاں ہاتھ میں لئے چلی جاتیں اور گپ شپ کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی رہتیں۔ ماسٹرنی سے ان کو پتہ چلا کہ ادھر ایک بیوہ عورت رہتی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کا بھائی پھلوں کا ٹھیلہ لگاتا ہے لیکن بھاوج کی آنکھوں میں نند اور اس کے دونوں بچے بری طرح کھٹکتے ہیں۔ ایک قلعی گر کے یہاں ایک اپاہج بچہ ہے۔ محلہ کے بچے اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور طرح طرح سے تنگ و پریشان کرتے ہیں۔ اس لئے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ حمیدہ کو ان غریب پڑوسیوں کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگی اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے پھر کیوں نہ وہ ان غربا کی مدد کرے۔ پیٹ بھروں کو دینے سے کوئی فائدہ نہیں اصل میں دینا تو ضرورتمندوں کا ہے۔ انسان اپنے لئے تو سب کچھ کرتا ہی ہے۔ قابلِ تعریف وہ ہے جو دوسروں کے لئے کچھ کرے۔

یہ طے کر کے حمیدہ نے پڑوس کے غریب بچوں کے لئے اپنے گھر میں اسکول کھول دیا۔ وہ نہ صرف بچوں کو پڑھاتی بلکہ ان کو پڑھنے کی ساری چیزیں فراہم کرتی تھی۔ کتابیں، پنسل، قلم، ربڑ وغیرہ تو وہ دیتی ہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انٹرول میں ان کو بسکٹ، ٹافیاں وغیرہ بھی بانٹتی۔ اس سے اس کو نہ صرف مسرت ہوتی بلکہ اس کو اطمینانِ قلب بھی حاصل ہوتا۔ بہت جلد محلہ کے غریب لوگوں میں وہ مقبول ہو گئی۔ اس نے اپنی بے مقصد زندگی کو بامقصد بنا لیا تھا۔

حمیدہ صبح سویرے اٹھ جاتی۔ نو بجے اسکول شروع ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے سارے کام نمٹا لیتی اور پھر پورے انہماک سے بچوں کو پڑھاتی بچے اس سے خوب ہل مل گئے تھے۔ اسکول کے اوقات کے علاوہ بھی ان کا آنا جانا حمیدہ کے پاس لگا ہی رہتا۔ حمیدہ اپاہج بچے کا بڑا خیال رکھتی۔ وہ بھی اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔

امتحان ختم ہو چکے تھے۔ حمیدہ نے بچوں کے لئے ایک پارٹی کا انتظام کیا تھا سب چیزیں میز پر سجا کر وہ کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ اتفاق سے چائے کا بھگونا اس کے ہاتھ پر لوٹ گیا اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کا ہاتھ بری طرح سے جل گیا تھا۔ پھر کیا تھا سارے بچوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کوئی دوڑ کر اپنی ماں کو، کوئی بہن کو اور کوئی خالہ یا پھوپھی کو بلا لایا۔ سب نے مل کر حمیدہ کی خوب خدمت کی۔ جی جان سے سب نے اس کو آرام دیا۔ اور کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کہ کہیں پانی لگنے سے زخم خراب نہ ہو جائے۔ حمیدہ کے سب کام بچوں کی مائیں بہنیں ذمہ داری سے کر جاتیں وقت سے اس کے کپڑے بھی دھل جاتے، کھانا بھی پک جاتا اور گھر کی صفائی وغیرہ بھی ہو جاتی۔

حمیدہ نے سوچا اس نے جو کچھ غریب بچوں کو دیا اس کو انہوں نے سود سمیت اسے لوٹا دیا ہے۔ خوشی غم، تیوہار ہر موقعہ پر حمیدہ کو اس کے پڑوسی ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اب کبھی بھول کر بھی حمیدہ کو احمد کی لاپرواہی اور بے نیازی کا احساس نہ ستاتا۔ احمد نے اپنی پسند کی زندگی جی اور ان کو نظر انداز کیا لیکن خدا نے حمیدہ کو اس وقت اتنی سمجھ دے دی کہ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرے۔ جو جا رہا ہے کیا وہ روکنے سے کبھی رکا ہے اور اگر رک بھی جائے تو کیا فائدہ؟ کہہ کہہ کر اور مانگ کر پیار حاصل نہیں ہو سکتا۔ پیار تو ایک اندرونی جذبہ ہے خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ پھر کسی کے چلے جانے پر کوئی جگہ خالی نہیں رہ جاتی کوئی نہ کوئی وہ جگہ بھر دیتا ہے۔ پہلے حمیدہ کو اکثر و بیشتر تنہائی کا احساس ستاتا تھا، خدا اور اس کی

سازؔ اناوی

اتحاد کی خوشبو

پنچھی
حدودِ صحنِ گلستاں سے اُڑ گیا
باقی ہے،
پھر بھی،
اس کے ترانوں کا بانکپن
روشن ہے
فیضِ نور سے،
پھولوں کی انجمن
ذرّوں کو،
آفتاب کا ہمسر بنا دیا۔
گلشن کو،
روکشِ مہ و اختر بنا دیا۔
شاخوں کو،
بجلیوں کے غضب سے بچا لیا۔
امن و اماں کے
اُس نے،
فروزاں کیے چراغ،
دھرتی سے،
نفرتوں کے اندھیرے مٹا دیے
ہر ناتواں کو،
حوصلۂ زندگی ملا،
رگ رگ میں
اتحاد کی خوشبو ہے موجزن۔
خاکِ چمن کو،
خونِ جگر سے سنوار کر،
پنچھی
حدودِ صحن گلستاں سے اُڑ گیا
لیکن
یہ کہہ رہا ہے ترنگا فضاؤں میں
زندہ رہے گا
تا بہ ابد
اِندرا کا نام

بات کو طول دینا اور محسوس کرنا اس کا مزاج بن گیا تھا اور وہ کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی لیکن اب اس کے مزاج میں زبردست تبدیلی آ گئی تھی۔ اب نہ وہ مزاج میں گرمی تھی، نہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاپن اور نہ ہی اس کو تنہائی کا احساس ستاتا بلکہ اب تو وہ چاہتی کہ اس کو کچھ دیر کی تنہائی مل جائے۔ پہلے اس کو پل پل گن گن کر کاٹنا پڑتا تھا۔ اب وقت کے پنکھ لگ گئے تھے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کو اپنے اس کام نے بے حد سکون اور اطمینان

قلب عطا کیا تھا۔ اس کے گالوں کے گلاب کھل اُٹھے تھے اور آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ چہرہ پر کچھ کر دکھانے کی اُمنگ و حوصلہ تھا۔ اب وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ زندگی کا سخت دور گزر چکا تھا۔ وہ وقت جو احمد کی جدائی کا تھا۔ اس وقت اسکو اپنی زندگی کا سفینہ ڈوبتا نظر آیا تھا مگر اب تو پڑوس کے بچے اس کی زندگی کو بھنور سے نکال لائے تھے۔

●●



● جولائی ۸۷ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اس میں ڈاکٹر محمد حنیف کا مقالہ "غالب کا نظریۂ فن" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر نریش، صغرا مہدی اور الیاس فرحت کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ غزلوں کا انتخاب بھی دلکش ہے۔ خاص طور پر سورج تنویر اور ہیرانند سوز کی غزلیں پسند آئیں۔
جنید حزیں (بنارس)

● زیرِ نظر شمارہ (جولائی ۸۷ء) میں جوگندر پال کا افسانہ "نئے لوگ" ڈاکٹر نریش کی کہانی "کھلا دروازہ" ہیرانند سوز، کرشن ادیب، قیس جالندھری اور مہدی پرتاب گڑھی کی غزلیں معیاری اور لائق مطالعہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی ادارت میں رسالہ متواتر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔
ظہیر غازی پوری (ہزاری باغ)

● ماہ جولائی ۸۷ء کا شمارہ دست ہوا۔ اس شمارے میں ڈاکٹر نریش کا افسانہ "کھلا دروازہ" کافی اچھا لگا۔ افسانہ "روشنی" بھی عمدہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حنیف کا مقالہ "غالب کا نظریۂ فن" اچھا لگا۔ ہیرانند سوز اور مہدی پرتاب گڑھی، شان بھارتی کا کلام معیاری ہے۔
محمد نہال فاروقی (مظفر پور)

● "تعمیرِ ہریانہ" جولائی ۸۷ء نظر نواز ہوا۔ رسالے میں پہلے کی نسبت کافی نکھار آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حنیف کا مقالہ "غالب کا نظریۂ فن" بے حد معلوماتی، معیاری اور دلچسپ ہے۔ ندیم انصاری کا "روشنی" صغرا مہدی کا "غریب خانہ" اور الیاس فرحت کا "تنہا تنہا" بہت خوب رہے۔ حصۂ نظم میں سورج تنویر اور قیس کا کلام پسند آیا۔
اقبال رضا (ارریہ کورٹ)

● جولائی ۸۷ کا تعمیر ملا۔ ڈاکٹر محمد حنیف کا "غالب کا نظریۂ فن" معلوماتی مقالہ ہے۔ جوگندر پال اور ڈاکٹر نریش کی تخلیقات قابلِ تعریف ہیں۔ مہدی پرتاب گڑھی، ہیرانند سوز، سورج تنویر اور شان بھارتی کی غزلیں اچھی ہیں۔ ہیرانند سوز کے اس شعر نے کافی متاثر کیا ہے

چلے جو خانۂ دل میں اداسیوں کی ہوا
تو دور حدِ نظر تک غبار ہوتا ہے

حسن نظامی (مصطفی آباد)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ایس۔ کے۔ جین نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس سی۔ او نمبر ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر ۱۷-سی چنڈی گڑھ سے اکتوبر، نومبر ۱۹۸۷ء کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ



عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہریانہ راج بھون، چنڈی گڑھ میں جناب سیتا رام سنگلا کو وزیرِ ریاست کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔ عالیجناب دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو پانچ پارلیمنٹری سیکرٹریوں (بائیں جانب سے) جناب بھاگ مل، جناب لچھمن داس کمبوج، جناب بھاگی رام، جناب سچدیو تیاگی اور جناب رتن لال کٹاریہ کو حلف دلانے کے بعد اُن کے درمیان۔





عالیجناب دیوی لال وزیرِاعلیٰ ہریانہ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ریواڑی میں راؤ تُلارام کے مجسّمہ کا سنگِ بُنیاد رکھتے ہُوئے ۔

عالیجناب دیوی لال وزیرِاعلیٰ ہریانہ کی خدمت میں چنڈیگڑھ پریس کلب کی جانب سے ایک MEMONTO پیش کرتے ہُوئے "دینک ٹری بیون" کے ایڈیٹر جناب آر۔ ایس۔ شرما ۔

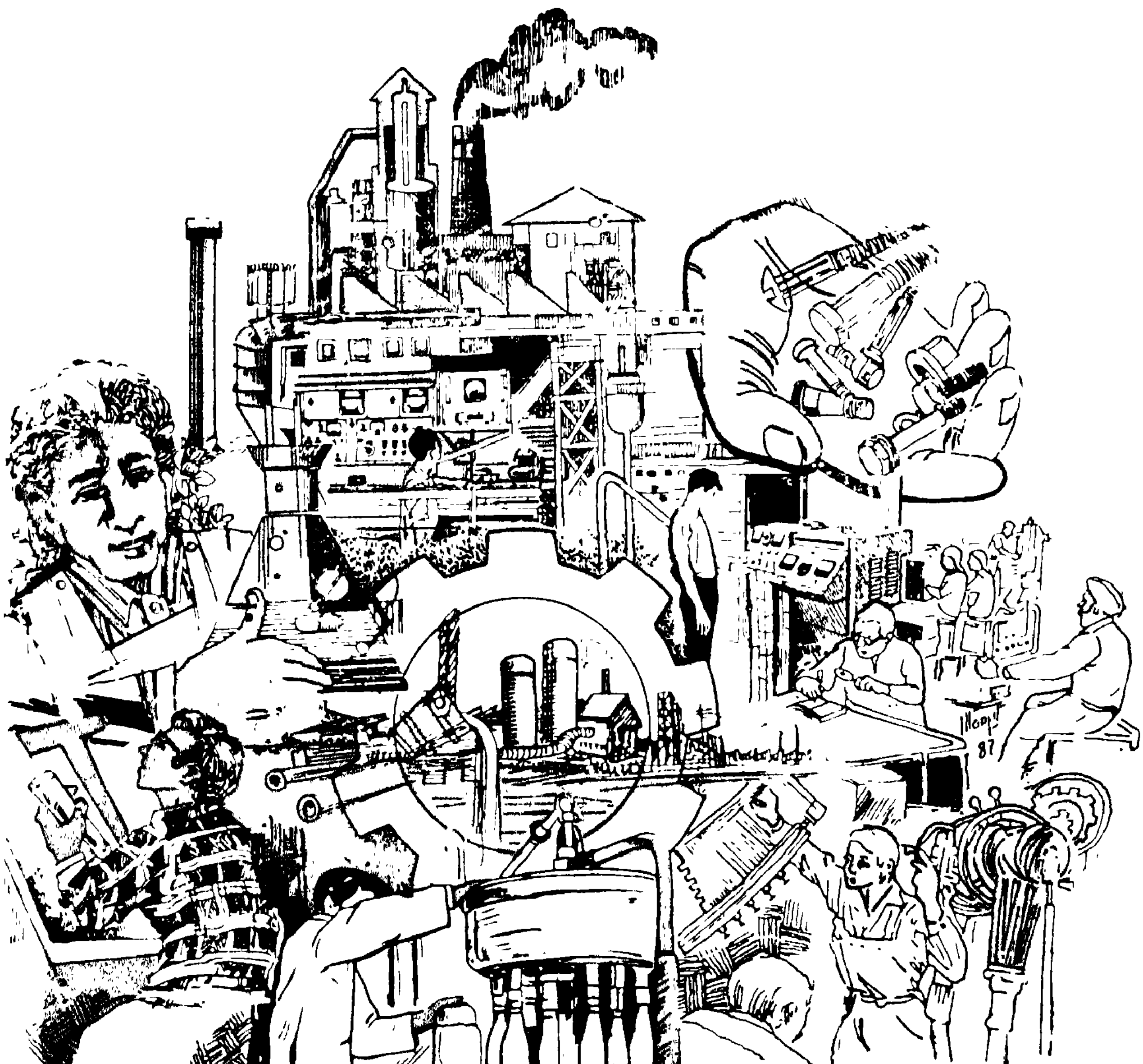


تعمیر

ہریانہ

دسمبر ۹۸۷

21 JAN 1988





۲۱ راکتوبر ۱۹۸۷ء کو راج بھون میں "امریکن کونسل آف ینگ پولیٹیکل لیڈرز" کے ایک وفد سے محوِ گفتگو عزت مآب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ۔

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

دسمبر ۱۹۸۷ء شمارہ ۱۲ جلد ۱۵

مدیرِ اعلیٰ ——————
این کے جین

مدیر ——————
سلطان انجم

سرورق : منجیت

فی شمارہ ——— پچاس پیسے
زرِ سالانہ ——— پانچ روپے
خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او نمبر ۱۹۱ - ۱۸۹
سیکٹر ۱۷ سی۔ چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

Zakir Husain Library ... Jamia Millia ... New Delhi

ترتیب

حرفِ آغاز

"محبِّ وطن اقبالؔ" کا تیلگو زبان میں بھی ترجمہ ہوا

علمی وادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ عزت مآب سیّد مظفرؔ حسین برنی، گورنر ہریانہ کی معرکتہ الآرا تصنیف "محبِ وطن اقبال" کا تیلگو ترجمہ "جاتیہ کوی (قومی شاعر) اقبالؔ" کے نام سے تیلگو یونیورسٹی، حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ ترجمہ ممتاز تیلگو ادیب ڈاکٹر کرشنا موہتی کا ہے۔ ۲؍دسمبر ۱۹۸۷ء کو ایک خصوصی تقریب میں تیلگو یونیورسٹی کے چانسلر، وزیرِ اعلیٰ آندھرا پردیش عالیجناب این۔ ٹی۔ راما راؤ نے اس کتاب کی رسمِ رونمائی ادا فرمائی۔ انھوں نے عالیجناب برنی صاحب کی گرانقدر ادبی خدمات کی تعریف کی اور کہا کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے نہ صرف قومی یکجہتی کو فروغ نصیب ہوگا بلکہ علامہ اقبالؔ کے بارے میں مروّج غلط فہمیاں بھی معدوم ہو جائیں گی۔

اس موقع پر گرامی قدر برنی صاحب نے اظہارِ خیال فرماتے ہوئے اس امر پر خصوصی توجہ دلائی کہ ہمارے ملک میں قومی یکجہتی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کے ادبِ اعلیٰ کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ اقبالؔ کے آخری دور کے

کلام میں بھی حب الوطنی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ البتہ وہ اس محدود قوم پرستی (NATIONALISM) کے ضرور مخالف تھے جس کی اہلِ مغرب تلقین کرتے تھے اور عصرِ حاضر کے دوسرے عظیم مفکرین GEORGE BERNARD SHAW, BERTRAND RUSSELL اور C.E.M. JOAD نے بھی اس محدود تصور کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ اب تک کلامِ اقبالؔ پر اسلامی اور مغربی اثرات کا ذکر ہوتا رہا ہے لیکن مصنف موصوف نے اپنی کتاب میں واضح کر دیا ہے کہ اقبالؔ ہندوستانی مفکروں سے بھی بیحد متاثر تھے۔ اُن کے کلام میں جا بجا اس کے شواہد موجود ہیں۔ موصوف نے اقبالؔ پر اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہ وہ پاکستان کے بانی تھے، علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب کے خط کا یہ اقتباس پیش کیا:

"کتاب (محبِ وطن اقبال) کے مطالعہ کے بعد میرا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ اگرچہ انڈین سول سروس میں بھی آپ نے نام پیدا کیا ہے اور اس سروس کے بامِ عروج پر پہنچ گئے ہیں لیکن جو شعبہ آپ کے لیے موزوں ترین تھا وہ آپ نے اختیار نہ کیا۔ وہ شعبہ وکالت کا تھا۔ اگر وہ شعبہ اختیار کرتے تو آج ہندوستان کے چوٹی کے وکیل ہوتے اور ڈھیروں دولت بھی کماتے۔

علامہ اقبال کی شہرت (غلط یا صحیح) ایک بانیانِ پاکستان کی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کے عوام کے نزدیک اقبالؔ بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کرنے کا مجرم ہے۔ آپ نے بڑی مہارت سے ایسے مجرم کا کیس PLEAD کیا ہے۔ اگر جیوری غیر متعصب اصحاب پر مشتمل ہو تو فیصلہ یقیناً آپ کے حق میں ہو۔"

اور فرمایا کہ میرے موقف کی حمایت میں اس سے بہتر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ شیخ اعجاز احمد صاحب ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

اس سے پہلے برنی صاحب کی کتاب کا انگریزی ترجمہ "IQBAL: POET-PATRIOT OF INDIA" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کا کنٹر زبان میں ترجمہ "دیش پریمی کوی اقبال" کرناٹک ساہتیہ اکیڈمی نے گذشتہ سال شائع کیا تھا۔ دوسری علاقائی زبانوں اڑیہ اور ملیالم میں

ترجمہ ہو چکا ہے اور زیرِ اشاعت ہے۔ تامل میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ بنگالی اور آسامی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ ہندی ترجمہ میسرز راج پال اینڈ سنز، دہلی عنقریب شائع کر رہے ہیں۔

یہ مسرت کی بات ہے کہ اس طرح کلامِ اقبال پہلی بار ہندوستان کی بیشتر علاقائی زبانوں میں منتقل ہو جائے گا۔ اس سے یقیناً علامہ اقبال کی شاعری اور اس کے وسیلہ سے اردو زبان کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

ریلوے اوور برج کا افتتاح

۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال نے کوروکشیتر میں دہلی انبالہ ریلوے لائن پر تعمیر ہوئے پہلے اوور برج کا افتتاح فرمایا۔ ۲۶۹ کروڑ روپے کی لاگت سے بنے اس اوور برج نے کوروکشیتر کو بذریعہ سڑک سہارنپور سے ملا دیا ہے اور اس سے پہیوہ، کیتھل، حصار اور جیند کی طرف آمد و رفت میں سہولت رہے گی۔ اس کی تعمیر پر حکومتِ ہریانہ کے ۱۲۵ کروڑ روپے اور ریلویز کے ۸۴ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔

یہ ریلوے کراسنگ مختلف اوقات میں اوسطاً آٹھ گھنٹے بیس منٹ روزانہ بند رہتا تھا۔ اس ریلوے اوور برج کے بن جانے سے بلا وجہ پریشانی سے نجات کے علاوہ ایندھن کی صورت میں ۲٫۴۰ لاکھ روپے ماہانہ کی بچت ہو گی۔

وزیرِ اعلیٰ نے فرمایا کہ موجودہ حکومت کا نعرہ "بجلی پانی کا پربندھ اور بھرشٹاچار بند" کانگریس کے بیس نکاتی پروگرام سے زیادہ موثر اور کارگر ہے۔ وزیرِ اعلیٰ موصوف نے مزید فرمایا کہ اس نعرہ کے نفاذ کے بعد ہر شخص کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور اس سے لوگوں کی حالت سدھرے گی۔

عالیجناب دیوی لال نے اس امر کی جانب توجہ دلائی کہ ایک جمہوری نظام میں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن انتظامیہ مشینری وہی رہتی ہے۔ اس لیے افسران کی ذمہ داری ہے کہ وہ انتظامیہ کو "لوک لاج" سے چلائیں۔ موصوف نے حکام پر زور دیا کہ وہ توجہ اور دلچسپی سے عوام الناس

کی شکایات کا تدارک کریں۔

وزیر اعلیٰ نے ریلوے استھارٹیز سے اپیل کی کہ ہریانہ میں جہاں کہیں بھی ریلوے اوور برج کی ضرورت ہو، وہ اس کی تعمیر میں ریاستی حکومت سے تعاون کریں۔

اس سے قبل وزیر تعمیراتِ عامہ، ہریانہ جناب اوم پرکاش نے حکومت کی حصولیابیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہاکہ سالِ رواں میں ہریانہ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر ۹۲ کروڑ روپے خرچ کرچکی ہے اور مورتھل۔ کرنال کے درمیان چار قطاروں والی سڑک بنانے پر ۴۸ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے۔

پرائمری ہیلتھ سینٹر کا افتتاح

عالیجناب دیوی لال، وزیر اعلیٰ ہریانہ نے ۲ نومبر ۱۹۸۸ء کو ضلع فرید آباد کے موضع جھجو نگر میں نئے تعمیر ہوئے پرائمری ہیلتھ سینٹر کا افتتاح فرمایا۔ دس بستروں والے اس اسپتال کی تعمیر پر ۲۰ لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں۔ اس سے علاقہ کے ۴۵ ہزار دیہی عوام مستفید ہوں گے۔ یہ اسپتال ایک صنعت کار جناب سی۔ ایل۔ ورما نے اپنے آنجہانی والد جناب ہیرالال ورما کی یاد میں تعمیر کروایا اور اب اسے علاقہ کے باشندوں کی سہولت کے لیے حکومتِ ہریانہ کے سپرد کر دیا ہے۔

وزیر اعلیٰ موصوف نے "برابر کی امداد" اسکیم کے تحت اسپتال کے لیے ادویات، جدید آلات اور ساز و سامان خریدنے کی غرض سے پانچ لاکھ روپے کی رقم کا بھی اعلان فرمایا۔ مزید برآں عالیجناب نے مقامی مڈل اسکول کا درجہ بڑھاکر اسے ہائی اسکول کر دیا۔

اس سے قبل چودھری دیوی لال نے فرید آباد میں ضلع افسران کی ایک میٹنگ سے بھی خطاب فرمایا۔ موصوف نے ریاستی حکومت کی ترقیاتی اسکیموں اور عوام کی فلاح کے لیے جاری دیگر اہم پراجیکٹوں پر تندہی سے عملدرآمد کی ضرورت پر زور دیا تاکہ لوگوں کو فوراً راحت میسر آسکے وزیر اعلیٰ نے افسران کو تاکید کی کہ وہ عوام سے نرمی کا سلوک کرتے ہوئے ان کے ساتھ مروّت اور خلوص سے پیش آئیں۔ ●●

فضا ابن فیضی

غزل

★

زمیں تو خیر زمیں ، آسمان کس کے لیے
نہ جانے کاٹ رہا ہوں چٹان کس کے لیے

نفس نظر، یہ در و بام خوابگہ کس کی
سفر حضر، یہ شجر سائبان کس کے لیے

نہیں ہے شاخ سے تا شاخ فاصلہ اتنا
پرندے! یہ تری لمبی اُڑان کس کے لیے

میں اِک اُداس، اکیلا گلاب جنگل کا
بناؤں شہر میں آخر مکان کس کے لیے

تمام عمر مجھے تو خزف رہنا ہے
مرا وجود ہے ہیرے کی کان کس کے لیے



اداشناس ہے ابلیس کا، نیا انساں
اُگا رہے ہیں یہ گندم، کسان کس کے لیے

متاعِ بُردہ کی صورت، کھنڈر کھنڈر یہ لوگ
لگائیں ہم بھی یہاں پر دُکان کس کے لیے

معانی اپنی جگہ ہیں لہو لہو خود ہی
یہ لفظ لفظ کڑکتی کمان کس کے لیے

بدل لیا ہے فضاؔ اب ہوا نے رُخ اپنا
وہ کھولتا ہے یہاں بادبان کس کے لیے

مہدی ٹونکی

افسانہ

کھڑکی گلی میں کھلتی ہے

آج کل ملاوٹ کے زمانے میں اچھی چائے پینا بھی واقعی ایک عذاب ہے۔ کیونکہ اچھی چائے کے لئے خالص دودھ یا کم سے کم پانی ملا دودھ ہونا ضروری ہے۔ چونکہ میں اچھی چائے پینے کا عادی ہوں اس لئے دودھ کے لئے مجھے اپنے گھر سے کافی دور ایک گوجر کے گھر جانا پڑتا ہے۔ میں ایک کپڑا مل میں نوکر ہوں۔ مجھے صبح جلدی گھر سے نکل جانا ہوتا ہے، اس لئے رات کو ہی دودھ لا کر رکھ لیتا ہوں۔ گوجر کے گھر تک پہنچنے کے لئے مجھے دو تین گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پوری بستی غریب و محنت کش لوگوں کی ہے۔ اس لئے مکان پکے کم، کچے زیادہ ہیں۔ پکے مکان بھی زیادہ تر ایک ہی منزلہ ہیں۔

میرے والد کا انتقال ہوئے بہت سال ہو چکے ہیں۔ اس بستی کی گلیوں سے گزرتا ہوں تو آس پاس کے مکانوں کی کھلی کھڑکیوں سے اندر دیکھتا ہوا نکلتا ہوں۔ اس عمر میں [illegible] شاید کوئی اچھا چہرہ نظر آجائے لیکن اس بستی میں پچھلے تین سالوں سے کوئی اچھا چہرہ نظر نہیں آیا۔

ایک دن تیسری گلی میں جو گوجر کی گلی سے جا کر ملتی ہے ایک کھڑکی میں ایک خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ کھڑکی کا مکان پچھلے کئی سالوں سے ویران اور بند پڑا تھا۔ کھڑکی کے کھلنے اور مکان کے ویران ہونے کی وجہ ایک نوجوان واقعہ ہے جو اس پوری بستی میں بچے بچے کو معلوم ہے۔ چونکہ میں اس شہر سے دور ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ تین سال سے اس بستی میں کرائے سے رہتا آرہا ہوں۔ اس لئے اس مکان کے بارے میں مجھے رشید چاچا نے بتایا تھا۔ چاچا کی پرچونے کی دکان ہے جو تیسری گلی کے بالکل سامنے چوتھی گلی میں واقع ہے۔ تیسری گلی کے اختتام سے ہی چاچا کی دکان نظر آنے لگتی ہے۔ اس دکان کے ساتھ [illegible] کا گھر ہے۔

جب میں رات کو دودھ لے کر واپس لوٹتا ہوں تو چاچا کی دکان پر ضرور دس پانچ منٹ کے لئے بیٹھتا ہوں۔ سگریٹ خرید لیتا ہوں اور چاچا سے بات چیت بھی کرتا ہوں۔ کبھی دوسرا سامان بھی خرید لیتا ہوں۔ مجھے چاچا کی ایک بات بہت پسند ہے۔ وہ بہت محنتی ہے۔ شروع شروع میں اس نے فٹ پاتھ پر بیڑی سگریٹ، ماچس اور پان کا خوانچہ لگایا۔ پھر اس گلی میں کمرہ کرائے پر لے کر چھوٹا سا سامان رکھا۔ چند سالوں بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ اس نے یہ دکان خرید لی۔ یہ سب اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ صبح پانچ بجے دکان کھول لیتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بابو جی یہ جتنی محنت کی [illegible] ہے۔ رات گیارہ بجے تک [illegible] واپس لوٹتے [illegible]

جب ادائیں ہوتی ہیں تو اپنے کام پر جانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت ان کو چائے پتی۔ گڑ، شکر، سگریٹ، بیڑی، ماچس اور صابن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو چاول دال، گھی تیل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ صبح ہی صبح میری دکان کھلی ہونے کی وجہ سے سب لوگ ادھر ہی آتے ہیں اس لئے اچھی بکری ہو جاتی ہے۔

چاچا کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ عام سندھیوں کی طرح اس کے چہرے اور سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ ڈاڑھی ہر وقت بڑھی ہوئی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پچھلے پندرہ بیس دن سے شیو نہیں کیا ہے۔ چاچا کی ایک بات اور مجھے پسند ہے۔ رات کو جب گاہکوں سے فرصت مل جاتی ہے تو اپنی گدّی صاف کرتا ہے۔ اُس وقت کوڑے میں سے ایک ایک دانہ شکر کا، چاول کا، دالوں کا بینتا ہے۔ لہسن کی کلیوں اور مرچوں کے ٹکڑوں کو الگ الگ کرتا ہے۔ اور انھیں واپس ڈبّوں میں ڈال دیتا ہے۔ جب اس جان ریزی کو دیکھا تو میں نے چاچا سے کہا۔

" چاچا۔ اس کوڑے پر اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟ پھینک کیوں نہیں دیتے؟"

" پھینک دوں؟" چاچا نے غور سے مجھے دیکھ کر کہا۔ " واہ خوب کہا۔ بابوجی اس کوڑے میں روزانہ چالیس پچاس گرام مال نکال لیتا ہوں۔ بتاؤ ایک ماہ میں کتنا مال اکٹھا ہوا؟ تقریباً ڈیڑھ کلو۔ اب آپ خود ہی سوچئے میں اتنا نقصان کیوں اٹھاؤں؟ اور پھر بابوجی اس وقت میں کروں بھی کیا؟ دکان بند کرنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ گاہک بھی اِکّا دُکّا آتے ہیں۔ بیکار بیٹھے رہنے سے تو یہ کام اچھا۔"

چاچا بہت سمجھدار ہے تجربہ کار ہے۔ جہاندیدہ ہے وہ محلے کی ہر بات سے باخبر رہتا ہے۔ رات کے نو بجے تک جب اسے گاہکوں سے چھٹکارہ مل جاتا ہے تب وہ مجھ سے اطمینان سے باتیں کرتا ہے۔ اصل میں انسان مختلف مزاجوں اور عادات کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک عادت سب انسانوں میں یکساں نہیں ہوتی اسی لئے انسان مختلف مزاجوں کے ملتے ہیں۔ چاچا ان آدمیوں میں سے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ میرے دکھ کوئی سنے بحث نہیں کرے۔ دو بول ہمدردی کے بولے۔ کئی آدمی جہان بھر کی خبریں، واقعات سنانے کے دکھ میں رہتے ہیں۔ رات کے وقت چونکہ مجھے بھی فرصت ہوتی ہے اس لئے میں بھی دو گھڑی کا وقت اطمینان سے کسی کے پاس کاٹنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے چاچا کے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور پھر چاچا آپ بیتی سناتا ہے، جگ بیتی سناتا ہے۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھتا ہے۔ بعض وقت تو وہ مجھ پر اتنا مہربان ہو جاتا ہے کہ سگریٹ بھی مفت پلا دیتا ہے۔ وہ مجھے محلّے کے لوگوں کے اندر باہر کے حالات بتاتا رہتا ہے۔ محلے میں جب بھی کوئی واقعہ، حادثہ، رونما ہوتا ہے تو وہ مجھے دلچسپی سے سناتا ہے۔ اسی نے مجھے اس ہرے مکان کے بارے میں جو تیسری گلی کے اختتام پر واقع ہے جو ویران رہتا ہے اور جس کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی ہیں بتایا تھا۔

" بابوجی۔ دکھی انسان کی بددعا دکھ دینے والے کو ضرور ڈستی ہے۔ انسان چاہے کسی کے ساتھ کتنی ہی بے ایمانی کرلے لیکن آخر میں اُسے نتیجہ بُرا ہی ملتا ہے۔ انسان دوسرے کے ساتھ ناانصافی کر کے ظلم کر کے یہ سوچتا ہے کہ جب مریں گے تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو من مانی کر لو لیکن مالک اندھا نہیں ہے، ناانصاف نہیں ہے وہ ظالم کو سنسار میں ہی اُس کے کئے کا بدلہ دے دیتا ہے۔ بابوجی۔ یہ جو گلی میں ہرا مکان ہے نا۔ جس کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی ہیں۔ اصل میں ایک بوڑھی عورت کا کچّا مکان تھا۔ ایک بیٹا تھا جو دوسرے شہر میں کسی جگہ پر چپراسی تھا۔ بوڑھی عورت کی بہو سے بنتی نہیں تھی اسی لئے وہ یہاں اکیلی رہتی تھی۔ دس سال پہلے اُس بڑھیا کا ایک رشتہ دار اُس کے یہاں کرائے پر آ کر رہا۔ رہتے رہتے اُس کے دل میں بے ایمانی آ گئی۔ شروع شروع میں اُس رشتہ دار نے اُس کی بیوی نے بڑھیا کی خوب خدمت کی۔ پیسے بھی اُدھار دئے پھر بڑھیا سے دھوکے سے کاغذ پہ

اُنگوٹھے بھی لگوائے اور ایک دن جب رشتہ دار کو پتہ چلا کہ بڑھیا کا بیٹا اس مکان کو بیچ کر بڑھیا کو اپنے ساتھ لے جائے گا تو اس نے بڑھیا کو دھکّے دے کر باہر نکال دیا۔ پورا محلّہ جمع ہو گیا۔ اُس آدمی نے رجسٹری لا کر سب کو بتائی کہ اس بڑھیا نے وقتاً فوقتاً مجھ سے چھ ہزار لئے ہیں جس کے عوض میں اس نے مکان کی رجسٹری میرے نام کر دی ہے۔ بڑھیا بہت روئی چلّائی کہ یہ غلط کہتا ہے لیکن بڑھیا کا کوئی حمایتی نہیں بنا کیونکہ بڑھیا کا وہ رشتہ دار پولیس میں ملازم تھا اور بہت چالباز تھا۔ اس کا بیٹا بھی آیا مگر وہ کچھ نہیں کر سکا۔ اپنی ماں کو ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں گئی۔ بڑھیا رات کو تو قریب ہی ایک مکان میں جا کر سو جاتی لیکن صبح سے لے کر شام تک اپنے مکان کے آس پاس منڈلاتی رہتی۔ چلّا چلّا کر اُسے کوستی۔ گالیاں دیتی۔ ایک صبح بڑھیا مری ہوئی ملی۔ نالی کے کنارے۔ بھگوان جانے وہ اپنی موت مری تھی یا اُسے مار دیا گیا تھا۔

بڑھیا کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی اُس آدمی نے کچّا مکان گرا کر پکّا مکان بنوایا۔ بڑی دھوم دھام سے نانگل کیا۔ رشتہ داروں کو، محلّے والوں کو کھانا کھلایا۔ سانجھ کے وقت جب اندھیرا ہونے لگا تو اس کی بیوی نے جیسے ہی لائٹ جلائی۔ بورڈ سے چپک کر رہ گئی۔ اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس آدمی پر ایسا ڈر بیٹھا کہ وہ دوسرے ہی دن اپنے بچوں کو لے کر دوسری جگہ چلا گیا۔

چند مہینے بعد اس آدمی نے ایک افسر کو اس مکان میں کرائے پر لا کر رکھا۔ بیوی بچے سب ہی تھے ایک جوان لڑکی بھی تھی۔ لیکن وہ اس کی شادی نہیں کرتا تھا۔ اصل میں بابوجی جب آدمی کو پیسہ جمع کرنے کا خون منہ کو لگ جاتا ہے تو پھر وہ اچھا بُرا نہیں سمجھتا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو ایک جگہ نوکر رکھوا دیا۔ اصل میں بابوجی میں اُس آدمی کو نامرد سمجھتا ہوں جس کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت ہوں پھر بھی وہ اپنی بہو بیٹیوں سے نوکری کرائے۔ ایسے مرد تو اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر عورتوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ اصل میں بابوجی شادی کا مطلب ہوتا ہے۔ بیوی اور بچوں کی ضروریات کی پوری ذمّہ داری نبھانا۔ اور جب مرد اپنی بیوی بیٹی سے نوکری کروائے تو سمجھ لو کہ جب یہ اُن کے پیٹ کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو پھر ان کے تن کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے؟ ایسے مردوں کو تو اُن کی پتنیاں جوتی کی نوک پر مارتی ہیں اور بیٹیاں ناک کان کاٹ کر انہی کے ہاتھوں میں دے دیتی ہیں۔ ایسا ہی اس افسر کے ساتھ ہوا۔ لوگوں نے رشتہ کی بات چیت چلائی بھی لیکن وہ انکار کر گیا۔ اصل میں بابوجی وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہر ماہ کی بندھی موٹی آمدنی ماری جائے۔ اور پھر بابوجی ایک رات اس کی بیٹی سارا زیور اور پیسے لے کر باپ کے دفتر کے ایک بابو کے ساتھ بھاگ گئی۔ باپ اتنی بڑی بدنامی برداشت نہیں کر سکا اُس کو دل کا دورہ پڑا اور مر گیا۔ مکان خالی ہو گیا۔

پھر بابوجی ایک ڈاکٹر آیا۔ بہت بڑا بے ایمان۔ اصل میں بابوجی جب ہم کسی انسان کی عزّت کرنے لگتے ہیں۔ ادب سے سلام کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو دیوتا سمجھنے لگتا ہے۔ اور ہمیں پاؤں کی جوتی۔ اپنے دیش کی سنسکرتی ہے ہی ایسی۔ ڈاکٹروں کی عزّت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ ہماری بیماریوں کو دُور کرتے ہیں۔ کہنے کو ڈاکٹر مسیحا بنتے ہیں لیکن وہ تو اُلٹا ہمارا ہی خون چوستے ہیں۔ تو بابوجی وہ ڈاکٹر تھا بڑا بے ایمان۔ من مانی فیس لیتا۔ رشوت خور اتنا کہ آپریشن ٹیبل پر مریض کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا اور اُس کے رشتہ داروں سے کہتا کہ اتنے روپے لاؤ تب پورا آپریشن کروں گا۔ لیکن بابوجی مالک نے آج تک کسی ظالم کو پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ وہ تو بہت بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ انسانوں کی کرتوتوں کا بدلہ یہیں دے دیتا ہے۔ تو بابوجی ایک رات نہ جانے کونسی دوا اُس کے چاروں بچے کھا گئے۔ صبح کو ہمیشہ کے لئے سوتے ہوئے ملے۔ بس اُسی دن سے یہ مکان خالی۔

ابھی جیکہ ہرا مکان روشن دیکھا تو وجہ چاچا سے پوچھی اُس نے بتایا "میں تم سے کہنے ہی والا تھا بابوجی لیکن اپنی تو

دن سے بات چیت ہوئی کہاں؟ یہ نیا کرایہ دار جوان چھوکرا ہے اور بجلی گھر میں جونیئر انجینئر ہے۔ پرسوں مکان دیکھنے آیا تھا۔ لوگوں نے جب اُسے اس گھر کے بارے میں بتایا تو اُس نے سب کا مذاق اُڑایا۔ کہنے لگا کوئی بھوت پریت نہیں۔ آج کل تو سائنس کا زمانہ ہے لوگ چاند تاروں پر پہنچ رہے ہیں اور ہم لوگ بھوتوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہے۔ انجینئر آج ہی اس گھر میں آیا ہے۔ شادی شدہ ہے لیکن ابھی اکیلا آیا ہے۔

میں روز رات کو جب اُس گلی سے گذرتا تو مکان کی کھڑکیاں کبھی روشن نظر آتیں اور کبھی بند۔ پھر ایک دن چاچا نے بتایا کہ وہ انجینئر اپنی بیوی کو لے آیا ہے۔ ساتھ میں اور کوئی نہیں ہے۔

اب کھڑکیاں تو روز رات روشن ملتیں لیکن پردے پڑے ہونے کی وجہ سے میں اندر کچھ بھی جھانک نہیں پاتا۔ پھر کچھ دنوں بعد چاچا نے مزید اطلاع دی۔ بابوجی یہ چھوکرا ہے رنگیلی طبیعت کا۔ دن بھر موٹر سائیکل دوڑاتا پھرتا ہے۔ بیوی کو بھی بناؤ سنگھار کرا کے گھماتا پھرتا ہے۔

چاچا کی باتیں سُن کر میرے دل میں یہ اشتیاق دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا کہ اس انجینئر کی بیوی کو دیکھوں لیکن جب رات کو گلی سے گذرتا تو روشن کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے ملتے اور دروازہ بند ملتا۔ ایک دن میں جان بوجھ کر دوپہر میں اس گلی سے گذرا۔ دور سے ہی مجھے کھڑکی میں کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ رنگین کپڑوں سے پتہ چل گیا کہ عورت بیٹھی ہے۔ میں نظرے گڑاتے آگے بڑھتا گیا۔ قریب پہنچنے پر صورت دکھائی دی۔ بہت خوبصورت چہرہ تھا۔ کھڑکی کے ایک پٹ سے سر ٹکائے، آنکھیں بند کئے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک کھلی کتاب سینے پر تھی، جیسے پڑھتے پڑھتے کوئی خیال آ گیا ہو۔ کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا۔ جس میں سے ایک پرانی فلم کی غمگین دھن نشر ہو رہی تھی۔ ایسا خوبصورت، دلکش چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے دیکھنے میں ایسا کھویا کہ اپنی چال کو جیسے سیمنٹ کی سڑک پر جوتے کی کھٹ کھٹ سے بچانے کے لئے بہت ہلکا کر لیا تھا، آہستہ کر لیا تھا، بھول گیا۔ کھٹ کھٹ کی وجہ سے اس کا دھیان ٹوٹ گیا۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی اُس نے مجھے دیکھا، میں کانپ گیا۔ آنکھیں کیا تھیں درد کا سمندر تھیں۔ جس طرح کوئی گھائل پنچھی آنکھوں میں درد لئے شکاری سے رحم کی بھیک مانگے۔ اُس کی المناک آنکھیں مجھے دیر تک درد میں ڈبوئے رہیں۔ رات کو سوتے وقت تک وہ درد بھری آنکھیں میرے ذہن پر حاوی رہیں۔

دوسرے دن جب فیکٹری سے واپس لوٹا تو میرے قدم غیرارادی طور پر اُس گلی کی طرف اُٹھ گئے جبکہ اس سے پہلے واپسی پر گھر پہنچنے کے لئے یہ راستہ کبھی اختیار نہیں کیا تھا گلی کے موڑ پر پہنچتے ہی میں نے اُس ہرے مکان کی طرف دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ نظریں کھڑکیوں پر گئیں وہ کھلی ہوئی تھیں۔ شاید ہوا اور روشنی کی وجہ سے پردے سرکا دئے گئے تھے۔ چال آہستہ کر کے اندر جھانکا۔ وہ نظر آ گئی جوتوں کی کھٹ کھٹ کی وجہ سے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ وہی درد بھری آنکھیں۔

اور پھر میں ڈیوٹی سے واپسی پر اسی گلی سے گذرنے لگا۔ تلاش کرتی میری آنکھیں اُسے ڈھونڈھ لیتیں اُس کا خوبصورت چہرہ دیکھتے ہی میں اپنے آپ کو بھول جاتا لیکن جیسے ہی اُس سے آنکھیں ملتیں میں کپکپا جاتا۔ بے حد درد بھری آنکھیں بے حد اُداس آنکھیں۔

کئی ہفتے بیت گئے۔ اس انجینئر کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں کہ وہ شرابی ہے اور آئے دن اُس کے یہاں آدمی آتے رہتے ہیں۔

تین دن پہلے کی بات ہے۔ ایک دن کے لئے مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا۔ لیکن سردی میں لگاتار تین دن تک بہادٹیں برسیں۔ جس کی وجہ سے مجھے رُکنا پڑا۔ واپسی پر راستہ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ شہر آتے آتے رات ہو گئی۔ سردی نے زور پکڑ لیا تھا۔ کپکپاتا ہوا دودھ لینے کے لئے چلا۔ حالانکہ ابھی سات ہی بجے تھے لیکن گلیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ میں جیسے ہی اس گلی میں مڑا۔ جس میں انجینئر کا مکان ہے تو نہ جانے

کیوں مجھے ڈر لگا۔ گلی بہت بھیانک لگی۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ گلی میں لیمپ پوسٹ پر لٹکے جلتے بلب بھی میرے ڈر کو کم نہیں کر سکے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیچھے کوئی چل رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر دو تین بار مڑ کر پیچھے دیکھا بھی لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے اب کوئی گردن پکڑ کر دبانے والا ہے۔ میرے جسم کو ہلکی ہلکی ٹھنڈی لہریں لرزانے لگیں۔ جیسے جیسے میں گلی کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا دل انجانے خوف کی وجہ سے تیز سے تیز دھڑکنے لگا۔ مجھے گلی بہت لمبی، میلوں لمبی معلوم ہونے لگی۔ قدم بہت چھوٹے محسوس ہونے لگے۔ جی چاہ رہا تھا کہ بھاگتا ہوا ایک دم گلی کے سرے پر پہنچ جاؤں۔ لیکن پتہ نہیں طاقت کہاں چلی گئی تھی۔ پھر جیسے ہی اس ہرے مکان کے پاس پہنچا تو جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ پورا گھر بھیانک اندھیرے میں ڈوبا ہوا اور یہ اندھیرا مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ میرا دل، پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے لگا۔ ڈر کے مارے پلکوں نے جھپکنا چھوڑ دیا۔ اور پھر مجھے بھیانک اندھیرے میں ڈوبی کھڑکی بھی دکھائی دی۔ وہ چمک دار مایوس، درد بھری آنکھیں مگر بہت بھیانک جو دھیرے دھیرے کھڑکی سے نکل کر میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں کانپ گیا۔ پوری طاقت لگا کر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا گلی کے سرے پر پہنچا۔ سامنے چاچا کی دُکان کھلی ہوئی تھی صرف ایک گاہک سودا لے رہا تھا۔ جان میں جان آئی۔ خوف کم ہوا۔ تیزی سے دودھ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ یہ گلی بھی پوری سنسان تھی۔ جب دودھ لیکر واپس لوٹا تو چاچا کو دُکان بند کرتے ہوئے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی ساڑھے سات بجے ہی دُکان بند ہو رہی ہے؟ چاچا کے قریب پہنچ کر میں نے پوچھا۔

"چاچا ــــ ابھی سے دکان کیوں بند کر رہے ہو؟"

"بے بے بے۔ چاچا ایک دم چونک پڑا اور پلٹ کر جب مجھے دیکھا تو اس کی بے بے کی خوفزدہ آواز ہنسی میں بدل گئی۔ جلدی سے اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہا" دیکھتے نہیں ایک گاہک بھی نہیں ہے اور سردی کتنی تیز ہو رہی ہے؟

میں نے پوچھا" لیکن چاچا آج اِن گلیوں میں اتنا بھیانک سناٹا کیوں ہے؟"

چاچا کا چہرہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ ڈر سے آنکھیں پھاڑ کر دھیرے سے کہنے لگا" تمہیں نہیں معلوم ــــ اس انجینئر کے مکان میں چار قتل ہوئے ہیں؟"

"کیا ــــ؟" میں خود ڈر گیا۔

"ہاں ــــ چاچا کا خوفزدہ چہرہ میرے اور قریب آ گیا اور تیز سرگوشی میں کہنے لگا" آج صبح کی ہی تو بات ہے جب دودھ والا انجینئر کے مکان پر آیا اور دودھ دینے کے لئے آواز لگائی تو اندر سے کوئی نہیں بولا۔ دودھ والے کو حیرت ہوئی کہ آج دروازہ بند کیوں ہے؟ کوئی بول کیوں نہیں رہا؟ اس نے دو تین بار آوازیں دیں۔ کچھ سُن گُن نہ پا کر اُس نے دروازہ کھٹ کھٹایا مگر پھر بھی اندر سے کوئی نہیں بولا۔ اور جب اُس نے دروازے کی درز میں سے جھانکا تو اُسے برآمدے میں کرسیوں پر تین آدمی اوندھے سیدھے مرے ہوؤں کی طرح سے پڑے دکھائی دئے۔ اُس نے محلے والوں کو بُلایا تب سب نے بتایا کہ واقعی وہ تینوں آدمی مرے ہوئے ہیں۔ پولیس آ گئی۔ دروازہ توڑا گیا۔ مرے ہوئے تینوں آدمی تھے۔ ایک یہ جونیئر انجینئر اور دو اس کے بڑے افسر۔ اُن کے سامنے ٹیبل پر شراب کی بوتلیں اور کھانا رکھا ہوا تھا اور ایک پلیٹ میں تینوں آدمیوں کی ناکیں کٹی ہوئی رکھی تھیں۔ گھر کی تلاشی لی تو ایک کمرے میں اس انجینئر کی بیوی چھت کے کڑے سے لٹکی ہوئی ملی۔ پاس ہی ٹیبل پر ایک کاغذ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

" میں اپنے ہوش و حواس کے ساتھ
یہ لکھ رہی ہوں کہ ان تینوں آدمیوں
کی قاتل میں ہوں۔ میرا پتی ترقی کا

ہوگا تھا وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد میں انجینئر بن جاؤں۔ اُس نے مجھے کئی بار کہا اگر تو میرے آفیسر کو خوش کردے تو میں بہت جلد افسر بن جاؤں گا۔ میں سختی سے انکار کرتی رہی۔ وہ مجھے مارنے پیٹنے لگا۔ اور ایک دن اُس نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ مجبوراً میں نے ہامی بھرلی۔ آج میرے پتی نے اپنے دونوں بڑے انجینئروں کو کھانے پر بُلایا تھا مجھے مَرنا منظور تھا لیکن اپنی عزت لٹانا گوارہ نہیں تھا اس لیے میں نے اِن کو کھانے میں زہر دے دیا۔ میں نے ہی ان کی ناگین ساتھی ہیں اور یہ ناگین میری طرف سے اُن مَردوں کے لیے ہیں جو دولت، شہرت اور ترقّی پانے کے لیے اپنی بیویوں کو رشوت کے طور پر دوسروں کے حوالے کردیتے ہیں۔ اِن کو مارنے کے بعد اب میں خود بھی چھت سے رسّی لٹکا کر پھندا ڈال کر خودکشی کررہی ہوں۔،،

چاچا ابھی بات پوری کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک ایک پھڑپھڑاتی چیز ہمارے پیروں کے نیچے آگری۔ کبوتر تھا۔ اس کے پَر شاید تیز سردی کی وجہ سے مفلوج ہوگئے تھے میں نے کبوتر کو اٹھالیا۔ کبوتر کی مایوس، سہمی اور درد بھری آنکھیں دیکھ کر اچانک مجھے جونیئر انجینئر کی بیوی کی آنکھیں یاد آگئیں اور پھر مجھے نظر آئیں اندھیری کی کھڑکی میں سے چمک دار، بھیانک مایوس آنکھیں۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے چاچا کو دیکھا۔ چاچا غائب تھا۔ وہ برابر والی گلی میں ڈر کی وجہ سے شک گیا تھا۔ میں ڈر سے کپکپا گیا۔ کبوتر کو وہیں پٹکا اور تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گیا۔ پھر کبھی اس گلی میں نہیں آنے کے لیے۔

●●

غزل ★ طلعت عرفانی

اِک تُو اَور ہُو بہ ہُو میرا
آئینہ بن گیا عَدُو میرا

مَیں تعارف ہُوں عالمِ ہُو کا
ورنہ کیا نام کیا نمُو میرا

سوزنِ عیاں لباس نایاب ہُوئی
اَب کہاں چاک کیا رفُو میرا

نُطق دریافت کیا کرے کہ مجھے
حرفِ آخر ہے خود گلُو میرا

ایک ہنگامہ ہر نفس مجھ میں
ایک آوازہ کُو بہ کُو میرا

یہ نشہ ہے کہ نیند کا عالم
جام طلعتؔ! ہُوا سبُو میرا

آزاد گلاٹی

ساحر ہوشیارپوری کی غزلیہ شاعری

ساحر ہوشیارپوری کی غزلوں کے مطالعہ سے پہلا تاثر یہ ملتا ہے کہ وہ ایک حُسن شناس اور حُسن پرست رومانی شاعر ہیں۔ انھیں خوبصورتی سے عشق ہے اور ان کا aesthetic credo فطرت کی خوبصورتی کے سبھی عوامل کی تجسیم انسانی پیکر کی خوبصورتی میں محسوس کرتا ہے۔ حسنِ فطرت کسی روپ میں ہو۔ ساحر کی نظر اس سے سیراب ہوتی ہے لیکن جب فطرت کا یہ حُسن اپنے خوبصورت ترین مظہر، یعنی انسانی پیکر میں سمٹ آتا ہے تو وہ ساحر کا محبوب بن جاتا ہے جس کے ساتھ رابطہ اُن کے ذہن و دل کو سرشار کرتا ہے اور جب یہ سرشاری روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے تو وہ اس کا اظہار رسیلے، سادے، سجل، سُریلے الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے شعری محرکات کا منبع و مخزن ان کی حسن پرستی ہی ہے اور ان کی جمالیاتی حس کی ضَو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے کتنے ہی گوشے منور کرتی ہے ساحر کے یہاں جمالیات کے خارجی اور باطنی دونوں تقاضوں سے شناسائی ملتی ہے خارجی تقاضوں سے شناسائی الفاظ کی سج دھج، ان کی فنکارانہ نشست اور ان کے باہمی آہنگ کی موسیقیت میں ظاہر ہوتی ہے اور داخلی تقاضوں کا اظہار مشاہدے کو تخلیقی عمل کی جادوئی رہگزاروں سے گزار کر ان کیفیات کے پیدا کرنے کے شعور میں جن سے وہ جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے جو اچھے اور سچے فن کی شناخت ہے۔

ساحر ایک ایسے رومانی شاعر ہیں جنھوں نے محبت کے نشاط و سرور سے وہ عرفان کشید کیا ہے جس سے زندگی گزارنے کا فن آتا ہے۔ محبت اور کیفیاتِ محبت اُن کی شاعری کا مرکزی موضوع ہیں۔ ساحر کے یہاں محبت اکتسابی یا روایتی نہیں بلکہ ایک ذاتی اور وارداتی تجربہ ہے جس کی روح افزا اور روح فرسا کیفیات سے وہ خود گزرے ہیں اور اس کے کربِ نشاط اور نشاطِ کرب کے کھٹے میٹھے ذائقے چکھے ہیں۔ انھوں نے محبت کے جذباتی ارتعاش کے سرگم کو الفاظ کا رُوپ دے کر ایسے اشعار خلق کئے ہیں جن میں مشاہدے کی صداقت اور تجربے کی حرارت ہے۔ ان کا محبوب خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ خود ان کی طرح گوشت پوست کا جیتا جاگتا پیکر ہے جسے انھوں نے جی جان سے چاہا ہے اور جس کی محبت سے انھوں نے نہ صرف جسمانی تسکین پائی ہے بلکہ روحانی ارتفاع بھی حاصل کیا ہے ساحر محبت میں وارفتگی کے قائل ہیں کیونکہ یہ زندگی کے ایک خاص دَور کا تقاضہ اور مدعا

اور اس کے لئے کسی جواز کی تلاش بے معنی ہے۔

محبت کا اک مدعا ہے جوانی
جوانی کا اک مدعا ہے محبت

یہ طبیعت ہے حضرتِ ناصح
یہ سمجھ سوچ کر نہیں آتی

محبت اور کیفیاتِ محبت سے متعلق اُن کے یہ اشعار ان کے فلسفۂ محبت کی اساس ہیں:

یہ غرورِ عشق ہے یا حسن کی شانِ کرم
میں تجھے پا کر زمانے بھر کو ٹھکرانے لگا

اک طرف ہو ساری دنیا، اک طرف صورت تری
تجھ کو ہم دنیا سے ہو کر بے خبر دیکھا کریں

ہمیں کبھی تو خاطر میں لاتا نہیں
یہ دل کو ٹھکانا کہاں مل گیا

میرے ہونٹوں پہ ترا ذکرِ جمیل
ہر نفس موجِ صبا ہو جیسے

دکھاتی ہے کثرت میں وحدت کے جلوے
مجازِ حقیقت نما ہے محبت

یہ "مجازِ حقیقت نما" ایک ایسا معجزہ ہے جو انسان کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ حسن و عشق کے باہم ارتباط اور اس رابطے کے نفسیاتی پہلوؤں کا اظہار بھی اُن کے اشعار میں جابجا ملتا ہے:

حُسنِ سادہ میں خود اپنا رنگ بھر دیتا ہے عشق
کیفِ نظارہ مرے حسنِ نظر کے ساتھ ہے

ہارنا بازیٔ الفت کا ہے اک کھیل مگر
لطف جب ہے کہ اسے جیت کے ہارا جائے

کوئی اس کو سمجھ نہیں سکتا
جو ستم ان کے التفات میں ہے

اے دوست! یہی سوچتا رہتا ہوں میں اکثر
یہ قُرب مجھے تجھ سے کہیں دُور نہ کر دے

ساحرؔ کے یہاں عشق و محبت کا عرفان یک سطحی نہیں ہے کیونکہ ان کے ذاتی تجربوں اور مشاہدے نے اس میں وسعت، کشادگی اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ اسی لئے جب وہ محبت میں والہانہ سپردگی اور "بے نیازی" اضطراب و اجتناب اور اس کے کیف و کرب کا ذکر کرتے ہیں تو نفسیاتی ابھار کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی عشقیہ شاعری الفاظ کی بازیگری نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ابھری ہوئی ان کیفیات کا کرشمہ ہے جو زندگی کو بھرپور ڈھنگ سے جینے کی خواہش نے انھیں عطا کی ہیں۔

گو ساحرؔ کے یہاں محبت کا تجربہ اکثر و بیشتر نشاطیہ انبساط عطا کرتا ہے، ساحرؔ کو یہ احساس بھی ہے کہ غم اور مسّرت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس طرح اُن کے رومانی حُزنیہ کا حزن دراصل عشقیہ نشاط ہی ہے۔ اُن کے یہاں غم قنوطیت پیدا نہیں کرتا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو دھندلانے کی بجائے انھیں جلا دیتا ہے، شخصیت کو وقار بخشتا ہے اور روح کو پالیدگی، رفعت اور عظمت عطا کرتا ہے۔ محبت کا غم ان کی متاعِ عزیز ہے کیونکہ اس نے زندگی کی خوبصورتی اور مسّرت کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے:

ہر خوشی میں غم کا اک پہلو ملا
ہر نئے غم سے خوشی ہونے لگی

کھائے سوزِ غم تو اک پھول تبسم کا کھلا
تم نہ سمجھو گے مرے شوق کی قیمت کیا ہے

ناگاہ جیسے بچھڑا ہوا ہم سفر ملے
غم مل گیا تو دل کو بڑی تازگی ملی

غم کی عطا کردہ اِس تازگی اور محبت کی سرشاریوں نے ساحر کو عام رومانی شاعروں سے ممتاز کر دیا ہے۔ انھوں نے اُن کے اندر اعتماد کی وہ صلاحیت پیدا کر دی ہے جس نے انھیں زندگی کی مشکلات سے فرار کی بجائے ان کا سامنا کرنے کی جرأت بخشی ہے، کامرانیوں اور شادمانیوں کا یہی احساس ہے جس نے انھیں منزل کی طرف گامزن رہنے کی جرأت دی ہے اور اگر وہ کہیں رُکتے بھی ہیں تو اِس اعتماد کے ساتھ کہ منزلیں خود آ کر ان کے قدم چوم لیں گی:

طوفان نے دیا جو پیامِ بقا مجھے
دریا کی موجِ موج کو ساحل بنا دیا

منزلیں خود ہی پاس آئیں گی
ہم نہ گزریں گے رہگزاروں سے

ساحر نے اپنی شاعری کا مواد براہِ راست زندگی سے اخذ کیا ہے۔ زندگی کے سانحات و تجربات نے انھیں اس کی حقیقت سے آشنا ہونے، اس کی گتھیاں سلجھانے، اس کی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج اور جد و جہد کرنے کے باوجود اس سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور فنا ہی میں بقا کے رازِ نہاں کی یافت کرنے کا جو شعور بخشا ہے، اس کی جھلک اُن کے اشعار میں جا بجا ملتی ہے:

تو کبھی درد، کبھی شعلہ، کبھی شبنم ہے
تجھ کو کس نام سے اے زیست پکارا جائے

زندگی نام ہے تلاطم کا
ابتدا، انتہا سے کیا مطلب

طوفان میں بن جا طوفان
ساحل پہ ساحل کی بات

رت جوانی کی جو بیتی تو سمجھ میں آیا
ڈھلتے سورج سے چڑھتے چاند کا رشتہ کیا ہے

یہ اشعار یقیناً اُسی شخصیت کا اظہار ہیں جس نے زندگی کے ہر پہلو کی بصیرت حاصل کی ہے۔ عرش ملسیانی نے بجا کہا ہے کہ ساحر کی شاعری میں "زندگی اور اس کے پیچ و خم پوری طرح اُجاگر ہیں، اُسی طرح جس طرح کسی حسینہ کے جسم کی قوسیں چُست لباس میں۔"

زندگی کے اِس گہرے شعور نے ساحر کو نت بدلتی قدروں سے روشناس کرائے رکھا ہے وہ ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے شعری سفر کے دوران کتنی ہی ادبی تحریکیں اس طرح جھیلی ہیں کہ ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ ساحر نے اپنے ذہن کے در تازہ ہواؤں کے لئے ہمیشہ کھلے رکھے لیکن فن کی اُن بنیادی اقدار پہ جو اُن کی شخصیت کا جزو بن گئی تھیں، کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے کئی ہم عصر شعراء نئے دور کے تقاضوں سے منحرف رہے، ساحر نے عصری حسیت کے لئے اپنے شعور کے در کبھی بند نہیں کئے اور غزل کی کلاسیکی روایت کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس التزام کے ساتھ ہی انھوں نے عرفانِ ذات کی ان بلندیوں کو بھی چھوا ہے جہاں ذات و کائنات کی حدیں ایک ہو جاتی ہیں اور جزو و کل میں تفاوت مٹ جاتا ہے۔ آج کے عہد کے مادی کمال اور روحانی زوال سے پیدا شدہ تضادات و انتشار کا اظہار بھی اُن کی تازہ غزلوں میں ملتا ہے اور آج کے اس خوف زدہ انسان کی شخصیت کا بھی جسے خود اپنے چہرے کی شناخت

ڈر لگتا ہے اور جن کی آنکھیں علم کی روشنی سے چندھیا گئی ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ آج کے دور میں جب زندگی کا سفینہ موجِ طوفان کے حوالے ہو کر بے سمتیت کا شکار ہے، تخلیقِ فن ایک سعیٔ رائیگاں بن کر رہ گئی ہے:

سمٹے جو ہم تو ذات کا آزار ہو گئے
پھیلے تو کائنات کا اظہار ہو گئے

رُو برُو آیا تو میری روح تک تھرّا گئی
چھپ کے بیٹھا تھا یہ چہرہ جسم کے اندر کہاں

موت کی چھاؤں میں یخ بستہ ہے روحِ آدم
دل نہیں سینے میں اک سِل ہے، غزل کیا کہیئے

یہ عصرِ حاضر کے ہر بشر کا دھواں دھواں سا اداس چہرہ
فضا میں پھیلی ہوئی کثافت کا مستقل اشتہار سا ہے

ساحر کی غزلوں میں جذبہ و احساس کا تہہ دارانہ امتزاج، محبت کے طرب اور کرب سے شگفتنِ ذات کے مراحل کا بیان، اظہار کی سلاست، انھیں ایک منفرد و ممتاز غزل گو بنا دیتے ہیں زندگی نے ساحر کی شخصیت کو تراش کر جو PRISM بنایا ہے، انھوں نے اپنے فن کی روشنی سے اس کے ذریعہ سات رنگوں کی وہ قوسِ قزح تشکیل کی ہے جس میں ان کے زندگی اور فن کے کتنے ہی رنگ ایک دوسرے میں پوری طرح گھل مل گئے ہیں۔ وہی سادگی، خلوص، محبت، متانت، شگفتگی اور شائستگی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ ہیں، ان کے کلام میں بھی نمایاں ہیں۔ زندگی اور فن کے نقطۂ ارتقاع پہ پہنچ کر اگر کوئی شاعر احساس کی ہم آہنگی کا یہ دعویٰ کرے:

ہر شعر میں اظہارِ احساس ہم آغوش
اس دور میں ساحر سا سخنور نہ ملے گا

تو اسے شاعرانہ تعلّی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔! ●●

منوہر لال ہادی

غزل

★

مجھ میں جو خطائیں ہیں وہ سب مجھ پہ عیاں ہیں
خاموش ہیں کچھ اور کئی رقص کُناں ہیں

اے طائرکِ عقل، یہ منظر بھی ذرا دیکھ
سینے میں مشیّت کے تضادات رواں ہیں

ہر شے میں تمنّا کی صدا گونج رہی ہے
اس بات کے آثار کراں تا بہ کراں ہیں

اے دیدۂ بینا مجھے سچ بات بتا دے
سُنتا ہوں یہاں رقص کُناں امن و اماں ہیں

وہ لوگ جنھیں سُونگھ گئی بادِ ہزیمت
غافل ہیں کہ مجبور کہ بے تیغ و سناں ہیں

خواہش کے درختوں پہ پڑے ہیں جو سیہ داغ
کہتے ہیں معارف کہ مرے غم کا دھواں ہیں

ہادی نہ ڈریں ان سے عقیدے تو کریں کیا
تشکیک کی زنبیل میں جو مارِ گُماں ہیں

افسانہ

نسیم بن آسی

کہاں جانا ہے

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، جو ڈاک آتی ہے اس میں کوئی خط اپنی الگ پہچان بنا لیتا ہے۔ اور نظریں اسی پر جم جاتی ہیں۔ یہ خط حسن دانا کا تھا۔ اثیر صاحب کے دماغ میں "نیا سویرا" کے ایڈیٹر حسن دانا پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ اسی بڑے آدمی کو وہاں سے نہیں جھٹک سکتے تھے۔ خط اور بڑا آدمی ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

بڑا آدمی وہی ہوتا ہے نا جس کے پاس خوبصورت کوٹھی اور کار ہو۔ حکومت میں اس کا اثر و رسوخ بھی ہو! ایک طرف اُسے عزت و شہرت ملتی ہے دوسری طرف وہ بگڑنے لگتا ہے۔ جو لوگ اُسے اوپر اٹھاتے ہیں، انہیں ہی وہ اپنے سے چھوٹا سمجھنے لگتا ہے۔ کوئی زیادہ پڑھ لکھ لے، علم و ادب میں کمال حاصل کر لے اور کئی کتابیں بھی لکھ ڈالے، اس کے بعد وہ اپنے کو بڑا آدمی سمجھنے لگے تو یہ اس کی بیوقوفی ہے۔ جس کا اندازہ اسے اُس وقت ہوتا ہے جب اس کے یہاں کوئی مہمان آتا ہے۔ وہ پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے اور شرمندگی سے اس کے بیٹھنے کے لئے کرسی کے بجائے چارپائی بچھاتا ہے۔ جو پہلے ہی سے بے حیثیت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی وہ سوچتا بھی ہے۔

کاش! مہمان دن ہی میں چلا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن مہمان جانا نہیں چاہتا۔ وہ الٹا احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے۔ میں تو اپنا ضروری کام چھوڑ کر چلا آیا۔ میرے پاس کہیں جانے کے لئے وقت کہاں؟ وہ دکھانے کے لئے اُس کی دلجوئی کرتا ہے اور مہمان اُس سے چپکتا جاتا ہے۔ رات آتی ہے جو اس کی نہیں مہمان کی ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک ہی چارپائی ہے جسے وہ سونے کے لئے مہمان کو دے دیتا ہے اور خود کہیں زمین پر لیٹ رہتا ہے!

حسن دانا نے خط میں لکھا تھا۔

" میں نے عباس سوز صاحب کو ٹیلی فون کر دیا ہے۔ آپ کمال کو الہ آباد جلد بھیج دیں۔ عباس سوز صاحب، الہ آباد میں ایچ۔ ویلر اینڈ کمپنی کے جنرل مینیجر ہیں۔ ان سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ وہ اپنے یہاں عزیزی کمال کو کوئی نہ کوئی جگہ ضرور دیں گے۔ ان سے ساری باتیں تفصیل سے ہو چکی ہیں۔"

خط پڑھ کر اثیر صاحب پر وہ عالم طاری ہو گیا جس میں انسان کا کبھی کبھی فیوز اڑ جاتا ہے۔ اور وہ کھنچا ہوا پایا جاتا ہے۔ دیکھا قسمت کھلتی ہے تو اس طرح! اُس وقت زبان سے ہی نہیں اُس کے جسم سے بھی اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ جب ان کی تنخواہ اعیار ٹھہر بیوی پر گئی۔ جس سے ان کی ایک منٹ نہ پٹتی تھی۔

" کمال کو الہ آباد میں کام مل رہا ہے!" انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیٹے کو کام ملے تو ہر ماں کو خوشی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو [illegible] الٹی تھی۔ وہ کچھ اداس [illegible] ہو کر بولی۔

"میرے بھی دو چار ہیں کیا؟ ایک ہی تو ہے!"
یہی تو ممتا ہے جو ماں کے دل سے کبھی نہیں مٹتی۔ ماں بھوکوں مر سکتی ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کو اپنے سے دور نہیں رکھ سکتی۔ ہاں بیٹے کی بات اور ہے۔ وہ ماں سے دور بھی رہ سکتا ہے اسے بھول بھی سکتا ہے!

دوسری طرف لوگوں کی باتیں۔ جو امیر صاحب کی دونوں لڑکیوں کی شادی کے بارے میں ہوتیں۔ یہ سچ تھا بن بیاہی لڑکیاں کب سے شرمائی شرمائی سی پھر رہی تھیں۔ شرم بھی جوان لڑکیوں کے وجود سے ایسے چپک جاتی ہے جو کبھی الگ ہی نہیں ہوتی!
پھر کمال کی بیکاری بھی تھی جس کی وجہ سے اس کی بہو شادی کے بعد تین سال سے اپنے میکے ہی میں تھی اور بیکار رہو رہی تھی۔ امکاں مقابلہ اور انٹرویو میں شامل ہونا لیکن ہونا ہوا تا کچھ بھی نہ تھا۔ جو جگہ خالی ہوتی اُس کے لئے امیدوار رشوت اور سفارش سے پہلے ہی رکھ لئے جاتے۔ مقابلے اور انٹرویو دکھانے کے لئے ہوتے۔ امیر صاحب کو اپنی چھوٹی سی آمدنی میں گرہستی کی گاڑی چلانے کے لئے اُسے دھکے دینے پڑتے۔ جو بیچ میں الٹ بھی جاتی تھی جس سے چوٹیں بھی آتی تھیں۔ خون بھی بہتا تھا۔ . . . .

کیا کمال ایسے ہی بیکار رہے گا؟" امیر صاحب نے اپنی بیوی سے کہا۔
"اُسے گھر سے نکال دو نا۔ مفت بیٹھے بیٹھے کھا رہا ہے"
بیوی نے کہا۔
"بیٹے کو میں گھر سے نکال دوں۔ جو کسی دوسرے کا نہیں اپنا ہی بیٹا ہے۔ میں ہی کیوں نہ نکل جاؤں۔ اس گھر میں اب تم ہی رہو نا!" امیر صاحب اُسی شر میں بولے۔
عورتیں جتنا جلدی کسی بات پر ناراض ہوتی ہیں، اتنا ہی جلدی کسی دھکے سے ڈر بھی جاتی ہیں۔
امیر صاحب کی بیوی کی آواز بند ہو گئی۔!

"نیا سویرا" بکتا ہی اسی لئے تھا کہ اُس کو امیر صاحب جیسے ادیب لکھتے تھے۔ حسن دانا کے پاس منقل تھی۔ اُنھوں نے امیر صاحب کو لاہور بلا لیا۔ وہ حسن دانا کے گھر سے ایسا جڑے کہ ان کا گھر امیر صاحب کے لئے اپنا گھر ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد حسن دانا لاہور سے دہلی آگئے تو "نیا سویرا" دہلی سے نکلنے لگا۔ دفتر بھی ملا تو دریا گنج میں جو دہلی ہی شہر کا خاص حصہ ہے جہاں کوئی دریا تو نہیں، لیکن اس کی لمبی چوڑی سڑک پر ہر وقت کاروں، ٹیمپوؤں اور اسکوٹروں کا دریا بہتا رہتا ہے۔ سڑک ہی کے کنارے "نیا سویرا" کا دفتر تھا جس کی دیوار پر "نیا سویرا" کا بورڈ لگا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے حروف دور ہی سے دکھائی دیتے تھے۔ پاس ہی "چترا" سینما میں شو دیکھنے والوں کی بھیڑ کبھی اندر کبھی باہر دکھائی دیتی۔ دہلی ویسے بھی بھیڑوں کا شہر ہے۔ جہاں انسان صرف بھیڑ کی وجہ سے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے!
امیر صاحب نے کمال کو بلایا اور کہا۔
"دیکھو، حسن دانا صاحب کا خط آیا ہے!"
خط پڑھ کر کمال کو وہی خوشی ہوئی جو ہر نوجوان کو بیکاری کے دنوں میں ہوتی ہے۔ نوجوان گریجویٹ کے لئے نوکری ایک مسئلہ ہوتی ہے۔ جو کسی طرح حل نہیں ہوتا ہے۔ وہ جگہ جگہ خاک چھانتا ہے، آخر وہ خود بھی خاک ہو جاتا ہے!
امیر صاحب کی خودداری تھی جو وہ اپنے مطلب کی بات کسی سے نہیں کہتے تھے۔ کہتے بھی تو اشارے اور کنائے میں۔ جسے آج کی دنیا سمجھ کر بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ اپنی اسی شرافت کی وجہ سے مارے جا رہے تھے۔ انہیں گھس پیٹھ کی عادت نہیں تھی۔ گھر والے کہتے۔
"لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور آپ ابھی زمین ہی پہ ہیں!"
امیر صاحب آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھتے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے، لیکن کہہ نہ پاتے کہتے بھی تو صرف اتنا۔
"کہاں پہنچ گئے؟ آسمان پہ!"
"نہیں۔ لیکن وہ آپ سے اچھے ہیں۔"
امیر صاحب کی آنکھیں کسی گہرائی میں ڈوب جاتیں۔

جیسے وہ حقیقت کی تھاہ پانا چاہتی ہوں۔

"اپنا بیٹا ہو کر تم ایسا کہتے ہو!"

"آپ کا بیٹا ہوں جب ہی تو کہتا ہوں!"

"اچھا۔ بکو اس بند! میں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا پھر بھی میں نے ماں بیٹے کے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔"

اس نوک جھونک کے بعد کچھ دیر کے لئے فضا میں خاموشی چھا جاتی۔ بیٹا تو اپنی بات کہہ کر چپ ہو جاتا۔ لیکن امیر صاحب پر اُس کی باتوں کا گھنٹوں اثر رہتا جیسے وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔!

حسن دانا اپنے قلم سے کسی کو خط نہیں لکھتے تھے۔ وہ اکثر لوگوں کو منیجر سے خط لکھواتے تھے اور نیچے صرف اپنے دستخط کر دیتے تھے۔ یہ جو خط آیا تھا، حسن دانا نے اُسے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ جس سے اُس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی!

زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جس میں انسان کچھ دیر کیلئے ماضی میں پلٹ جاتا ہے۔ اور اس میں سے نکلنا نہیں چاہتا سوچ کی پرواز اتنی اونچی ہو جاتی ہے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ امیر صاحب کچھ لمحوں کے لئے ماضی میں کھو گئے۔

چمکیلی کار دریا گنج سے ہو کر نہ جانے کتنی لمبی چوڑی سڑکوں کو پار کر رہی تھی۔ پرانا قلعہ، انڈیا گیٹ، چڑیا گھر اور بہت سے دوسرے مقام آئے جو کار کی وجہ سے ذرا بھی دور نہیں معلوم ہوتے۔ حسن دانا کار خود ڈرائیو کر رہے تھے، ایسٹ نظام الدین میں کار داخل ہوتے ہی بڑی بڑی کوٹھیاں نظر آنے لگی تھیں۔ راستے میں جینز . . . میں ملبوس جوان لڑکیاں دکھائی دیں جو اپنے ملک کی ہوتے ہوئے بھی غیر ملکی معلوم ہو رہی تھیں۔ کوٹھیوں کے سامنے پھولوں سے لدے لان۔ جن میں جوان لڑکیاں چست لباس پہنے اپنی ننگی گداز بانہوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی ننگی بانہوں کے نیچے اُن کا "وہ" دکھائی دے رہا تھا، جس کی انھیں ذرا بھی پرواہ نہیں تھی!

ایک کوٹھی کے سامنے کوئی ادھیڑ عمر کی پنجابی عورت چست جینز پہنے اپنی کار کے پاس کھڑی تھی۔ شاید اُسے کہیں جانا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پہ گہری لپسٹک تھی اور اس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ دل جوان ہے تو عمر سے کیا ہوتا ہے! ہمارے بڑے بڑے مفکر بھی یہی کہتے ہیں!

حسن دانا کی کوٹھی آ گئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا۔

"امیر صاحب! اس کوٹھی میں آپ کا بھی حصہ ہے!"

کسی کی کوٹھی میں ایسے ہی کسی کا حصہ نہیں ہو جاتا۔ اُس کے کاروبار میں بھی اُسے شامل ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں انھوں نے اپنے خونِ جگر سے "نیا سویرا" کو سینچا تھا۔ اُسے دن رات ایک کر کے پروان چڑھایا تھا۔ اس میں شائع ہونے والے سارے مضامین وہ خود دیکھتے تھے۔ اب وہ تناور درخت تھا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں حسن دانا اور ان کے گھر کے لوگ عیش کر رہے تھے۔ اسٹاف کے لوگ کیسے جھک جھک کے انھیں سلام کرتے تھے۔ کہنے کو سب کچھ ان کا تھا۔ لیکن ان کا کچھ بھی نہ تھا ——!!

جب ہی امیر صاحب کی بیوی نے ہانک لگائی۔

"کھانا نکل گیا ہے!"

بیوی کی ہانک سنتے ہی امیر صاحب کار سے جھونپڑی میں آ گئے! وہ اس یقین کو دل میں جمانے لگے جس کے بغیر انسان کبھی کبھی بہک جاتا ہے اور اپنے کو اس دنیا کا آدمی سمجھنے لگتا ہے جو اصل میں اُس کی اپنی نہیں ہوتی!

انھوں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ لیکن یہ ساڑھے بارہ گھڑی میں نہیں جیسے انھیں پر بج رہے تھے۔ وہ کھانے کی چوکی پر بیٹھے بھی لیکن اوپر کے مَن سے۔ کھانا روزانہ والا ہی تھا۔ تین چار سوکھی روٹیاں، دال، اور کچھ پیاز کی سلاد—! پھر بیوی نے اس انداز سے کھانے کے لئے کہا جیسے وہ کھانا کھانے کے لئے نہیں، کچھ اور کھانے کے لئے کہہ رہی ہو! ایسی حالت میں انسان کھانا کھائے یا کھانا انسان کو۔ بات ایک ہی ہے!

کھانا کھاتے وقت امیر صاحب کے سامنے عباس سوز

شیب کی تصویر ابھر آئی جو "نیا سویرا" ہی میں چھپی تھی فربہ بدن، گٹھا دو پیشانی، کوٹ اور ٹائی۔ تصویر اپنا رعب جما رہی تھی۔ میں ہوں! ایسا نہیں تھا، وہ جنرل منیجر نہیں تھے۔ تھے ــــ بالکل تھے ــــ!!

کتابوں کی مشہور فرم اپنک ڈیلر اینڈ کمپنی کے جنرل منیجر عباس سوز صاحب سے حسن دانا کے تعلقات خالص کاروباری تھے۔ اس پر بھی خلوص و محبت کا خوبصورت لیبل لگا ہوا تھا۔ جیسے کسی بازاری عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی خوبصورت مسکراہٹ۔!

یہی تو بات تھی جب حسن دانا دہلی سے امیر صاحب سے ملنے آئے تو... وہ بنارس سے عباس سوز کے لئے تحفہ کے طور پہ پانچ طرح کے اچار اور پانچ طرح کے مربّہ کے ڈبّے لے آئے۔ جنہیں امیر صاحب نے دیکھا بھی! لیکن صرف دیکھا۔ یہاں بھی ان کی وضعداری آڑے آ گئی۔ اور وہ اپنی خواہش زبان پہ نہ لا سکے! لیکن امیر صاحب کی بیوی بھڑک اٹھی تھی۔

"یہ دلّی والے آپ کے بھائی، میرا مطلب، حسن دانا صاحب آپ کو کیا دیتے ہیں۔ آپ کے لئے کیا لاتے ہیں؟"

"وہ مجھے کتنی عزّت، کتنا پیار دیتے ہیں، یہ تمہیں نہیں معلوم کمال کی ماں!" امیر صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"پیار، محبت اور ہر ماہ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ــ جس سے انسان زندہ تو رہ سکتا ہے، پیٹ نہیں بھر سکتا۔!"

"کیا مطلب ؟ اُن کا کام چھوڑ کر کہیں چوری ڈکیتی کروں!"

پھر وہی بے بسی۔!

اور امیر صاحب کی بیوی چپ ہو گئی تھی۔!

کھانا کھانے کے بعد امیر صاحب نے بنڈل سے حسن دانا کا خط نکالا اور اُس کی گرد جھاڑ کر کمال کو دیتے ہوئے کہا۔

"کل الٰہ آباد جانا ہے، یہ خط عباس سوز صاحب کو دے دینا۔"

خط کمال صاحب نے سنبھال کر رکھ لیا۔

رات ہمیشہ کی طرح کالی اور جوان تھی۔ اور آسمان پر اسی طرح تاروں کا جگمگٹ تھا، جیسے ہر چیز لٹنے کے لئے تیار رہو! کمال بستر اور نیند کی آغوش کے بیچ لٹکتا رہا۔ یہ کیسی خوشی تھی جو اس کی نیند پر چھا گئی تھی۔ جب اُسے نیند نہیں آئی تو وہ ٹکٹکی لگا کر آسمان دیکھنے لگا۔

سورج نکل چکا تھا۔ اور دھوپ اس کے بستر پر رینگ رہی تھی۔ دھوپ نہ نکلتی تو وہ کچھ دیر اور سوتا۔ لیکن دھوپ تو ہر چیز کو جگا دیتی ہے اور جب ایک بار انسان جاگ جاتا ہے تو پھر نیند کہاں آتی ہے۔ ہاں بچپن میں وہ دھوپ میں بھی سویا رہتا تھا۔ تب اس کے والد کو اُس پر پانی چھڑکنا پڑتا تھا۔ اور وہ بڑبڑا کر اٹھ جاتا تھا۔ لیکن وہ بچپن کی نیند تھی۔ اور یہ تھی جوانی کی نیند۔ جو آتی بھی ہے، نہیں بھی آتی۔!!

ریل کے عام ڈبّوں میں ایسے بھی مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ ریزرویشن کی بات دوسری ہے۔ جس میں انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جس سیٹ پر وہ بیٹھا ہے، وہ سیٹ اس کے باپ کی ہے۔ جس کے کسی کونے پر بھی وہ کسی کو بیٹھنے سے منع کر سکتا ہے۔

گاڑی میں ایک کالا انجن جڑا کب سے سوں سوں کر رہا تھا۔ اور چالو ہونے کے لئے بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ سیٹ نہ ملنے پر کمال کو کھڑا ہی رہنا پڑا۔ جس سے اس کا اپنا آپ کچھ چھوٹا معلوم ہوا۔ لیکن کچھ ہی دیر میں یہ احساس ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ بہت سے دوسرے لوگ بھی اسی طرح کھڑے تھے۔ انجن کو جوش آ گیا تھا۔ اُس نے چیخ ماری۔ پھر وہ چلنے لگا۔ چلتے ہوئے انجن کو دیکھ کر نیلم ہوتی تو ضرور شرما جاتی۔ جیسا وہ اسٹوو میں ہوا دیتے وقت شرما گئی تھی ــ!

جب کوئی اسٹیشن آتا تو انجن کی رفتار مدھم ہو جاتی۔ اور وہ رُک جاتا۔ کچھ ہی لمحے میں وہ پھر چالو ہو جاتا۔ زندگی کا پورا سفر ایسے جھک جھک پھک پھک سے شروع

ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے!

راستہ میں مرزاپور آیا جہاں اس کے جان پہچان کے ایک شاعر حیرت صاحب رہتے تھے۔ گاڑی ایک پل کے لئے وہاں رک گئی۔ حیرت صاحب اپنی شاعری کی وجہ سے بیکار تھے۔ اور وہ گر یجویٹ ہونے کی وجہ سے! گاڑی تین ساڑھے تین گھنٹے میں الٰہ آباد پہنچ گئی۔ یہاں بہت سے مسافر اتر گئے بہت سے چڑھ گئے۔!

وہ اسٹیشن سے باہر آیا تو وہی قلی، رکشا والے اور بیکار مزدور نظر آئے جو ساری دنیا میں اپنے چہروں ہی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ کمال کو محسوس ہوا، اُسے بھی کوئی پہچان رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔

"میاں! کیا کرتے ہو۔؟" اور اس کے پاس اس "کیا" کا کوئی جواب نہیں ہے!

اُس نے ایک رکشا کیا۔ اور اُس پر بیٹھ گیا۔ رکشا والا بوڑھا تھا اور ضد کر رہا تھا۔ کمال نے اُسے ایک دو بار کہا بھی۔ یار! ذرا جلدی چلو! لیکن وہ اپنی ایک ہی رفتار سے چل رہا تھا۔ جیسے وہ رکشا کو نہیں، رکشا اسے خود کھینچ رہا ہو۔ اس سے اچھا تو پیدل ہی تھا۔ یہ سالے۔ یہ رکشا والے ہی تو ہیں جو ذرا سی بات پر ہڑتال کر دیتے ہیں اور لوگوں کا آنا جانا بند کر دیتے ہیں۔ پولیس والے رکشا والوں کو ایسے تھوڑے ہی مارتے ہیں، یہ اُن سے بھی پیسے مانگتے ہیں!

اینگلو ویلر اینڈ کمپنی کا دفتر آ چکا تھا۔ کمال نے نیم کے پیڑ کے پاس ہی رکشا رکوا دیا۔ اور رکشا والے کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔ "جیو!"

اُس وقت رکشا والا اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔ کمال جب آگے بڑھا تو وہ بھی جاتے ہوئے رکشا والے کو کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔!

دفتر کے سامنے ٹین شیڈ کی ایک عمارت تھی جس کی کھڑکیوں کے پٹ باہر کھلے ہوئے تھے۔ اس میں ترشے ہوئے بالوں اور ہونٹوں پر گہری لپسٹک لگائے اینگلو انڈین اور ہندوستانی لڑکیاں ٹائپ کر رہی تھیں۔ ٹائپ کرتے ہوئے ان کی انگلیاں زخمی ہو رہی تھیں۔ . . . . . . شاید ان کے دل بھی . . . .

دفتر کے دروازہ پر جنرل منیجر کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ کمال نے چپراسی سے کہا۔

"مجھے عباس سوز صاحب سے ملنا ہے!"

چپراسی نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر کمال کو دیکھا پھر ہرے رنگ کا پردہ ہٹا کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور بولا۔

"صاحب کہہ رہے ہیں، کیا کام ہے؟"

کمال نے حسن دانا کا خط دیتے ہوئے کہا۔

"اسے صاحب کو دے دو۔!"

چپراسی خط لے کر اندر چلا گیا۔ کمال نے سوچا، خط دیکھتے ہی وہ اندر بلا لیا جائے گا۔ لیکن وہ بہت دیر تک باہر ہی کھڑا رہا۔ اندر سے جو آدمی باہر آیا وہ شکل و صورت میں عباس سوز ذرا بھی نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ جنرل منیجر کا پی۔ اے تھا۔ اس نے کمال کو دیکھتے ہی کہا۔

"حسن دانا صاحب کا فون آیا تھا انھوں نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ لیکن اس وقت صاحب مل نہیں سکتے۔ وہ بہت بزی ہیں!"

کمال کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر وہ سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی لمبائی گھٹنے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ سڑک کی طرف مڑ گیا۔ جب ہی ایک رکشا والے نے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟"

کمال کے اندر سے بھی آواز نکلی لیکن وہ اُس کے گلے ہی میں کہیں پھنس کر رہ گئی۔!

●●

کرشن دھیجہ

جمہوریت کے لیے پریس کی آزادی نہایت ضروری —— وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

کوروکشیتر یونیورسٹی کے گیتا سدن میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو "ہریانہ ایکریڈیٹڈ پریس رپورٹرز یونین" کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں ریاستِ ہریانہ کے یکصد سے زائد مندوبین شریک ہوئے۔ وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال نے اجلاس کا افتتاح فرمایا۔ وزیرِ اعلیٰ کی جلسہ گاہ میں تشریف آوری پر تمام مندوبین نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ اس اجلاس میں چیف پارلیمنٹری سیکریٹری، ہریانہ جناب رن سنگھ مان، مشہور جرنلسٹ جناب کلدیپ نیئر اور شریمتی نیئر، روزنامہ "وشو مانو" کے چیف ایڈیٹر جناب مادھو کانت مشر، محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ کے ڈائریکٹر جناب این۔ کے۔ جین، کوروکشیتر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ایم۔ کے۔ مِگلانی جیسی اہم شخصیات بھی تشریف فرما تھیں۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال نے خطاب کے دوران فرمایا کہ پریس کی آزادی میں ہمارا پختہ یقین ہے۔ پریس کی آزادی کے بغیر جمہوریت برگ و بار نہیں لا سکتی۔ ہر اخبار کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ عوام میں اپنی ساکھ اور اعتماد مضبوط کرے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میں اخبارات کی وجہ سے ہی جنگِ آزادی میں شامل ہوا تھا — طالب علمی کے دوران میں مہاشہ کرشن کے شذرات پڑھا کرتا تھا۔ میری زندگی پر ان کا اثر پڑا۔ اخبارات ہی عوام میں حب الوطنی کے جذبات بیدار کر سکتے ہیں۔ ہریانہ سنگھرش سمتی کے "نیائے یدھ" میں پریس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریس نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا اور کسی دباؤ کے بغیر "نیائے یدھ" کے سبھی پہلوؤں کو صحیح طریقے سے عوام الناس کے سامنے

پیش کیا۔

چودھری دیوی لال نے صحافیوں کو یاد دلایا کہ سماج نے بڑی اہم ذمہ داری آپ کے سپرد کی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ جو کچھ دیکھیں یا محسوس کریں اُسے صحیح صورت میں پیش کریں۔ اکثر اوقات محض شخصی عناد، بغض یا کینہ کے باعث ہی کسی شخص کی کردار کشی کی جاتی ہے جس سے سماج کا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وزیر اعلیٰ موصوف نے مزید فرمایا کہ اخبارات جہاں ایک طرف عوامی بیداری کے ذریعہ نئے سماج کی تعمیر کرتے ہیں وہیں یہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ قائم کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ حکومت جو نیک کام انجام دے رہی ہے، اُنہی سے متعلق عام لوگوں کو صحیح جانکاری دی جانی چاہیے۔ تاکہ عوام تعمیری کاموں میں تعاون کر سکیں۔

وزیر اعلیٰ نے شہید لالہ جگت نارائن اور شہید رمیش چندر کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے نصب العین اور آدرشوں کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ موصوف نے پریس رپورٹرز یونین کے دو ممبر ریاست کی پریس ایکری ڈیشن کمیٹی میں شامل کرنے کا بھی اعلان فرمایا۔ مشہور اخبار نویس جناب کلدیپ نیئر نے اپنی تقریر میں کہا کہ صحافت ہی ایک ایسا پیشہ جس میں آپ اپنے آدرشوں اور سدھانتوں کے [illegible] سکتے ہیں۔ جمہوریت میں صحافت کو چوتھا ستون تسلیم کیا گیا ہے۔ اس پیشہ کو اپنانے والے اپنے فرائض کو بخوبی ادا کریں۔ ملک سب سے عظیم اور عزیز ہے۔ ہم سب کو اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ تمام پارٹیاں اور حکومتیں ملک سے کمتر ہیں۔ حکومتیں اور پارٹیاں ٹوٹتی رہتی ہیں لیکن ہم سب کا فرض ہے کہ باہمی اتحاد و اتفاق سے ملک کو ٹوٹنے سے بچائیں۔

چیف پارلیمنٹری سکریٹری جناب سن سنگھ مان نے اخبار نویسوں کے لیے اہم مراعات کا اعلان کیا۔ موصوف نے وزیر اعلیٰ کی طرف سے چند مانگیں منظور کرتے ہوئے کہا کہ ہریانہ میں ضلع، تحصیل اور قصبے کی سطح پر کام کرنے والے اخبار نویسوں کو "ایکری ڈی ٹیشن" دی جائے گی۔ اس کے لیے اب پانچ سال کے تجربہ کی جگہ صرف ایک سال کام کرنے کا تجربہ ہی کافی ہوگا۔ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ جرائد کے نمائندے بھی اسی ذیل میں آئیں گے۔

ہریانہ ایکری ڈیٹیڈ پریس رپورٹرز یونین کے صدر ڈاکٹر شانتی سروپ شرما نے اس موقع پر اخبار نویسوں کی مانگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجاہدینِ آزادی کی طرح صحافیوں کو بھی بڑھاپا پنشن دی جائے۔ اخبار نویسوں کے بچوں کو مفت تعلیم دی جائے۔ ہاؤسنگ بورڈ کالونیوں اور ہُڈا کے رہائشی پلاٹوں کی تقسیم میں کچھ پلاٹ صحافیوں کے لیے ریزرو رکھے جائیں۔ اخبار نویسوں کو ضلعی و ریاستی سطح پر اعزازات سے نوازنے کا انتظام کیا

—

استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری جناب دیوی دیال نتھل نے وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال کی شریمتی اور شری کلدیپ نیر، جناب اوبرائے، جناب رن سنگھ مان اور دیگر معزز مہمانوں اور ہریانہ بھر سے آئے صحافی دوستوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کوروکشیتر "گیان ستھلی" ہے۔ یہ عام انسانوں کے لیے علم و معرفت کا سرچشمہ ہے۔ اخبار نویس اس مقدس سرزمین سے تحریک حاصل کرکے بے خوفی سے صحافت کے شعبے میں ہریانہ اور ملک کی خدمت کریں۔

پریس رپورٹرز یونین کے جنرل سکریٹری جناب ہیرانند شرما نے اجلاس میں یونین کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد وزیر اعلیٰ ہریانہ نے جناب کلدیپ نیر کو امر شہید لالہ جگت نارائن ایوارڈ عطا کیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جناب نیر کو اس اعزاز کے ساتھ خلعت اور ۲۱۰۰ روپے نقد عطا کیے گئے۔ انبالہ کے صحافی جناب جی سی اوبرائے کو "شہید رمیش چندر ایوارڈ" سے نوازا گیا۔

(س ۔ ا ۔ م)

ظہیر رحمتی رامپوری

غزلیں

★

جیب میں چار پیسے جو آنے لگے
وہ حویلی کو سر پہ اٹھانے لگے
جو جزیرے سمندر کی باہوں میں تھے
اب وہاں لوگ بسنے بسانے لگے
ڈوبنے سے بچانے کو اپنا نگر
گاؤں کی اور پانی کٹانے لگے
چست کپڑے اب اس کے بدن پر بھی ہیں
میرے منے کو بھی "سر" چڑھانے لگے
نوجواں کیا ہوا پیڑ ان کا ظہیر
پتے اڑ کر میرے گھر میں آنے لگے

★

بستر خواب سے اٹھا دینا
آٹھو تم مجھے جگا دینا
دن صفائی نہ دے سکا اپنی
رات کے حق میں فیصلہ دینا!
گود لے کر جھکے درختوں سے
سوکھے پیڑوں پہ پھل لگا دینا
چاند کی روشنی میں پڑھتا ہے
اس کو سورج میرے خدا دینا
سبز منظر ظہیر چاہتا ہے
میرے مالک میرے خدا دینا

سلیم شہزاد

(دوسری اور آخری قسط)

جدید غزل کی لفظیات

تشبیہ اور استعارہ کے بعد اب پیکر اور علامت جدید غزل میں شعریت کے حامل لوازم کی طرح کثرت سے مستعمل ہیں ان کے غزل میں در آنے سے غزل کے بہت سے تکنیکی مسائل از خود حل ہو گئے ہیں۔ مثلاً خیال کی ادائیگی کا طول جس سے صرف و نحو کے تقاضوں کو مکمل طور پر برتنے بغیر فنکار کو آزادی نہ تھی، جو شعر میں الفاظ کی افراط اور غیر فطری اظہار کا سبب بنتا تھا، شعری پیکر اور علامت نے اس طول بیانی کو مختصر کر دیا ہے۔ جدید غزل کی لفظیات میں سیکڑوں ایسے منفرد الفاظ اور لفظی تراکیب ملتی ہیں جو ان لوازم کی تخلیق میں معاون ہیں۔ فطری اظہار نے صرف و نحو کی مکمل پابندی کے اصول کو توڑ دیا ہے اس لئے جدید غزل کی زبان کا نمایاں اسلوب زبان کی شکست و ریخت کا اسلوب ہے جس میں مجرد الفاظ، تراکیب اور مختصر جملاتی تشکیلات کو اظہار خیال کے لئے بظاہر مربوط لسانی اکائیوں میں پیش کیا جاتا ہے اس طرح کے اظہار میں اکثر فعلیہ کلمات غائب ہوتے ہیں اور خیال اسماء و صفات کے ذریعہ ترسیل کیا جاتا ہے جس کے کامیاب ابلاغ کے لئے تکنیک اور فنکار کی بصیرت کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اس عام فہم علامات کے علاوہ جدید غزل نے جن غیر شعری مظاہر کو علامتوں کے نام پر لفظی حیثیت سے قبول کیا ہے ان میں حشرات الارض سے لے کر وحوش و طیور اور تراکیب و ملابس شامل ہیں۔ چند مثالیں:

ہاتھ سے چھوٹے کبوتر لوٹ کر آتے نہیں، اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر،
سانپ کی آنکھ کہیں سے مجھے تکتی ہے ابھی آخری سانس چھپکلی پہ حرام / چیونٹیوں
میں قتال پھیلا ہوا، تنے ہیں جال ابھی مکڑیوں کے چار طرف، سر کٹا کالی بلائیں
پر ہجوم ابر میں بگلوں کی قطار، راج پشاچوں کا شہر میں، سپاہیوں کے
اینک کتوں نے / دھوپ کی ہڈیاں چبا ڈالیں، نہ منتظر کوئی شیشے کا دیو ہو،
بھوت رہتے ہیں اب مکانوں میں، شیر ہے میرے مچان پر، مجھ پر جھپٹ
پڑیں چیلیں، میرے حواس کو چمگادڑوں کا خون پلا، بھیڑئیے پڑھتے نہیں
ہیں فلسفہ، ذہن میں کیڑے سے رینگ اٹھے، ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اتارے
پکڑ لیا مجھے مکڑوں کے آکٹوپس نے، اندھیارے کمرے میں کالی بلی
ڈھونڈ رہا ہوں،

سانپ، چیونٹی، مکڑی، مچھلی، بلی، کتے اور بھیڑئے وغیرہ الفاظ نے عصری سچائیوں کو طنز و استہزا کے روپ میں بخوبی اجاگر

کرتے ہیں۔ ان کی تخئیلی اور علامتی تہ داریاں اپنے اندر کثیر المعنی دنیائیں پوشیدہ رکھتی ہیں۔ فنکار کا تخلیقی تجربہ جو بھی اظہار اختیار کرتا ہے، اگر اس کے شعور و بصیرت سے بھی ہم آہنگی رکھتا ہوا ہو تو غیر شعری الفاظ بھی ترسیل جذبات و احساسات کا ذریعہ بن جاتے ہیں جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

اب وہ لفظیات جس کی بدولت جدید غزل کو اینٹی غزل کا نام ملا۔ اس قسم کی لفظیات چند فنکاروں کے یہاں ملتی ہے اور کم مستعمل ہے لیکن جدید غزل کو شہرت دینے اور رسوا کرنے میں اس کا بڑا حصہ رہا ہے۔

ہوا جنگلوں میں گزر [illegible] کو کھلے پھلانگنے لگیں [illegible]ں، کوئی [illegible] ماچس سا کانوں میں [illegible] چیل نے انڈا چھوڑ دیا، کوٹھے [illegible] گزر گئی، خواہش پر چھچھوند جم گئی ہے، چاروں طرف بریکیں لگیں ہارن بج اٹھے، مکھیاں بھنکیں گی بھونکیں گے غزل میں کتے، بندوق [illegible] بے ہوش [illegible] میں آدھر اچھالو الف، کاف کی کرسی پہ کالی چاندنی، وہ پھیڑ تھی کہ چوک میں تانگہ الٹ گیا، گھٹنے تڑوا کے فرشتہ ہی پہ ر/ کھیلے نہ پلنگ پہ کبڈی، دھوپ کی ہڈیاں چباڈالیں، جوتے بغل میں دابے کے پگڑی سنبھالنا، حضرت بیوی کو شکایت ہے زبانی نوے ٹوسوبح کو جو بچے ہیں بنئے مرغا کھڑا ہے، تمام بجلیاں لوٹیں تو ہتھوا اروں وغیرہ۔

لفظیات کا ایک ڈھیر ہے جس سے فنکار کے ذہنی الجھنوں کا پتہ چلتا ہے۔ روایت اور کلاسیکیت کے تصنع اور پابندیوں سے انحراف ان مثالوں سے واضح ہے۔ اصول و ضوابط، جبر و تسلط اور رعایت کے خلاف فنکار کا احتجاج اسی زبان میں ممکن اور موثر بھی ہو سکتا ہے۔ جدید زندگی کے اسٹیج پر فرد اور سماج جس لغو مضحکہ خیز اور متضاد صورت حال سے دوچار ہیں اس کا اظہار بھی تصنع اور سکہ بند زبان میں ظاہر ہے کہ غیر فطری ہی ہوگا۔ عصری فضا میں جو فکر و فن، زبان و تہذیب اور قول و فعل غرض ہر شعبۂ زندگی پہ چھایا ہوا ہے، بے معنی سنجیدگی، کھوکھلا تقدس اور لغو کلاسیکی نظم و ضبط ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ تب فنکار کا جذبہ بے لاگ رنگ کا اظہار کرتا، کھڑکیوں کے رنگین شیشے پر پتھر اچھالتا اور دیوار کی سفیدی پر کالک پھیرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ غزل اس طرز و اسلوب کو کہاں تک سہار سکتی ہے؟ کیا اس طرز و اسلوب میں غزل غزل بھی رہتی ہے یا اس لفظیات کے لباس میں اسے کچھ اور نام (ریزل وغیرہ) دینا چاہیے؟ جواب یہ ہے کہ یہ نام نہاد مزاحیہ شاعری نہیں جس کا مقصد بے مقصد ہنسی ٹھٹھا ہوتا ہے اور جو مزاج کی ریا عادتاً ہوتی ہے۔ جدید غزل کا یہ رنگ مصنوعی سنجیدگی اور ضبط کے خلاف رد عمل سے نمو پاتا ہے اور جدید زندگی کی لغو اور بے معنی صورت حال کو اس کے اپنے رنگوں میں اجاگر کرتا ہے۔ اس میں شگفتگی بے ساختگی اور ظرافت سے مزاح کی بجائے طنز اور ہجو کے دائرے میں آتے ہیں جن کے پس منظر میں الم کے سائے بھی جھانکتے ہیں۔

جدید غزل کے وہ موضوعات جنہیں لفظی صورتوں میں تنہائی، ذات، لاحاصلی، بے سمتی، بے یقینیاں، عصر کی سبک رفتاری، ذہن و شعور کا تدریجی ارتقا، اجنبیت اور بے غیرت وغیرہ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے، مختلف لسانی وسائل کا سہارا لے کر اپنی اظہاری تشکیل کرتے ہیں۔ ان موضوعی لفظیات کی چند مثالیں اس طرح ہیں:

کون آئے گا یہاں، اپنے یہاں کے سب رنگ مٹا، صنوبر کا درخت، وہی جسم [illegible] ہے

میں کسی جاتا کیا چلتا ، یہ شخص دوسرا ہے کوئی ، ملبوس خوشنما ہے مگر کھوکھلا ہے جسم ، بہروپیوں کے ساتھ سے گھر رہے ہو کیوں کیسا مکان سایۂ دیوار بھی نہیں ، زوالِ شب کا ہر منظر ہے مجھ میں میں ہوں دیوار پہ لکھا ہوا ، منظر سراب جیسا ہے اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو گئی ، ذہانت کو چھپاتے رہیے ، ایک صحرا کے سوا اب درمیاں کوئی نہیں ، گم سارا دفتر میرا ، سائبان ثابت نہ رہ پایا ، کسی ایسے ڈرامے کا کوئی کردار میں بھی ہوں ، میں بھی دھوکا کھا کر کچھ چالاک ہوا ، اپنے آپ کو اپنا نہ جانیے ، میں کھلونا ہوں تیرے ہاتھوں میں ، تو اپنے گھر کی آگ بجھا۔ قریب آئے تو اپنا ہی سامنا تھا ، نہیں ، ہمسفر کون ہے بے سمت سفر میں اپنا۔

لفظیات کے جائزے کو ذیل میں جدید غزل کے قافیوں اور ردیفوں کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ لوازمِ غزل صوتی آہنگ ، نغمگی اور اپنی ملفوظی حیثیت سے شعر کے خیال کو ترغیبات بخشتے اور ابلاغ کی سرعت میں معاونت کرتے ہیں۔ جس طرح اقبال کی غزلوں کے قوافی (بالِ جبریل کے پیشِ نظر) اقبال کے مخصوص پیغام کی ترسیل میں مدد و معاون ہوتے ہیں اور ان کا آہنگ خیال کی عظمت اور رفعت کی ہمسری کرتا ہے اسی طرح جدید غزل کے قوافی اور خصوصاً ان کی تخلیقی ردیفیں فنکار کے جذبات کی شدتوں اور اس کے ذہن کی متموج کیفیات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ بنتی ہیں۔ قافیہ شماری کے ذریعہ لفظیات کا وہ تقاضہ بھی پورا کیا جاسکتا ہے جس میں متعین صوتی آہنگ والے الفاظ کے انشائے معنی اور ترسیل و ابلاغ کے بعد تاثر پذیری کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ردیف شماری کا مقصد لفظیات کی گونا گونی ، تعددِ معنی اور ابلاغ میں صوتی آہنگ کے تاثرات کا جائزہ ہوتا ہے۔ بعض ماہرین قافیہ اور ردیف کی شعریت کے قائل نہیں ان کے خیال میں حرفِ روی پر قافیے کی حد ختم ہو کر ردیف کی حد شروع ہو جاتی ہے چاہے حرفِ روی کے بعد کے ملفوظی اجزاء (صوتیے اور صرفیے وغیرہ) قافیے کی لفظی صورت کا حصہ ہوں اس شعر سے جس کی مثال واضح ہوتی ہے ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل ، جگر تشنۂ فریاد آیا

" تر " اور " فر " کے حرفِ روی " ر " پر قافیہ ختم ہو جاتا ہے اور پہلے مصرعے کے بامعنی فقرے " یاد آیا " اور دوسرے مصرعے کے بے معنی فقرے " یاد آیا " (کہ یہ فریاد کا حصہ ہے) سے ردیف کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مخصوص مثال ہے۔ عام صورتوں میں " آتیں " اور " روتیں " وغیرہ میں " آ " اور " رو " میں قافیہ ہے جن کا حرف روی [illegible] " تیں " صرفیہ جزوِ ردیف ہے " پالے " اور " نکالے " " وفتہ " اور " ترکتے " " اٹھاؤں " اور " گیا ہوں " " پانی " اور " [illegible] " " خواب ہوں " اور " [illegible] ہوں "

وغیرہ اسی زمرے میں آنے والے قوافی ہیں۔ جدید غزل کی قافیہ اور ردیف شماری میں اسی تصور سے حرفِ نظر نہیں برتا گیا ہے چند شعراء کے انتخابات سے ماخوذ قوافی کی خانہ بندی اس طرح پیش ہے:

کتابیں	الف قافیہ	ب	ت	د	ر	س/ش	ن	ا+ن د+ن ی+ن	ل	ے/ی
شعر شگفتہ	۱۶	۹	۳	۳	۹	–	۴	۱۲	۳	۳
بھیگا ہوا کاغذ	۳۲	۳	۴	–	۱۶	۳	۹	۵	۸	۲
حاصل	۲۳	۱	۲	–	۱۲	–	۵	۴	۴ ۲/م ۲	۲
رنگِ شکستہ	۲۱	۴	۶	۱	۲۲	–	۶ ۳/و	۱	۵	۵
برگِ آتش سوار	۱۷	۱ ۱/پ	۳	۷ ف/ڑ ۱+۱	۲۴	۸	۱۴	۶	۱۱ ۳/م ۴	۷
امیج	۲۹	۱	۲ ۱/ٹ	ف/ ۱	۹	۱	۳	۳	۲ ۲/ ۱	۱۱
ایک سو غزلیں	۴۴	۳	۱ ۲/ٹ ۳	۱ ۱/ڑ ۱	۲۸	ک/گ ۱+۱	–	۵	۶	۵
روبرو	۲۶	۱	۵	–	۱۳	۱/گ ۱	۲ ۲/و ۲	۱	۲ ۱/م ۱	۶
اقرار	۱۳	۲	۴	۳	۱۰	۳	۱	۵	۳	۴
رشتہ گونگے سفر کا	۱۷	–	۳	–	۱۰	–	۲	۲	۱	۱
نفی	۱۰	۱	–	۱	۷	–	۱	۳	۲ ۱/م ۱	۳
دعا: بر منتشر	۱۳	۴	۴ ۱/ٹ ۱	۱	۲۰	۱ ۱/گ ۲	۳	۴	۴	۵

اس خانہ بندی میں وہ قوافی "الف قافیہ" ہیں جن کا حرفِ روی صوتی لحاظ سے "الف" ہے (دعا، دیکھنا، کیا) ہائے مختفی پر ختم ہونے والی قوافی بھی اسی میں شامل کر لئے گئے ہیں (آئینہ، سایہ، مرثیہ، اندازہ) کیونکہ اس کا تلفظ "الف" جیسا ہی کیا جاتا ہے۔ مصادر کے وہ امر جو "الف" پر ختم ہو کر بعض حرفیوں کے ساتھ افعال بناتے ہیں انھیں اسی خانے میں رکھا گیا ہے (لایا، دکھایا/کمائی، مسکرائی/مسکراتے، بچاتے) "ب قافیہ" میں حرفِ روی "ب" کو اولیت دے کر (خواب، کتاب، انقلاب) دوسری شکلوں کو بھی "ب" ہی میں شامل کیا گیا ہے (خوابوں، کتابوں، انقلابوں) "ت قافیہ" میں حرف روی "ت" (ذات، حیات، کائنات مع الفِ تاسیس) کے علاوہ بھی "ت" صوتیے والی قوافی شامل ہیں (حسرت، قیامت/جیت، گیت/بھوت، بھبھوت) "ر قافیہ" میں حرفِ روی "ر" (سر، سفر، منتشر) کے علاوہ حرف تاسیس "الف" کے ساتھ آنے والے قوافی بھی شامل ہیں (یار، بہار، دیوار، انتشار) دوسری شکلیں ان کے علاوہ ہیں (میر، تصویر/دور، منظور/مرتے، گزرتے) "ن قافیہ" حرف روی "ن" (تن، چمن، پیرہن) اور حرف تاسیس "الف" کے ساتھ (جان، انسان) کے قوافی پر مشتمل ہے۔ "ا + ن"، "و + ن" اور "ی + ن" (امتحان، دھواں/خوں، جنوں/زمیں، آستیں) جدا خانے میں ہیں۔ "ل قافیہ" حرفِ روی "ل" (دل، منزل/جنگل، بادل) کے قوافی اور حرفِ تاسیس "الف" (جال، نڈھال) اور "ل" سے بنتا ہے "ل" پر ختم ہونے والے مصادر کے امر اور حرفیوں کے اضافے سے بننے والے افعال بھی اس میں شامل ہیں (جلتے، پگھلتے) "ی قافیہ" میں "ی" معروف حرف روی والے (پانی، کہانی/روشنی، دوستی) کے قوافی اور "ے" مجہول حرف روی والے (چہرے، دیکھے، اترائے) قوافی آتے ہیں "ز، ڑ، س، ش، ک، گ، م، و" وغیرہ کی تمام قافیائی شکلیں چونکہ کم مستعمل ہیں اس لئے سوائے "برگِ آتش سوار" کے قافیوں کے اندراج کے ان سے صرفِ نظر کیا گیا ہے کیونکہ اس مجموعے میں زیرِ شمار تمام مجموعوں کے مقابلے میں مختلف النوع قوافی ہر ممکن صوتی تبدل کے ساتھ برتے گئے ہیں۔

اس خانہ بندی میں بارہ مجموعہ ہائے کلام سامنے رہے ہیں جن میں آٹھ صرف غزلوں پر اور چار غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہیں مگر ان میں غزلوں کی تعداد قابلِ لحاظ ہے مجموعی حیثیت سے جن قوافی کی تعداد نمایاں ہے وہ "الف قافیہ" اور "ر قافیہ" ہیں۔ غزلوں کے آٹھ مجموعوں کے "الف قافیہ" کا اوسط (۴۹) اور "ر قافیہ" کا اوسط (۱۹٫۷) ہے دیگر چار مجموعوں کے "الف قافیہ" کا اوسط (۱۳٫۲۵) اور "ر قافیہ" کا اوسط (۱۱٫۷۵) ہے تناسب کا فرق یا توازن واضح ہے۔ حاصلِ شمار یہ کہ

(۱) صرف غزلوں پر مشتمل مجموعوں میں جو اوسط تعداد "الف قافیہ" اور "ر قافیہ" کی ہے وہی یا کچھ کم و بیش اوسط تعداد غزل و نظم کے مشترکہ مجموعوں کے مذکورہ قافیوں کی بھی ہے۔

(۲) جدید غزل میں قافیائی لفظیات سے صرف "الف" اور "ر" حرفِ روی والی لفظیات استعمال کی جا رہی ہے۔ دیگر قوافی کی جانب شاعر متوجہ نہیں۔

(۳) "ب، ت، گ، ن، م اور ی" وغیرہ قوافی نسبتاً کم مستعمل ہیں۔

یہ صورتِ حال کیوں ہے؟ کیا شاعر سہل پسند ہے؟ کیا اس کے اظہار کے لئے یہی دو قافیے کافی ہیں؟ کیا دیگر قافیوں میں اس کے خیال کے اظہار کی صلاحیت نہیں؟ یا وہ اپنے مرغوب مضامین باندھنے کی دھن میں محدود سے چند قافیوں سے بندھ کر رہ گیا ہے؟ کیا تکرارِ لفظی کی ایک اہم وجہ تکرارِ قافیہ بھی نہیں؟

پہلے سوال کا جواب دوسرے سوال میں اور دوسرے کا جواب تیسرے سوال میں موجود ہے۔ اس لفظیاتی جائزے

سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو چند خاص مضامین پسند ہیں جو ایسے قوافی کی طرف خیال کی رہنمائی کرتے ہیں کہ پھر پھر کر
انھیں میں غزل تیار ہو جاتی ہے۔ سفر، سمندر، پتھر، گھر، منتشر، بال و پر، شام و سحر، منظر، تار، دیوار، بانا، اخبار، گرفتار، سراب
حباب، اضطراب، زباں، رائگاں، آسماں، دھواں، گماں ہوا، دعا، سلسلہ، انا، صحرا، سایہ، دھوکا، مدیا وغیرہ ایسے الفاظ
(قوافی) ہیں جو جدید شاعری کے معروف موضوعات کے اظہار کے لیے کافی ہیں۔ شاعر کی طبع رواں زوروں پر ہو تو انھیں
قوافی کو صیغہ جمع میں باندھ دیتا ہے یا ردیفوں کے ہیر پھیر، تذکیر و تانیث اور آیا آئی کے فرق سے غزل کہہ ڈالتا ہے۔ نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ شعری انتخاب اٹھائیے یا کوئی ادبی رسالہ، نصف سے زیادہ غزلوں میں یہی قوافی برتے ہوئے نظر آتے ہیں جسے
دیکھتے ہوئے جدید غزل سے تخلیقیت کے خاتمے کا یقین ہونے لگتا ہے۔

اس بحث کا حتمی طور پر یہ مقصد ہے کہ قافیہ بندی چھوڑ کر قافیہ پیمائی کی جائے۔ شاعر صرف منظوم اظہارِ خیال کا
ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک فنکار بھی ہوتا ہے جو الفاظ کے کل خزانے کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ پھر چند گنے چنے قوافی
سے چمٹ کر رہ جانا کیا معنی؟ آج تو لسانی شکست و ریخت بھی جائز و روا ہو چکی ہے۔ لازمی ہے کہ فنکار لفظ کی ایک ہی صورت
پر قانع نہ رہ کر اسے ہر زاویہ سے گھما پھرا اور توڑ مروڑ کر شعر میں بروئے کار لائے تا کہ فن کے نئے تقاضے پورے ہوں
اور فنکار کی خلاقی کے جوہر بھی کھلیں۔

لفظی ترکیب ہونے کے سبب شعری لفظیات میں ردیف خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ زمینِ شعر کا تصور اس کے بغیر
ممکن نہیں۔ غیر مردف غزلوں میں شعر کی لفظی درو بست اور اس کے خیال کا خاکہ عمومیت رکھتا ہے لیکن معمولی سی ردیف
کے اضافے سے اس کی صوری اور معنوی سطحیں بدل جاتی ہیں۔ ویسے زمینِ شعر کا انحصار بحر و قافیہ پر بھی ہے۔ سنگلاخ
زمینوں میں شعر کہنا قدیم سے فنکاری تصور کیا جاتا ہے اور آج کی غزل میں بھی، نہ سہی سنگلاخ زمینوں میں لیکن معنویت
اور شعریت رکھنے والی ردیفوں کے استعمال سے اسلوب کا حسن، تازگی اور غزل کے فنی رچاؤ کے مقاصد حاصل کیے جا رہے ہیں۔ ناسخ
اور شاہ نصیر کی طرح ظفر اقبال اور زیب غوری وغیرہ نے بھی مشکل ردیفوں والی غزلیں کہی ہیں لیکن عام طور پر جدید غزل
کی ردیف تخلیقی، موضوعات سے ہم آہنگ اور سادہ و پُرکار ہوتی ہے۔ "سفر، سمندر" اور "دعا، مدعا" کے قافیوں
کی طرح اس کی چند ردیفیں بھی مقبولِ عام کے درجے کو پہنچ چکی ہیں۔ "دکھائی دے"، "دکھائی دیتا ہے"، "مجھ میں" اور
"مجھ کو" کی ردیفوں میں بلا مبالغہ ہزاروں غزلیں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ رعایتی شعرا نے بھی "سمندر دکھائی دے" اور
"پتھر دکھائی دیتا ہے" والی غزلیں کہی ہیں۔ شعری لفظیات میں ردیف شماری کا مقصد عموماً صوتی آہنگ کے تاثرات کا جائزہ
اور خصوصاً ردیفوں کی معنیاتی سطحیں تلاش کرنا ہے لیکن شعر میں ردیف قافیے کے بغیر بے معنی ہوتی ہے کہ بے قافیہ لیکن
ردیف والی غزل کا تصور لغو ہے۔ اس لیے یہاں ردیفوں کی معنویت اجاگر کرنے کے لیے قوافی بھی لیے گئے ہیں۔ شعری ادب
کی غزلوں کی ردیفوں کا خاکہ (مع قوافی) یوں بنتا ہے۔

(دیوار) ہے اُف (فضا) میں قید تھا (برابر) کون تھا،
(شاق) ہے کیا، (جدا) کر لے جائے، (بڑھ کر) ہے یہاں
(پانی) میں تھی، (اظہار) میں بھی ہوں، (عذاب) سے چھوٹا
(ستمبر) آ، (ذرا) چل، (فاصلہ) نہ تھا، (نشہ) ہوں
میں بھی، (بجھا بجھا) سا تھا، (ستاروں) کے بیچ، (شراب)

مانگے ہے، (بکھر) جاؤں گا میں، (میزان) میں رکھ، (جائے)
کہاں کہاں، (سبب) کچھ بھی نہیں، (سمندر) تک ہے
(نظر) کہتے ہیں، (گماں) بہت، (منظر) دیکھ، (خطر)
ہے یہ بھی، (سلسلہ) کچھ اور، (اعتبار) کم نہ تھا، (گھر)
تک آئے گی، (خیال) تراش، (مانوس) ہے پاگل، (آئیں)
گی، (نگراں) میں ہوں کہ تو، (کنارے) کی، (لکھی) ہوئی
ہے بستی، (خزانے) آئیں گے، (گہرے) نہیں ہیں، (جھلک)
رہی تھی، (سفر) رہ جائے گا، (صدا) بھی دے

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ردیفوں میں بعض استفہامیہ ردیفیں ہیں (کون تھا، ہے کیا، کہاں کہاں)۔ بعض میں صیغۂ واحد متکلم استعمال ہوا ہے (میں بھی ہوں، ہوں میں بھی) اور چند ایک میں زمانی پابندی ہے (قید تھا، آئے ہیں، آئے گی)، ان میں تخاطب بھی ہے (آ، چل، دیکھ) اور سنگلاخی بھی (ہے اُف، قید تھا، کم نہ تھا، تراش، ہے پاگل)۔ اس جائزے سے جدید غزل کی ردیفوں کا کچھ کم وکاست سے مکمل خاکہ واضح ہو جاتا ہے۔ ان سے جدید غزل کے موضوعاتی رجحانات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے، اس کے طنزیہ اور رمزیہ اسلوب کا پتہ چلتا ہے اور غزل میں تخلیقی جدتوں کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ (اس فہرست کے قوسین میں ہند قوافی میں "رقافیہ" کل قوافی کا ایک تہائی یعنی ہماری قافیہ شماری کے مطابق قابلِ لحاظ تعداد میں ہے)۔

جدید غزل کی مذکورہ مختلف النوع لفظیات کا المیہ ابتدا ہی سے اس کی تکرار کا المیہ رہا ہے۔ کورانہ تقلید کے ضمن میں لفظی دہراؤ کا ذکر آ چکا ہے۔ یہاں کچھ تفصیل:

یوں تو قدیم وجدید ہر عہد کی غزل لفظیات کی تکرار کا شکار رہی ہے لیکن مختصر تر عرصے میں دہراؤ میں مبتلا ہو جانا جدید غزل کی لفظیات ہی کا مقدر تھا۔ جب کہ اس کے لیے حال سے مستقبل تک کی وسعتیں موجود ہیں اور ماضی سے بھی اس کا رشتہ استوار ہے۔ گل وبلبل کی غزل ڈھائی تین سو برس اپنا رنگ جمائے رہی۔ دار و رسن کی غزل بھی کم وبیش پچیس برس تک اپنا پیغام سناتی رہی۔ ان مدتوں میں قدیم غزل میں عصر و فکر کی یکسانیت اور ٹھہراؤ کے باعث اور ترقی پسند غزل میں نظریاتی وابستگی اور پیش آمدہ حالات میں نظریے کی تبلیغ اور ادعائیت کے باعث لفظیاتی دہراؤ واقع ہونا ناگزیر تھا لیکن جدید غزل تو ان میں سے کسی صورت سے دوچار نہیں۔ یہ جس عصر میں رونما ہوئی وہ ہر لحظہ تغیر پذیر اور نئے نئے افکار کے ظہور کا شاہد ہے۔ زمان ومکاں کی تحدید ختم ہو کر وسعتوں اور ہمہ گیریوں کا دور دورہ ہے۔ آواز، رفتار اور فاصلے کے تصورات بدل گئے ہیں۔ دنیا اب خاصی سمٹ چکی ہے۔ ایک خطے کے اثرات دوسرے خطے میں منتقل ہو کر اسے متاثر کرنے لگے ہیں۔ افکار و خیالات، زبان وتہذیب وغیرہ ایک قسم کی عالمی ہم آہنگی سے گذر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں فن وادب بھی جامد اور عہدی مزرہ کر مسلسل تغیرات سے دوچار ہوتے ہیں جیسا کہ آج کا ادب۔ پھر شاعری یا غزل کے اظہار میں یہ دہراؤ کیوں واقع ہوا؟ یہ غزل تو وابستگی اور ادعائیت یا کسی فکری تسلط کی بھی قائل نہیں۔ نت نئے لسانی نظریات وضع ہو رہے ہیں۔ اور شعر وادب پر مرتب ان کے اثرات بھی خاصے نمایاں ہیں۔ یہ لفظی اور خیالی تکرار پھر کہاں سے در آئی؟ کئی وجوہات

ہی جن میں مذکورہ بے شعور تقلید ہی کو مقدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر نئے تجربات سے گریز کی دھن میں جدیدیت اختیار کرکے راتوں رات شہرت حاصل کر لینے کی تمنا، عصر و فکر کی بصیرتوں سے محرومی اور وسیع النظری اور وسیع المشربی کے فقدان کو اس تکرار کی دیگر وجوہات کہہ سکتے ہیں۔ جدید تنقید نے جدید غزل کی تفہیم و تفسیر بھی کچھ ایسے مبہم پیرایوں میں کی ہے جن سے عموماً جدیدیت اور خصوصاً جدید اصنافِ ادب کے تصورات محدود اور غیر واضح ہو کر رہ گئے ہیں جس کے باعث فنکاروں نے آٹھ دس موضوعات اور سو ڈیڑھ سو الفاظ کی اُلٹ پھیر ہی کو اپنے اظہار کے لیے مقرر کر لیا ہے چنانچہ اس دہراؤ، تکرار اور یکسانیت سے تعرض کے لیے انسانی اور فنکارانہ وسیع النظری اور وسیع المشربی، عصر و فکر کی بصیرتوں کے حصول اور اجتناب دمُو کے اصول پر مبنی جدیدیت کے اختیار و اظہار اور پیروی اور تقلید سے احتراز کی شدید ضرورت ہے تاکہ جدید شعر و ادب اور خصوصاً جدید غزل کی لفظی اور موضوعی تحدید ختم ہو سکے۔ ●●

علی عباس اُمیدؔ

زخمی لمحہ

★

رات نے اوڑھ لی پُر کیف خیالوں کی رِدا
خوابِ نادیدہ سمٹنے لگے پلکوں کے تلے
پھر کسی نے درِ اُمّید پہ دستک دی ہے
کون ہو سکتا ہے اُڑتی ہوئی خوشبو کے سوا

●

میں کہ جلتا ہوا لمحہ ہوں مرے پاس ابھی
ایک اِک یاد امانت ہے نگارِ دِل کی
جسم کا لوچ، تر و تازہ گلابوں کی مہک
پُر فسوں بوسے، اُلجھتی ہوئی سانسوں کی کھنک
ابرِ مغرور، جنوں خیز ہواؤں کی سنک
برف کی قاش سے اٹھتی ہوئی شعلے کی لپک
سطحِ احساس پہ یکبارگی بجلی کی چمک
روبرو صرف پگھلتے ہوئے سونے کی دمک
ہر خطِ جسم کے ہونٹوں پہ مچلتی باتیں
جانے انجانے گناہوں کی دھڑکتی راتیں
صفحۂ ذہن پہ اب بھی ہیں نمایاں ایسے
تیشۂ دل پہ منقش وہ سراپا جیسے

●

دے رہا ہے درِ اُمّید پہ دستک کوئی
کون ہو سکتا ہے اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا
خوابِ نادیدہ بکھرتے ہیں کلی کی مانند!
مجھ کو اُڑتی ہوئی خوشبو کی ضرورت کیا ہے
میں کہ جلتا ہوا لمحہ ہوں صدی کی مانند!!

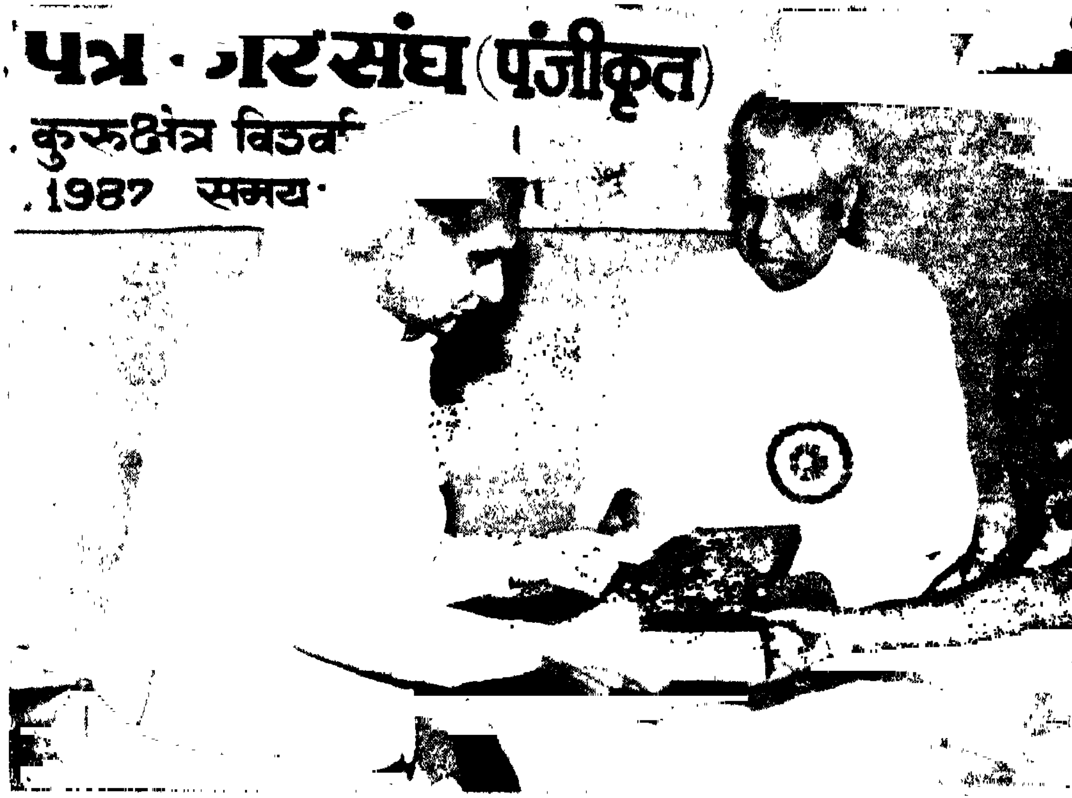
پبلشر اور چیف ایڈیٹر ایل۔ کے۔ جین نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی۔ او نمبر ۱۸۹۔ ۱۹۱ سیکٹر ۱۷۔ سی چنڈی گڑھ سے دسمبر ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ ٹی چنڈی گڑھ



وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال کا، ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو وطن واپسی پر پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے اُن کے مداحین۔

عالیجناب دیوی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو کوروکشیتر میں ۲ کروڑ، ۹ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئے ریلوے اوور برج کا افتتاح فرماتے ہوئے۔





وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو کوروکشیتر میں
"ہریانہ ایکریڈیٹڈ پریس رپورٹرز" کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر ممتاز اخبار نویس
جناب کلدیپ نیر کو "لالہ جگت نارائن ایوارڈ" سے نوازتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ سوکھا راحت فنڈ" کے لئے ۱۹۰۴۴ لاکھ روپے کی رقم عالیجناب دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جناب خورشید احمد، وزیرِ تعلیم ہریانہ اور پارلیمنٹری سیکریٹری
جناب سہاگ مل۔

